

اقبال اور بھوپال

صہبائے کھنڈوی

اقبال اکادمی پاکستان

دیباچہ طبع سوم

”اقبال اور بھوپال“ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اور خلاف توقع سال کے دوران ہی ختم ہو گیا۔

دوسرہ ایڈیشن نظر ثانی اور اضافے کے ساتھ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا اور اب یہ تیسرا ایڈیشن مزید چھان بین اور ترمیم و اضافے کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے صحیح طور پر علم نہیں کہ علامہ اقبال پر شائع ہونے والی تحقیقی کتابوں میں کتنی کتابیں ایسی ہیں جن کے دو تین یا زائد ایڈیشن چھپے ہوں بہر حال راقم المروف کے لیے یہ امر باعث فخر و مسرت ہے کہ ”اقبال اور بھوپال“، کو ہمہ گیر مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ حوالے کی ایک اہم کتاب بن گئی۔ اور دوسرہ ایڈیشن ختم ہونے کے بعد تیسرا ایڈیشن کی اشاعت کا امکان پیدا ہوا۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ چالیس سال بعد مجھے بھوپال جانے اور دریینہ دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ بھوپال کے بیس روزہ قیم میں جن ممتاز اہل قلم نے میری پذیرائی کی اور قدردانی فرمائی ان میں جناب ممنون حسن خان، جناب اختر سعید خاں، ڈاکٹر اخلاق اثر، ماسٹر اخڑھ، جناب فضل تابش، جناب ابراہیم یوسف، جناب اشتیاق عارف، جناب قمر جلالی، جناب قدر چعتائی، ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی، جناب عشرت قادری، ڈاکٹر خلیل بدر، جناب عبد الباط، مختار مہ شفیقہ فرحت، جناب مصطفیٰ تاج، برادر خورد، ڈاکٹر حنیف فوق جنات شوکت رموزی، جناب نعیم کوثر، جناب ایم نہمان وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

بھوپال پہنچ کر جس چیز نے مجھے بہت زیادہ متأثر کیا..... وہ دارالاقبال..... میں علامہ اقبال کی یادوں اور یادگاروں کو قائم اور محفوظ رکھنے کا عمل تھا جس کے لیے حکومت مدھیہ پر دلیش اقبال شناس جناب ممنون حسن خاں اور ان کے رفقائے کارکاذ کر مناسب ہو گا۔ کہ ان سب کے مشترکہ مسامی سے شیش محل..... جہاں علامہ اقبال نے قیام فرمایا تھا..... اس کے سامنے کھرنی والا میدان..... اقبال میدان..... میں موسم ہوا۔ جہاں بھارت کے ایک معروف آرٹسٹ نے اقبال کے شاہین سے اس میدان کو زینت بخشی ہے۔ نیز کل ہند اقبال ادبی مرکز کا قیام اور ایک لاکھ روپے سالانہ کے اقبال (سماں) اعزاز کی ابتدا ہوئی..... اب تک جن ممتاز شخصیتوں کو اس اعزاز سے نوازا جا چکا ہے ان میں سردار جعفری عصمت چفتائی، اختر الایمان۔ قراہ اعین حیدر اور آنندز رائے ملا بطور خاص قبل ذکر ہیں چنانچہ اب بھوپال کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہے کہ بر صغیر پاک و ہند میں رہ علامہ اقبال کی یادوں اور یادگاروں کا واحد مرکز ہے۔ اور کسی بھی دوسرے شہر کو یہ اعزاز نصیب نہیں۔۔۔۔۔ ایک لاکھ روپے سالانہ کا اقبال اعزاز بھی پاک و ہند میں کہیں اور نہیں دیا جاتا۔

میرے بھوپال جانے کا واحد مقصد دیرینہ احباب سے ملاقات کے علاوہ علامہ اقبال سے متعلق نئے مواد کی تلاش افکار کی ابتدائی پانچ سالہ فائل کی دستیابی اور..... اقبال اور بھوپال..... پر بعض اعتراضات کی مزید چھان بین تھا۔ افکار کی فائل کے سلسلے میں برادرم اختر سعید خاں نے بھوپال کے قدیمترین روزنامہ ”ندیم“ میں اعلان کر دیا کہ صبا لکھنوی کو اپنے رسالہ افکار کی مکمل فائل درکار ہے۔ جو صاحب یا ادارہ قیمتاً یا تحفتاً عنایت کر سیں ان کا خصوصی کرم ہو گا۔ اس اعلان کے نتیجے میں بھوپال کے کئی احباب سے تبادلہ خیالات ہوا اور اندازہ ہوا کہ مکمل فائل تو شاید ہی دستیاب ہو سکے۔ البتہ متفرق رسائل مختلف جگہوں میں مل سکتے ہیں۔ چنانچہ میری درخواست پر بھوپال کے احباب نے مجھے ان رسالوں کی فہرست

مضامین کی فوٹو کا پیاس مہیا کر دیں۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۳۶ء کے دوران میں مجموعی طور پا افکار نے دو خاص نمبر ۱۹۲۸ء میں لکھنوا و دو کا نفرنس نمبر اور ۱۹۳۹ء میں بھوپال اردو کا نفرنس کے علاوہ تقریباً باون رسالے پابندی سے شائع کیے تھے۔ لیکن کافی تلاش کے بعد مجھے صرف پچھیس تیس رسالوں کی فہرستیں مل سکیں۔ لیکن ۱۹۲۸ء کا لکھنوا و دو کا نفرنس نمبر کہیں نہ مل سکا۔ افسوس کہ ان فہرستوں میں علامہ اقبال سے متعلق مواد دستیاب نہ ہو سکا۔ اسی طرح روزنامہ ندیم اور هفت روزہ ندیم کی مکمل فائلیں بھی نہ مل سکیں۔ اب میرے لیے لیدے کے جناب ممنون حسن خاں کی ذات تھیں جنہیں روز اول سے ہی میں نے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ ان کے پاس علامہ اقبال کے جو غیر مطبوعہ خطوط ہیں وہ مجھے ان کی فوٹو کا پیاس عنایت کر دیں تاکہ میرے بھوپال آنے کا سب سے بڑا مقصد پورا ہو سکے۔ اور میں ”اقبال اور بھوپال“ کے تیرے ایڈیشن میں کچھ یہ ممواد شامل کر سکوں۔ ممنون صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ ہیں۔ میری خواہش اور اصرار پر مسکرا کر تسلی دیتے رہے اور روائی سے صرف ایک دن پہلے مجھے علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط پتہ لکھے ہوئے لفافہ کے ساتھ عطا کر دیا جس کا اعلان افکار میں شائع کر چکا ہوں۔

علامہ اقبال کا خط اور پتے کا عکس ملاحظہ ہو:

اہم اخبار شمارہ نمبر ۲۲۸ ستمبر ۱۹۹۱ء صفحہ ۵۷

یہ خط جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے..... ۱۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو ذریعے رجسٹری لاہور سے پوسٹ کیا گیا اور پتے کی مہر سے علم ہوتا ہے کہ رجسٹری ۱۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو بھوپال پہنچ گئی۔ یہ خط جناب شبیح قریشی کے نام ہے جو ان دونوں مشیر الہام روکاری خاص تھے۔

خط میں علامہ اقبال نے تحریر کیا ہے کہ ان کی آنکھوں میں موتابند اتر آیا ہے۔ اس لیے وہ یہ خط اپنے دوست نذیر نیازی سے لکھوار ہے ہیں۔ دوسری اہم بات انہوں نے اپنے

دونوں بچوں یعنی جاوید اور منیرہ سے متعلق لکھی ہے جن کی عمریں چودہ اور ساڑھے سات سال کی ہیں اور خواہش ظاہر کی ہے کہ تمہاری وساطت سے اعلیٰ حضرت ان پر توجہ فرمائیں۔

اسی خط میں اپنی علالت کا ذکر کر کے ساتھ یہ جملہ بھی لکھا گیا ہے:
ممکن ہے میرا یہ خط تمہاری طرف آخری خط ہو۔
آخر میں تحریر ہے:

”صرف تم کو اور اس مسعود کو میرے حالات کا علم ہے۔ وہ بے

چارا تو چل بسا ب میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں“۔

علامہ اقبال کے آخری ایام کا تحریر کردہ یہ خط اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ اپنی علالت جاوید اور منیرہ کے مستقبل اور نواب صاحب بھوپال کی ان کے بچوں پر خصوصی توجہ کے لیے..... جناب شعیب قریشی پر جوان کے خاص نیاز مندوں میں شامل ہیں کتنا اعتماد کرتے تھے۔ اس خط پر..... پرائیویٹ اور کنفیڈنیشنل، ”بھی خصوصی طور پر لکھا گیا ہے۔ شکر ہے کہ یہ خط جناب ممنون حسن خاں کے پاس محفوظ رہ گیا اور ۵۲ سال کے بعد پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ اس خط میں یہ حقیقت بھی عجیب ہے کہ اپنی عمر کے آخری ایام میں بھی علامہ اقبال کا بھوپال سے رابطہ برقرار رہا اس لیے بھوپال اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

قیام بھوپال کے دوران مجھے اقبال اور بھوپال کی دواہم کوتا ہیوں پر بھی مزید تحقیق کا موقع ملا..... جن کی نشاندھی محمد نعمان خاں صاحب اور اسٹراختر نے اپنے تبروں میں کی تھی ایک تو مفتی انوار الحق کی وفات سے متعلق اور دوسری موتی مسجد کی مطبوعہ تصویر کی سخت سے متعلق۔

”اقبال اور بھوپال“، میں شائع شدہ تقریباً تمام تصاویر مجھے بھوپال سے میرے دیرینہ رفیق کا رہا درم رشدی ایڈیٹر روزنامہ افکار بھوپال کی وساطت سے دستیاب ہوئی تھیں جن کا

ذکر دیباچہ اول میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں موتی مسجد کی بجائے جامع مسجد کی تصویر شائع ہوئی جس پر مصرین نے اب توجہ دلائی..... چنانچہ میں خود بی جامع مسجد گیا۔ مغرب کی نمازوں میں ادا کی اور یہ اطمینان ہو گیا کہ رشدی مرحوم نے نادانستگی میں جامع مسجد کی و تصویر کو موتی مسجد تحریر کر کے مجھے ارسال کیا تھا اور میں نے ان کی ہبری پر اسی طرح اس تصویر کو شامل کتاب کر لیا۔ اس نادانستہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے موتی مسجد کی جوئی تصویر میں بھوپال سے لا یا ہوں وہ تیسرے ایڈیشن میں شامل کر دی ہے۔

میں نے تو دونوں ایڈیشنوں میں اپنی مجبوری اور بے ضابطی کا اظہار کیا ہے اور یہی درخواست کی ہے کہ تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تین سال کی سعی کاوش کے بعد دوسرے ایڈیشن کوئی اغلاط سے پاک کیا تھا۔ لیکن نشان دہی کے بغیر خامیوں اور کوتا ہیوں کو بھلا کیوں کر علم ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں صمیم قلب سے جناب محمد نعمان خاں کا اور ماسٹر اختر کا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ مفتی انوار الحق سے متعلق میری تحریر مطبوعہ ”اقبال اور بھوپال“ صفحہ نمبر ۳۳۶ درست نہیں تھی۔

۱۔ اس مستند خط کی دستیابی کے بعد ”اقبال اور بھوپال“ کے دوسرے ایڈیشن میں صحیح ۲۵۲ پر مطبوعہ خط جس کو اب تک آخری سمجھا جا رہا تھا یعنی ۱۹۳۸ء اپریل ۱۹۴۱ء کا خط بنام منون حسن خاں وہ اب مشتبہ ہو گیا ہے۔

آخر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ”اقبال اور بھوپال“ کے دوسرے ایڈیشن میں جو اشاریہ شامل ہے وہ ”اقبال اور بھوپال“ کے صرف پہلے ایڈیشن میں تیار کیا گیا تھا۔ اور دوسرے یا تیسرے ایڈیشن میں جو دیباچہ شامل ہیں ان کی تفصیلات اس اشاریہ میں شامل نہیں۔

مفتی صاحب کا انتقال واقعی ۱۹۴۰ء میں ہوا جب کہ میرے ذرائع کے مطابق اطلاع

درست نہیں تھے۔ کہ میں نے یہ کتاب کراچی میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ اور دس گیارہ سال تک مواد فراہم کرتا رہا تھا۔ بھوپال کے جورِ فیق میری رہبری اور مدد کر رہے تھے ان ہیں کی اطلاع پر میں نے جناب عبدالقوی دسنوی کے کتابچہ ”علامہ اقبال بھوپال میں“..... پر اظہار رائے کرتے ہوئے تحریر کیا تھا:

”کتابچہ کے صفحہ نمبر ۵ پر انہوں نے اقبال سے ملاقات کرنے والوں کے جو نام شائع کیے ہیں ان میں دونا محل نظر ہیں مفتی انوار الحق کا اقبال کی بھوپال آمد سے بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔“

شکر ہے کہ مفتی صالح کی وفات کی اطلاع بے بنیاد نکلی اور تیسرے ایڈیشن میں راقم الحروف کو سرخ رو ہونے کا موقع مل سکا۔
جہاں تک ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اور دیوان غالب کا تعلق ہے میں نے بہت صراحت سے لکھا ہے۔

”بھوپال کا تنہا یہ ادبی کارنامہ ہی اس کی عظمت کا ہمیشہ امین رہے گا کہ غالب کے دو ابتدائی دیوان بھوپال سے ہی وستیاب ہوئے۔ پہلا دیوان فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا جس کی بابت مشہور ہے کہ مرزا غالب نے ان کی فرمائش پر ارسال کیا تھا۔ یہ دیوان مولوی انوار الحق کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے معرکہ آرا مقدمہ کے ساتھ نواب حمید اللہ خاں کے دور حکومت میں نسخہ حمید یہ کے نام سے شائع ہوا۔“

میرا خیال ہے کہ ماسٹر اختر صاحب کی نظر سے کتاب کا یہ صفحہ نہیں گزرا اور نہ وہ نسخہ

حمدید یہ سے متعلق معرض نہ ہوتے:

اقبال اور بھوپال کے پہلے ایڈیشن میں صفحہ نمبر ۲۷ پر میں نے لکھا ہے:

”شاغل فخری کے علاوہ بھوپال کی جن دیگر ممتاز شخصیتوں نے

اقبال کو موضوع بحث بنایا ان کے فکر و فن پر کام کیا اور ان میں رضیہ

فرحت بانو محمد امین زیری، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور عبدالقوی دسنوی

قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی ادبی کاوشوں کا آئندہ صفحات میں

احاطہ کیا گیا ہے۔ صرف رضیہ فرحت بانو کی مرتبہ کتاب خطبات

اقبال مجھے دستیاب نہ ہو سکی۔ لیکن یہ کتاب لاہوری بھوپال میں

موجود ہے رضیہ فرحت بانو بھوپال کی ممتاز ادیبہ اور افسانہ نگار

ہیں۔“

بھوپال کے قیام میں..... ”اقبال لاہوری“ کی مجلس انتظامیہ نے مجھے لاہوری آنے

کی دعوت دی میں تو خود لاہوری دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک شام ماسٹر اختر صاحب مجھے

لاہوری لے گئے مجلس انتظامیہ کے اراکین نے لاہوری کے دروازے پر میرا خیر مقدم

کیا۔ اندر پہنچ کر سب سے پہلے رضیہ بانو کی کتاب ”خطبات اقبال“ دیکھنے کی فرمائش کی تو

لائق لاہوریین نے چند منٹ میں کتاب مہیا کر دی۔ کتاب دیکھ کر جی خوش ہوا۔

۱۔ ”اقبال اور بھوپال“ دوسری ایڈیشن صفحہ نمبر ۳۳۷

اس کے ابتدائی صفحات کی فوٹو کا پیاں حاصل کیں ان کے مطالعے سے علم ہوا کہ عرض

مرتب کے عنوان سے رضیہ فرحت بانو نے دو صفحات تحریر کیے ہیں جس کا ایک اقتباس ملاحظہ

ہوا:

”علامہ اقبال موصوف کے ان خطبات کا کوئی مجموعہ میری نظر

سے نہیں گزرا۔ اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لیے میں نے ان کے تمام صداری خطبات اس مجموعے میں جمع کر دیے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شاائقین اقبال اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

”خطبات اقبال“..... ۵۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو حالی پبلیشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی سے شائع ہوئی۔ کتاب کے کل ایک سو گیارہ (۱۱۱) صفحات ہیں اور اس کی قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال پر شائع ہونے والی دوسری کتاب ہے جسے بھوپال کی ادیبیہ نے مرتب کیا۔ اس میں تین اہم خطبات بہ تفصیل ذیل شامل ہیں۔

۱۔ خطبہ صدارت..... آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس منعقدہ الہ آباد ۲۷ نومبر ۱۹۳۰ء
۲۔ خطبہ صدارت..... آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس منعقدہ لاہور ۳ مارچ ۱۹۳۱ء

۳۔ ملت بیضا پر ایک نظر..... مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کتاب کے آغاز میں رضیہ فرحت بانو نے عرض مرتب تحریر کیا ہے اور پیش رس کے عنوان سے جناب چودھری غلام احمد پرویز نے علامہ اقبال کی ادبی عظمت اور ان کے شاعرانہ کمالات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور ان خطبات کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

”اقبال لاہوری“ کی توسعی و ترقی میں سماجی کارکن آصف شاہ میری (مرحوم) نے عملیاً سرگرمی سے حصہ لیا جس کا تذکرہ ”اقبال اور بھوپال“ کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ کاش ”اقبال لاہوری“، اس بوسیدہ عمارت سے کسی اچھی اور وسیع عمارت میں منتقل ہو سکے۔ بہر حال منتظمین نے اقبال کی اس یادگار کو سجن و خوبی محفوظ رکھا ہے۔

بھوپال کی ایک ادبی تقریب میں مجھے جناب اختر سعید خاں کا ایک منتظر لیکن جامع تحقیقی مضمون ”شیش محل اور اقبال“ سننے کا موقع ملا۔ اس قیمتی مضمون میں علامہ اقبال کے قیام بھوپال کی تیرہ نظموں میں سے ایک نظم کا سراغ لگایا گیا ہے..... دلائل کے ساتھ یہ

جامع مضمون افکار میں شامل ہو چکا ہے اس مضمون کے چند اقتباسات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ آغاز میں لکھتے ہیں:

”شیش محل اور اقبال پر جستہ جستہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

ہندوستان میں بھی اور ہندوستان کے باہر بھی۔ لیکن یہاں میں بھوپال سے تعلق رکھنے والے تین صاحبوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ایک پروفیسر عبدالقوی دسنوی جنہوں نے ایک رسالہ..... ”علامہ اقبال بھوپال میں“ کے عنوان سے مرتب فرمایا۔ دوسرے یادش بخیر جناب صہبائے لکھنوی شمہ بھوپالی مدیر افکار کراچی کی کتاب (اقبال اور بھوپال) جس میں انہوں نے دوسروں کے لیے کچھ کہنے کو باقی نہیں

چھوڑا۔

۱۔ ماہنامہ افکار کراچی شمارہ نمبر ۱۲۵۲ اکتوبر ۱۹۹۱ء صفحات ۲۳ تا ۲۶

تیسرا مضمون ”شیش محل اور اقبال“ پروفیسر اخلاق اثر کا ہے جس میں ان نظموں کا پس منظر بیان کیا گیا ہے جو علامہ نے بھوپال میں کہی تھیں۔

آگے چل کر اختر سعید خاں صاحب نے شیش محل کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے کہ اس محل کی تعمیر کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھے پوچھیئے تو اس عمارت کو صرف علامہ اقبال کے مختصر قیام سے ہمہ گیرشہرت نصیب ہوئی۔ لکھتے ہیں:

”یہ عمارت جو شیش محل کے نام سے موسوم ہے اور جس میں

علامہ اقبال نے چند روز قیام فرمایا تھا..... کب بنی کیسے بنی کس نے

بنائی اس کا تذکرہ نہ کسی کتاب میں ملتا ہے نہ ایسا کوئی کتبہ دریافت ہوا
جسے تاریخ اسناد کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ گزشتہ چند برسوں سے
اسپر ناگرک بند کا بورڈ لگا ہوا نظر آتا ہے۔ اور میں سوچنے
گلتا ہوں..... اس جگہ ایک مے کدھ تھا کیا ہوا؟ اعمارت کی جستجو میں
صرف ایک صاحب جنہوں نے عیسیٰ کی نہیں تو بزرگوں کی آنکھیں
ضرور دیکھی تھیں۔ میری رہنمائی فرمائی۔ انہوں نے بتایا کہ اب سے
سو اسال پہلے جب بھوپال کی ایک خاتون فرماں رو انواب سکندر
جہاں بیگم نے اپنی ولیہ عہد نواب شاہ جہاں بیگم کے لیے ایک عمارت
شوکت محل کے نام سے تعمیر کروائی تو یہ عمارت بی جو مغربی دروازے
سے ملحت ہے تعمیر ہوئی اور شیش محل کھلائی۔ اس محل میں پہلے بھوپال
کے وزیر اعظم کی رہائش تھی بعد ازاں یہ شاہی مہمان خانہ قرار پائی۔
میں نے عرض کیا..... قبلہ اس میں شیش محل والی کون سی بات
ہے..... بے شک اس کے کمرے اور دالان بہت وسیع ہیں اور کئی
حصوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن اس عمارت میں نہ کوئی تعمیری
تناسب ہے نہ صناعی نہ مجموعی حسن جو دیکھنے والوں کو متاثر کر سکے۔
اگر مغل طرز تعمیر کا تین محرابوں والا بلند اور کسی قدر پر شکوہ دروازہ نہ
ہوتا تو اسے محل کون کہتا؟

فرمایا..... تم ٹھیک کہتے ہو صاحبزادے..... مگر یہ مت بھولو کہ
بھوپال کی سادگی پسند بیگمات حسن سے زیادہ قوت پر اعتماد کرتی
تھیں۔ دیکھتے نہیں ہو کہ سوا سوال بیت جانے کے باوجود اس

عمارت کی کسی میاں نے خم نہیں کھایا۔ اتنا کہہ کر میرے خضر را تو
نظروں سے اوچھل ہو گئے اور میں سوچنے لگا کہ اس عمارت کے
بانے والوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ غیر اہم عمارت جس کا ذکر شاہی
 محلات کے تذکروں میں ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ایک دن اردو ادب کی
 تاریخ میں نقش دوام بن کر ابھرے گی جس نقش دوام کی تعبیر علامہ
 اقبال نے اپنے شعر میں اس طرح فرمائی ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
 جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
 ہر چند کوششیں محل کو کسی مرد خدا نے تمام نہیں کیا۔ لیکن ایک مرد
 خدا کے قیام نے اس کے نقش میں ثبات بھر دیا اور وہ مرد خدا.....
 اقبال کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

جس چودھویں نظم کا جناب اختر سعید نے سراغ لگایا ہے وہ اقبال کے بھوپال میں قیام
 کے دوران لکھی گئی ہے جیسا کہ اس نظم پر مندرجہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ البتہ نظم کے
 نیچے..... ”شیش محل بھوپال میں لکھی گئی“..... درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

ان کا استدلال ہے:

”تیرہ نظموں کے علاوہ ضرب کلیم میں ایک نظم اور ہے جس کے
 بارے میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ بھوپال کے قیام کے زمانے
 میں شیش محل میں کہی گئی ہے..... اگرچہ اس نظم پر یہ نوٹ نہیں ہے
 کہ وہ بھوپال میں کہی گئی ہے۔ تاہم اس پر جو تاریخ درج ہے اس کی
 رو سے ان دونوں علامہ اقبال شیش محل بھوپال میں مقیم تھے اور شیش محل

میں یہاں کا پہلا قیام تھا۔

اس نظم کا عنوان ہے.....ابی سینیا.....اس نظم کی تاریخ ۱۸ اگست ۱۹۳۵ء درج ہے جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا علامہ تیسری بار.....۱ جولائی ۱۹۳۵ء کو بھوپال تشریف لے گئے تھے اور ۲۸ اگست ۱۹۳۵ء کو واپس تشریف لے گئے یعنی روانگی سے دس روز قبل نظم کہی گئی۔

اس سلسلے کی دوسری نظم.....مسولینی.....ہے جس پر قطعیت کے ساتھ ضرب کلیم میں ۱۲۲.....۱۸ اگست ۱۹۳۵ء بھوپال شیش محل میں لکھے گئے درج ہے یعنی روانگی سے چھ روز قبل.....یہ نظم وجود میں آئی۔ ابی سینیا اور مسولینی کی تخلیقات میں صرف پانچ دن کا فصل ہے یہ دونوں نظمیں ذہنی تشکیل کی آئینہ دار ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابی سینیا کے عنوان سے یہ نظم کہہ لینے کے بعد بھی.....علامہ کے ذہن میں ایک خلش تھی اور وہ اس موضوع پر مزید کچھ کہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پانچ دن بعد ہی مسولینی کے عنوان سے انہوں نے جو نظم کہی اس میں یورپ کی جارحانہ اور ظالمانہ روشن دیکھ کر بڑا تینکھا طنز کیا ہے۔

دونوں نظموں کو ایک ساتھ پڑھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ ابی سینیا میں اگر اطالبیہ کے فسطائی نظام کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے تو مسولینی میں اقبال نے یورپ کے دیو استبداد کی جمہوری قبا کا پرده چاک کیا ہے۔ معصومات یورپ نے مخاطب ہو کر مسولینی کا یہ کہنا کہ:

پرده تہذیب میں گارت گری آدم کشی!
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج
منطقیانہ طریق استدلال نہ سہی لیکن نفسیات کے عین مطابق
ہے۔ علامہ اقبال نے ڈرامائی انداز میں دو ظالموں کو مدقابل کر کے
مسئلینی کی زبان سے وہی کھلوا یا ہے جو ایک غاصب دوسرے
غاصب سے کہہ سکتا ہے۔ نظم ابی سینیا کی خارجی اور داخلی شہادتیں
ثابت کرتی ہیں کہ نظم شیش محل کے قیام کے دوران کبھی گئی ہے اور
اس طرح ایک اور نظم بھوپال کے حصے میں آتی ہے۔

ضرب کلیم..... بقول علامہ اقبال Topical اور اس کا مقصد
یہ ہے کہ وہ بعض خاص مضامین پر اپنے خیالات کا اظہار
کریں..... شیش محل یا ریاض منزل میں کبھی گئی نظمیں اسی زمرے میں
آتی ہیں۔

جناب منون حسن خاں صاحب جناب اختر سعید اور ماسٹر اختر صاحب سے تقریباً
روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے ماسٹر اختر صاحب سے ذکر کیا کہ بھوپال کے کئی
ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین بھوپال کے جرائد میں اور رسائل میں شائع ہوئے
ہیں۔ علامہ اقبال کے قیام کے دوران بھی اور ان کے جانے کے بعد بھی..... مثلًا مولا نا
ارشد تھانوی مولانا مائل نقوی، ملار موزی وغیرہ، کاش ان پر اخبارات اور رسائل کی فائلیں
وستیاب ہو جاتیں تو شائع شدہ مضامین کو جمع کر کے شائع کر دیا جاتا۔ اس پر ماسٹر اختر
صاحب نے فرمایا کہ ملار موزی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون ان کے بیٹے شوکت رموزی کو ملا تھا
جسے انہوں نے بھوپال کے معروف شاعر عشرت قادری کو دے دیا اور عشرت قادری نے اس

مضمون کو ماہنامہ ”عکس“، دہلی کو اشاعت کے لیے بھیج دیا اور ماہنامہ ”عکس“، دہلی نے اپنی جون ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں شائع کر دیا۔ چنانچہ جناب عبدالقوی دیسوی نے اس مضمون کو اپنی کتاب ”اقبال اور درالاقبال“ میں ”عکس“ کے حوالے سے شامل کیا ہے۔ ذیل کا مضمون دیسوی صاحب کی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے تاکہ ملارموزی کا یہ نایاب مضمون محفوظ ہو جائے۔

ملارموزی ہندوستان گیرشہرت کے مالک تھے۔ اور علامہ اقبال کے بھوپالی نیازمندوں میں انہیں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ علامہ اقبال بھی ان پر شفقت فرماتے تھے جن کا ثبوت مضمون کے مطالعے سے مل جائے گا۔ ملارموزی کے مضمون کا عنوان ہے:

مقامات اقبال

علامہ اقبال سے ملنے والوں میں ملارموزی کی ملاقات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ خود لاہور گئے تھے لیکن لوگوں کے کہنے کے باوجود علامہ اقبال سے ملنے نہیں گئے تھے علامہ اقبال جب بھی بھوپال آئے تو لوگ جو ق در جو ق ان سے ملنے گئے تو بھی ملارموزی ان سے ملاقات کرنے نہیں گئے۔ آخر علامہ اقبال نے سر راس مسعود کے ذریعے بلا یا تو ملاقات ہوئی۔

تفصیل ملارموزی کی زبان سنئے:

۱۔ عجب اتفاق ہے کہ اختر سعید خاں نے جس نظم کی بقید تاریخ نشان دہی کی ہے یعنی ”مسولیتی“، اس کا ذکر محمد احمد سبزواری کے مضمون بے عنوان نہزاد نو مطبوعہ اقبال اور بھوپال دوسرے ایڈیشن صفحہ ۲۸۲ پر موجود ہے جس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”جب پہلی مرتبہ میں اس محفل میں شریک ہوا تو یورپی سیاست موضوع بحث تھی اس

سلسلے میں علامہ نے اپنی ایک تازہ نظم "مسویتی" سنائی۔

علامہ مددوح بھوپال تشریف لائے۔ لوگ جو ق در جو ق ملنے
گئے مگر میں جو ق جو ق گیا نہ بے جو ق جو ق گیا۔ خدا گواہ ہے کہ ان
کے کلام کو ابھی اسی حد تک پڑھتا تھا۔ جتنا کہ اخباروں اور رسائلوں
میں شائع ہو کر خود ہی میرے منہ کے سامنے آ جاتا تھا۔ اب علامہ
سے اتنا دور اور تنا بے خبر رہ کر کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ اقبال کی تباہ
علالت اور بھوپال میں بغرض علاج تشریف آوری کی خبر سن کر بے
ساختہ آنسو گرانے لگا۔ اور چند منٹ تک میری آنکھوں سے آنسو
جاری رہے۔ بے سبب رو نے پر میری بیوی اور میری والدہ مغفورہ
نے مجھ سے رو نے کا سبب دریافت کیا تو مجھے اب تک یاد ہے کہ
جب سبب ان کو بتایا تھا وہ یہ تھا کہ اس بے ساختگی ہی سے میری زبان
سے یہ فقرے نکلے کہ ایک سب سے بڑا مسلمان اذیت میں مبتلا ہے
یعنی اقبال۔

حیران تھا کہ میرے اس فقرے پر میری بیوی اور میری والدہ
بھی رو نے لگ گئیں یہ تھا مقال اقبال!

شرح یہ ہے کہ اقبال کا شرف خدمت اور رسوخ مرتبہ ملاحظہ ہو
کہ میں ان سے کبھی نہ ملا۔ ان کے کلام کو کبھی غور سے نہ پڑھا لیکن
ان کی اذیت کی انتہا اطلاع ہی پر میرے اعصاب حیات نے اپنی
با ضابطگی بدل دی۔ حتیٰ کہ اقبال سے یکسرناواقف میری والدہ اور
بیوی کے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ کیا کروڑ پتی انسان کی تکلیف کی

اطلاع سے بھی اس قدر جلد اور ایسا تاثر پیدا ہو سکتا ہے؟

علامہ اقبال بھوپال میں مقیم رہے مگر پھر بھی شرف نیاز حاصل کرنے نہیں گیا۔ وہ پھر وطن تشریف لے گئے۔ اب مجھے نہ وہ یاد رہے نہ اپنا آنسو بہانا یاد رہا کہ ایک رات کوئی ۸۔ ۹ بجے کے درمیان ایک موڑ کار آیا اور مجھے حضرت العالیٰ علامہ راس مسعود رحمۃ اللہ کی کوٹھی پر لے گیا۔ سب دنیا جانتی ہے کہ سید صاحب قبلہ کس درجہ اشرف انوار تھے۔ مجھ مزدور وضع قطع کے ملار موزی کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ ایک چادر سی اوڑھے ہوئے بے حد مضموم سے انسان کی طرف کھیچ کر مجھ سے فرمایا کہ یہ تم کو بہت یاد کرتے ہیں۔ میں صورت دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ مضموم سا انسان عہد حاضر کا حکیم معرفت اقبال ہے۔ علامہ کو ملاحظہ فرمائیے کہ مجھ سے ایسے مگرور اور مزدور قماش..... ناکارہ انسان کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ طبعی اور پیدائشی حیثیت سے اس غصب کا مغرب اور خود ہم انسان ہوں کہ میرے روزمرہ کے دوست ہی میری حد غرور بتا سکتے ہیں مگر علامہ کے معافقہ فرماتے ہی مجھ پر پھر ایک کیفیت رقت طاری ہوئی۔ یہ تھا علامہ کا دوسرا مقام خلق و قوم شرف۔ معافقہ سے متصل ہی میرے منہ سے بے ساختہ نکلا..... اف..... سر راس علیہ رحمۃ یہ اُنے مقام پر صاحب مرتبہ صوفی تھے۔ میرے اف کہنے پر فرمایا کہ پھر ان سے ملنے خود کیوں نہ آئے؟ میرا کمینہ پن ملاحظہ ہو کہ میں نے تڑ سے کہا..... میں خود اپنی جگہ پر اقبال ہوں۔ یہ

کہنا تھا کہ سبحان اللہ کہہ کر اقبال نے پھر میری طرف بڑھے اور مجھے
دیریکٹ لکھیج سے لگائے رہے۔ یہ تعالیٰ مکا تیسرا مقام فیاضی و مقام
شرف افت آگاہی.....!

علامہ اقبال بڑے خوش تھے۔ کوئی میں اس وقت ہم تین کے سوا
کوئی نہ تھا۔ رسی الفاظ اور آغاز کلام کے کسی مربوط موقع کے بالکل بیچ
میں کافی بد تیزی سے میں سید صاحب قبلہ سے عرض کیا کہ حضور
علی..... چائے پیے بغیر مجھ میں جودت بیان و ذوق ساعت بیدار نہ
ہو گا۔ علامہ نے پھر زور سے فرمایا..... زندہ باد..... یہ تعالیٰ مکا چوخ تھا
مقام انسان آگاہ.....!

ملاحظہ فرمائیے..... کتنی اوپنچی تعلیم کتنی اوپنچی ذہانت کتنی اوپنچی
مجلس کتنے اوپنچے جلسوں اور کتنی اوپنچی معاشرتوں سے وابستہ رہنے
والا علامہ اقبال میری کتنی نیچے درجے کی باتوں کو کس قابل جامعیت
سے معاً اور فی الفور تاثر جاتا تھا اور ملاقات میں عین اس پست سطح پر
خوش خوش اتر آتا تھا۔ جہاں سے مجھے ایسا مغروگ تاخت خود فہم اور خود
سر انسان اس ایسے صاحب مقام بلکہ صاحب عصر انسان سے ہم کلام
تھا۔

اس عرصے میں چائے آگئی۔ میں نے چائے کی حسین پیالیوں
کو دیکھ کر سید صاحب قبلہ سے بے ساختہ گستاخی کی اور عرض کیا کہ
پیالیاں بے جوڑ ہیں سید صاحب غصب حساس تھے اس لیے ان کے
تیور بدل جانے سے پہلے میں نے یہ شرح پیش کی کہ بے جوڑ سے

مراد یہ نہیں کہ پیالیوں کو شاہانہ یک رنگی میں فرق ہے بلکہ بے جوڑ سے مراد یہ ہے کہ علمی لوگوں کو نفاست نہیں بلکہ شدت کی ٹکر سے کام کی ارزی جلتی ہے۔ کیونکہ اگر وہ نفاست ورنگینی میں کھو جائیں تو پھر کام کون کرے۔ اس جگہ میں نے دیکھاہ علامہ مجھے ایسی حکیمانہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ بس میں جانتا ہوں۔ سید صاحب قبلہ نے بے ساختہ فرمایا دیکھا بھئی اقبال صاحب بولے کہ پھر کیا ہو گا۔ میں نے حوصلہ پا کر عرض کیا کہ اگر دماغی لوگوں کو نفاست اور کاسامان دے دیں تو وہ اس حلقة عیش کو توڑ کر باہر نہیں آ سکیں گے۔ کہ ان سے زیادہ اور بہتر طریق پر ان نفاستوں کو دوسرا کون محسوس کر سکے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ خوش رنگ ماحول کی تحسین و مدحت میں مبتلا ہو جائیں گے اور ان کے کرنے کا کام پورا نہ ہو سکے گا۔ اسی لیے سرکار گیتی پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عوض شدت و تنفس کی زندگی عنایت ہوئی۔

ان جملوں کو سن کر میں کیا کہوں کہ علامہ اقبال کا کیا حال ہوا۔

بس یہ کہ اس مقام پر پہنچ کر ان کے ہوئے بسم نے وقار و استغنا اور خود اعتمادی کی تمام بلند فطرتوں کو روند کر مجھے ایسی دادع طافرمائی کہ ان کی ایسی شہرت کا ایک انسان بھی مجھا یسے کمترین انسان کو بھی نہ دے سکے گا۔ اور نہ دیتا ہے۔ یہ تھا علامہ کا پانچواں مقام مزاج بلند۔

اب میں اپنے زور میں چٹا خ پٹا خ بتیں کر رہا تھا اور بے پروا چائے پر چائے پیے جا رہا تھا کہ معاذ اللہ علامہ نے میری اس ترکیب

پر بھی داد دی تو میں نے عرض کیا کہ قبلہ یہ مقام داد کس طرح قرار
 پایا۔ علامہ نے میرے جملے مجھی پر اس طرح دے مارے کہ ارویہ
 مسلسل چائے کس طرح؟ میں نے عرض کیا کہ حضور عالیٰ میں اپنے
 جسم کو اس آزاد افادہ سے بقلم خود تنگ ہوں کہ جس چیز کے عوام عادی
 ہوتے ہیں ان کی تقلید مجھ سے بن نہیں آتی۔ لہذا میں محفل کا لاحاظہ کیے
 بغیر چائے پر چائے پیے جاتا ہوں اور تعزیرات ہند سے نہیں ڈرتا۔
 علامہ کے جی کی سی کہہ دی تڑپ گئے اور فرمایا کہ اگر میں جانتا کہ
 گلابی اردو کا لکھنے والا یہ ہے تو اس سے پہلے حاضر خدمت ہونے کی
 کوشش کرتا۔ ملاحظہ فرمایا کہ مترين نوازي کا مقام کرم۔

اس جگہ میں نے علامہ سے شعر کی درخواست کی۔ بر جستہ فرمایا
 کہ کیا ملار موزی صاحب تشریف لے گئے سر راس موصوف کے
 فقرے پر وجد فرمانے لگے۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ کو بوسہ دیا بڑی
 دشواری سے علامہ نے یہ دو شعر سنائے:

ستارہ کا پیغام

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
 مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
 تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا
 کہ اپنی رات کو داغ جگر سے نورانی
 اشعار سن کر مجھے مسرت کے عوض ایک عظیم مصیبت کا مقابلہ کرنا

پڑا جو میں آپ کے کلام کے دوسرا سے سنانے والوں سے بھی کہا کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایک ہی شعر اتنے عظیم مطالب اور اصول کلام کا حامل ہوتا ہے کہ گھنٹوں دماغ اسی پیچ و تاب سے فرصت نہیں پاتا کہ معا دوسرਾ شعر سنادیا جاتا ہے۔ تو فرمائیے کہ اتنی جلد جلد داد دینے والا یا تو بے ایمان ہو جائے یا کند آنا تراش۔

میں کیا کہوں کہ علامہ نے کس درجہ کمال بلندی سے میری ان خرافات کو تحسین و مرحبا کے ساتھ برداشت کیا۔ مگر ایک کرم کا شرف یہ عطا فرمایا کہ جس وقت بھی یکسر تہہ ہوتے مجھے ضرور یاد فرماتے۔

اب علامہ کی جس آخری چیز نے ان کے سب سے برتر مقام کا مجھے پتا دیا وہ یہ کہ حضرت علامہ راس مسعود اور تاجدار بھوپال ایسی عظیم شخصیتیں ان کی میزبان تھیں۔ عقیدت مندوں کے ہجوم میں کم فرست پاتے تھے۔ مگر اس پر بھی ہر لمحہ اداں اور خاموش رہتے۔

علامہ کے اس انداز کے مقام تاثر کو میں تاثر گیا تھا۔ اور جان گیا تھا کہ علامہ جس رتبے کے حساس ہیں اس رتبے کا چونکہ ماحول نہیں ہے پھر بھی مجھے ان کے مقام ضبط و علوئے استقامت پر بہت نہیں ہوئی کہ میں کچھ عرض کرتا۔ البتہ میں نے ان کے اداں تاثر کو دور کرنے کے لیے ایک دن اپنے ظریفانہ رنگ کو اس طرح استعمال کیا کہ میں نے حاضر ہوتے ہی عرض کیا کہ..... مجھے اقرار ہے کہ آپ کے دوسرے مقامات روحانیت کے علاوہ آپ کا مقام مرض بھی اتنا بلند ہے کہ مجھے حضور کی عیادت کے لیے حاضر ہونا بھی اب ناممکن

محسوس ہوتا ہے جس طرح اچانک اولاد جدا ہونے لگے۔ اس بے چینی سے فرمایا کیوں کیوں؟

میں نے عرض کیا کہ اتنے ناقابل برداشت مرض کے لاحق ہونے کی قانونی صورت تو یہ تھی کہ اگر حضور کا مرض مجھے لاحق ہوتا اور اس زمانے میں حضور کی طرح..... تاجدار بھوپال کا مہماں ہوتا تو میں اس طرح رہتا کہ روزانہ مہماں شاہی خانہ کو ایک پرچہ لکھ بھیجتا کہ آج مجھے ڈاکٹر نے ذیل کی غذا میں بتائی ہیں..... فراہم کر دیجیے۔

ایک پاؤ طاعں کے کباب۔ ڈریٹھ چھٹا نک بیٹر کے گوشت کا قیمه۔ تھوڑے سے انگور اور انناس۔ شام کے وقت پرچہ لکھتا کہ ہر ن کے گوشت کے خشک قسم کے کو فیتے۔ مسلم مرغانی اور دراج کا آب جوش۔ تھوڑے سے بادام منقی کشمکش اور انجری۔ اس نوع کی غذاؤں کے بعد جب کوئی ملاقات کو آتا تو اس سے اس طرح ملتا کہ خواہ مخواہ دس بارہ وتر کی آہ کی آواز پیدا کرتا اور مرض میں مزید شدت اور اضافے کا یقین دلاتا۔

میں اس طرح کا بیان دے رہا تھا اور علامہ کامارے ہنسی کے برابر حال تھا۔ الحاصل میں نے علامہ کے جسم و قوی اور مرض کے حالات کا کافی مطالعہ کر کے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ علامہ اپنے پیدائشی مقدرت حیات سے کہیں پہلے اس لیے بے روح ہو رہے ہیں کہ قومی حالت و رہبری کے جدید و بلند راستے تلاش کرنے میں دماغ کمال شدت سے کام کرتا تھا اس شدت میں جسم کے دوسرے اعضاء کی فطری غذا

کا حصہ بھی دماغ چھین لیتا تھا اور اعصاب کا وہ تمام خون جو روح
حیات کو تمام جسم میں منتقل کرتا ہے دماغ ہی چھین کر جلا دیا کرتا تھا۔
اس لیے علامہ نے گویا قوم اور تحقیق را کے بے پناہ انہاک کے
باعث غیر طبعی اور قبل از وقت جان دی اور غصب کی حالی حوصلگی
سے۔

اللہ تعالیٰ کے انوار کی بے پناہ بارشیں ان کے مزار پر ہوتی رہیں
اور بے نہایت الطاف ان کی اولاد پر اور آنے والی نسل ان کو یاد کرتی
رہے۔

بر صغیر پاک و ہند میں بھوپال وہ پہلا خوش نصیب شہر ہے جہاں علامہ اقبال کی یادیں
آج بھی تازہ ہیں اور ان کی یادگاریں قائم کی گئی ہیں۔ اور ان کے فکر و فن پر تحقیق کے نئے
نئے گوشے دریافت کرنے کی سعی و جهد جاری ہے۔ اقبال اور بھوپال سے متعلق اب تک جو
کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے تاکہ اقبال شناسوں کو بجا طور پر یہ علم ہو
سکے کہ دارالاقبال کے رہنے والے علامہ اقبال سے کس قدر عقیدت رکھتے ہیں۔

۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں..... عبدالقوی دیسوی سن اشاعت: ۱۹۶۷ء

۲۔ اقبال اور بھوپال صہبائکھنوی سن اشاعت: ۱۹۷۳ء پہلا ایڈیشن

۱۹۸۲ء دوسرا ایڈیشن

۳۔ اقبال اور شیش محل ڈاکٹر اخلاق اثر سن اشاعت: ۱۹۷۷ء

۴۔ اقبال آئینہ خانے میں مرتبہ: آفاق احمد سن اشاعت: ۱۹۷۹ء

۵۔ اقبال نامے مرتبہ: ڈاکٹر اخلاق اثر سن اشاعت: ۱۹۸۱ء

۶۔ اقبال اور دارالاقبال بھوپال عبدالقوی دیسوی سن اشاعت: ۱۹۸۲ء

- ۷۔ اقبال اور ممنون.....ڈاکٹر اخلاق اثر.....سن اشاعت: ۱۹۸۳ء
- ۸۔ ریاست بھوپال اور اقبال.....ماسٹر اختر.....سن اشاعت: ۱۹۸۳ء
- ۹۔ بیانہ مجلس اقبال.....مرتبہ: ممنون حسن خاں.....سن اشاعت: ۱۹۹۰ء
- ۱۰۔ اقبال اور ممنون.....ڈاکٹر اخلاق اثر.....نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن.....سن اشاعت: ۱۹۹۱ء

ماسٹر اختر نے اپنی کتاب.....ریاست بھوپال اور اقبال کے آخری صفحات میں جس نئی کتاب کی نویدی ہے اس کا نام ہے.....اقبال اور نواب بھوپال۔

موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ کاش ماسٹر اختر اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر اس کتاب کو جلد شائع کر سکیں۔ تو اقبال اور نواب بھوپال کے قریبی روابط کے بارے میں دنیاۓ ادب کوئی معلومات فراہم ہو جائیں گی۔

آخر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اقبال اور بھوپال کے دوسرے ایڈیشن میں جواشاریہ شامل ہے وہ ”اقبال اور بھوپال“ کے صرف پہلے ایڈیشن میں تیار کیا گیا تھا اور دوسرے یا تیسرے ایڈیشن میں جو دیباچے شامل ہیں ان کی تفصیلات اس ”اشاریے“ میں شامل نہیں۔

کراچی ۱۱۶ اپریل ۱۹۹۸ء

صہبائکھنوی



دیباچہ طبع ثانی

”اقبال اور بھوپال“ کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اور خلاف توقع سال کے دوران ہی ختم ہو گیا۔

مئی ۱۹۷۳ء میں اس کتاب کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی جس کی صدارت شہزادی عابدہ سلطان سابق ولی عہد ریاست بھوپال نے فرمائی۔ شہزادی صاحبہ کے علاوہ پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر الجم عظیمی اور محمد احمد سبزواری نے کتاب کے بارے میں نہایت حوصلہ افزای خیالات کا اظہار فرمایا ہے اور ملک بھر کے مقامی اخبارات اور رسائل ریڈی یو پاکستان کے مبصرین اور ادب کے ناقدین نے سیر حاصل تبصرے اور تقدیمیں کیں جن کا تفصیلی احاطہ اس دیباچہ میں تو ممکن نہیں البتہ اقبال شناسوں کی دلچسپی کے پیش نظر یہ تمام مضامین اور تبصرے کتاب کے آخری باب میں محفوظ کر دیے گئے ہیں..... پھر بھی یہاں چندراہم آرا کا تذکرہ ضروری ہے۔

ڈاکٹر ممتاز حسن (مرحوم) سابق نائب صدر اقبال اکیڈمی پاکستان نے جن کی تحریک و خواہش پر میں نے یہ کتاب لکھی..... کھل کر اعتراف فرمایا:

”مجھے اس پر دلی مسرت ہے کہ اقبال اور بھوپال کے متعلق جس قسم کی تحقیقی کتاب میں چاہتا تھا..... آپ نے اپنی محنت اور جستجو سے اسے مہیا کر دیا۔ آپ کی تصنیف اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور میری توقعات سے زیادہ ہے۔“

اسی دوران یہ کتاب کسی طرح بھوپال پہنچ گئی اور علامہ اقبال کے خاص نیاز مند ممنون حسن خاں کی نظر سے گزری تو انہوں نے ڈاک کی آمد رفت بند ہونے کے باوجود ایک تفصیلی خط مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کسی ذریعہ سے مجھے ارسال فرمایا جو کافی عرصہ کے بعد مجھ تک پہنچا..... میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس خط کو افکار میں محفوظ کر دوں بعد میں اسے نظر ثانی کے وقت شامل کتاب کرلوں گا۔

اس خط کے جستہ جستہ اقتباسات کے مطالعہ سے کئی ایسے واقعات کا علم ہوا جن کے بارے میں اقبال شناس اور اردو دنیا قطبی لاعلم تھی۔ ممنون حسن خاں کا یہ خط افکار کے شمارہ جنوری ۲۷ ۱۹۴۷ء میں دیگر خطوط کے ساتھ ”تین شہرتیں داستانیں“ کے عنوان سے جس ذیلی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ہے اس کا اقتباس پیش ہے:

إذ أتي خط باسم رقم الحروف مطبوعة افكار شماره ۳۲ نومبر ۱۹۴۷ء

”ذیل کے تینوں خط یقین ہے دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

جناب ممنون حسن خاں کا تفصیلی گرامی نامہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔

جنہوں نے بارہ سال کے بعد اقبال اور بھوپال ایک نظر دیکھنے کے بعد مجھے تحریر کیا ہے۔ علامہ اقبال کے بھوپالی نیاز مندوں میں جناب

ممنون حسن خاں سب سے بزرگ و محترم اور مستند و معتبر شخصیت ہیں ان کے نام علامہ کا آخری خط جو وفات سے صرف دو دن پہلے ہی

یعنی ۱۹ اپریل ۱۹۴۸ء کو تحریر کیا گیا تھا اقبال نامہ میں شامل ہے جناب ممنون حسن خاں نے میری کتاب کے جن گوشوں کی

وحاحت کی ہے ان کی اہمیت مسلم ہے۔

ہمایوں منزل بھوپال

۳۰ ستمبر ۱۹۷۳ء

بادر محترمسلام مسنون

آپ کی لاجواب کتاب اقبال اور بھوپال اختر سعید خاں صاحب نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے عطا فرمائی اور اس طرح مجھے اس کو بہت عجلت میں پڑھنے کا موقع ملا۔ آپ کی ہمت عالیٰ کی داد دیتا ہوں اور آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس قدر مشکل حالات میں آپ نے اس قدر معلومات جمع فرمائیں اور ان کو اس قدر بہتر طریقے سے کتاب کی شکل میں پیش کیا۔ آپ نے کتاب میں جگہ جگہ مجھ ناچیز کا تذکرہ کیا ہے۔ جس کے پاس سراپا سپاس ہوں۔ میں کہاں اس قابل ہوں کہ حضرت علامہ کے نام نامی کے ساتھ میر انام بھی لیا جائے۔ حقیقتاً تو میں ان کے جو توں کے بند بھی کھولنے کے لا اُن نہیں تھا۔

اس وقت آپ کی خدمت میں ایک عریضے کو پیش کرنے کا اچھا موقع ہے۔ میری ایک شاگرد عزیز زہ بیگم فرحت نور خاں جواہر مارشل نور خاں کی اہلیہ تھیں یہاں اپنی پھوپھی صاحبہ بیگم شاہ بانو میمونہ سلطانہ صاحبہ سے ملنے آئی ہوئی تھیں ان ہی کے زریعہ یہ خط کراچی تک پہنچ رہا ہوں جہاں سے وہ یہ خط آپ کو پوسٹ کر دیں گی۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں تو اس وقت آپ مجھ سے ضرور خط و کتابت فرمائیں میں جو بھی خدمت ہوگی اس کو بجالا دوں گا اور اس وقت آپ اپنی کتاب کی ایک یا دو جلدیں ضرور میرے پاس ارسال فرما

دیجیگا میں کسی طرح ان کی قیمت آپ تک ضرور پہنچا دوں گا۔“

۱

یہ طویل خط کا مختصر اقتباس ہے جن دیگر اہم مسائل پر ممنون حسن خاں نے روشنی ڈالی ہے وہ آئندہ صفحات میں پیش کیے جائیں گے۔

۱۹۷۳ء ہی کے دوران ممتاز ادیب و صحافی اقبال احمد صدیقی رکن ادارہ ہنگ مجھ سے ملے اور کہا کہ علامہ اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد..... اس کتاب کے سلسلے میں ملنے کی خواہش مند ہیں۔ چنانچہ پہلی فرصت میں اقبال احمد صدیقی کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ میرے کام کی تعریف کی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ ساتھ ہی اقبال کا ایک نسخہ دکھایا جس میں میری کتاب میں مشمولہ بعض خطوط یا ان کے کچھ حصے حذف تھے یا ان میں تحریف کی گئی تھی چنانچہ طے پایا کہ کسی روز اپنا نسخہ (اقبال نامہ) لے آؤں تاکہ دونوں نسخوں کا موازنہ کر کے اصل صورت حال کا پتا چلا یا جاسکے۔

دوسری ملاقات میں شیخ صاحب نے اور میں لے اقبال احمد صدیقی کی موجودگی میں اقبال نامہ کے نسخوں کا موازنہ کیا تو وہ واقعی ان میں کئی تبدلیاں نظر آئیں یہ اکشاف جہاں شیخ صاحب کے لیے باعث مسرت تھا وہیں میرے لیے بھی حیرانی کا باعث تھا کیونکہ جگہ جگہ میں نے اپنی کتاب میں اقبال نامہ کے پہلے ایڈیشن کی نایابی کا ذکر کیا ہے اور اس وقت وہی ایڈیشن پہلا میرے پاس تھا۔ اور تحریف شدہ ایڈیشن شیخ صاحب کے قبضے میں تھا۔ موازنے سے پتہ چلا کہ ایک خط تو پورا حذف کر دیا گیا ہے۔ تحریف شدہ ایڈیشن میں دو مختلف رنگ کے کاغذ شامل ہیں اصلی اور تحریف شدہ ایڈیشن کے صحات کے نمبروں میں فرق ہے کچھ عبارتیں حذف کی گئی ہیں وغیرہ۔ شیخ صاحب نے دونوں نسخوں کا موازنہ کرنے کے بعد فرمایا کہ آپ کی کتاب ”اقبال اور بھوپال“ شائع نہ

ہوتی تو علامہ کے خطوط میں تحریف و روبدل کا شاید ہی کسی کو علم ہوتا۔
میں نے عرض کیا کہ اقبال نامہ کے ناشر شیخ محمد اشرف اسے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔
یہ سخن بھی میں نے ان سے حاصل کیا تھا..... میں انہیں خط لکھ کر صحیح واقعات کا پتہ چلا دیں گا
اور نتیجہ سے آپ کو بھی مطلع کروں گا۔

اسی ملاقات کے دوران شیخ اعجاز احمد نے کتاب کے بعض واقعات کی صحت پر عدم
طمینان کا اظہار فرمایا تو میں نے انہیں اپنی مشکلات اور اس کتاب کے سلسلے میں مواد کی
弗راہمی کے سلسلے میں چند رپورٹوں کا مختصر احوال سنایا اور عرض کیا کہ آپ اپنا طمینان
فرمانے کے بعد ان واقعات کی نشان وہی فرمادیں تو مجھ پر بھی اردو ادب پر بھی احسان ہو
گا۔ کیونکہ میں ذاتی طور پر کسی بھی تحقیق کو حرف آخوندیں سمجھتا۔ چنانچہ شیخ صاحب نے تحریری
تفصیلات کی فراہمی کا وعدہ فرمالیا اور تقریباً ایک سال کی کوشش و کاوش کے بعد بعض
واقعات کی درستی فرمائی آپ کی تحریر کے اقتباسات آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیجیے
عبد الواحد معینی ۲..... سابق نائب صدر اقبال اکیڈمی پاکستان نے جن کی نگرانی میں یہ
کتاب چھپی تھی۔ کتاب کی اشاعت کے تقریباً آٹھ ماہ بعد از رہ شفقت تفصیلی
تبصرہ..... اقبال ریویو شمارہ جنوری ۱۹۷۳ء (جلد ۱۲ شمارہ ۲) میں صفحات ۲۰ تا ۷ شائع
فرمایا..... ساتھ ہی اس تبصرے کو علیحدہ علیحدہ بھی شائع کر کے تقسیم کیا اور اس طرح اقبال
اکیڈمی میں ایک نئی روایت کی طرح ڈالی اس تبصرے کی تفصیلات سے قطع نظر انہوں نے
جس فراخ حوصلگی سے میری سمعی و کاوش کو سراہا ہے وہ میرے لیے بہر طور باعث امتیاز ہے
لکھتے ہیں:

”علامہ کے علاج کی غرض سے تین بار قیام اور ان کا تفصیلی

حال جو تین ابواب میں دیا ہے کتاب کی جان ہے۔ گوہر پڑھنے والا

یہ چاہے تگا کہ یہ حالات اور مفصل ہوتے تو اچھا ہوتا مگر شاید زیادہ تفصیلات کا حاصل کرنا مصنف کے لیے ممکن نہ تھا۔ ان تین ابواب کے علاوہ یعنی تیسرے باب پانچویں باب اور آٹھویں باب کے علاوہ کتاب کے کچھ اور ابواب بھی ہیں جن میں بہت دلچسپ معلومات دی گئی ہیں۔ مثلاً دوسرا باب علامہ اور نواب حمید اللہ خاں بہادر کے خصوصی روابط پر روشنی ڈالتا ہے۔ چوتھا باب اقبال کے وظیفہ اور اس کے پس منظر کی تفصیلات دیتا ہے۔

۱۔ افسوس کہ یہ دونوں شخصیتیں ۱۹۸۰ء کے دوران ہم سے جدا ہو گئیں۔

چھٹے باب میں جشن حالی کا مستند احوال پیش کیا گیا ہے اور بلا شک و شبہ ہا جاسکتا ہے کہ فاضل مصنف نے اس باب کی تفصیلات بڑی محنت اور عرق ریزی سے جمع کی ہیں۔ رقم الحروف کا خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر اور زیادہ مفصل حال کسی دوسری جگہ مانا محال ہے اور قابل مصنف اپنی محنت کے لیے قابل مبارک باد ہیں۔ ساتواں باب علامہ اور ان کیک خصوصی معانج ڈاکٹر عبد الباسط سے خط و کتابت پر مشتمل ہے۔ اس باب میں علامہ کے وہ غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں جو علامہ نے ڈاکٹر عبد الباسط کو تحریر کیے تھے۔ ۱۔ ڈاکٹر محمد عباس علی خاں کے بارے میں ”اقبال اور بھوپال“ کے صفحہ ۲۷ اور اقبال اور حیدر آباد کے صفحہ ۲۳۱ پر جو کچھ لکھا گیا ہے عبد الواحد معینی نے اس پر اعتراض کیا ہے ان کا ارشاد ہے:

”یہ ضروری ہے کہ اس کا ذکر کروں کہ لمعہ صاحب کے نام

علامہ کے خطوط بیشتر جعلی ہیں اور خود عطاۓ اللہ صاحب مرحوم نے اس کے معرف تھے۔ اس لحاظ سے لمع صاحب کا ذکر ہی اس سلسلہ میں ضروری نہیں ہے۔ اور یہ سراسر غلط ہے کہ علامہ لمع صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کے دل سے معرف تھے۔ اتنا بڑا جعل اردو ادب کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی سرزد ہوا ہو گا۔

عجب اتفاق ہے کہ لمع کے جعلی خطوط کے بارے میں..... اقبال اور بھوپال کی اشاعت سے پہلے کبھی کسی نے اظہار رائے کی ضرورت نہیں سمجھی بہر طور میرے لیے معین صاحب اور بعض دیگر مفترضین کے پیدا کردہ نئے مسائل کی چھان بین ضروری تھی۔ چنانچہ جب اقبال اور بھوپال کا آخری نسخہ بھی فروخت ہو گیا تو ۱۹۸۴ء کے دوران اقبال اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ نے اس کی دوبارہ اشاعت کا فیصلہ کیا اور مجھے اطلاع دی چنانچہ میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس دوران وہ نیا مواد بھی جو اس دوران مجھے دستیاب ہوا چنانچہ تین سال کی سعی و جہد کے بعد دوسرا ایڈیشن اس امید اور موقع کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ آپ ترمیم و اضافہ اور نظر ثانی کے بعد اسے پہلے ایڈیشن سے زیادہ مفید پائیں گے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اقبال کے متعلق بعض ضعیف اور مشتبہ روایات کی صحت و درستی ہو جائے۔ اور جو نیا مواد شامل ہو رہا ہے اس سے کتاب کی قدر و اہمیت میں کچھ اضافہ ممکن ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال ایسی نابغہ روزگار شخصیت کے بارے میں نئے گوشوں اور معلومات کے نئے اضافوں کے ابھی وسیع امکانات موجود ہیں اقبال یقیناً ان عظیم شاعروں میں شامل ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں تک زندہ رہتے ہیں اور ہر زمانے کی نئی نسل ان کے فن ان کی زندگی اور شخصیت سے فیضان حاصل کرتی ہے۔

مجھے اپنی کوتا ہیوں کا پہلے کی طرح اب بھی اعتراض ہے۔ میں نے پوری توجہ احتیاط اور

عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب پر نظر ثانی کی ہے۔ پھر بھی اگر کوئی واقعہ خلاف حقیقت آپ کو نظر آئے تو میری رہبری فرمائیں..... شاید کبھی تیرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح بھی ممکن ہو سکے۔

۱۔ اقبال ریویو۔ جنوری ۲۷ء صفحہ ۷۶

۲۔ یہ اعتراف زبانی تھا یا تحریری اور اگر تحریری تھا تو کب اور کہاں اشاعت پذیر ہوا..... معینی صاحب نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔

۳۔ اقبال ریویو..... جنوری ۲۷ء صفحہ ۷۷

دیباچہ کے دوسرے حصے میں نئے مواد کی تفصیلات اور وہ تمام واقعات و حفائق شامل ہیں جو انہائی کدوکاوش اور پوری ذمہ داری سے فراہم کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ممنون حسن خال، شیخ عباز احمد، بیگم چھتاری ۱ اور جلیل قدوامی کا بطور خاص ممنون ہوں جن کے تعاون سے دوسرے ایڈیشن میں قابل قدر راضا نہ اور صحیت و درستی ممکن ہو سکی۔

دوسرے ایڈیشن کا نیا مواد

گزشتہ تین سال کے دوران میں اس کتاب پر نظر ثانی کے دوران سمعی و کاؤش سے جو نیا

مواد دستیاب ہوا ہے اس کی تفصیلات یہ ہیں:

- ۱۔ اقبال نامہ میں تحریف و رد و بدل کا انکشاف۔
- ۲۔ بعض واقعات کے سلسلے میں شیخ عباز کی توضیحات اور تحقیق مزید۔
- ۳۔ امسی ۱۹۳۱ء کو بھوپال کا نفرنس کا انعقاد اقبال کا بیان مطبوعہ انقلاب لا ہور۔
- ۴۔ راس مسعود کے چھ نادر خطوط بنام اقبال بتواریخ ۲۵ مارچ ۱۹۳۵ء مارچ ۳۱ء ۱۹۳۵
- ۵۔ ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء اپریل ۲۲ء ۱۹۳۵ اور ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء اور ایک خط بنام حفیظ

جالندھری بلا تاریخ جس میں جشن عالی منعقدہ پانی پت میں پڑھی جانے والی نظم پر دلچسپ تبرہ کیا گیا ہے۔ اقبال کی دو خطوط کی فوٹو کا پیاس۔

۵۔ اقبال کے وظیفہ سے متعلق نواب حمید اللہ خاں کی جانب سے بھجی جانے والی ایک قیمتی یادداشت۔

۶۔ اقبال کا ایک یادگار خط خواجہ حسن نظامی کے نام جس میں ”خواجہ نمبر“ کے سلسلے میں انہوں نے بطور حج پروفیسر سید نواب علی کے مضمون کو بہترین قرار دیا ہے۔

۷۔ اقبال کی وفات پر باسط بھوپالی، اختر سعید خاں اور حسن علی خاں کے گم شدہ اور غیر مطبوعہ مرثیے۔

۸۔ ممنون حسن خاں کے چند اہم انسافات۔

۹۔ اقبال کے احکام وظیفہ کی فوٹو کا پی جس سے وظیفہ کے غیر مشروط ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۰۔ مولانا محمد علی کو ولایت کے سفر میں سلسلے میں اور عبدالرحمن چغتائی کو..... اقبال اور راس مسعود کی سفارش پر ”نقش چغتائی“ کے لیے کثیر رقم ریاست بھوپال نے عطا کی تھی۔

۱۱۔ قرآن مجید کا خاک کے اقبال نے تیار کر دیا تھا جسے ڈاکٹر ڈاکٹر حسین مرحوم نے مصر ارسال کیا تھا۔

۱۲۔ اقبال کا ایک نایاب خط ڈاکٹر تاشیر کے نام جس سے پہلی بار یہ علم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے حواشی کے متعلق کتاب کا نام انہوں نے ”مقدمة القرآن“ رکھا تھا۔ اسی خط میں انہوں نے بھوپال کے وظیفہ کو لٹریری پیشن سے موسم کیا ہے۔

۱۳۔ آخری باب کتاب کے بارے میں ان مضامین اور تبرہوں پر مشتمل ہے جو پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد قومی پرلیس میں شائع ہوئے۔

۱۲۔ نواب حمید اللہ خاں کی بچپن کی نایاب تصویر اپنے والد کے ساتھ۔

۱۔ افسوس کہ بیگم راحت سعید چھتراری (سابق لیڈی مسعود) کا مارچ ۹۷۹ء میں انتقال ہو گیا۔

اقبال نامہ میں تحریف و روبدل

شیخ اعجاز احمد سید و سری ملاقات کے بعد فوراً میں نے اقبال نامہ کے ناشر شیخ محمد اشرف کو تفصیلی خط لکھ دیا تھا۔ جس کا جواب کافی تاخیر سے ملا انہوں نے جو واقعات تحریر کیے ہیں ان سے قطعی نئی صورت حال سامنے آئی ہے۔ سب سے پہلے خط کا متن ملاحظہ ہو۔

”کشمیری بازار لاہور

۱۳۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء

مکرمی جناب صہباصاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔ آپ کا گرامی نامہ موصول ہو گیا تھا۔ موسم سرما کی وجہ سے میں پہاڑ وغیرہ پرجاتا رہوں اور آپ کے خط کا جواب دفتر والے نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے معدرت خواہ ہوں۔

مکاتیب اقبا کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں طبع ہوا تھا۔ شیخ عطا اللہ کے لاک فرزند مختار مسعود نے بتایا کہ اقبال نامہ کی پہلی جلد ۱۹۳۶ء میں اور دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی جس وقت یہ کتاب (پہلی جلد) چھپ کر بازار میں آئی تو اس وقت چوہدری محمد حسین جن کو آپ خوب جانتے ہوں گے زندہ تھے۔ چوہدری صاحب پر میں برا نج

کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور Paper Controller بھی تھے
میرے ان سے تعلقات بھی تھے۔

علامہ اقبال نے ایک خط اس راس مسعود کو تحریر کیا تھا جو بالکل درست تھا۔ وہ خط بھی طبع شدہ ایڈیشن میں موجود ہے۔ چوہدری صاحب پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ خط اس مجموعہ میں شامل ہو۔ میں نے ہر چندان کو سمجھا نے کی کوشش کی لیکن اس خط کو حذف نہ کیا جائے مگر وہ اس پر آمادہ نہ وہیتے۔ مجبوراً وہ خط حذف کیا گیا۔ جو نسخہ قبل از یہ فروخت ہو گئے ان میں وہ خط شامل ہو گا۔ اور اتفاق دیکھیے کہ رقم کے پاس وہی نسخہ ہے جو چوہدری صاحب مرحوم کی قطع و برید سے محفوظ رہ گیا بقایا نسخے اس خط کے بغیر ہوں گے۔ یہ نسخہ شیخ اعجاز احمد کے پاس میں نے دیکھا یہی فرق ہے جس کی طرف آپ نے نشاندہی کی ہے اس خط کا عکس اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اصل خط شیخ عطاء اللہ خال صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے انہوں نے واپس نہیں کیے تھے۔ غالباً ان کے صاحبزادے مختار مسعود کے پاس محفوظ ہوں گے۔

آپ نے صحیح فرمایا کہ بعض نسخوں میں صفحات بھی کم ہیں اور عبارتیں بھی مختلف ہیں چونکہ ایک بہت اہم اور طویل خط حذف کر دیا گیا تھا اس کی وجہ سے صفحات اور عبارت میں فرق ہونا لازم ہے۔
امید ہے آپ کی الجھن دور ہو گئی ہو گی۔

اگر مزید ضرورت ہو تو آپ ہر وقت دریافت کر سکتے ہیں۔ اس تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ کا ملخص

محمد اشرف“

اس خط کے مندرجات سے جہاں اقبال نامہ کی پہلی جلد میں تحریف و روبدل کا علم ہوتا ہے وہیں پہلی بار یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ چودھری محمد حسین مرحوم نے علامہ اقبال پر اتنا بڑا ظلم کیا ہے جس کی ادبی تاریخ میں مثال ملننا ممکن ہے اس ناروا اقدام سے وہ شخصیتیں بھی محروم ہوں جن سے علامہ اقبال کے نہایت قربی اور مخلصانہ رابطے تھے اور علامہ ایس بلند مرتبہ شخصیت کے ذاتی خطوط کی دیانت پر بھی حرف آیا۔ میں سمجھا ہوں کہ..... چودھری صاحب مرحوم کے لیے ایسے بے جا اور نازیبا اقدام کو ادبی سورخ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ چودھری محمد حسین مرحوم نے اقبال کے صرف اسی ایک خط کو حذف کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض دیگر خطوط میں بھی ترمیمات سے دریغ نہیں کیا جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

شیخ اعجاز احمد کی توضیحات

جبیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہوں علامہ اقبال کے لاکن سمجھتے شیخ اعجاز احمد سے اس کتاب کے سلسلے میں دو تفصیلی ملاقاتیں ہوئی تھیں اقبال نامہ کے بعض خطوط میں روبدل کے انکشاف کے علاوہ بعض روایات و واقعات پر شیخ صاحب نے شک و شبہ کا اظہار فرمایا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے گزارش کی تھی کہ آپ مزید تحقیق فرمائے کرنے کی وجہ سے مجھے مطلع فرمادیں۔ تاکہ کتاب کے دوسراے ایڈیشن میں آپ کے تحقیقی نتائج شامل کرلوں۔

اس طرح واقعات روایات کی صحت و درستی بھی ہو جائے گی اور آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان نہیں رہے گا۔

شیخ صاحب نے ازره اقبال شناسی یہ ذمہ داری قبول فرمائی..... تقریباً ایک سال تک انہوں نے تمام ممکنہ ذرائع سے بعض واقعات کی چھان بین فرمائی اور مجھے تحریری طور پر تفصیلات مہیا فرمادیں جن کا سلسلہ وارتذکرہ پیش خدمت ہے:

”۲۱۳۔ بی۔ فریا سٹریٹ“

کراچی۔۲

۱۹۷۵ء اکتوبر

مکری محترمی صہبا صاحب..... السلام علیکم

پچھلی دو ملاقاتوں میں آپ کی تصنیف ”اقبال اور بھوپال“ کے متعلق آپ کے ساتھ تفصیل گفتگو ہوئی۔ اس موضوع پر بکھرے ہوئے مواد کو آپ نے جس کاوش اور لگن سے یکجا کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ اقبالیات میں اس گراں قدر اضافہ پر جہاں میں نے آپ کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا وہاں یہ عرض کرنے کی جسارت بھی کی تھی کہ علامہ اقبال کے متعلق بعض ایسی روایات بھی آپ کو نے معتبر و مستند سمجھ کر انہیں نئے اچھوتے اور منفرد واقعات جن کا آض تک کسی کو علم نہ تھا قرار دیتے ہوئے اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ جو میری دانست میں اگر رہ افسانہ زندگی کی ذیل میں نہیں آتے تو کم از کم تا حال تشنہ تحقیق ضرور ہیں۔ ”اقبال اور بھوپال“ کی چند ایسی ضعیف روایات کی نشان دہی کرتے ہوئے میں نے ان کے متعلق

مزید چھان بین کا مشورہ دیا تھا۔ آپ سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ آپ نے مزید کچھ معلومات حاصل کی ہیں جن سے میری معروضات کی ایک حد تک تائید ہوتی ہے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنی معروضات کو اس تحریر میں قلم بند کر کے پیش کرتا ہوں:

محمد عباس علی خاں لمعہ

اقبال نامہ حصہ اول میں علامہ اقبال کے کچھ خطوط ایک صاحب محمد عباس علی لمعہ کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا میں ان صاحب کے علامہ کے ساتھ تعلقات پر روشنی ڈال سکتا ہوں کیونکہ بعض حلقے ان خطوط کی اصلاحیت کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ خطوط کے متعلق بغیر اصل خطوط کو دیکھنے حتی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن حسب ذیل قرائن سے مجھے یہ خطوط اصل ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اولاً ایک خط کا عکس ۱۔ اقبال نامہ حصہ اول میں شامل ہے جسکی تحریر کو میں پہچانتا ہوں کہ یہ پچا جان کی ہی ہے۔ دویم ان خطوط کا طرز تحریر بھی انہی جیسا ہے۔ سویم آخر عمر میں انہوں نے آنکھوں میں موتیا تر آنے کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ ان ایام میں خطوط کا جواب کسی اور سے لکھواتے۔ عام طور پر یہ کام مشہور صحافی م۔ ش صاحب (جناب محمد شفیع صاحب ایم اے) کے سپرد تھا۔ بعض اوقات پچا جان کی ہدایت پر شفیق صاحب ہی جواب لکھ دیتے تھے چنانچہ اقبال نامہ میں شائع ہونے

والے خطوط بنام معہ صاحب کا آخری خط ۳ محررہ ۱۳۱ اگست ۱۹۳۷ء
 شفیع صاحب کی طرف سے ہے اس میں دیوان غالب کا ایک نسخہ چا
 جان کی خدمت میں بھینے کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ
 دیوان غالب کا ایک پاکٹ سائز نسخہ مطبع آفتاب برلن معہ صاحب
 کی طرف سے علامہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ اس کی نہایت دیدہ
 زیب جلد بندی دکن کی مشہور مخوبیہ بک باسٹنڈ نگ فیکٹری جواب
 کراچی میں ہے۔ کی تیار کردہ ہے۔ معہ صاحب نے اس نسخہ پر
 حسب ذیل شعر تحریر کیا ہوا ہے:

اقبال تو سر اپا اسرار ایزدی ہے
 افسون تیرا تکلم تو شعر کا نبی ہے
 محمد عباس علی خاں معہ

۱۴ اگست ۱۹۳۷ء

(میں نے ”افسون“، (نوں میں نقطہ کے ساتھ) ویسے ہی لکھ دیا
 ہے جیسے معہ صاحب نے لکھا ہوا ہے ورنہ شعر کے لحاظ سے ”افسون“
 ہونا چاہیے تھا۔

۱۔ اقبال اور بھوپال صفحہ ۲۷

۲۔ اقبال نامہ۔ (جلد اول) صفحہ ۲۷

۳۔ ایضاً صفحہ ۲۹۸

سے نوں میں نقطہ ڈال دیا ہے۔ واللہ اعلم دیوان غالب کا یہ نسخہ
 علامہ اقبال نے اپنے بڑے بھائی یعنی میرے والد صاحب کو دے

دیا تھا۔ چنانچہ والد صاحب کے دستخط اس پر موجود ہیں۔ والد صاحب اسے دیوان غالب کا نسخہ مجھے ملا اور اب میرے قبضہ میں ہے۔ لمعہ کے نام اقبال نامہ میں شائع ہونے والے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ لمعہ صاحب گاہ ہے گاہ ہے علامہ صاحب کی خدمت میں کتابیں پیش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کی پیش کی ہوئی ایک کتاب ”ارمغان عزیز“، کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر جلد دوم بھی میرے پاس ہے جو لمعہ صاحب نے ۱۹۳۷ء کو علامہ کی خدمت میں پیش ہے۔

سرور ق پر حسب ذیل عبارت رقم ہے:

خدمت شریف عالی جناب حضرت ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب مدظلہ پیر سڑا یٹ لاء۔ لا ہور۔ از محمد عباس علی خان لمعہ۔ ۱۹۳۷ء۔

یہ کتاب پچا جان نے مجھے عطا فرمائی یہ سب قرآن خطوط متذکرہ بالا کے اصلی ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

لمعہ کی فرضی شخصیت اور جعلی خطوط کے سلسلے میں رقم الحروف نے مختار مسعود سے بھی معلومات حاصل کی۔ ایک ملاقات کے دوران انہوں نے فرمایا کہ والد صاحب کی لمعہ سے خط و کتابت رہی ہے۔ ان کے کچھ خطوط اب بھی ان کے پاس محفوظ ہیں لہذا ان کی فرضی شخصیت کا اعتراض بے معنی ہے۔ ان کے تمام تر خطوط جعلی ہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے..... بہر حال وہ جلد ہی اقبال نامہ کی دونوں جلدیں سمجھا..... شیخ و بیگم عطا اللہ ڈرست کے زیر اہتمام فوٹو آفسٹ پر شائع کر رہے ہیں..... اس میں وہ ابتدائی لکھیں گے اور مزید چھان

بین کے بعد لمحہ کے جعلی خطوط اور دیگر خطوط پر اظہار رائے کریں گے۔ فی الوقت حتمی طور پر وہ کچھ کہنے سے قادر ہیں۔

جناب جمیل نقوی صاحب کی روایت

شیخ اعجاز احمد نے اس سلسلے میں تحقیق فرمائی ہے وہ ان کی زبانی سنئے:
اقبال اور بھوپال کے صفحات ۷۱۱ تا ۱۲۲ پر آپ نے جمیل نقوی صاحب کی ایک
یادداشت نقل کی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

”ماہانہ وظیفہ سے قبل راس مسعود کی مساعی سے ڈاکٹر اقبال کو
یکمشت بھی کئی ہزار کی رقم نواب صاحب بھوپال نے عطا کی تھی
تاکہ وہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے کے لیے کتب کی خریداری کر
سکیں،“۔

اپنے اس بیان کے ثبوت میں وہ فرماتے ہیں:

”اس رقم کا حوالہ جناب منون حسن خاں صاحب کے نام ایک
خط میں بھی کیا جو ”اقبال نامہ“ کے پہلے ایڈیشن میں شامل تھا..... بعد
میں اسے بعض وجوہ کی بنابر ”پہلے ایڈیشن“ سے خارج کر دیا گیا“

جمیل صاحب نے جو کچھ اپنے بیان کے ثبوت میں فرمایا ہے وہ واقعات کے خلاف
ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اقبال نامہ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی تو ابھی نوبت
ہی نہیں آئی۔ آپ سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد اشرت صاحب ناشر کتاب مذکور نے آپ کے
استفسار کے جواب میں اس بات کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ اقبال نامہ چھپ چکنے کے بعد
جناب چوہدری محمد حسین صاحب کو جو علامہ کے دوست اور ان دونوں پرلس برانچ میں افسر

اعلیٰ تھے۔ اقبال نامہ میں شامل بعض خطوط کی اشاعت پر اعتراض ہوا اور ان کے کہنے کے بوجود دو ایک خطوط ان کو طبع شدہ کتاب میں روبدل کرنا پڑا۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح کیا جائے گا یہ روبدل ممنون حسن خاں صاحب کے نام جو خطوط شامل اقبال نامہ میں ان میں نہیں کیا گیا۔

میں نے بھی اپنے طور پر اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعہ جوالا ہور میں مقیم ہیں۔ شیخ محمد اشرف صاحب سے اس واقعہ کے متعلق صورت حال دریافت کرائی تھی۔ میرے بھائی کا جواب جو آیا ہے اس کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں:

”میں کل شیخ محمد اشرف صاحب کو ملا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اقبال نامہ کے بارے میں انہوں نے بھی وہی بات بتائی ہے جس کا آپ نے ذکر کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کتاب کی قریباً ۱۰۰ کا پیاس جب فروخت ہو گئیں تو چوہدری محمد حسین صاحب نے چند خطوں کے بعض حصوں کو حذف کرنے کو کہا۔ میں اپنے دوستوں سے مشورہ کیا۔ سب نے یہی کہا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا کہ چوہدری صاحب چھ ماہ بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ چوہدری صاحب لڑائی کے زمانے میں پیپر کنٹرولر بھی تھے اور کاغذ کا کوٹھ بھی وہی دیتے تھے۔ انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ فیصلہ کیا کہ ابھی کتاب کی فروخت بند کر دی جائے اور کسی طرح چھ ماہ گزار دیے جائیں۔ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد فروخت کریں گے۔ چوہدری صاحب کی ملازمت میں دو سال کی توسعہ ہو گئی۔ میں مجبور ہو گیا کہ کتاب کی چار ہزار کا پیاس چھپی تھیں۔ ان کا پیوں میں ورق تبدیل کرنے پڑے

جس سے مجھے کافی نقصان ہوا،۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ خود آپ کے پاس اقبال نامہ حصہ اول کی جو کاپی ہے اور جس سے آپ ان علامہ کے خطوط بنام سید راس مسعود و ممنون حسن خاں صاحب ”اقبال اور بھوپال“ میں نقل کیے ہیں انہیں چند کاپیوں میں سے ایک کاپی سے کر کے طمینان کر لیا ہے کہ یہ وہی پہلا ایڈیشن ہے جس کے متعلق جمیل نقوی صاحب اپنی یادداشت لکھتے ہیں :

”مجھے معلوم نہیں کہ اب پہلا ایڈیشن کہاں ملے گا۔ اقبال اور

بھوپال صفحہ ۱۲۱ اور آپ نے لکھا ہے کوشش کے باوجود اقبال نامہ کا

پہل ایڈیشن کہیں دست یاب نہ ہوسکا۔ جس سے یکمشت ادائی کی

قصد یق ہو سکتی اقبال اور بھپال صفحہ ۱۲۲ سے کہتے ہیں اڑکا بغل میں

اور ڈھنڈو را شہر میں“۔

اقبال نامہ کی جو کاپی آپ کے پاس ہے اس میں ممنون حسن خاں صاحب کے نام درج ہیں اور وہ دسوں کے دسوں ان کاپیوں میں بھی موجود ہیں جن میں چوہدری محمد حسین صاحب کے ایما پر روبدل کیا گیا۔ کوئی ایک خط بھی ایسا نہیں جو یا جس کا کوئی حصہ روبدل شدہ کاپیوں میں حذف کیا گیا ہو۔ اور آپ والی اقبال نامہ کی کاپی کا مقابلہ ان کاپیوں سے کیا جائے جس میں روبدل کیا گیا تو جمیل صاحب کے اس بیان کی واضح طور پر تردید ہوتی ہے کئی ہزار کی مبینہ رقم کا ذکر علامہ اقبال نے ممنون حسن خاں صاحب کے نام ایک خط میں کیا جو اقبال نامہ میں شائع ہوا لیکن بعد میں بعض وجوہ کی بنا پر خارج کر دیا گیا۔ چوہدری محمد حسین صاحب کی سنسرا نہ قیخی صرف راس مسعود صاحب کے نام تین خطوط پر چلی معلوم ہوتی ہے۔ اول خط محررہ ۳۰۵ مئی ۱۹۳۵ء کا کچھ حصہ حذف کر دیا گیا..... دویم خط محررہ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۵ء سارے کا سارا حذف ہوا۔ سوم خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کا کچھ حصہ حذف کیا گیا۔

اقبال نامہ کی جو کاپیاں روبدل سے پہلے فروخت ہو چکی تھیں جن میں آپ کی کاپی بھی شامل ہے ان میں یہ تینوں خطوط مع حذف شدہ حصوں کے موجود ہیں۔

سید راس مسعود صاحب کے نام خط محررہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء اقبال اور بھوپال صفحہ ۷۸ کا کچھ حصہ اور خط محررہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء اقبال اور بھوپال صفحہ ۱۵۰ اسارے کا سارا حذف کرانے میں چوہدری محمد حسین صاحب کی کیا مصلحت تھی یہ انہیں ہی معلوم ہوگی۔ مجھے تو ان کے شائع ہو جانے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ اس تحریر میں طوالت کے خوف سے اس بارے میں تفصیلی جائزہ ترک کرتا ہوں۔ سید صاحب موصوف کے نام خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء اقبال اور بھوپال صفحہ ۱۸۹۰ کا جو حصہ چوہدری محمد حسین صاحب نے اقبال نامہ حصہ اول کے طبع ہو جانے کے بعد حذف کرایا اس تحریک کی مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔ اگر اصل خط جو ”اقبال اور بھوپال“ کے صفحہ ۱۸۹ پر شائع ہوا ہے کا مقابلہ تحریف شدہ خط سے کیا جائے آپ کے قارئین کی سہولت کے لیے ذیل میں اصل خط اور تحریف شدہ خط کے اقتباس نقل کرتا ہوں۔

۲

اقتباس اصلی خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء اقتباس خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء جو ”اقبال نامہ حصہ اول“ نے پہلے شائع ہوا چوہدری محمد حسین صاحب کے ایما پر بعض اور ”اقبال اور بھوپال“ کے صفحہ ۱۸۹ پر نقل حصے حذف کرنے کے بعد ”اقبال نامہ“ حصہ اول میں شامل ہوا۔

۱

وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب کے دفتر میں محفوظ ہے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) شیخ طاہر الدین: یہ میرے (۱) شیخ طاہر الدین: یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودہ بھری محمد حسین ایم اے سپرنڈنڈنٹ پرنسپلیس برائج سول سیکرٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست اور نہایت نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی مخلص مسلمان ہیں۔ (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب نج دہلی۔ (۴) اے ایل ایل بی سب نج دہلی (۴) عبدالغفرانی عبدالغفرانی مرحوم۔

عبدالغفرانی بے چارے کے متعلق میں تم کو عبدالغفرانی بے چارے کے متعلق میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں اس کی جگہ خال اطلاع دے چکا ہوں میں چاہتا ہوں کہ اس صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار کی جگہ تم کو Guardian مقرر کر لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (۳) شیخ دول وغیرہ وغیرہ۔

اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی
ہے لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور
پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں
کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کر
دول وغیرہ وغیرہ۔

کالم نمبر ایں خط کشیدہ حصہ حذف کرنے سے ایک تیر سے دوشکار کیے گئے ایک تو یہ خاکسار جس کے متعلق پچا جان نے از رہ شفقت فرمایا..... میرا بھت جانہ بہیت صالح آدمی ہے۔ یہ صالحیت کا سٹپ فلکیٹ اگرچہ اس حسن ظن کا مر ہوں منت تھا جو بزرگ عام طور پر اپنے عزیزوں کے متعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس کی اشاعت چوہدری محمد حسین صاحب کی سیاست کو گوارانہ ہوئی لہذا ان الفاظ کو حذف کر دیا گیا اگرچہ ایسا کرنے سے خط کا مفہوم بدلتا گیا۔ مذکورہ بالاتر تحریف کے تیرے کے دوسرے شکار جناب میاں امیر الدین صاحب ہوئے اس اجمالی کی تفصیل بیان کرنے سے یہ تحریر طویل ہو جائے گی لہذا اسے ترک کرتا ہوں۔ اس سیاست بازی کے متعلق میں کچھ مزید کہنا نہیں چاہتا۔ چوہدری صاحب اپنے خالق کے پاس پہنچ چکے ہیں اور ان کا معاملہ اب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

سید راس مسعود صاحب کے نام علامہ کے تمام خطوط جواباً نامہ میں شائع ہوئے میں بشمول ان کے جن میں بعد میں پورا کوئی حصہ حذف کرایا گیا پڑھیں تو معلوم ہو گا کہ کسی ایک خط میں بھی جیل نقوی صاحب کی بیان کردہ کئی ہزار کی رقم کا ذکر یا اشارہ تک نہیں اگر سید ہا صاحب مرحوم کی مساعی سے کئی ہزار کی رقم عطا ہوئی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ علامہ ان کے نام کسی خط میں بھی اس خطیر رقم کا ذکر نواب صاحب کی شکر گزاری کے طور پر نہ کرتے جیسا کہ انہوں نے ماہانہ وظیفہ عطا ہونے پر سید صاحب مرحوم کے نام اپنے ۳۰ مئی ۲۲ جون اور ۱۸ ستمبر ۱۹۳۵ء کے خطوط میں بار بار کیا۔ علامہ کو اعتراف احسان میں کبھی دریغ نہیں ہوا۔ نواب صاحب نے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تو فوراً سید نذرینیازی صاحب کے نام اپنے خط محررہ کیم جون ۱۹۳۵ء میں اپنی احسان مندی کا ذکر کیا لیکن اس کئی ہزار کی رقم کا ذکر نہ ہمیں لگر میں ہوانہ احباب میں سے کسی کے ساتھ۔ میں نے احتیاطاً سید نذرینیازی صاحب سے جو ان دونوں پچا جان کے بہت قریب تھے اس روایت کے متعلق دریافت کیا ہے..... وہ

فرماتے ہیں.....:

”جمیل نقوی صاحب کی روایت بھی تصنیف بندہ ہے اور کچھ نہیں۔ اگر سید راس مسعود صاحب کی مسامی سے کئی ہزار کی رقم نواب صاحب نے عطا کی ہوتی تو حسب ذیل تین زندہ ہستیوں کو اس کا ضرور علم ہوتا۔ اول سید راس مسعود صاحب کی بیگم صاحبہ جنہیں علامہ نے گھری عقیدت تھی۔ دوسرا نواب صاحب کی کابینہ کے ایک ممتاز رکن جناب علی حیدر عباسی ا صاحب۔ سابق مشیرالمہام صیغہ سیاسیہ بھوپال جنہوں نے ماہانہ وظیفہ کی منظوری میں عملاً حصہ

لیا۔

۱۔ افسوس کے علی حیدر عباسی کا ۱۹۷۳ء میں انتقال ہو گیا

(اقبال اور بھوپال صفحہ ۵۹۔ ۲۲۰ تا ۲۲۲) اور تیسرا شہزادی

عبدہ سلطان صاحبہ ولی عہد ریاست بھوپال جن کے دستخطوں سے ماہانہ وظیفہ کا پہلا چیک جاری ہوا (اقبال اور بھوپال صفحہ ۲۲۹)

جہاں تک مجھے علم ہے اول الذکر کراچی میں ہی مقیم ہیں۔ آپ کی کتاب سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ آپ نے ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی یا نہیں۔ دوسری دونوں ہستیوں سے آپ ملے اور ان کے ساتھ اپنی گفتگوؤں کا بالتفصیل ذکر فرمایا ہے ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی مبینہ کئی ہزار کی رقم دیے جانے کا ذکر نہیں فرمایا۔

جناب علی حیدر عباسی صاحب کے ساتھ آپ کی گفتگو میں تو قرآن مجید کے حواشی کا ذکر بھی آیا کہ آخری قیام بھوپال کے دوران میں

عالیہ کی تمام تر توجہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے پر مبذول تھی جس کے لیے نواب صاحب نے ان سے درخواست کی تھی۔ اس سلسلہ میں کئی ہزار کی رقم اگر عطا کی گئی ہوتی تو علی حیدر عباسی صاحب اس کا ذکر ضرور فرماتے۔

اب اس ہر لحاظ سے معبر مستند اور قابل اعتماد روایت کے ثبوت کے لیے ایک جناب جمیل نقوی صاحب کی زبانی بیان رہ جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی روایت کی تائید میں جس تحریری ثبوت کا ذکر فرمایا ہے یعنی علامہ کا خط بنام ممنون حسن خاں مندرجہ اقبال نامہ اس کا کہیں وجود نہیں۔ آپ نے اقبال اور بھوپال کے صفحات ۲۹۲ تا ۲۹۱ پر علامہ اقبال کے ایک معاند مولوی محمد امین زیری صاحب کا ذکر فرماتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ انہیں علامہ سے کچھ اسی نوعیت کا لفظ تھا جیسا انہیں مولا ناشبلی سے تھا اور اس کے نتیجہ میں آخری عمر میں انہوں نے علامہ کے خلاف خدو خال اقبال کے نام سے ایک کتاب بھی لکھ ڈالی جس کا مقصد ان کے بیان کے بموجب علامہ کی سیرت کے دوسرے رخ کو اجاگر کرنا تھا۔ ان معاند مولوی صاحب نے علامہ کی مخالفت میں غلط بیان سے بھی دریغ نہ کیا۔ اپنے مضمون بھوپال کا علمی جائزہ میں لکھتے ہیں..... ہر ہائنس نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کی ایک مستقل تصنیف کی درخواست پر افکار حاضرہ کی روشنی میں قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کے لیے ۵۰۰ روپے ماہانہ کی امداد مقرر کی۔ حالانکہ ۵۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ نہ

کہ قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کے لیے امداد لیکن ایسے معاند نے بھی اس کام کے لیے کتب خریدنے کی خاطر کئی ہزار کی رقم عطا ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ بات تو جمیل نقوی صاحب نے خود تسلیم کی ہے کہ اقبال نامہ کے بقول ان کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ ان کے پاس تھا جو انہوں نے خود خال اقبال کی مدد و دین کے سلسلے میں جناب زیری صاحب کو دے دیا اقبال اور بھوپال صفحہ ۱۲۱

۱۔ بیگم چھتراری (سابق لیڈی مسعود) کتاب کی اشاعت کے وقت پاکستان سے باہر تھیں۔

کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جمیل نقوی صاحب زیری صاحب کے ہم خیالوں میں ہیں۔ انہیں علامہ اقبال کے متعلق اچھی یا بری رائے رکھنے کا توثق ہے لیکن اگر وہ زیری صاحب کے ہم خیالوں میں ہیں تو پھر اصول شہادت کے مطابق ان کی بیان کردہ زبانی روایت کو بغیر معتبر اور مستند ثبوت کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسی کوئی شہادت ابھی تک سامنے نہیں آئی۔“

کئی ہزار کی رقم اور تحقیق مزید

شیخ اعجاز احمد نے کئی ہزار کی رقم کے سلسلے میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی اہمیت اور صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جیسا کہ خود شیخ صاحب نے ایک ملاقات کے دوران اظہار فرمایا تھا کہ اگر اقبال اور بھوپال شائع نہ ہوئی تو اقبال نامہ کے نسخوں میں تحریف و رد و بدل کا کسی کو علم نہ ہوتا۔ اس کتاب کے بعض واقعات کی صحت و درستی کی نوبت آتی۔ نہ

اقبال اور بھوپال سے متعلق کتنے ہی تاریخ ساز حقائق کا انکشاف ہوتا اور مزید تحقیق کی راہیں کھلتیں۔ چنانچہ واقعات کی صحت اور تدرستی اور تحقیق کی دیانت کے پیش نظر راقم الحروف نے سب سے پہلے منون حسن خاں سے قلمی رابطہ پیدا کیا اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے پہلی فرصت میں تو جگہ فرمائی اور مجھے تحریری طور پر کئی ہزار کی رقم کے سلسلے میں نہایت تسلی بخش جواب سے نواز دیا۔ ان کا خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

۱۹۷۸ء کتوبر ۱۱۹

ہمایوں منزل متصل فارسیشن

نر صدر منزل بھوپال ایم۔ پی

عزیز گرامی صہبا صاحب سلام مسنون

آپ کا دوسرا گرامی نامہ ملا جو مورخہ ۱۹۷۵ء مجھے ابھی ملا ہے۔ جس کے لیے میں آپ کا تھا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس گرامی نامہ میں عزیز محترم اظہر میاں (اظہر سعید خاں) کی تحریر بھی شامل ہے۔ آپ سے میری طرف سے ان کی خدمت میں میری دعا پہنچا دیتی ہے اور یاد آوری کیلئے شکریہ بھی۔

علامہ کے بھانجے صاحب بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب کی خدمت گرامی میں آپ میرا سلام پہنچا دیں۔ کاش مجھے ان کی قدم بوسی کی عزت حاصل ہوتی۔ خداوند کریم ان کو اور عزیز گرامی جاوید سلمہ اور عزیزہ منیرہ سلمہ کو خوش و خرم اور تدرست رکھے۔ جاوید تو بھوپال بھی آئے تھے۔ اس وقت وہ بہت کم سن تھے اور میں علامہ اقبال ان کے ساتھ کیرم کھیلا کرتے تھے۔

وظیفہ کے علاوہ نواب صاحب کے یہاں سے اور کوئی رقم کی خدمت میں نہیں پیش کی گئی۔ اس کا مجھے اچھی طرح علم ہے۔ اگر کوئی اور رقم دی جاتی تو سر راس مسعود مرحوم کو اور مجھے ضرور ضرور معلوم ہوتا۔ شیخ اعجاز صاحب کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔

اقبال ناہ کے سب سے پہلے ایڈیشن میں میرے نام ایسا کوئی مكتوب اس رقم کے بارے میں نہیں ہے۔ حیدر آباد سے اکبر حمیدی نے ضرور ایک حقیر رقم کا چیک علامہ کی خدمت میں گرامی میں ارسال کیا تھا جو علامہ نے فوراً واپس کر دیا تھا۔ اس کے متعلق ایک قطعہ بھی علامہ نے لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ علامہ نے مجھے لکھا تھا کہ ایک چیک حیدری صاحب نے ارسال کیا تھا جس کوشکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔

آپ کوشاید میں لکھ چکا ہوں کہ وظیفہ میں علامہ نے بڑی مشکل سے منظور فرمایا تھا۔ اور وہ بھی اس شرط پر کہ جو کتاب قرآن مجید کے متعلق وہ شائع فرمائیں گے اس کے جملہ حقوق نواب صاحب کے نام کر دیں گے۔ شیخ عبدال قادر صاحب نے بھی علامہ صاحب سے فرمایا تھا کہ کم از کم کتاب لکھنے میں آسانی کی وجہ سے وہ نواب صاحب کا وظیفہ منظور فرمائیں۔ سید راس مسعود صاحب نے تو ساری کوشش اس سلسلے ہی میں کی تھی کہ اگر کتاب مدنظر نہ ہوتی تو آپ یقین فرمائیں کہ علامہ اس حقیر وظیفہ کو بھی منظور نہ فرماتے۔ حقیقت میں نواب صاحب کا وظیفہ قبول فرمائے اور علامہ نے نواب صاحب پر

احسان فرمایا تھا۔ اور اس طرح نواب صاحب کو وہ حد درجہ دے دیا جو گونئے نے پرنس آف ویر کو دیا تھا۔ یہ کیا ہے کہ انہوں نے ضرب کلیم نواب صاحب کے نام معنوں کر دی اور اس طرح نواب صاحب کو زندہ جاوید بنادیا۔

ممکن ہے اس رقم کے سلسلے میں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہو کیونکہ علامہ اقبال اور سر راس مسعود کی سفارش پر نواب حمید اللہ خاں مرحوم نے چغتائی صاحب مرحوم کو ”نقش چغتائی“ کے لیے ایک کشیر رقم میرے توسط سے ضرور مرحمت فرمائی تھی۔ اور اس سلسلے میں چغتائی مرحوم بھوپال تشریف بھی لائے تھے۔ اس کا ذکر جہاں تک مجھے یاد ہے سید راس مسعود نے اپنے کسی خط میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اور سید راس مسعود کے کہنے پر حالی سنیٹری کے موقع پر پانی پت میں نواب صاحب مرحوم نے ایک بڑی رقم حاصل میموریل ہائی سکول کے لیے اور مسدس کے سنیٹری ایڈیشن کے لیے بھی عطا فرمائی تھی۔ مسدد کا سنیٹری ایڈیشن اس رقم کی مدد سے شائع ہوا تھا۔ اس کا Forward سر راس مسعود نے مجھ سے ہی لکھوا�ا تھا۔ پھر علامہ کی سفارش پر اور سید راس مسعود کے کہنے سے نواب صاحب نے ایک بڑی رقم (Muhammad Asad) Dr. Leopold Weiss کو صحیح بخاری کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے عطا فرمائی تھی۔ اس طرح ان نیک کاموں میں علامہ اور سر راس مسعود کی مساعی شامل رہیں لیکن علامہ نے اپنے لیے کبھی کوئی درخواست نہ کی

اور نہ کوئی رقم وظیفہ کے علاوہ قرآن حکیم کے متعلق کتاب لکھنے کے لیے نواب صاحب کے یہاں سے ان کو دی گئی۔

یہ ضرور ہے کہ علامہ اقبال لکھنے کے سلسلے میں کچھ قلمی کتب کو دیکھنے کے لیے مشرق و سطی اور یورپ اور کیبریجن جانا چاہتے تھے بلکہ لاڑکانہ نے ان کو کیبریجن میں لیکچرس کے لیے مدعو بھی کیا تھا لیکن خداوند کریم کو منظور نہ تھا،۔

ا مصنف شیخ محمد اشرف لاہور Islam at the Cross Roads

ممnon حسن خاں صاحب ایسی معتبر شخصیت کے اس اظہار کے بعد چند اس ضرورت نہ تھی کہ میں کسی اور قریبی شخصیت سے اس سلسلے میں مزید دریافت کرتا پھر بھی تحقیق کا تقاضا تھا کہ شہزادی عابدہ سلطان اور بیگم چھتری (سابق لیڈی مسعود) سے بھی معلومات حاصل کر لوں۔ چنانچہ کافی سعی و جهد کے بعد ان معزز شخصیتوں سے میں نے رابطہ قائم کیا اور دونوں نے بیک زبان فرمایا کہ وظیفہ کے علاوہ اقبال کو کوئی رقم نہیں دی گئی اس طرح یہ اطمینان ہو گیا کہ جیل نقوی کی بیان کردہ کئی ہزار کی رقم کی روایت غلط فہمی یا علمی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے اور یکسر بے بنیاد ہے۔

مولوی عبدالحق حاصلی اور مضمون کی گمشدگی

جشن حاصلی اور اقبال کے باب (صفحہ ۱۰۹ تا ۱۲۳) میں جتنی تفصیلات رقم الحروف نے کئی سال کی سعی و کاوش کے بعد فراہم کیں اتنی اس سے پہلے شاید ہی کہیں اور مل سکیں۔ پھر بھی دلچسپ اتفاق یہ ہے کہ پہلے ایڈیشن کے دوران ابوالاثر حفیظ جالندھری کی نایاب نظمیں دستیاب ہو گئیں اور اب دوسرے ایڈیشن کے دوران مولوی عبدالحق کے طویل اور قیمتی

مضمون کی گمشدگی کا علم مجھے اردو کے بلند پایہ ادیب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زبانی ہوا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ان دنوں جب جشن حالی ہوا ہے بابائے اردو کے ساتھ حیدر آباد دکن سے پانی پت گئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جشن کی تیاری بہت پہلے س ہو رہی تھی راس مسعود کی خواہش پر مولوی صاحب نے حالی پر نہایت تفصیلی مضمون کئی ہفتلوں کی محنت شاقہ سے لکھا تھا۔ اس مضمون کی تیاری کے دوران ان کے ہاتھ پر ورم بھی آ گیا تھا اس کے باوجود انہوں نے ہاتھ پر پیاس بندھوا کر مضمون کو مکمل کر لیا تھا۔ یہ مضمون فل سیکیپ کے ۲۰۔۷ صفحات پر پھیلا ہوا تھا اور اس میں انہوں نے حالی کے عہد ساز کارناموں کا ہر جہتی مطالعہ پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اور بابائے اردو جشن میں شرکت کے لیے حیدر آباد دکن سے دہلی پہنچ اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا دوسرا روز پانی پت پہنچے۔

جشن کے دن پانی پت میں میلہ کا سماں تھا۔ نواب صاحب بھوپال کی آمد کے بعد ہی کوئی دس بجے دن کو جلسہ کا آغاز ہوا۔ ڈائس پر نواب حمید اللہ خاں علامہ اقبال، سر راس مسعود اور سراکبر حیدری وغیرہ فروکش تھے۔ جب مولوی عبدالحق صاحب کا نام پکارا گیا تو وہ ڈائس پر گئے اور اپنے طویل مضمون میں سے خاص خاص حصے تقریباً پون گھنٹے تک پڑھتے رہے۔ ان کا مضمون کافی مبسوط اور جامع تھا جسے عام طور پر پسند کیا گیا۔

اسی روز شام کو بابائے اردو ڈاکٹر صاحب اکبر حیدری کے سیلوں میں پانی پت سے دہلی پہنچ اور اسٹیشن سے تانگہ میں ڈاکٹر انصاری کے لیے روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کا سامان مختصر تھا۔ بستر کے علاوہ ان کے ساتھ چڑے کا ایک بیگ اور ایک سوت کیس تھا۔ بیگ میں تولیہ صابن منجن

کچھ کتابیں اور جشن حالی میں پڑھا جانے والا طویل مضمون رکھا تھا۔ اسٹیشن پر قلی نے بستر اور کوٹ کیس تو اگلی نشفت پر اور مولوی صاحب کا بیگ پائیدان کے نیچر کھدیا۔ جب تانگہ انصاری کی کوٹھی واقع نمبر ادریا گنج پہنچا تو ڈاکٹر انصاری کے ملازم نے بستر اور سوت کیس تو اتار لیا۔ پائیدان کے نیچر کھے ہوئے بیگ پر اس کی نظر نہیں گئی۔ اسی دوران ملازم نے اسے پیسے دیے اور تانگہ والا روانہ ہو گیا۔ سامان جب اندر پہنچا اور مولوی عبدالحق صاحب نے اپنا بیگ نہ پایا تو شور مچایا۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری کے دو تین ملازم تانگہ والے کی تلاش میں دوڑ پڑے..... ایک ملازم سائیکل پر نکل کھڑا ہوا..... لیکن تانگہ والے کا نہ ملنا تھا نہ ملا اور مولوی صاحب کا وہ قبیتی مضمون ضائع ہو گیا۔

اس طویل مضمون کی گمشدگی کا مولوی صاحب کو ہمیشہ قلق رہا اور جیسا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بتایا کہ وہ اسے دوبارہ نہیں لکھ سکے۔

جنوری ۱۹۷۷ء کے دوران مجھے علم ہوا کہ انجمن ترقی اردو پاکستان حالی پر بابائے اردو کے متعدد مضامین کا مجموعہ..... افکار حالی کے عنوان سے شائع کر رہی ہے..... چنانچہ میں نے شبیر علی کاظمی سیکرٹری انجمن ترقی اردو سے رابط قائم کر کے افکار حالی کا ایک نسخہ حاصل کیا اور اسے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو دکھایا انہوں نے تمام مضامین پر نظر ڈالنے کے بعد فرمایا کہ جو مضمون ببابائے اردو نے پانی پت میں پڑھا تھا۔ وہ اس میں شامل نہیں..... البتہ جو نامکمل مضمون حالی کا جشن صد سالہ کے عنوان سے اس میں شامل ہے وہ ایک نامکمل مسودہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ جس کا ثبوت مرتبین کے ذیلی نوٹ سے بھی ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق کا مضمون حالی کا جشن صد سالہ افکار حالی کے صفحات ۲۶ تا ۲۸ تک

پھیلا ہوا ہے اور اس نوٹ پر ختم ہوتا ہے:

”مولوی صاحب مرحوم کی یہ تحریر یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ مولوی

صاحب حالی مرحوم کی سیرت اور ادبی و ملی خدمات کے جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ اگرچہ اس کتاب میں شامل ان کی دوسری تحریروں میں بھی زیر بحث آچکے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب ہی کے قلم سے یہ تحریر بھی تیکیل کو پہنچتی تو یہ حکایت دل فریب ایک ادب پارہ بھی ہوتا،۔

افکار حالی..... میں کوئی مضمون بھی پندرہ بیس صفحات سے زیادہ پر مشتمل نہیں اور یہ تمام مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں جشن حالی پر صرف تین صفحات کی ایک ادھوری تحریر ہے اور بس۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ جشن حالی میں پڑھا جانے والا مضمون دوبارہ قلم بندہ ہو سکا۔ اور ایک اتفاقی حادثے کی نذر ہو گیا۔

صوفی خدا بخش کی روایات

جواب شکوہ کے سلسلے میں صوفی خدا بخش نے جو واقعات بیان کیے ہیں ان کے بارے میں شیخ اعجاز احمد کی توضیحات ملاحظہ ہوں:

”کتاب کے صفحات ۲۱۲ تا ۲۲۲ (ملفوظات قدسی اور نیاز مندان بھوپال) پر آپ نے حضرت شاہ اسد الرحمن صاحب قدسیؒ کا ذکر فرمایا ہے۔ اور ان کے مرید خدا بخش کی بیان کردہ روایت کی بنا پر آپ نے اپنی کتاب کے ان نئے اچھوتے اور منفرد واقعات جن کا آج تک کسی کو علم نہ تھا میں یہ روایت بھی شامل کی ہے کہ شکوہ کے بعد جواب شکوہ علامہ نے محض حضرت قدسیؒ کی تحریک اور آپ کی خواہش کے احترام میں لکھا تھا،۔“

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ علامہ کی نظم شکوہ اپریل ۱۹۱۱ء کے جلسہ انجم حمایت اسلام لاوہ میں پڑھی گئی تھی اور جواب شکوہ نومبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ حضرت قدسی کے جو حالات آپ نے کتاب کے صفحہ ۲۱۲ پر لکھے ہیں ان کے مطابق وہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ سن شعور کو پہنچ تو آئندہ تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیے گئے۔

۱۔ افسوس کہ ۱۹۷۶ء میں آپ انتقال فرمائے گئے۔

سات سال بعد بھوپال آئے تو آپ کے والد بزرگوار کا وصال ہو چکا تھا اس لیے آپ خاندانی سلسلہ رشد و ہدایت پر فائز ہوئے۔ چار پانچ برس تک صحراؤں پہاڑوں اور ریاست شاہقہ میں بسر کیے۔ آخر میں وہ بھوپال کی مشہور ٹکیری منا جھانڈ پر چل کشی فرمائی۔ اگر سن شعور کو پہنچنے کی عمر ۱۶ سال تھی جائے تو قدسی صاحب ۱۹۰۵ء میں لاہور بھیجے گئے۔ چونکہ وہ سات سال بعد لوٹ کر سلسلہ رشد و ہدایت پر فائز نہ ہوئے لہذا شکوہ کی اشاعت کے وقت بھی وہ ابھی سلسلہ رشد و ہدایت پر فائز نہ تھے اور غالباً ابھی لاہور میں ہی تعلیم پار ہے تھے۔ ان حالات میں جواب شکوہ کا پس منظر بیان کردہ صوفی خدا بخش صاحب ایک داستان معلوم ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ حضرت صاحب نے یہ بات بیان نہیں فرمائی کہ ان کے قدس کے نقطہ نظر سے کچھ وزن رکھتی ہے۔ میں نے نذر نیازی صاحب سے دریافت کیا کہ کیا علامہ نے ان سے یا ان کے علم میں کسی اور سے جواب شکوہ کا یہ پس منظر بیان فرمایا وہ فرماتے ہیں:

”میں نے حضرت علامہ سے کبھی نہ شاہ اسد الرحمن صاحب کا

نام سنانہ ان کا کچھ ذکر آیا یہ ساری روایات خانہ ساز ہے۔“

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ بعض اقبالیوں کا یہ نظریہ بھی ہے کہ علامہ دراصل اپنی قوم سے وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ جو جواب شکوہ میں کہا گیا ہے۔ اور وہ کچھ کہنے کے لیے شکوہ کی

نظم کہی گئی تھی گویا ان حضرات کے نظریہ کے مطابق شکوہ اور اس کا جواب ایک ہی وقت میں شاعر کے ذہن میں آئے واللہ عالم۔

اس روایت کے سلسلے میں رقم کے استصواب پر منون حسن خاں نے جو وصیت فرمائی ہے اس سے بھی شیخ اعجاز احمد کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

”نے تو علامہ نے اور نہ سید راس مسعود مر جوہم نے کبھی یہ فرمایا کہ

علامہ نے قدسی صاحب کے ایما پر جواب شکوہ لکھا تھا۔ میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ شکوہ کے بعد جواب شکوہ کا لکھا جانا یقینی امر تھا کسی کے ایما پر نہیں لکھا گیا۔ یہ ایسی بات ہوتی کہ ملٹن نے کسی کے ایما پر Paradise Regained لکھی تھی۔ میرے یاں میں علامہ نے شاعری کے سلسلے میں اگر کسی شخص کی بات مانی تھی تو وہ تھے سر شیخ عبدال قادر مر جوہم لیکن ”جواب شکوہ“ ان کے ایما پر بھی نہیں لکھا گیا۔“ ۱

چودھری خاقان حسین صاحب کی روایت

شیخ اعجاز احمد نے چودھری خاقان حسین صاحب کے بیان کردہ بعض واقعات کے سلسلے میں جو تو ضیحات فرمائی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

”کتاب کے صفحہ ۲۲۳ پر چودھری خاقان حسین صاحب

بھوپال میں علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک بار کھانے کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا کہ مسلم لیگ کے لکھنوا جلاس کے دوران جیسا کھانا راجہ صاحب محمود آباد نے کھلایا

ہے ایسا تو شاید پھر نصیب نہ ہو۔ ہر ڈیلیگیٹ کے لیے مختلف اور لذیذ
ترین کھانوں کے چکوان دونوں وقت آتے تھے،

۱۔ اقتباس خط بنام رقم الحروف مورخہ ۱۹۱۹ کتوبر ۵

لکھنوں میں مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا تو دوسرا ۱۹۳۷ء میں۔ علامہ اقبال
ان دونوں میں سے کسی میں شریک نہیں ہوئے۔ واللہ اعلم خاقان حسین صاحب مسلم لیگ
کے کس اجلاس کا ذکر فرمائے ہیں۔

خاقان حسین صاحب مزید فرماتے ہیں..... ایک شب آپ نے فرمایا کہ جب تک
میں نے عربی زبان پر عبور حاصل نہیں کیا تھا میر اعلم ناقص تھا۔ عربی سیکھنے کے دوران میری
ملاقات دہلی میں مقیم عرب سفیر سے ہو گئی اور انہوں نے اپنی لائبریری کی تمام عربی کتب
محجہ استفادہ کے لیے عنایت کر دیں۔ جن سے میں نے بہت علم حاصل کیا۔ معلوم نہیں
خاقان حسین صاحب نے کس زمانے کے متعلق یہ روایت بیان کی ہے۔ علامہ کے عربی
سیکھنے کا زمانہ تو ان کے کالج میں تعلیم پانے کا زمانہ تھا۔ انہوں نے ۱۸۹۷ء میں بے اے
کا امتحان پاس کیا اور وہ عربی میں امتیازی حیثیت سے حاصل کرنے پر انہیں گولڈ میڈل دیا
گیا۔ ۱۸۹۹ء میں ایم اے پاس کرنے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے اور نشل کالج لا ہور
میں عربی کی تعلیم دیتے رہے۔ پھر ۱۹۰۷ء میں لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آر نلڈ کے قائم
مقام کی حیثیت سے شعبہ عربی کے پروفیسر رہے۔ عربی سیکھنے کے دوران دہلی میں مقیم عرب
کے سفیر سے ملاقات کی بات سمجھ میں نہیں آتی اور ان کے عربی سیکھنے کے زمانے میں دہلی میں
کوئی عرب کا سفیر متعین بھی نہ تھا۔

چوہدری خاقان حسین صاحب کی روایت کی بناء پر آپ نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ اپنیں
کا سفر علامہ اقبال نے نواب صاحب بھوپال کی ذاتی خواہش اور عملی اعانت سے کیا۔ یہ سفر

علامہ نے جنوری ۱۹۳۲ء میں میڈرڈ یونیورسٹی کی دعوت پر تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آتے ہوئے کیا تھا اور یونیورسٹی مذکور میں ہسپانیہ اور عالم اسلام کا ذہنی ارتقاء کے عنوان سے ایک لیکچر بھی دیا تھا۔ ان کے قیام انندن کے دوران میں پاکستان کے سابق وزیر خزانہ سید امجد علی صاحب بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں موجود تھے اور عاملہ کے ساتھ لا ہور سے لندن گئے تھے۔ علامہ کے سید صاحب کے خاندان سے گھرے مراسم تھے میں نے ان سے خاقان حسین صاحب کی بیان کردہ روایت کے متعلق دریافت کیا ہے انہیں اس کا کوئی علم نہیں۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ہوا ہوتا تو علامہ سید امجد علی صاحب سے اس کا ضرور ذکر فرماتے۔ میں سید نذرینیازی صاحب سے جو علاہ کے قربی احباب میں سے اور علامہ کے آخری سالوں میں تقریباً روز آنے والوں میں سے تھے خاقان حسین صاحب کی روایات کے متعلق دریافت کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔ یہ روایات محض روایات ہیں۔ ان میں حقیقت نام کوئی نہیں۔ حضرت علامہ نے اپنیں کا سفر تیسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر کیا تھا۔ نواب صاحب بھوپال کی مالی اعانت کا اس سفر سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی مالی اعانت کی ابتداء ۱۹۳۵ء میں ہوئی حضرت علامہ کی عربی دانی کے بارے میں بھی خاقان حسین صاحب نے جو کچھ فرمایا خالی از حقیقت ہے۔ اگر پسین کا سفر نواب صاحب بھوپال کی ذاتی خواہش اور مالی اعانت سے ہوا ہوتا تو علامہ اس ذکر اپنے قربی احباب سے ضرور کرتے۔

جمیل نقوی صاحب اور خاقان حسین صاحب کی روایات جو نواب صاحب بھوپال کی مالی امداد کے متعلق ہیں اور ان پر میری معروضات کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کی طرف سے علامہ کی مالی اعانت کو تسلی کرنے میں کسی کوئی تأمل نہیں۔ نواب صاحب نے علامہ کے لیے بھوپال میں علاج کا انتظام فرمایا اور پھر انہیں تاحیات ماہوار وظیفہ مقرر کر کے جملہ متعلقین و معتقدین علامہ پر جواہسان فرمایا ہے اس کا ہمیں اعتراف ہے۔ خود علامہ نے سید

راس مسعود کے نام اپنے خطوط میں بار بار اپنی شکرگزاری کا اظہار فرمایا ہے۔ ماہانہ وظیفہ کے علاوہ بھی نواب صاحب نے کوئی مالی اعانت کی ہو تو اس عقیدت سے بعد نہیں جوانہیں علامہ سے تھی۔ ان معروضات کا مطلب صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ کے ادعاء کے مطابق اقبال اور بھوپال ایک ایسی تحقیقی کتاب ہے جس میں جتنا کچھ مواد مہیا کیا گیا ہے پوری ذمہ داری سے تحقیق کے اصولوں کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ لیکن تحقیق کے جو اصول آپ نے خود بیان فرمائے ہیں یہ روایات اس معیار پر پوری نہیں اترتیں صرف ایک صاحب کے زبانی بیان پر کسی روایت کو معتبر و مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ روایت کی صداقت کو پر کھنے کے لیے جو ذرائع موجود ہوں ان سے روایت کے ہر پہلو سے چھان بین کریں تبھی تحقیق کا حق ادا ہو۔

گا۔

اسی سلسلے میں راقم نے ممنون حسن خاں صاحب سے بھی استوار ب ضروری سمجھا کہ اس کتاب کی پہلی بار اشاعت کے دوران ان سے کسی طور پر رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ راس مسعود اور نواب حمید اللہ خاں کے ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ممنون حسن خاں صاحب کی شخصیت سب سے زیادہ معتبر اور مستند قرار دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ان کے جواب میں جہاں سفر پیش اور لکھنوا جلاس سے متعلق صراحة ہوتی ہے وہیں ایک بالکل نئے واقعہ کا علم ہوتا ہے جس کا تعلق راؤ نڈیبل کا نفرنس اور مولانا محمد علی جو ہر مرحوم کے سفر انگلستان سے ہے لکھتے ہیں:

”لکھنؤ میں لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں مجھے

کوئی علم نہیں ہے۔ میری رائے میں یہ ادنیٰ سیاست کی باتیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ علامہ کو ادنیٰ سیاست سے وابستہ نہیں کرنا چاہیے۔“

مجھے اس بات کا مطلق کوئی علم نہیں کہ نواب صاحب نے پیش کے سفر کے سلسلے میں علامہ کی خدمت گرامی میں کوئی رقم پیش کی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جبکہ علامہ Round

Table Conference میں شرکت کے لیے ولایت تشریف لے گئے تھے۔ اور نواب صاحب بھی وہاں بھی اسی سلسلے میں گئے تھے۔ اگر کوئی رقم دی گئی تھی تو وہ یا تو شعیب صاحب کے ذریعہ یا پھر عباسی صاحب مرحوم کے ذریعہ دی گئی ہو گی لیکن علامہ نے یاسر مسعود نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں فرمایا۔ میرے عزیز بھائی اور دوست خاقان میاں (چودھری خاقان حسین صاحب) کو زیادہ معلوم نہ ہو گا۔ بہر حال میں اس سلسلے میں اس سے زیادہ اور کچھ عرض نہیں کر سکتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب نے مولانا محمد علی صاحب مرحوم کی کچھ مدد ولایت کے سفر کے لیے کی تھی۔ اور مولانا صاحب بھی اس کا انفرس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

مجھے یہ اس لیے معلوم ہے کہ ان دونوں مولانا علیل ہو کر بھوپال تشریف لائے تھے اور میں ان کی خدمت میں برابر حاضر رہتا کیونکہ میں کالج کی تعطیلات میں لکھنؤ سے اپنے بھائی کے پاس بھوپال آیا ہوا تھا اور مولانا صاحب کی جملہ خط و کتابت کا ایک طرح انچارج تھا کیونکہ مولانا سے ہمارے خاندان کے بہت گھرے تعلقات تھے اور مولانا مجھ سے اپنی اولاد کی طرح محبت فرماتے تھے۔ اسی رشتے سے گلناربی بی مجھے اپنا بھائی مانتی تھیں اور بیگم محمد علی اپنا بیٹا تصور فرماتی تھیں۔ اور یہ رشتے آخر تک قائم رہے۔ مجھے یہ سب باتیں اچھی طرح یاد ہیں۔ اس لیے بھی کہ میں مولانا خطوط لکھنے میں غلطیاں کرتا تھا اور میری اچھی طرح گوش مالی کی جاتی تھی۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ مولانا صاحب نے ان دونوں بہت سے تاریخی مکتب مجھے ہی Dictate کرائے تھے۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ان واقعات کی ایک اور عینی شاہد بیگم راحت سعید چختاری (سابق لیڈی مسعود) سے ۱۹۷۶ء کو پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی میں ان کی قیام گاہ پر جلیل قدوانی کی معیت میں ملاقات کا موقع میرسا آیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے وقت وہ

اپنے شوہر کے ساتھ اردن میں مقیم تھیں۔

چوہدری خاقان حسین کے بیان کردہ واقعات کے سلسلے میں بگم چھتاری نے بیان کیا کہ جہاں تک چوہدری خاقان حسین صاحب کی ذات و صفات کا تعلق ہے وہ ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ وہ ایک معزز خاندان کے فرد اور نہایت ذمہ دار انسان ہیں۔

۱۔ اقتباس خط بنام راق الحروف مورخہ ۱۹۷۵ کتوبر ۱۹۷۶ء

ان سے ہمارے خاندانی تعلقات ہیں۔ وہ برابر ہمارے گھر آتے جاتے تھے اور علامہ اقبال خاقان صاحب سے بے حد شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اور اکثر عباہی صاحب کے گھر سے انہیں بلوایجیت تھے۔ اس لیے میں نہیں کہ سکتی کہ انہوں نے لکھناوجلاس کا جو واقعہ لکھا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ ہی ہو سکتا ہے کہ لکھناوجلاس کے دوران رنگ رنگ کھانوں کی تفصیل علامہ نے انہیں بطور واقعہ سنائی ہو جسے انہوں نے شرکت سے تغیر کر دیا ہو۔ لیکن میری رائے حقیر میں یہ اس دلچسپ واقعہ سے علامہ کی شخصیت کسی طور پر مجرور نہیں ہوئی بلکہ ان کے حسن ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

یہی صورت اپین کے سفر سے متعلق ہے۔ یہ واقعہ دو حضرات کے درمیان گفتگو سے عبارت ہے۔ نہ اب اس دنیا میں نواب صاحب موجود ہیں اور نہ علامہ اقبال جو اس واقعہ کی تصدیق ہو سکے۔ نہ وہ اخبار دستیاب ہے جس میں سیکرٹری کی ضرورت کا اشتہار چھپا تھا نہ سیکرٹری کا نام کسی کو معلوم ہے۔ خود چوہدری خاقان حسین اپنی مسلسل اور شدید علالت کے سبب اس قابل نہیں ہیں کہ اس واقعات کے سلسلے میں مزید کچھ وضاحت کر سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بیان کردہ روایات میں واقعات کا دور بست صحیح پس منظر میں انہیں یاد نہ رہا ہو، ویسے میں یہ کسی طور پر تسلیم نہیں کر سکتی کہ انہوں نے دانستہ طور پر کسی واقعہ کو علامہ سے غلط منسوب کیا ہوگا۔ سمجھنے اور اظہار کرنے میں بھول چوک ممکن ہے۔

ایک سوال کے جواب میں بیگم چھتاری نے بتایا کہ علامہ اقبال..... قیام بھوپال کے دوران اکثر و پیشتر راس مسعود کی معیت میں نواب صاحب سے ملاقاتیں فرماتے تھے اور گھنٹوں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں غور و فکر اور مشورے کرتے تھے۔ نواب صاحب کو علامہ سے بے حد عقیدت تھی۔ اسی طرح علامہ نواب صاحب کو اسلام اور مسلمانوں کا سچا ہمدرد اور ہی خواہ تصور کرتے تھے۔ یہ سب کچھ راس مسعود کی مخلصانہ مسامعی کا نتیجہ تھا کہ علامہ نے ضرب کلیمان کے نام معنوں کر کے انہیں حیات دوام عطا کی۔

ایک نام دو شخصیتیں تحقیق کی ستم ظریفی

”اقبال اور بھوپال“ کے صفحہ ۲۷۲ پر رقم المحرف نے یہ عبارت لکھی ہے:

”شاغل فخری کے علاوہ بھوپال کی جن دیگر ممتاز شخصیات نے اقبال کو موضوع بحث بنایا ہے یا ان کے فن و فکر پر کام کیا ہے۔ ان میں رضیہ فرحت بانو، محمد احمد خاں، محمد امین زیری اور ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور عبدالقوی دسنوی قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی ادبی کاؤشوں کا آئندہ شمارے میں احاطہ کیا گیا ہے۔ صرف رضیہ فرحت بانو کی مرتبہ کتاب خطبات اقبال مجھے دستیاب نہیں ہو سکی لیکن یہ کتاب اقبال لاہوری میں بھوپال میں موجود ہے۔ رضیہ فرحت بانو..... بھوپال کی ممتاز ادیبہ اور فسانہ نگار ہیں۔

”تصورات اقبال کی ایک طرح ایک اور اہم کتاب ”اقبال کا سیاسی کارنامہ“ ہے جسے محمد احمد خاں ایم اے ایل ایل بی نے تالیف فرمایا ہے۔ یہ کتاب کاروان ادب کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۵۲ء میں

شائع ہوئی تھی۔ اس کا انتساب ہے:

اس شاہین شادہ کے نام
جو پاکستان کے قلب کو اسلام
کی روح سے ہمکنار کر دے۔

محمد احمد خاں عرصہ دراز تک بھوپال میں رہے۔ آپ نے ابتدأ
نجہ ہائی کورٹ بعدہ چیف جسٹس کی حیثیت سے ریاست بھوپال کی
گرال مایہ خدمات انجام دیں یہ وہی زمانہ ہے جب سر راس مسعود
بھوپال آگئے تھے۔ اور اقبال کی بھوپال میں آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا
تھا ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ آپ پاکستان آگئے اور یہیں انتقال فرمایا،“

اس اقتباس سے میں نے جن محمد احمد خاں کے نام نامی سے..... ایک اہم کتاب اقبال
کا سیاسی کارنامہ کا بھوپال کے متعلق تذکرہ کیا ہے۔ واقعتاً وہ محمد احمد خاں سابق چیف جسٹس
بھوپال کی نہیں تھی اور جن کا انکشاف پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد ہوا اور پہتہ چلا کہ اس
کے مولف محمد احمد خاں ایم اے ایل ایل بی ہیں اور ان کا تعلق حیدر آباد کن سے ہے چنانچہ
محمد احمد سبزواری کے ہمراہ میں کتاب کے حقیقی مولف محمد احمد خاں کی خدمت میں حاضر ہوا
ہوں اور ان سے دلی معدرت کی اور دو یکساں ناموں سے جو مغالطہ ہوا تھا اس کی تفصیلات
انہیں بتائیں اور درخواست کی کہ وہ اپنے بارے میں مختصرًا معلومات بھم پہنچا دیں تاکہ
دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ممکن ہو سکے چنانچہ ان کے خط کا متن پیش خدمت ہے:

”۲۲۹ بہادر آباد

کراچی

۱۹۷۸ء پر میل ۱۱۸

مکرمی سلام علیکم

آپ سے ملاقات کے بعد مجھے یاد ہی نہ رہا کہ حسن اتفاق سے
آج آپ کا دیا ہوا الفافہ مل گیا تو یاد آیا کہ میں نے آپ سے خودستائی
کا وعدہ کیا تھا۔ ایفائے وعدہ ضروری ہے اس لیے گزارشات ذیل
پیش خدمت ہیں۔

میں نے جامعہ عنانیہ سے ایم اے اور علی گڑھ سے ایل ایل بی
کیا ہے میری حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:
(۱) ہندوستان کی معيشت اور جنگ (۲) ہندوستان کے
زر پر جنگ کے اثرات (۳) ہندوستان کا قومی قرضہ اور جنگ
(۴) انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے (۵) ہمارا قائد
(نواب بہادر یار جنگ کی سیاسی زندگی)

میں مارچ ۱۹۷۹ء میں پاکستان آیا اور کراچی ہی میں مستقل
رہا۔ اگست ۱۹۵۱ء میں میں لے اقبال کا سیاسی کارنامہ لکھا
۔ ادارہ کارروان ادب نے اس کتاب کو شائع کیا۔ یہ ادارہ حیدر آباد
ٹرسٹ کے تحت کام کرتا تھا.....

کراچی آنے کے بعد میں نے یہ کتاب لکھی اور اس کتاب کے
بعد زیادہ تر معاشی الجھنوں کے باعث تصنیف و تالیف کا سلسلہ
چھوٹ گیا۔ البته کبھی کبھار اخبار جنگ میں میرے مضامین شائع
ہوتے رہے.....

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

محمد احمد خاں“

”اقبال کا سیاسی کارنامہ“ کے اصل مولف کی تحریر کے بعد اب تحقیق کی ستم نظر لینی بھی

ملاحظہ ہو:

ہوا یوں کہ اقبال اور بھوپال کے پہلے ایڈیشن کے دوران مسلم ضیائی کی معیت میں میں محمد احمد خاں سابق چیف جسٹس بھوپال سے ملنے گیا۔ ان کی طبیعت ناساز تھی۔ مختصر سی ملاقات کے دوران میں اے اپنے کام کی مشکلات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ نہ بھوپال کے اہل قلم سے مدل رہی ہے نہ یہاں متعلقہ کتابیں دستیاب ہیں اقبال کا سیاسی کارنامہ میں بھوپال سے متعلق سناء ہے۔ کچھ تذکرہ ہے..... وہ بھی نہیں مل رہی ہے۔ یہ سن کر محمد احمد خاں اندر آگئے اور کچھ دری بعدوہ کتاب لے کے دے دی۔ اور کہا کہ اسے دیکھ لیجئے۔

میں نے صفحہ الٹ کر دیکھا..... کتاب پر محمد احمد خاں درج تھا۔ کچھ دری کے بعد میں نے اور مسلم ضیائی نے ان کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔ روانگی سے قبل انہوں نے بتایا کہ اقبال کا سیاسی کارنامہ ان کی اپنی تالیف نہیں ہے نہ ہی میں نے نام دیکھنے کے بعد دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کی اور بات آئی گئی ہو گئی..... میں خوش اور مطمئن تھا کہ بھوپال سے متعلق ایک اور قیمتی کتاب دستیاب ہو گئی۔ اسے پڑھا تو ایک دو جگہ بھوپال اور اقبال کے متعلق اقتباسات بھی نظر آئے اور یہ یقین ہو گیا کہ یہ کتاب محمد احمد خاں..... سابق چیف جسٹس بھوپال کی تحریر کردہ ہے..... چنانچہ صفحہ ۲۷۸ تا ۲۷۷..... رقم الحروف نے اس کتاب کے جگہ جگہ حوالے دے کر اس کی قدر واہمیت پر روشنی ڈالی۔

لیکن جو بات وہم و گمان میں بھی اس وقت نہ آسکتی تھی..... دوسرے محمد احمد خاں کو موجود پا کر حقیق مسرت میں تبدیل ہو گئی۔ محمد احمد خاں سابق چیف جسٹس کا کچھ عرصہ بعد انتقال ہو گیا جیسا کہ اقتباس میں بھی آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا لیکن اقبال کا سیاسی کارنامہ کے

اصلی مولف محمد احمد خاں کو زندہ وسلامت پا کر..... کم از کم میں تو تحقیق کی ستم ظریفی کا قائل ہی نہیں گھایل بھی ہوا۔ اور یہ سطور لکھنے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایک نام کی دو شخصیتوں سے انسان کس طرح مغالطہ کھا سکتا ہے؟ شکر ہے کہ اصلی محمد احمد خاں مولف..... اقبال کا سیاسی کارنامہ نے میری معدتر قبول کر کے مجھے تحقیق کی رسائی سے بچالیا۔

چونکہ یہ کتاب بھوپال کے کسی اہل قلم کی نہیں تھی اس لیے صفحہ ۲۷۸ تا ۲۷۹ کی عبارت حذف کر دی گئی ہے۔

ممنون حسن خاں کے انکشافات

قرآن مجید کے حواشی کا باب صفحہ ۲۸۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۰۰ پر ختم ہوتا ہے۔ اس باب میں اقبال کے وظیفہ محمد امین زیری کے بعض اعتراضات قرآن مجید کے حواشی کی عدم تتمیکیل وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب جب اشاعت کے بعد ممنون حسن خاں تک پہنچی تو انہوں نے رقم الحروف کے نام ایک ذاتی خط میں نہ صرف محمد امین زیری مرحوم کے بیان کی تردید فرمائی بلکہ وظیفہ کے احکام کی نقل بھی عطا فرمادی جس سے یہ ثابت ہوا کہ نواب صاحب بھوپال کا وظیفہ غیر مشروط تھا پھر اسی خط سے یہ بھی پہلی بار مناشفہ ہوا کہ اقبال نے قرآن مجید کے حواشی کا خاکہ تیار کر دیا ہے جسے ڈاکٹر ڈاکٹر حسین خاں نے مصر بھیجا تھا..... ان کے خط کا متن ملاحظہ ہو:

”اپنی کتاب میں آپ نے حضرت علامہ اقبال کے وظیفے کے متعلق مولوی محمد امین زیری مرحوم کے کسی مضمون کا حوالہ دیا ہے مولوی صاحب مرحوم میرے بھی بزرگ تھے۔ ارداں لیے ان کے

متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کروں گا لیکن میں آپ کی خدمت میں اس حکم کی ایک نقل ارسال کر رہا ہوں۔ جو سید راس مسعود مرحوم نے میرے ذریعہ مفتی انوار الحق صاحب مرحوم کے پاس ارسال کرایا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ وظیفہ کے لیے کوئی شرط نواب صاحب مرحوم نے نہیں عاید فرمائی تھی۔ اس سے زیادہ اس سلسلے میں مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بھی درست نہیں کہ تین سال کے عرصے میں حضرت علامہ نے کوئی نوٹس Notes نہیں لکھے یا نامکمل کتاب کا کوئی مسودہ تیار نہیں کیا۔ اول تو اس سارے زمانے میں حضرت علامہ شدید علیل رہے اور پچوں کی وجہ سے پریشان رہے۔ دوسرا کچھ کتابیں ایسی تھیں جو ہندوستان میں موجود نہیں تھیں۔ اور جن کو دیکھنے کے لیے وہ ولایت جانے کا قصد کر رہے تھے۔ پھر بھی انہوں نے جو بھی نوٹس لکھے تھے یا جو بھی خاکہ تیار فرمایا تھا اس کو میری اطلاع کے مطابق ڈاکٹر ڈاکٹر حسین خاں صاحب مرحوم نے مصر بھیجا۔ مصطفیٰ الراغی مرحوم کے پاس جو اس وقت ازہر کے Chancellor تھے مقصد یہ تھا کہ علماء مصر ان نوٹس کو دیکھ رہی کوشش کریں کہ کیا علامہ نے جہاں سے یہ کام چھوڑا تھا وہاں سے وہ اس کو شروع کر کے کتاب کو مکمل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان NOTES پر عالموں اور بڑے بڑے پروفیسر صاحبان نے کئی ماہ تک غور کیا۔ وہ متفقہ طور پر اس نتیج پر پہنچ تھے کہ کتاب کو اس طرح مکمل کرنا جس طرح کہ علامہ چاہتے تھے۔ ان سب کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ ان میں وہ VISION ہو نظر وہ بصیرت نہیں تھی جو حضرت علامہ کو باری تعالیٰ نے قرآن مجید کے متعلق خاص طور سے عطا فرمائی تھی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ ان NOTES کا کیا حشر ہوا ذاکر بھائی مرحوم ہو گئے۔ میرے دوست سیدین اللہ میاں کو

پیارے ہو گئے۔ پروفیسر مجیب مدت سے بے ہوش ہیں اے۔ اعزاز الدین صاحب کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ کیونکہ وہ جامعہ میں نہیں تھے۔ حیات بھائی اور شعیب قریشی صاحب بھر مر جوم ہو گئے۔ اب کس سے دریافت کروں۔ بہر حال کوشش کروں گا اور اگر کچھ معلوم ہو تو انشاء اللہ مطلع کروں گا۔

یہ جناب عزیز احمد صاحب کون بزرگ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بڑے آشفتہ مغز اور آشفتہ ہو ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اقبال کا مقام بلند معلوم کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ میرے رائے میں ایسے لوگوں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جواب تو عقل کی بات کا دیا جاتا ہے۔ کوچھ گردوں کی باتوں کا سنجیدہ لوگ کیونکہ جواب دے سکتے ہیں رہا اقبال کو سمجھنا تو حضرت گرامی مر جوم کا یہ شعر بات صاف کر دیتا ہے:

تر اچنان کہ توئی ہر کسے کجا داند
بقدر ہمت خود می کنند است دراک

میری رائے میں جس آدمی میں ایمان نہیں ہو گا وہ اقبال کو بالکل نہیں سمجھ سکتا ہے۔ اعتراض کرنا تو بہت آسان ہے لیکن اعتراض کرنے والے کو خود اپنا مقام معلوم ہونا چاہیے۔

اقبال اور ممنون حسن خاں

آپ نے کتاب میں کسی جگہ میرے نامکمل مضامین کا تذکرہ کیا ہے ۲۷ را درم میں کیا اور میرے مضامین کیا۔ سالہا سال سے اقبال کے کلام کو وظیفہ جان کر پڑھ رہا ہوں لیکن بچ جانیے اب تک الف بے بھی نہیں سمجھ سکا ہوں۔ یہ حقیقت ہے یقین فرمائیں۔ بہر حال اگر زندگیے اور اللہ پاک نے ہمت عطا فرمائی تو ان اشعار کے متعلق ضرور کچھ پیش کروں گا۔ جو حضرت علامہ نے یہاں بھوپال میں فرمائے تھے اور جن پر میری اور سید راس مسعود مر جوم

کی ان سے اکثر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ اس طرح ان کے وہ مطالب جو خود علامہ نے بتائے تھے شاید میں پیش کر سکوں۔ لیکن یہ سب اللہ پاک کے حکم پر منحصر ہے۔ ویسے اقبال پر کیا کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے اور کیا کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ آج دنیا میں کون سی بڑی یونیورسٹی ہے جہاں اقبال پر CHAIR قائم نہ کی گئی ہو۔ اور ویسے پاکستان میں کیا کچھ کام کام ہو رہا ہے میرے لکھنے یا نہ لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

۱۔ افسوس کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

۲۔ ملاحظہ، صفحہ ۲۸۳ (اقبال اور بھوپال)

یہ ضرور ہے کہ دوران قیام بھوپال میں نے ان کے ساتھ وہ کام انجام دیا تھا جو کریماں نے گوئے کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ریمارک میر انہیں سید راس مسعود مر حوم کا ہے۔ جس خواب کا آپ نے ذکر فرمایا ہے اس کو صبح کو مجھنا چیز سے بیان کیا گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب آنکھ کھلی اور ان کی زبان پر یہ شعر تھا۔ جوانہوں نے نہ تو عالم بیداری میں کہا تھا اور نہ عالم خواب میں۔ شعر یہ تھا:

ستیز دارم شب باز روغن در چراغ من بریز
با پرستاران

حضور سرور کائنات گی خدمت میں جو عرض داشت پیش کی گئی تھی انہوں نے مجھے ہی لکھانا شروع کی تھی۔ اللہ اللہ کیا عشق رسول تھا۔ جب آپ سے ملاقات ہو گئی تو سارا قصہ عرض کروں گا۔ بہت سی باتیں کرنا ہیں یہ تو میرے عشق کی داستان ہے دفتر میں کس طرح سما سکتی ہے..... بقول حسن:

قلم بشکن سیاہ زیر کاغذ سوز دم درکش
حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد

اور یہی وجہ تھی کہ میں باوجود کوششے اپنے مضامین کو اب تک مکمل نہیں کر سکا ہوں۔ بالکل افکار پر پیش ہیں ان کو کون چھاپے گا میرے بھائی!

شعری بھوپالی کے پاس جو کتاب علامہ کی ہے اور جو حضرت علامہ نے نواب کو دی تھی..... وہ ان کے پاس کس طرح آئی۔ جب آپ سارا قصہ سنیں گے تو سر پیٹ لیں گے۔

یوں تو ریڈ یو پر میں حضرت علامہ کے متعلق کئی بار چھوٹی چھوٹی تقاریر کر چکا ہوں۔ اور کالجوں میں میرے یہ پھر ہو چکے ہیں لیکن میں کیا اور میرا علم کیا؟

اگر خلیل اللہ خاں صاحب میاں خاقان چوہدری خاقان حسین میاں عبدالحی اور اظہر سعید خاں صاحب مل جائیں تو ان سب کی خدمت میں میرا اسلام ضرور پہنچا دیں۔ میں ان سب کا ادنیٰ نیاز مند ہوں۔ خدا ان سب سے خیریت کے ساتھ جلد ملائے۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ گز شستہ سال ماہ اگست میں میری رفیقہ حیات کا انتقال ہو گیا۔ جب سے میں چلتی پھرتی لاش ہوں۔ وقت بھی میرے سینے کے زخموں کو اب تک نہ بھر سکا۔ اب علامہ ہی کی طرح بچوں کے لیے زندہ ہوں۔

نوٹ:

”آپ نے اپنی کتاب میں ان چند خطوط کا بھی ذکر کیا ہے جن کو میں نے کسی کو نہیں دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ خطوط بخوبی ہیں اور علامہ نے اپنے قلم سے ان پر Private and Confidential لکھ دیا ہے۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ میں اس امانت کو کس طرح منظر عام پر لاوں۔“

شیش محل..... یادگار اقبال

ممنون حسن خاں نے اپنے دوسرے خط میں شیش محل..... قیام گاہ اقبال سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی اقبال شناسی اور بے پناہ عقیدت کا ایک اور ثبوت متاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۔ اقبال اور بھویال صفحہ ۱۶۵

۲۔ ایضاً صفحہ ۲۲۷

۳۔ انکار شمارہ ۳۶۵ جنوری ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۹-۴۰

”زیادہ کیا عرض کروں..... کوشش کر رہا ہوں کہ شیش محل کا وہ حصہ جہاں علامہ نے قیام فرمایا تھا حکومت کی طرف سے اقبال کی یادگار کو قائم رکھنے کے لیے PRESERVE کر دیا جائے۔ اور وہاں اقبال اکادمی قائم کی جائے۔ ایدمیری ناچیز کوشش بار آور ہو دعا فرمائیں۔

حکومت ہند از راہِ علم اور ادب نوازی اقبال سینئری کے سال میں کثیر رقم خرچ کر کے کئی سینئر کر رہی ہے۔ پہلا سینئر حیدر آباد میں ہوا۔ دوسرا کشمیر میں ۱۹۷۱ء میں آخری سینئر دہلی میں ہو گا جس میں ساری دنیا کے عالم فاضل شرکت کریں گے۔ ہماری حکومت کا یہ اقدام ہر طرح قابل تعریف ہے اور ہم سب حکومت ہند کے بہت زیادہ احسان مند اور شکر گزار ہیں عالمی سینئر میں خاکسار بھی شرکت کر رہا ہے اور شاید ایک PAPER بھی پڑے گا۔

جواب سے شکرگزار فرمائیے۔ کارلا یقہ کے لیے حکم دیجیے۔

والسلام۔ آپ کا بھائی

منون

(منون حسن خاں)

کفشن بردار علامہ اقبال،

ان معروضات و توضیحات کے بعد آخر میں مجھے اتنا ہی اور کہنا ہے کہ اقبال کی شخصیت..... سچ پوچھیے تو روشنی کا ایک ایسا ہالہ ہے جس کے گرد عہد کی دیگر شخصیتیں سیاروں کی مانند گردش کر رہی ہیں اور چراغ سے چراغ روشن ہو رہے ہیں۔

اب یہی دیکھیے کہ نظر حیدر آبادی مرحوم نے اقبال اور حیدر آباد کھنڈ میرے ذہ میں اقبال اور بھوپال کا خاک مرتب ہو گیا اور پہلی اشاعت کے بعد دوسری اشاعت کی نوبت آتے آتے کئی ورنے پہلو سامنے آگئے۔ چنانچہ نظر ثانی کے دوران جہاں بعض واقعات کی صحت اور درستی کا مرحلہ سر ہوا ہیں بعض نادر و نایاب خطوط اقبال کے مرثیے قلمی خطوط کے عکس وغیرہ بھی دستیاب ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ یہ اطلاع بھی ملی کہ اقبال اور بھوپال کے بعد راس مسعود ایجوکیشنل اینڈ کلپرل سوسائٹی آف پاکستان..... اقبال اور راس مسعود کے موضوع پر اور بھوپال میں ڈاکٹر اخلاق اثر اقبال اور منون کے عنوان سے کتابیں لکھ رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب موضوعات ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ایک ہی شخصیت اقبال کے گرد گھومتی ہے اور جب یہ کتابیں شائع ہوں گی تو یقیناً اقبال کی فنی اور شخصی عظمت کے کچھ اور پہلو ہمارے سامنے آئیں گے۔

دوسرے ایڈیشن کا مسودہ ۱۹۷۷ء کی ابتداء میں مکمل کر کے اقبال اکیدمی پاکستان کو پہنچ

دیا تھا لیکن چند روزوں کی بنا پر اس کی اشاعت ۱۹۸۲ سے قبل ممکن نہ ہو سکی۔ چنانچہ پورے مسودے پر ایک بارہ نظر ڈالنے کے بعد اس کتاب سے متعلق جو شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں ان کے اندر ارجات کر دیے ہیں اور ضروری اضافے بھی۔

مجھے یقین ہے کہ آپ نظر ثانی شدہ ایڈیشن کو پہلے سے زیادہ مفید پائیں گے۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۱ء

صہبائکھنوی

اقتباس خط بنا مرقم الحروف۔ مورخہ ۱۹۷۵ اکتوبر



حرف آغاز

تحقیق کی دنیا امکانی دنیا ہے اور یہ دنیا وسیع بھی ہے اور بسیط بھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے فن میں حرف آخر ف غلط ہے اور اسی وجہ سے ہمیں جلد بازی میں حکم لگانے اور تاریخ کے تعین میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔

(ایک نقاد اور محقق کی رائے).....

۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء کی ایک شام کا ذکر ہے کہ کٹرک ہال کراچی میں ڈپٹی نذریہ احمد کی یاد میں ادارہ مصنفوں پاکستان کے زیر اہتمام جلسہ منعقد ہوا۔ ممتاز حسن کی صدارت ملک کے مشہور دانشوروں ممتاز حسن نے فرمائی تھی۔ مجمع بہت تھا ہال کھچا کھج بھرا تھا۔ کوئی دو گھنٹے تک مختلف شخصیتوں نے ڈپٹی صاحب کی تاریخ ساز شخصیت ان کی مثالی زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد حاضرین گوشہ نمائش میں جمع ہو گئے ڈپٹی نذریہ احمد کی تقریباً تمام تصانیف کٹرک ہال کے باہر کھلے میدان میں سلیقہ سے آراستہ تھیں۔ میں بھی ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میز کے گرد ممتاز حسن مسلم ضیائی اور شاہد احمد دہلوی مرحوم یک جاہو گئے۔ اسی عرصہ میں نظر حیدر آبادی مرحوم بھی ہم میں آمدے اور ممتاز حسن نے نظر کو دیکھتے ہی دریافت کیا کہ ان کی کتاب ”اقبال اور حیدر آباد“ تیاری کی کس منزل پر ہے نظر مرحوم نے بتایا کہ کتاب چھپ رہی ہے۔ یہ سن کر یک لخت میرے ذہن میں ”اقبال اور بھوپال“ کا تصور گھوم گیا۔ اور میں نے ممتاز حسن سے عرض کیا کہ اقبال اور حیدر آباد کے بعد اگر اقبال

اور بھوپال پر بھی کچھ کام ہو سکے تو علامہ کی زندگی کا ایک نیارخ بھی دنیا کے سامنے آ جائے گا۔ ممتاز حسن میرا یہ مشورہ سن کر بہت خوش ہوئے اور برجستہ کہا تو یہ کام آپ کر ڈالیے۔

بات آئی گئی ہو گئی جلسہ کے بعد گھر آیا اور یہ موضوع اور اس کتاب کے امکانات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ موضوع کی افادیت مسلم تھی لیکن اس کی تمام تر تفصیلات پر جب میں نے غور کیا تو اس کام کی تکمیل مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن نظر آئی۔ مجھے بھوپال چھوڑے ہوئے وہ سال بیت گئے تھے۔ کتاب کا سرسری ساخا کہ جو میں نے تیار کیا ہے اس کی تکمیل بھوپال جائے بغیر ممکن نہ تھی آخر کار میں نے اپنے چند خاص دوستوں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا اور اپنا تحریری خاکہ انہیں دکھایا تو سب نے بیک زبان ہن ہو کر اس موضوع کو پسند کیا۔ اور کہا کہ یہ قطعی اچھوتا پہلو ہے اس پر ضرور کام ہونا چاہے کیونکہ اقبال کے فلسفہ ان کی فکر اور ان کے کجلا پر منی تشریفات اور کتابیں تو کثرت اور آسانی سے مل جاتی ہیں۔ لیکن علامہ اقبال کی ذاتی صفات ان کی شخصیت کے رنگارنگ پہلوؤں اور ان کی زندگی کے مستند واقعات پر بہت کم مودتا ہے۔ چنانچہ احباب کی ہمت افزائی پر میں نے تھیہ کر لیا کہ مواد کی فراہمی کی کوشش تو کر دیکھوں۔ شاید کچھ کام بن جائے۔

”اقبال اور بھوپال“ کے موضوع پر جب میں نے کتابوں کو تلاش کیا تو صرف دو تین کتابیں مجھ سے ہولت سے مل گئیں کتابوں میں بھوپال سے متعلق چند خطوط میری نظر سے گزرے۔ میں نے تمام مکتبات کو نقل کر لیا ارو تاریخی تسلسل کے ساتھ یکجا کر کے بھوپال کے چند مخلص دوستوں کو خطوط لکھ ڈالے۔ لیکن وہاں سے قابل اعتماد مواد بہت کم مل سکا۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ڈالی ارو چند دوسری کتابوں کو تلاش شروع کر دی۔ اور یہ سلسلہ کوئی دو سال تک جاری رہا۔

اسی زمانے میں فقیر و حید الدین مرحوم کی مشہور کتابیں روزگار فقیر جلد اول اور دویم مجھے

دیکھنے کو مل گئیں ان میں بھوپال اور اقبال کے متعلق تھوڑا بہت مواد موجود تھا۔ اسے بھی میں نے نقل کر کے محفوظ کر لیا۔ کام کچھ آگے بڑھ گیا تو میں نے مزید سعی و جہد کر کے دوسرا کتاب میں بھی حاصل کر لیں۔

کتاب سے متعلق بھوپال کی بزرگ اور ممتاز شخصیتوں نے قلمی رابطہ پیدا کیا۔ کئی احباب اور جوان سال ادیبوں نے بظاہر بڑے خوش کن جوابات دیے۔ ان خطوب میں اس موضوع سے متعلق مواد بھیجئے کی بشارت بھی تھی۔ وعدے اور وعدید بھی کیے گئے تھے۔ لیکن تقریباً دو سال تک یاد دہانیوں کے باوجود نہ مطلوبہ مواد مکمل سکا نہ دیگر تفصیلات فراہم ہو سکیں۔ صرف تین حضرات مرحوم یوسف قیصر بھوپالی رشدی مدیر روزنامہ افکار بھوپال اور شیم احمد نے جوان دنوں اور نگ آباد کے ایک کالج میں لیکچر ہیں۔ تھوڑی بہت مدد ضرور کی۔ بھوپال کے دیگر احباب نے تو جواب تک دینے کی زحمت نہ اٹھائی۔

رشدی کے علاوہ شیم احمد نے جب تک وہ بھوپال میں رہے میرے استفسارات کے جواب بھی دیے اور کچھ قابل اعتبار مواد بھی بھیج دیا۔ لیکن ہر ممکن کوشش کے باوجود ہفت روزہ ندیم کی جواب روزنامہ ہے فائلیں دستیاب نہ ہونا تھیں نہ ہو سکیں۔ اسی عرصہ میں شیم احمد لیکچر رہو کر بھوپال سے باہر چلے گئے اور اس طرح بھوپال سے رابطہ کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

مواد کے سلسلہ میں مزید جستجو سے پتہ چلا کہ بھوپال کے ایک بزرگ و محترم ادیب صوفی شاعر شاہ اسد الرحمن قدسی بھون ضلع جہلم میں قیام فرمائیں جہاں خاندانی سلسلہ رشد و ہدایت جاری ہے۔ چنانچہ میں نے شاہ صاحب سے قلمی رابطہ پیدا کیا تو انہوں نے فوراً جواب سے نوازا اور علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط بھی عطا کر دیا۔ میں نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے اپنے کام کی مشکلات کا تذکرہ کیا اردو رخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد اور رہنمائی فرمائیں تاکہ اس کام کو پایہ تیکیل تک پہنچا سکوں۔ میری اس گزارش پر موصوف نے

نہ صرف اپنی یادداشتتوں سے اہم غیر مطبوعہ اور منفرد مواد بحثیج دیا بلکہ اپنے تمام مریدین اور معتقدین کو بھی ہدایت فرمادی کہ اقبال اور بھوپال کے ناتے میری ہر ممکن اعانت کی جائے۔ انہوں نے اس کام کا پڑا اٹھانے پر مجھے دعا میں بھی دیں اور کئی نادر و نایاب چیزیں شاہ صاحب قبلہ کے توسط سے مجھے دستیاب ہو گئیں۔

اب کام کچھ آگے بڑھ گیا تھا۔ کراچی کی ادبی تقریبات میں جب بھی ممتاز حسن سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ آپ اقبال اور بھوپال سے متعلق کتنا کام کر چکے ہیں؟ میں نے صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیا کہ یہ کام کافی وقت طلب ہے۔ میں اپنی کوشش کر رہا ہوں تاکہ معتبر مواد فراہم ہو جائے ممتاز صاحب کی ہدایت پر میں نے اس کتاب کے بارے میں اقبال اکیڈمی کو خط لکھا چنانچہ ہر چوتھے پانچویں مہینے وہاں سے یادداشتیں آنے لگیں اور میں یہی جواب دیتا رہا کہ کتاب لکھ رہا ہوں۔ اور مواد کی تلاش جاری ہے۔ انشاء اللہ کامل ہوتے ہی کتاب کا مسودہ پیش کر دوں گا۔

..... اور آج تقریباً گیارہ سال کے بعد جب میں اپنی بے نام سی جدوجہد اور لگا تاریخی کوشش کا جائزہ لیتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ کراچی میں بیٹھے بیٹھے اتنا قیمتی اچھوتا اور اہم مواد کیتے مل گیا۔ جس کا دس گیارہ سال پہلے تصور بھی ممکن نہ تھا.....!

اس کتاب میں جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے حسب ذیل نئی چیزیں شامل ہیں چھ غیر مطبوعہ خط چارائی سے خط جو مکتبات کے کسی مجموعہ میں نہیں چھپے وغیر مطبوعہ مرثیے جو علامہ کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ کئی نادر و نایاب کتابیں جو علامہ کی شاعری سیاست اور ان کی فکر کے وسیع گوشوں پر محیط ہیں۔ تین ایسی کتابوں کے انتسابات جو شہزادی عابدہ سلطان اور خصوصی معانع ڈاکٹر عبدالباسط کو بھوپال بھیجی گئی تھیں۔ نواب حمید اللہ خاں کے وہ تاریخ خطیب جو مرحوم نے جشن حالی کے موقع پر پانی پت میں پڑھے تھے۔ اقبال کے پہلے قیام بھوپال

سے متعلق شاہ اسد الرحمن قدسی کے مرید اقبال حسین خاں ندیم خاص فرماں روائے بھوپال کے اچھوتے واقعات بھوپال کی تاریخی عمارت راحت منزل ریاض منزل اور شیش محل کی تصاویر۔ بھوپال کی ایک نہایت حسین موتی مسجد کی تصویر جہاں علامہ اکثر جمعہ کی نماز کے لیے جاتے تھے۔ جاوید اقبال کے بچپن کی تصویر جب وہ بھوپال گئے تھے۔ نیز کتاب کے متعلق کئی اور تصویریں خطوط خاکے اور عمارتوں کے نقشے وغیرہ اور یہ کتاب تقریباً گیارہ سال کے بعد میری دیوانہوار اروان تھک محنت کا حاصل..... آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ذرا پھر ایک بار ابتدائی اقتباس پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ تحقیق کی دنیا واقعی امکانی ہے اور یہ دنیا وسیع ہی نہیں بسیط بھی ہے۔ علاوه ازیں اس صداقت سے بھی انکر ممکن نہیں کہ تحقیق کے فن میں حرف آخر حرف غلط ہے میری دانست میں تحقیق کی ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ معتبر و مستند مواد فراہم کیا جائے۔ تحقیق کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر جتنا کچھ مواد اس کتاب میں مہیا کیا گیا ہے..... پوری ذمہ داری سے کیا ہے..... بغیر حوالہ کے کوئی واقعہ پیش نہیں کیا ہے اس کتاب میں اول تا آخر یا تو مستند کتابوں کے حوالے سے آپ کی نظر سے گزریں گے یا مشہور ممتاز اور سر برآور دہ شخصیتوں کے بیانات ایک اہم بات یہ بھی عرض کر دوں کہ میری تحقیق علامہ اقبال کے بھوپال سے ربط و تعلق تک محدود ہے جسے اکثر خطوں میں علامہ اقبال نے دارالاقبال لیکھا ہے۔ اس طرح تحقیق کے کسی امکان کو میں نے نظر انداز نہیں کیا ہے اب یہ فیصلہ آپ کریں گے کہ تحقیق کا حق ادا ہو سکا کہ نہیں.....!

اس کتاب کا ایک نہایت اہم اور قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کے بھوپال سے روابط کا آغاز ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا اور یہ روابط وفات سے صرف تین دن پہلے یعنی ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء تک برابر قائم رہے۔ چنانچہ میں نے ابتداء سے انتہا تک حالات و واقعات کا تاریخی تسلیل برقرار رکھا ہے..... اسی طرح میں اپنے موضوع سے انصاف کر سکتا تھا۔ اس تاریخی

تسلسل کی روشنی میں علامہ اقبال کی بھوپال سے ہنی والیگی کا آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

چچ پوچھیے تو یہ کام نہایت پیچیدہ اور صبر آزماتھا۔ تیس پینتیس سال پہلے کے صحیح واقعات کی چھان بین اور علامہ اقبال کے خطوط کا پس منظر تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مراد فتحا۔ لیکن میں نے چند روز مشکالت کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا اور بہ کوشش صرف اسی مواد کو کتاب میں شامل کیا جسے میں نے ہر لحاظ سے معتبر مستند اور قابل اعتماد سمجھا۔

اقبال اور بھوپال بظاہر ایک محدود سا موضوع ہے۔ اس موضوع کا تفصیلی احاطہ کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ البتہ ایک مختصر سامقالہ عبدالقوی دسنوی صدر شعبہ اردو سیفیہ کا چج بھوپال نے تحریر کرنے کا حوصلہ کیا۔ دسنوی صاحب نے اپنے مقالہ کو بعد میں کتابچہ کی صورت میں بھی شائع کیا۔ اور مجھے بھی ایک کاپی عنایت کی۔ میں نے اسے پڑھا تو افسوس ہوا کہ دسنوی صاحب اپنے مقالہ علامہ اقبال بھوپال میں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے پھر بھی میں نے انہیں مبارک بادی اور یہ لکھا کہ جن نظموں یا مرثیوں تصاویر اور دیگر مواد کو آپ فراہم نہیں کر سکے۔ اور صرف تذکرہ پر اتفاقاً کیا ہے براہ کرم وہ مجھے مہیا کر دیں۔ انہوں نے وعدے ضرور کیے لیکن وفا نہ کر سکے۔ ایک خط میں انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ اسے انہوں نے بہت عجلت میں لکھا ہے۔ حالانکہ عجلت کی ضرورت نہیں تھی۔ ادیب و محقق کو اپنے موضوع سے پورا انصاف کرنا چاہیے۔ میری مبارک بار پر دسنوی صاحب نے جو خط مجھے بھیجا اس کا حوالہ اور مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا فرماتے ہیں:

۲۰ جون ۱۹۶۷ء

محترمی صہبا صاحب

السلام علیکم آپ کا خط ملا۔ اطمینان ہوا کہ علامہ اقبال بھوپال

میں پسند فرمایا..... میں نے یہ کام بڑی عجلت میں کیا ہے اب اسے آپ مکمل کیجیے۔ انشاء اللہ آپ کی فرمائیش جلد پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں کام کرنے میں بڑی دشواریاں ہیں۔ تصویروں کے لیے کئی صاحبوں نے وعدے کیے ہیں لیکن ہنوز وعدہ ہی کی کے منزل میں ہیں۔

امید ہے کہ آپ بغیر و عافیت ہوں گے اپنی یادوں میں اس ناجیز کو بھی یاد رکھیے..... آپ کا عبدالقوی دسنوی“

اس خط کے بعد میں نے دسنوی صاحب کو کئی خط لکھے لیکن بات کوشش اور وعدہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ تب میں نے اپنے ہی ذرائع اور وسائل پر تمام توجہ مبذول کر دی اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ علامہ کے کئی بھوپالی نیاز مند مجھے کراچی میں مل گئے جن کے بیان کردہ واقعات آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس ضمن میں ماہر غالبیات اور ماہر اقبالیات مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی خصوصی توجہ اور عنایت خاص کا ذکر بھی ضروری ہے۔

۱۹۶۹ء میں غالب صدی کی تقریبات میں شرکت کے لیے مولانا مہر مرحوم کراچی تشریف لائے تو میں نے ان کی قیام گاہ پران سے شرف نیاز حاصل کیا اور اقبال اور بھوپال کے آٹھ ابواب میں لکھ چکا ہوں۔ ازره شفقت آپ انہیں ایک نظر دیکھیں اور مشوروں سے نواز دیں۔ نیز مناسب سمجھیں تو اس کتاب پر مقدمہ یاد بیجا چھ بھی تحریر فرمادیں۔ مولانا مرحوم نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی اور دوسرے روز میں آٹھ ابواب پر مشتمل مسودہ انہیں دے آیا۔ لاہور پہنچ کر انہوں نے پہلی فرصت میں میرا مسودہ پڑھ دالا اور مجھے بڑی محبت سے خط

لکھا۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

”..... حقیقت ہے کہ یہ مسودہ جتنا بھی دیکھا معلوم ہو گیا کہ

آپ نے حالات بڑے ہی مناسب انداز میں مرتب فرمائے ہیں
اور کوئی قابل ذکر مأخذ جو دسٹرس میں آ سکتا تھا انداز نہیں کیا
ہے۔“۔

اس عرصہ میں میں نے کتاب کے دو باب اور لکھڈا لے اور ان کو جسٹری سے مولانا مہر
مرحوم کی خدمت میں بھیج دیا۔ میں نے یہ گزارش بھی کی کہ ان دس ابواب میں سے کتاب کا
تھائی حصہ مکمل ہو جاتا ہے اگر آپ مسودہ کو کسی قابل سمجھیں تو مقدمہ یاد بیاچہ تحریر فرمادیں۔
میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اب صرف تین چار ابواب اور لکھنا ہیں اور ان ابواب کے عنوانات
مسودہ میں شامل ہیں۔

اس درخواست پر انہوں نے فوراً توجہ مبذول فرمائی اور مجھے لکھا:

”..... آپ باقی ابواب کب سمجھیں گے تا کہ انہیں دیکھ کر ایک

دیباچہ یا مقدمہ لکھ دوں..... اگرچہ میرا احساس یہ ہے کہ آپ کی
کتاب ایسے چھپے اور دل پذیر انداز میں لکھی گئی ہے کہ اس کے لیے
میرا مقدمہ نہ محض ناموزوں نہ ہو گا بلکہ کسی بھی مقدمہ کی ضرورت
نہیں،“۔

باقیہ چار ابواب میں اپنی خرابی صحت اور افکار کی چند در چند مصروفیات کے سبب لکھنے
سے قاصر ہا۔ اسی دوران اقبال اکیڈمی سے عبدالواحد معینی کا خط آگیا کہ اقبال اور بھوپال کا
مسودہ جلد اکیڈمی کو بھجوادیں تا کہ انتظامیہ کمیٹی اس کی اشاعت پر غور کر سکے۔ چنانچہ میں نے
اپنا مسودہ معینی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ معینی صاحب کو میں نے بتایا کہ دس

ابواب تیار ہیں۔ ان پر مولانا مہر مرحوم نظر ڈال چکے ہیں۔ آپ بھی ایک نظر دیکھ لیں اگر کتاب اشاعت کے لیے منظور کر لی گئی تو باقی تین یا چار باب..... انشاء اللہ ایک دو مہینے میں مکمل کر دوں گا۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء سے مئی ۱۹۷۱ء تک میری کتاب کا مسودہ اقبال اکیڈمی میں رہا۔ عبدالواحد نے بڑی شفقت اور توجہ سے میرا مسودہ ملاحظہ کیا اور اپنی سفارش کے ساتھ کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا۔ کمیٹی نے اس مسودہ کو اشاعت کے لیے منتخب کر لیا اور مئی ۱۹۷۱ء کو مجھے تحریری اطلاع عمل گئی چنانچہ میں نے سب کام چھوڑ کر باقی ابواب پر کام شروع کر دیا۔ اور شبانہ روز جو جہد کے نتیجہ میں ۱۳ جولائی ۱۹۷۱ء کو اکیڈمی جا کر بقیہ حصہ ڈاکٹر صاحب اقبال اکیڈمی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس کتاب کو مکمل کر کے جتنی ڈنی آسودگی اور مسرت مجھے نصب ہوئی اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اقبال اور بھوپال بظاہر محدود سا موضوع ہے لیکن جب میں نے اسے لکھنا شروع کیا تو نئے سے نیا مواد مجھے دستیاب ہو گیا اور اس طرح یہ موضوع سمندر بن کر پھیل گیا۔ ایک نظر فہرست مضمایں پڑا یہ تو با آسانی اس امر کا اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے کتاب کے تقریباً ہر باب میں نئی معلومات فراہم کی ہیں اور تمام تر اس بات کی کوشش کی ہے کہ علامہ مرحوم کے ڈنی اور قلبی رشتہوں اور بھوپال دارالاقبال سے ان کی خصوصی وابستگی کو تاریخی تسلسل کے ساتھ اس کتاب میں محفوظ کر دوں۔ میں نے حقائق کی تلاش و تحقیق سے ان کی خصوصی وابستگی کو تاریخی تسلسل کے ساتھ اس کتاب میں محفوظ کر دوں۔ میں نے حقائق کی تلاش و تحقیق سے ان کی خصوصی وابستگی کو تاریخی تسلسل کے ساتھ اس کتاب میں محفوظ کر دوں میں نے حقائق کی تلاش و تحقیق سے پوری دیانت داری اور سچائی اور خلوص سے کام لیا اور انی طرف سے بہت کم فیصلہ یا حکم لگایا ہے۔

ایک باب میں میں نے بڑی جتنی جو اور محنت کے بعد اقبال سے نواب حمید اللہ خاں کے

ذاتی روابط کی نشان دہی کی ہے۔ میں نے خود یہ سوال پوچھا کہ ان دونوں میں کیا مشترک قدر تھی کہ علامہ نے مرتبے دم تک بھوپال سے ہنر رشتہ قائم رکھ سکے۔ ایک نواب اور ایک فنّاًعٰت پسند عزالت گزیں اور فقیر منش انسان۔ چنانچہ میں نے ان محركات کا جائزہ لیا بھوپال کے کئی نیازمندوں سے معلومات حاصل کیں۔ اپنے طور پر غور و فکر کیا تو پہلے چلا کہ امیر اور فقیر کا قریبی ربط و تعلق دراصل ایک نصب العین کے اشتراک کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے دور زریں اور ان کی نشأة الثانیہ کے جذبے دونوں میں مشترک تھے۔ نواب صاحب کی طرف سے اقبال کا حد درجہ احترام ان کی ہر خدمت کے لیے ہمہ وقت آمادگی۔ دوسری جانب اقبال کے دل پر یہ اثر کہ نواب صاحب والی ریاست ہونے کے باوصاف عوامی انداز فکر کھتے ہیں اور مسلمانوں کی سودو بہبود سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے اور یہ دو مختلف اور مختلف النوع زندگی بس کرنے والے اکابر تھیات سچ اور اچھے دوست رہے۔

اب آئیے ایک نظر کتاب کے ابواب پر بھی ڈال لیں۔

پہلا باب

علامہ کے بھوپال سے روابط کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کا دستاویزی ثبوت آئینہ مشاعرہ سے ملتا ہے۔ یہ انتخاب غزلیات ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ آئینہ مشاعرہ کا عکس شامل کتاب ہے۔ اسی میں علامہ کی غزل بھی شامل ہے جو غالب کی زمین میں کہی گئی ہے۔ اور ان کے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہیں۔

دوسرہ باب

اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے ذاتی روابط اور خصوصی مراسم پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسی

باب میں علامہ کی اصلاح شدہ غزل بھی شامل ہے جسے اقبال حسین خاں ندیم خاص فرمائے جھوپال نے علامہ کے اصرار پر سنایا تھا۔

تیسرا باب

علامہ کی بھوپال میں آمد و قیام مختصر سے متعلق ہے۔ اسی باب میں ان کے علاج کے سارے انتظامات کا علم ہوتا ہے جو نواب صاحب بھوپال اور راس مسعود کی ذاتی توجہ سے کیے گئے تھے۔

چوتھا باب

اقبال کے وظیفہ اور اس کے پس منظر کا تفصیلی احاطہ کرتا ہے۔

پانچواں باب

بھوپال کے دوسرے قیام سے متعلق ہے ان میں وہ یادگار نظمیں بھی شامل ہیں جو بھوپال میں قیام کے دوران علامہ نے لکھیں۔

چھٹا باب

اس میں جشن حالی کا مستند احوال پیش کیا گیا ہے۔ اسی باب میں نواب صاحب کے وہ تاریخی خطبات بھی شامل ہیں جو چار ساریں کی کوششوں کے بعد مستیاب ہو سکے۔ یہ خطبات پانی پت میں پڑھے گئے تھے۔

ساتواں باب

اقبال اور ان کے خصوصی معانی ڈاکٹر عبدالباسط سے خط و کتابت پر مشتمل ہیں اسی باب میں وہ پانچ غیر مطبوعہ خط میں شامل ہیں جو علامہ نے ڈاکٹریا باسط کو تحریر کیے تھے علامہ

اقبال کی خط نہایت سادہ زبان میں لکھے گئے ہیں اگرچہ ان میں تمام تر نفرس کی تفصیل اور بیان جانے کا تذکرہ ہے۔

علامہ اقبال کے جتنے بھی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط میری نظر سے گزرے ہیں ان میں بڑی روائی سادگی و پرکاری ہے۔ اور شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ خطوط نویسی کے سلسلہ میں منیر احمد شیخ کا ایک اقتباس قابل توجہ ہے:

”..... ذاتی خطوط کو اس لحاظ سے اہم جانا چاہیے کہ ان میں

لکھنے والے کی ذات کا عکس بے حد نمایاں اور بے داغ ہوتا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی میں کئی خطوط لکھے ہوں

گے۔ بعض ایسے خطوط جہاں دل کا حال کھل کر بیان کیا۔ ایسا حال کہ

شاید کسی مضمون یا افسانے میں بھی کھپ نہ سکے۔

خط لکھنے میں یہ اہم بات ہوتی ہے کہ یہ لکھا کس کو گیا ہے۔ وہ

خطوط جو محبوبہ کو لکھے جاتے ہیں۔ ان میں شخصیت کے جذباتی پہلو کوئی

رنگوں میں سامنے آتے ہیں۔ یہ خطوط انسانی زندگی کی سب سے اہم

تحریری دستاویز ہوتے ہیں کہ ان میں افراد کی شخصی کمزوریاں

اعترافات حرف مدعہ کا بیان اٹھا کر کی بے ساختگی اور تصورات کی

اڑان اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ذات کے کے لیے عشقیہ خطوط سے

بڑھ کر کوئی شے نہیں میں سمجھتا ہوں کہ آدمی اپنی بیوی کو خط لکھتے وقت

بھی اپنی ذات کو اسی کوسامنے اس طرح نہیں کھوتا جیسے وہ اپنے

محبوب یا بے حد عزیز دوست کے سامنے خوف و خدشہ کے بغیر اپنی

قلبی و ذہنی کیفیات کو بیان کرتا ہے۔

تمام زبانوں میں ادب میں خطوط کے ایسے سرمایے بے شمار میں
گے جہاں خط ایک خالصہ ذاتی تحریر سے آگے نکل کر ادب بن جاتا
ہے۔

علامہ اقبال کے خطوط بھی معیار کے مندرجہ بالا اقتباس پر پورے اترتے ہیں۔

آٹھواں باب

بھوپال کے تیرے قیام کی تفصیلات پیش کرتا ہے اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو
اس قیام کے دوران اقبال نے لکھی تھیں۔ اسی باب میں مشنوی پس چہ باید کردائے اقوام
شرق کا بھی ذکر ہے۔ جوانہوں نے بھوپال میں لکھی۔ اس سلسلے میں خواب کی حقیقتوں کا
سراغ اور اس کا پس منظر شاید پہلی مرتبہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور توقع ہے
کہ اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کرے گا۔

نواں باب

اقبال راس مسعود اور ضرب کلیم کی اشاعت کے متعلق ہے۔ اس باب میں بھی کئی نئی
باتیں آپ کے ملاحظہ سے گزریں گی۔

وسواس باب

اقبال کی وفات اور بھوپال میں اس کے اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ ایں وہ مرثیے بھی
شامل ہیں جو ان کی وفات پر لکھے گئے ہیں اور آج تک غیر مطبوعہ تھے۔

گیارہواں باب

ان اثرات کو ظاہر کرتا ہے جو علامہ کے بھوپال میں قیام کے سبب بھوپال کے ادیبوں

شاعروں فن کاروں وغیرہ نے قبول کیے۔ اس باب میں بھی کئی نئے گوشے اجاگر کیے گئے ہیں۔

بارھواں باب

ملفوظات قدسی اور نیازمندان بھوپال پر محیط ہے۔ اس میں مستند حالات و واقعات پیش کیے ہیں ہیں۔ یہ باب بھی تمام ترنی معلومات پرستی ہے اور پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

تیرھواں اور آخری باب

قرآن مجید کے حواشی کے متعلق ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس کی فرمائش نواب صاحب بھوپال نے علامہ سے کی تھی اور جس کی تیاری میں وہ زندگی کی آخری سانس تک کرتے رہے۔ افسوس کہ علاہ اقبال کی رحلت نے اس عظیم کتاب کے خواب کو شرمندہ تغیرہ ہونے دیا۔

اور سب سے آخر میں کتابیات اور اشاریہ ہے۔

یہ ہے سرسری ساخا کہ جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اب ایک نظر ان اچھوٹے اور منفرد واقعات پر بھی ڈال لیجیے جن کا آج تک کسی کو علم نہیں تھا۔

۱۔ انیسویں صدی کے آغاز سے آخری دم تک علامہ اقبال کا بھوپال سے ہنگی قلبی اور عملی تعلق رہا ہے بھوپال کی ج گراں قد رش خصیات سے ان کو خط و کتابت رہی ان میں محمد امین زیری، شاہ اسد الرحمن قدسی راس مسعود، خاتون ارشد (بیگم ارشد تھانوی) ممنون حسن خاں ڈاکٹر عبدالباسط وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۲۔ ان ابواب میں ان نظموں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو علامہ نے ریاض منزل و شیش محل میں قیام کے دوران لکھیں۔ اس طرح ان نظموں کی صحیح تاریخوں کا علم ہو جاتا ہے۔ ضرب

کلیم میں جو نظم علامہ نے حمید اللہ خاں والی ریاست بھوپال کی ذات و صفات سے متعلق لکھی تھی وہ بھی شامل ہے۔

۳۔ علامہ توجہ دلانے پر اپنے کلام کی خود ہی اصلاح کر لیتے تھے جیسا کہ خاتون ارشد

کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ ماہنامہ ”فنون“ جون جولائی ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۳۲-۱۳۵

۴۔ علامہ اقبال بھوپال کے ممتاز شاعروں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شاعروں کے کلام پر بھی اصلاح دیتے تھے اور مشورے بھی۔ اس کا ثبوت لمعہ کے نام خطوط میں مل جاتا ہے۔ وہ دیگر شعرا کا کلام بھی سنتے تھے اور داد دیتے تھے۔

۵۔ شکوہ لکھنے کے بعد جواب شکوہ علامہ نے محض شاہ اسد الرحمن قدسی کی تحریک اور ان کی خواہش کے احترام میں لکھا تھا۔ ۱

۶۔ علامہ کے نیاز مدوں کا ہندوستان گیر حلقة تھا۔ چنانچہ قیام بھوپال کے دوران جب وہ علیل تھے تو بڑی پابندی سے دوستوں عقیدت مندوں اور شاگردوں کو خطوط لکھتے تھے۔ ان کے خطوط کی زبان انہایت سادہ و دلنشیں ہے۔

۷۔ پسین وغیرہ کا سفر انہوں نے نواب حمید اللہ خاں کی ذاتی خواہش اور عملی اعانت سے کیا تھا۔ ۲

اسی نوع کے اور بھی ان گنت اچھوتے واقعات جو قطعی نئی معلومات پرمی ہیں۔ یکتاب کے مطالعہ کے دوران آپ کی نظر سے گزریں گے۔ ان کا اعادہ لا حاصل ہے۔ اگرچہ کتاب تفصیل بفضل خدادیر سوری مکمل ہو گئی ہے پھر بھی مجھے کچھ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خون جگر صرف ہونے میں کچھ کمی رہ گئی ہے علامہ اقبال کے یہ دو مصرعے میرے جذبات احساسات اور خیالات کی کتنی صحیح ترجیحی کرتے ہیں:

مجھہ فن کی ہے خون جگر سے نمود!
 نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
 آخر میں ان بزرگوں رفیقوں اور دوستوں کا شکر یہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اس کتاب کی
 تیاری کے ہر مرحلہ میں میری مدد کی، مشوروں سے نوازا اور میرا حوصلہ بڑھایا تاکہ میں اس
 کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ ان حضرات کی فہرست بہت طویل ہ۔ پھر بھی چند ایک کا
 ذکر ضروری ہے۔ سب سے پہلے عبدالواحد معین اور محمد احمد سبزواری کے نام آتے ہیں
 جنہوں نے علیحدہ علیحدہ میری کتاب کے مسودہ پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا فرمائی اور
 نہایت قیمتی مشوروں سے نوازا۔ دیگر حضرات میں مولانا غلام رسول مہر، شاہ اسد الرحمن قدسی،
 نذیر نیازی، اسماعیل پانی پتی سید محمد یوسف قیصر بھوپالی، شمشیم احمد، عبدالجعی، شہزادی عابدہ
 سلطان، شریف الدین پیرزادہ علی حیدر عباسی، محمد خیل اللہ خاں جیل نقوی، اقبال حسین خاں
 رشدی (ایڈیٹر روزنامہ افکار۔ بھوپال) چودھری خاقان حسین مسحی الدین مسح صدیقی
 عبدالجید کمالی، مسلم ضامنی، اظہر سعید خاں، ڈاکٹر عبادت بریلوی، خواجه آشکار حسین، عبداللہ
 قریشی، ڈاکٹر سید محمد یوسف، انجمن عظمی، ڈاکٹر حنیف فوق، احسن علی خاں، ڈاکٹر آغا افتخار حسین،
 سید فیضی، اختر جمال، محمد علی صدیقی، محسن بھوپالی، سحر انصاری، سید احمد علی انور حارث، مسعود
 احمد برکاتی اور احمد طاہر بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

صہبائکھنوی

۱۶ افروری ۱۹۷۳ء

۱۔ ملاحظہ ہو دیا چہ طبع ثانی



بھوپال سے علامہ اقبال کے روابط

بر صغیر کی آزادی سے قبل ہندوستان کی جن اسلامی ریاستوں کی علمی ادبی اور سانسکریتی خدمات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان میں ریاست حیدر آباد کے بعد ریاست بھوپال کا نام سرفہرست ہے۔

یوں تو ریاست بھوپال کے قیام سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک ہر فرماں روائے دور میں ہمیں کئی مشہور و ممتاز شخصیتیں ملتی ہیں جو ریاست بھوپال یا دربار بھوپال سے وابستہ تھیں لیکن خصوصیت کے ساتھ ریاست کی آخری دو حکمران خواتین تینی نواب شاہجہاں بیگم (۱۸۲۸ء۔ ۱۹۰۱ء) اور نواب سلطان جہاں بیگم (۱۹۲۶ء۔ ۱۹۴۱ء) کا دور حکومت بلاشبہ سنہری دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حکمران خواتین جو خود علم و فضل کی حامل تھیں اور تصنیف و تالیف ان کا پسندیدہ مشغله تھا۔ اپنے اب وجد کی طرح اس بات کی بھی شایق تھیں کہ ان کی ریاست میں زیادہ سے زیادہ اہل علم و اہل کمال جمع ہو جائیں اور ہر طرف علم و تعلیم کا چرچا ہو۔ خوان ان کے محل پر مشاعرے منعقد ہوتے تھے شعراء کو اعمامات اور خلعتیں عطا کی جاتی تھیں۔ ریاست میں امن اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ حکمران وقت کی ذاتی دلچسپی کے باعث تعلیم نسوان اور خواتین کی سودو بہبود پر خصوصی توجہ دی جا رہی تھی مدارس محل رہے تھے۔ عمارتیں بن رہی تھیں خواتین کے لیے کلب لائبریریاں قائم ہو چکی تھیں اور ریاست بھر میں اردو کا سرکاری عمل دخل تھا۔ قوانین اردو میں نافذ کیے گئے تھے اور سرکاری ملازمتوں میں اردو کی قابلیت لازمی قرار دی گئی تھی۔ اور بقول مولانا اصل جیرا چوری مولف تاریخ الامت:

بھوپال کی حیثیت اس وقت بغداد الہند کی تھی।

علم و ادب کی اشاعت کے لیے آٹھ سرکاری مطابع تھے جو دن رات کتابیں چھاپتے رہتے تھے اور تقریباً دوسوکتا میں مختلف علوم و فنون پر ہرسال ان مطابع میں شائع ہو کر مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔

شاہجہان بیگم نے جب قتوج کے ایک جید عالم مولوی سید صدیق حسن سے عقد ثانی کر لیا تو ریاست کے علمی اور فکری سرمایہ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپ عربی و فارسی کے متینی اور تقریباً ڈھائی سو کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ جن میں سے ڈیڑھ سو کے قریب عربی و فارسی کی تھیں۔ یہ کتابیں ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی خاصی مقبول ہوئیں۔ شاہ سعود نے آپ کے بعض تصانیف کو نہایت اہتمام سے شائع کیا اور یہ کتابیں آج بھی عرب ممالک میں الشیخ صدیق القوچی والخاری کے نام سے مشہور ہیں اور علم و بصیرت کا منع ہیں۔ علامہ جمال الدین افغانی مصر کے مفتی عبدہ اور سید احمد شہید کے رفقائے کار سے آپ کا قریبی تعلق تھا

۲۱۸ مقالات اسلام صفحہ

اور آپ پان اسلامزم کی تحریک کے بڑے حامی تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر برطانوی حکومت نے آپ کا نوابی کا خطاب واپس لے لیا تھا۔ اور آپ کو کچھ عرصہ تک نظر بند رکھا تھا۔ نواب شاہجہان بیگم نے دور حکومت میں ہر سید احمد خاں علی گڑھ کالج کے لیے چندہ لینے بھوپال آئے تھے۔ لندن کی وکنگ مسجد شاہجہانی بھا آپ ہی کے نام سے معنوں ہے اور جس کی تعمیر کے لیے آپ نے گرانوں قدر عطیہ دیا تھا۔ بعض نادر کتابوں کی اشاعت بھی نواب شاہجہان بیگم ہی کے عطیہ سے ہوتی تھی۔ مثلاً صحیح بخاری کی شہرہ آفاق تصنیف فتح الباری جو آج کل تیرہ جلدیوں میں ملتی ہے متعدد کتابیں اس کے علاوہ ہیں۔ اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا تو

شاہجہاں بیگم نے فتح الباری کی اشاعت پر ایک لاکھ سے زیادہ رقم صرف کی تھی۔
نواب سلطان جہاں بیگم خود بھی صاحب علم، بیدار مغز اور علم دوست خاتون تھیں۔
مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں آپ نے ہمیشہ بڑھ کر حصہ لیاں مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ کی آپ پہلی چانسلر ہیں اور اس حیثیت سے آپ نے یونیورسٹی کی توسعہ و
ترقی میں گراں قدر اور گراں ماہی خدمات انجام دیں دیوبند ندوہ دار المصنفین مکہ معظمہ کے
مدرسہ صولتیہ لندن کے اسلامی اور بے شمار تعلیمی اور رفاقتی ادارے آپ کی امداد و سرپرستی سے
فیض یاب ہوتے تھے۔ علامہ شبلی کی سیرۃ ابنی مولوی عبدالرزاق کی البرامکہ اور مشنی افتخار عالم
کی مارہدی کی حیات النذیر کے لیے بھی آپ نے خصوصی مالی اعانت فراہم کی۔ بھوپال
میں ازسرنو دفتر تاریخ قائم کیا جس میں محمد امین زیری علامہ نیاز فتح پوری علامہ محوی..... سید
محمد یوسف قیصر مانی جائیں محمد مهدی، مولوی عبدالرزاق ایسی بلند پایہ شخصیتیں شامل تھیں.....
دوبار آپ بھوپال کی اور ایک مرتبہ فریضہ حج ادا کیا۔ حمید یہ لاہوری کا قیام رسالہ الحجaba ا
اور رسالہ ظل السلطان ۲ کا اجراء مائل نسوان پر آپ کی قابل قدر کتابوں کی اشاعت کی وہ چند
تاریخی اور ادبی کارنامے ہیں جو تاریخ ادب میں ہمیشہ ازندہ رہیں گے۔ شاہجہاں بیگم اور
سلطان جہاں بیگم کے دور حکومت میں متعدد شخصیتیں بھوپال آ کر آباد ہو گئیں اور بھوپال میں
رہ کر انہوں نے کتاب زبان و ادب تہذیب و ثقافت اور علم و فن کی بے مثال خدمات انجام
دیں جن مشاہیر کا بھوپال سے کسی نہ کسی عنوان سے ربط و تعلق رہا۔۔۔ یا وہ یہاں کچھ عرصہ
کے لیے مقیم رہے۔ ان کی آمد و رفت کا سلسلہ رہایا انہیں ریاست سے وظیفہ یا امداد دی گئی
ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ پھر بھی ذیل کے چند مشاہیر کا تذکرہ نامناسب نہ ہو گا
کہ ان کے ذکر کے بغیر بھوپال کی ادبی عظمت بھوپال کی نیک نامی ارو شہرت اور تاریخ ادب
میں بھوپال کی نمایاں حیثیت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

نواب شاہجہاں بیگم خود بھی شعر کہتی تھیں۔ آپ کے دو دیوان مطبوعہ موجود ہیں تخلص شیریں اور تاجور تھا۔ آپ کے بلند مرتبہ شوہر نواب صدیق حسن اختلص بہ توفیق کے علاوہ جمیل احمد جمیل سہسوائی..... سید امجد علی اشہری و امجد حکیم معشووق علی خاں جو ہر مولوی شکر اللہ سہیل، فرانسیسی نسل کے بھوپالی شاعر ابی جہر بن بیہقی نقیش حکیم فرانس فطرت، سید ظہیر الدین طہبیر دہلوی (شاگردِ ذوق) مرزا شاغل فخری، محمد عباس رفت، خاں محمد خاں شہپر، مولانا محمد عبدالحکیم صدیقی ذکار مولانا اسلم جیراچپوری۔ مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنؤی، مولوی احسن اللہ خاں، ثاقب بدایوی امیر بینائی (جو دو بارہ بھوپال تشریف لائے اور شاہجہاں بیگم نے انہیں باغ فرحت افرزا میں مہمان رکھا) محمد ہادی رسو۔ احمد علی شوق قدوائی، رشید احمد ارشد تھانوی مولانا محمد حسین محوی لکھنؤی، علامہ نیاز فتح پوری

۱ زیر ادارت سید محمد یوسف قیصر ۱۹۱۱ء

۲ زیر ادارت محمد امین زیری ۱۹۱۵ء

клب احمد مانی جائسی، مضطرب خیر آبادی قاضی ولی محمد، مفتی انوار الحق، مولوی محمد مهدی، ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری، مولوی افتخار عالم مارہروی، مولوی عبد الرائق، علامہ شبیلی، محمد امین زیری، سر راس مسعود، علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی، جگر مراد آبادی، پروفیسر سید نواب تلی (جو بھوپال میں مستقل طور پر کبھی نہیں رہے لیکن بھوپال سے خصوصی روابط کی بنا پر اکثر و بیشتر بھوپال تشریف لا کر قیام کرتے تھے) حفیظ جالندھری، کوثر چاند پوری، مولوی مظہر احمد و اہمی ارو جاں شاہ اختر کے علاوہ اسی عرصہ میں خود ریاست بھوپال کے جن مشاہیر نے بیرونی مشاہیر کے دو شہزادوں اردو زبان کی گراں مایہ خدمات انجام دے کر ہندوستان گیر شہرت حاصل کی یا جن کی ذات گرامی سے بھوپال کی ادبی عظمت اور علم و فن میں اضافہ ہوا ان میں سراج میر خاں سحر بھوپالی، امراء علی عیش (شاگردِ داغ) مشتی انور علی انور بھوپالی

شاگرد داع غ عبدالشکور اخلاص (شاگرد امیر مینائی) حافظ سلیمان خاص خالص، سید محمد میاں شہید، محمد کریم ذکی وارثی شاہ اسد الرحمن قدسی، منیر الدین منیر بھوپالی، میاں ارجمند محمد خاں، عبدالجلیل مائل نقوی، شریف محمد خاں فکری، سید محمد یوسف قیصر بھوپالی، ممتاز احمد سہما مجددی ڈاکٹر عبدالحسین، سید محمود اعظم فہی بھوپالی، محمد اسماعیل رمزی ترمذی، منتی پھمن نزاں افسر، شعبودیاں سخن، گوبند پرشاد آفتاب، صالح خانم عاجز، نواب سلطان جہاں بیگم جو ۲۰۰ سے زائد کتابوں کی مصنفہ تھیں ہر ہائی نس نواب میمونہ سلطان معروف بہ شاہ بانو بیگم۔ علامہ میاں خالد علامہ خلیل عرب، حامد سعید خاں حامد بھوپالی، باسط بھوپالی، شعری بھوپالی، ملار موزی، حامد رضوی، ابوسعید بزمی، عبدالحکیم آرٹسٹ، قدوس صہبائی، شاغل فخری اور محمد احمد سبزواری وغیرہ شامل ہیں جنہوں نے آخری فرمان روانوب حمید اللہ خاں کے دور حکومت تک علم و ادب کی گراں مایی خدمات انجام دیں۔

اسی دور میں بھوپال کے شعرا کی تخلیقات بھوپال سے باہر کے مشہور رسائل میں بھی شائع ہونے لگیں۔ خود بھوپال سے کئی اخبارات و رسائل جاری ہوئے جن میں خصوصیت سے احتجاب (ایڈیٹر سید محمد یوسف قیصر) ”ظل سبحان“، (ایڈیٹر محمد امین زبیری) سید محمد یوسف قیصر، ”نگار“، (ایڈیٹر نیاز فتح پوری) ”زرنگار“، (ایڈیٹر منتی عبد القدر آزاد) ”مالوہ رویو“، (ایڈیٹر محمد یوسف قیصر، کامدار عبد المتنی) ”محسن الملک“، (ایڈیٹر حامد سعید خاں) ”آفتاب نسوان“، (ایڈیٹر سرور جہاں۔ انور جہاں) ”ندیم“، مصور (ایڈیٹر محمود الحسن صدقی) ”افکار“، (ایڈیٹر صہبائی لکھنؤی اے آر شدی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس دور کے جن نوجوانوں ادیبوں اور شاعروں نے بھوپال میں فکری انقلاب کی داع بیل ڈالی اور خود کو منظم کر کے اقبال اور دوسرے معاشر شعرا کے مقصدی تعمیری، اور اصلاحی روحانات کو عام کیا ان میں سبعہ سیارہ کے ارکین جو محمد حسین محیی لکھنؤی اصلًا بھوپالی سید محمد

یوسف قیصر بھوپالی، ارشد تھانوی، حضور احمد حضور، نعیمی، خورشید علی مہر دہلوی، عبدالحکیم صدقی، ذکا بھوپالی، معین الدین احسن دہلوی، سرورقادری بدایوی، عصمت اللہ بیگ دہلوی، (برادر مرزا فرحت اللہ بیگ) پر مشتمل تھے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اسی ادبی انجمن نے سہا مجددی محمود اعظم نہیں، اور محمد حسین مجھی ایسے باکمال فن کار بیدا کیے اور شعروادب کی اصلاح کے ساتھ ساتھ نئے رجحانات کو عام کیا۔ انگریزی نظموں کے ترجیح کیے۔ ہندوستان کے مشہور رسائل مثلاً دکن رویوں الناظر ”پنجاب رویو“، ”تنوری“، ”الشرق“، ادیب، تمدن، العصر، تہذیب نسوان وغیرہ میں جدید نسل کا کلام انتیازی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد ”سبعہ سیارہ“، کاشیرازہ بکھر گیا تو انہیں حضرات نے دائرہ ادبیہ کے نام سے ایک اور انجمن بنائی اور جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق ادب و فن کی خدمت کا فریضہ جاری رکھا۔

۱۔ افسوس کے ۱۹۷۶ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مشاعرے بھوپال کی ادبی و تہذیبی زندگی کا جزو لا ینک تھے۔ چنانچہ آل انڈیا مشاعرے بھوپال میں بھی ہونے لگے۔ اور طرح مشاعروں کا سلسہ بھی جاری رہا۔ اسی سلسلے میں پہلی بار ہمیں اقبال سے متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ”آئینہ مشاعرہ“ یعنی مشاعرہ بھوپال منعقدہ ۱۲ شعبان المظہم ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۸ اگست ۱۹۱۰ء مرتبہ سرورقادری سے پوچھیے تو وہ پہلی ادبی دستاویز ہے جسے ہم اقبال اور بھوپال کے ڈینی و ادبی رشتے کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہمیں کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تخلیق یا کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے اقبال کا بھوپال سے کسی عنوان ربط و تعلق ثابت کیا جا سکے۔ آئینہ مشاعرہ ۵۶ صفحات کا ایک محصر سا انتخاب کلام ہے جس میں اس عہد کے کئی باکمال اور بلند پایہ شعرا کی طرحی غزلیں جو غالب کی زمین میں حروف تہجی کے اعتبار سے

شائع ہوئی ہیں انتخاب مشاعری کے پہلے صفحہ کا عکس حسب ذیل ہے۔

صفحہ ۲ پر عنوان نذر جو عبارت درج ہے اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا لکھا ہے:

”..... یہ مجموعہ غزلیات جس میں ہندوستان کے مشہور اور مستند

سحر نگاروں کے پاکیزہ اور نقیص خیالات شامل ہیں انتہائے جوش

عقیدت مندی سے شاعر عرش آشیانِ حُمَّمِ الدُّولَهِ دَبِيرِ الْمَلَكِ نواب

مرزا اسد اللہ خاں غالب نظام یار جگ بہادر اعلیٰ مقامہ کے نام نامی

اور اسم گرامی پر نذر کیا جاتا ہے۔

محض اس غرض سے کہ اس روح مقدس کو یہ معلوم ہو کہ مسرت

ہو کہ اس نے جن پودوں کو خون جگر سے سینچا تھا وہ آج بڑے تناور

درخت ہو کر شاہراہ عالم و ادب کے مسافروں پر سایہ کیے ہوئے ہیں

محض اس غرض سے اس پاک روح کو یہ امر موجب نشاط ہو کہ اس

نے جس خارزار کو ہموار اور صاف راستہ بنانے میں بے شمار مصائب

اٹھائے ہیں اس پر آج ہزاروں را گیر اس کے نام پر درود تھیات بھیجتے

ہوئے منزل مقصود کو پہنچ رہے ہیں محض اس غرض سے کہ اس خلد

مکاں کے یہ یہ خبر باعث ابہاج ہو کہ اس کے ابتلاء ہوئے

راستے پر آج سیکڑوں چل رہے ہیں اور ہزاروں کم ہمت باندھے

بنجھے ہیں۔

درحقیقت میرزا غالب بر الدُّلُلِ مجتعہ و نور الدُّلُلِ مرقدہ ایک خضر

طریق یا بالفاظ دیگر امت شعر کے ایک مسلمہ لیر اور ایک بحق پیغمبر

تھے جن کی حقیقی مدح سرائی میں ابد الآباد تک زبان و قلم دونوں قاصر

ہیں۔

نیاز مند مع اپنے احباب کے اس کے مشہد خاص پر نہایت خلوص
کے ساتھ گلہائے بولموں کا سحر طراز گلدستہ پیش کرتا ہے خدا اس کے
مزار مطہر کو پھولوں سے بھرے آمین
.....سیکرٹری مشاعرہ“

صفحہ نمبر ۳ پر تعارف ہے جس کی عبارت کچھ یوں شروع ہوتی ہے:
”.....بزم شعراء میں جن باکمال حضرات نے شرکت فرمائی یا
اپنے لاجواب کلام سے سرفرازی کا موقع دیا ان میں سے چند قابل
الذکر حضرات کا مختصر حال اس طریق سے کھا جاتا ہے کہ پیلک ان کا
کلام دیکھنے سے پہلے ان سے تعارف کرے۔“

اس عبارت کے بعد حروف تجھی کے لحاظ سے ج شعر اکا تعارف کرایا گیا ہے ان کی
تعداد ۲۷ ہے پہلا نام سید علی احسن صاحب احسن ماہروی کا ہے اس کے بعد امیر احمد امیر
بدایونی سید معین الدین حسن صاحب، احسن حکیم علی محسن خاں صاحب ابر کے نام آتے ہیں۔
اور پانچویں نمبر پر اقبال کا تعارف ہے جس کی عبارت یہ ہے:
”اقبال.....پروفیسر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی
بیرون سڑایٹ لاء صوبہ پنجاب کے قابل فخر انشا پردازوں میں سے ہیں ا
اور تعلیم یافتہ سوسائٹی کے مایناز فرزند ہیں۔“

اقبال کے بعد مشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی، سید مہدی حسن صاحب احسن مرزا
عاشق حسین صاحب بزم اکبر آبادی، حافظ سلیمان صاحب خاں، سید محمد عالم صاحب نجفی
سید امیر حسن صاحب دلیز، سید ریاض احمد صاحب ریاض خیر آبادی، مشی پیارے لال

صاحب رونق دہلوی، سید بادشاہ حسین صاحب رعنا، ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں
صاحب سائل دہلوی، منشی چندی پر شاد صاحب شیدا دہلوی، راقم الدولہ سید ظہیر الدین خاں
صاحب ظہیر دہلوی، مولوی مرزا ہادی رسواعزیر لکھنؤی، سید ابن علی صاحب علی صفائی پوری، بابو
عطاء محمد صاحب عطاء، سید امراء علی صاحب عیش بھوپالی، سید محمد یوسف قیصر صاحب قیصر
بھوپالی، حکیم سید مهدی حسن صاحب کمال لکھنؤی، مفتی اکرام احمد صاحب لطف سید کاظم
حسین صاحب محشر لکھنؤی، مرزا محمد ہادی صاحب مرزا اور میر غلام بھیک نیرنگ کے اسمائے
گرامی مع تعارف جو زیادہ سے زیادہ ستاسٹروں اور کم از کم دو سطروں پر مشتمل ہے پہمیش
کیے گئے ہیں۔ تعارف ص ۳ سے شروع ہو کرس ۶ پر ختم ہوتا ہے ص ۷ پر رواد مشاعرہ کے عنوان
ن سے اس مشاعرہ کی نوعیت غرض و غایت تفصیلات مقامی اریروں نی شعراء کا شکریہ انتخاب
اور ممبران کمیٹی کا نام بنام تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ روئیداد ص ۷ اور ص ۸ پر مشتمل ہے اور اس
اعتبار سے اہم اور قابل مطالعہ ہے کہ اس میں آج سے باسٹھ سال پہلے کی ادبی محفلوں اور
بزم آرائیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں بھوپال کے اس عہدہ کی سماجی ثقافتی اور
محلسی زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ اور وہاں کی وہ چند علمی و ادبی
شخصیتیں بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہیں جنہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں زبان و
ادب کیک ارتقاء میں نمایاں حصہ لیا۔ روئاد مشاعرہ کی تفصیلات یہ ہیں:

”..... ۱۹۱۰ء شب پنجشنبہ کو دس بجے کے وقت مولوی

محمد اسمعیل صاحب کے مکان کے ایک بڑے ہال میں یہ مشاعرہ
ہوا۔ نوبجے شرکاء مجلس کی آمد شروع ہوئی۔ معززین شہرومندین ملک
و شاکرین و سامعین سے دس بجے تک ہزار آٹھ سو سے زیادہ افراد جمع
ہو گئے۔ دس نج کر منٹ پر شمع کو گردش دی گئی۔ باہر کی آئی ہوئی

غزلیں سنانے کے واسطے نیاز مند سیکرٹری اور سید معین الدین حسن
صاحب دہلوی تجویز کیے گئے جنہوں نے نہایت مستعدی سے اپنے
کام کو انجام دیا۔

کثرت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اس زمین میں غزل لکھنا
بالکل عبث ہے۔ اساتذہ سلف خصوص مرزا غالب کی ہم نوائی کرنا
کوئی آسان بات نہیں ہے۔ مگر جیسا کہ غزوں سے ثابت ہو گا کہ
شعراء نے اپنی زود طبع سے وہ گل کرتے کہ حاضرین بحوم بحوم اٹھے
اور یہ زمین گستاخ بن گئی۔

باہر کی آئی ہوئی غزلیں نہایت دلچسپی سے سنی گئیں۔ اور ہر ہر
شعر پر خوب ہی داد دی گئی اور خلاف امید اس مشاعرہ کو کامیابی
ہوئی۔ جن بزرگوں کے نام سلسلہ انٹروڈکشن میں ملاحظہ فرمائے گئے
یہیں ان کی غزلیں چوٹی کی غزلیں ہیں جنہوں نے مشاعرہ کو چار
چاند لگائے اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں حضرات کی بدولت محفلِ خنچ چک
اٹھی اور بقول بعض شرفاء بھوپال یہ مشاعرہ اپنے رنگ ڈھنگ کا پہلا
مشاعرہ تھا ساڑھے پانچ بجے صحیح یہ محفل برخاست ہوئی۔ چونکہ بہت
سے حضرات کی غزلیں باقی رہ گئی تھیں اور یہ امر قرین انصاف نہ تھا
کہ ان حضرات کے کلام کو جنہوں نے دونوں غور و فکر کر کے آج کے
واسطے کافی ذخیرہ فراہم کیا تھا نہ سنا جائے اس لیے مشاعرے کے
تیسرا دن پھر ایک مشاعرہ کیا گیا جن میں ان شاعروں کی گل
نشانی کے علاوہ کچھ کلام غیر طرحی بھی شامل تھا۔ اور دس بجے سے صحیح

دشی تک نہایت دلچسپی سے گزری اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ
محفل بہ نسبت اور مشاعروں بھوپال کے نہایت تہذیب و شانستگی
سے رہی۔

۱۔ مولوی سید محمد اسماعیل دیسوی نواب سکندر بیگم کے زمانے میں وارد بھوپال ہوئے
اور روکاری میں ملازم ہو گئے عہد شاہجہانی میں تحریک دار بنادیے گئے۔ علم و ادب سے آپ
کو خصوصی لگا و تھا۔ آپ کی مشہور تصانیف میں ”تاریخ طسم بکاوی“ اور ”تاریخ بھوپال“
خصوصیت سے قبل ذکر ہیں جو نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانے میں شائع ہوئیں آپ
کے دولت کدہ پر اکثر ادبی محفیلیں اور مشاعرے منعقد ہوئے تھے۔

۲۔ یہ طریقی مشاعرہ غالب کی مشہور غزل کے اتباع میں ہوا تھا جس کا مصرع ہے:

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
مشی محمود علی صاحب شہزادہ سلطان عالم صاحب، مشی احمد رضا
صاحب ہیڈ کلرک، مشی عبدالحی صاحب رنج، سید حسن صاحب سید
سید معین الدین حسن صاحب دہلوی، استٹنٹ پرائیوٹ سیکرٹری
فرمان روائے بھوپال جناب ارشد تھانوی استٹنٹ کورٹ اسپکٹر
در بار بھوپال، جناب قیصر صاحب ایڈیٹر الحجاب و مالوہ ریویو کے حسن
انتظام سے بزم شعر بہت ہی پر واقع رہی۔ میں ان حضرات کی کار
گزاری کا مشکور ہوں۔

خت ناسپاسی ہو گی اگر میں ان حضرات کا شکر یہ ادا نہ کروں
جنہوں نے مہربانی فرمائی کرا رواپنے بہت سے کام ہرج کر کے محض
اس مشاعرہ کے واسطے غزلیں لکھیں اور روانہ کیں۔

ڈاکٹر پروفیسر اقبال صاحب میر نیرنگ صاحب جناب ریاض
صاحب جناب ابر صاحب لکھنؤی صاحب امیر صاحب بدایوئی،
جناب عطا صاحب بدایوئی، وغیرہ وغیرہ اور جس قدر حضرات نے
از راہ نوازش ہمدردی سے مجھے مر ہوں منت بنا یا جب تک میرے منہ
میں زبانہ ہے میں ان کے اس احسان اور منت پذیرہ میں ہمیشہ ہمیشہ^۱
رطب اللسان رہوں گا اور مجھے پورے طور پر یقین ہے کہ اگر پھر کبھی
یاران مشرب کی ترغیب سے اس قسم کی تکلیف دہی کا موقع ہاتھ آیا تو
یہ بزرگوار مجھے پھر اداۓ شکر میں ترانہ سخ پائیں گے اور اس حقیر بے
بضاعت کو دل سے فراموش نہ فرمائیں گے۔

اپنی اس تحریر کو ختم کرنے سے پہلے مجھے مبران کمیٹی انتخاب
غزلیات یعنی ابن علی صاحب عالی اور جناب سید حسن صاحب سید و
جناب سید معین الدین صاحب احسن دہلوی و جنات سید بادشاہ
صاحب رعنا لکھنؤی و جناب حافظ سلیمان صاحب خالص و جناب
منشی رشید احمد صاحب ارشد تھاونی و جناب سید محمد یوسف صاحب
قیصر ایڈیٹر الحجاب و مالوہ رویویو کا سپاس گزار ہونا ضروری ہے
جنہوں نے نہایت نیک نیتی سے غزلوں کا انتخاب کر کے اس گلdestہ
کو ایسا گلdestہ بنادیا کہ جس کے مضامین کی مہک اہل سخن کے دماغوں
کو ہمیشہ معطر کرتی رہے گی۔

آپ کا مر ہوں منت

عبدالحصمد سرور قادری بدایوئی،^۲.....

اس گلددستہ انتخاب کا آغاز صفحہ ۲۱ سے ہوتا ہے لوح پر بسم اللہ الرحمن الرحيم درج ہے اور اس کے نیچے خوبصورت نیل بوٹوں میں آئینہ مشاعرہ درج ہے۔ روئنداد مشاعرہ صفحہ ۸ ختم ہوتی ہے اور انتخاب صفحہ ۲۱ سے شروع ہوتا ہے۔ درمیانی صفحویں تا ۲۰ پر سید محمد یوسف قیصر بھوپالی کا مضمون بعنوان شاعری چھپا ہے جس کی ذیلی سرخیاں یہ ہیں:

شاعری کی ابتداء۔ ہندی شاعری۔ عربی شاعری۔ انگریزی شاعری۔ اردو شاعری۔

آغاز۔ گزشتہ دور۔ موجودہ دور۔ قدیم و جدید شاعری۔ ایک مفید مشورہ اس مضمون کے فوراً بعد شعرا کی غزلیات حروف تہجی کے مطابق یوں شروع ہوتی ہیں:

احسن۔ جناب سید علی احسن صاحب احسن مارہروی فتح الملک
اور یہ الترام آخر تک برقرار رہتا ہے۔ پہلے تخلص پھر پورا نام بعض حضرات کے نام کے آگے تمیذ بعض کے آگے تعارفی عبارت اور بعض کے ساتھ مقیم بھوپال لکھا گیا ہے۔ گلددستہ میں بحیثیت مجموعی ۶۸ غزلیات ہیں صفحہ نمبر ۲۳ پر اقبال کی طرحی غزل اس طرح درج ہے:

اقبال۔ جناب ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی

اتیج ڈی بیر سٹرائیٹ لا

حلقة زنجیر کا ہر جوہر پہاں لکلا
آئینہ قیس کی تصویر کا زندان لکلا
ہم گراں جان کے لائے تھے عدم سے بلبل
باغ ہستی میں متاع نفس ارزان لکلا
و سعت افزائی آشقتگی شوق نہ پوچھ

خاک کی مٹھی میں پوشیدہ بیباں نگا
غالب کی زمین میں اقبال کے یہ تین شعران کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں تھے حالانکہ
ان کی وفات کے بعد ان کا کافی منتشر اور متفرق کلام ان کے تین مجموعوں رخت سفر، باتات
اقبال (پہلی اشاعت و اضافہ شدہ اشاعت ثانی) اور سرود رفتہ میں شائع ہو گیا۔ ان
مجموعوں میں بہت سا کلام مشترک بھی ہے۔ لیکن اقبال کے لاائق بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے جو
مزید غیر مطبوعہ اور متفرق کلام بڑی جتنوں سے اور سعی بلیغ کے بعد جمع کیا اسے انہوں نے فقیر
وجیہ الدین صاحب کو اشاعت کے لیے دے دیا جو روزگار فقیر جلد دوم (سن اشاعت
۱۹۶۳ء) میں ”کلام اقبال“ کے عنوان سے صفحہ ۲۱۵ تا ۳۹۵ شائع ہوا ہے۔ اسی کتاب میں
یہ تین اشعار بھی صفحہ ۳۰۹ پر زیر عنوان برائے مشاعرہ بھوپال شامل ہیں۔

اقبال کے بھوپال سے ذہنی ربط و تعلق کا آغاز جیسا کہ آئینہ مشاعرہ سے ظاہر ہے ۱۹۱۰ء
میں ہوا ہے جسے ہم بلا خوف تردید بھوپال سے ربط و تعارف کی پہلی کڑی قرار دے سکتے
ہیں۔

کچھ مدت کے بعد نواب سلطان جہاں بیگ و الی ریاست کے ایماء پر بھوپال سے رسالہ
ظل السلطان ۱۹۱۵ء میں جاری ہوا تو مولوی محمد امین زیری اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ
رسالہ قومی اصلاحی اور خواتین کے مسائل پر مضماین شائع کرنا چاہتا تھا چنانچہ اقبال
نامہ میں اقبال کا ایک خط شائع ہوا ہے جو محمد امین زیری ایڈیٹر ظل السلطان بھوپال کے نام
ہے خط کا متن یہ ہے:

”لاہور.....۱۹۱۷ء پر میل ۱۲۹“

مندوی السلام علیکم

اپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے میرے رائے میں اس بحث پر

سب سے بہتر کتاب قرآن کریم ہے۔ تدبیر شرط ہے۔ اس میں تمام
باتیں موجود ہیں۔

کے تمام مسائل بھی اس میں موجود ہیں زمانہ حال کی سفیر بحث ا
عورتوں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک کتاب..... میری نظر سے
گزری ہے۔ کسی عورت کی لکھی ہوئی ہے مگر افسوس ہے کہ مصنف کا
نام ذہن میں محفوظ نہیں۔

ل..... مراد ہے حق رائے دہی کی خواستگار خاتون

جان سٹورٹ مل نے بھی اس پر ایک مضمون لکھا تھا۔
خالص محمد اقبال،

یہ خط اقبال اور بھوپال کے ربط تعلق کی دوسری کثری کی حیثیت رکھتا ہے جس سے یہ
اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بھوپال کی سرکردہ شخصیتیں بھی اقبال کی علمیت و عظمت فن کی قائل
تھیں۔ اور ان سے استفادہ کرنے میں فخر و عزت محسوس کرتی تھیں جیسا کہ اس خط کے
مضمون میں ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے بھوپال کی علمی و ادبی شخصیتوں سے قلمی ربط و
تعلق کے دو دستاویزی ثبوت مزید دستیاب ہوئے۔ ان میں پہلی خاتون ارشد (بیگم مولانا
ارشد تھانوی) ہیں اور دوسرے مولانا شاہ اسد الرحمن قدسی۔

خاتون ارشد اپنے نامور شوہر کے دوش بدوش بھوپال میں رہ کر اصلاحی اور تعمیری
 مضامین لکھتی تھیں ۱۹۳۳ء میں آپ نے رسالہ بنو بھی جاری کیا جو خواتین کے محبوب اور
پسندیدہ رسالہ کی حیثیت سے عرصہ تک جاری رہا۔ ان دونوں آپ کراچی میں ہیں..... آپ
بھی اقبال کی گرویدہ و شیدا تھیں چنانچہ ایک ملاقات کے دوران آپ نے بتایا کہ غالباً ۱۹۱۸ء
میں جب علامہ اقبال کا جواب شکوه شائع ہو چکا تھا تو اس کے ایک بند پر میں نے اعتراض

کرتے ہوئے علامہ کو توجہ دلائی تھی میری حیرت کی انہتانا نہ رہی جب علامہ نے صرف میرے خط کا جواب عنایت فرمایا بلکہ زیر بحث بند میں بھی تبدیلی کر دی۔ اس واقعہ سے میرے دل میں علامہ کی عقیدت و عظمت دوچند ہو گئی۔ اس واقعہ کو انہوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان شاعر ملت میں بھی لکھا ہے جو یکتا امروہوی کی مرتبہ کتاب ”اقبال..... خواتین کی نظروں میں“ شامل ہے خاتون ارشد لکھتی ہیں:

جب جواب شکوہ ابتدأ اخبارات میں شائع ہوا تھا تو اس کا ایک بند یہ تھا:

قیس منت کش تنهائی صحرا نہ رہے
شہر کی کھائے ہوا بادیہ پیلا نہ رہے
یہ تو دیوانہ ہے جنگل میں رہے یا نہ رہے
یہ ضروری ہے جاب رخ لیلی نہ رہے
شوq تحریر مضامیں میں گھلی جاتی ہے
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

می نے اس بند کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحب کو نہایت مود با نہ خط لکھا جناب والا رخ لیلی کا بے جا ب ہونا یقیناً قابل اعتراض ہے لیکن اس کا انشاء پردازی میں حصہ لینا۔ مضمون نگاری کرنا بھی کیا آپ جائز نہیں رکھتے۔ اگر عورت کے تحریر مضامیں کو آپ بے جا بی تصور کرتے ہیں تو عہد رسالت کی ان خواتین کے متعلق آپ کی کیارائے ہے جن سے آئندہ کرام نے حدیبوں کا درس حاصل کیا تھا۔ اور اسلام کی بہتری مقدس مستورات ایسی گزری ہیں کہ جنہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور غلط یا صحیح استدلال پیش کیے تھے۔ میرا خیال یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس پر توجہ بھی نہ کریں گے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی اخلاق آمیز مختصر جواب بھیجا جس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس بند کے آخری شعر کو تبدیل

کر دیا ہے جو ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ تہذیب اور انصاف پسندی کا ثبوت ہے۔
چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب کی نظمیں بانگ درا کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں

۱۔ اقبال نامہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۵۲

۲۔ افسوس کہ ۱۹۷۲ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

تو اس میں یہ آخری شعر نکال کر بجائے اس کے دوسرا شعر درج کر دیا گیا اب مطبوعہ صورت میں کہیں بھی وہ سابقہ شعر:

شوق تحریر مضامین میں گھلی جاتی ہے
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے
موجود نہیں۔

بانگ درا ۲ میں یہ شعر اقبال نے رد و بدل کے بعد اس طرح کر دیا ہے:
گلم جور نہ ہو شکوہ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو ۳
اس ایک واقعہ سے جہاں ایک طرف اقبال کی وسعت نظر کشاوہ قلبی اپنے سے چھوٹوں
کے اعتراضات کے ٹھنڈے دل سے سننے کے بعد خود اصلاحی کی اعلیٰ روایت کا پتہ چلتا
ہے۔ وہاں اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ بھوپال کے اہل قلم اقبال سے قلبی ربط و
تعلق رکھتے تھے اور ان کی شاعری ان کے فلسفہ اور ان کے افکار و خیالات سے بھر پور
استفادہ بھی کرتے تھے۔

مولانا شاہ اسد الرحمن قدسی بھوپالی..... اسی دور کے ایک صوفی پاک باز اور عالم باعمل
ہیں جن سے اقبال کی خط و کتابت رہی۔ قدسی صاحب کی ساری عمر عبادت و ریاضت میں

بسر ہوئی ہے۔ نظم و نثر دونوں پر قوت تامہ آپ کو حاصل ہے۔ آپ کے ارادت مندوں کا وسیع حلقة بھوپال میں آج بھی موجود ہے۔ آزادی کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور ان دونوں بھوپال (ضلع جہلم) میں آپ کا آستانہ فیوض و برکات کا وسیلہ بننا ہوا ہے۔ شاعری کے دو مجموعے ”آیات قدسی“ اور ”نغمات“ کے علاوہ سلوک و طریقت پر آپ کی سات کتابیں الحبیب (۱۹۱۵ء) ”سترویں نامہ“ (۱۹۱۵ء) ”نامہ قدسی“، ”اطمینان قلب“، ”کشکول قلندری“، ”الکلام“ اور ”حفظ البحر“ لاہور لکھنوا و دہلی سے شائع ہو چکی ہیں۔

اس کتاب کی تحریر کے سلسلے میں جب میں نے آپ سے رابطہ قائم کیا تو آپ نے از رہ شفقت اقبال کا ایک مختصر سا کارڈ جو ہجرت کے دوران محفوظ رہ گیا تھا مجھے عطا فرمادیا جس کا عکس پیش خدمت ہے۔

۱۔ اقبال خواتین کی نظر میں صفحہ ۸۰۔ ۸۱

۲۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔

۳۔ بانگ درا۔ صفحہ ۲۲۸۔

اس غیر مطبوعہ تحریر سے جہاں اقبال کے قدسی صاحب سے ربط و تعلق کا علم ہوتا ہے وہیں ان کے صوفیانہ مزاج اور مسلک قلندری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ قدسی صاحب نے اپنی ذاتی یادداشتوں سے اقبال کے متعلق چند نہایت دلچسپ اور اچھوتے واقعات بھی ارسال فرمادیے جن کا اردو دنیا کو شاید ہی علم ہو۔ یہ تمام واقعات آئندہ صفحات میں شامل ہیں۔

قدسی صاحب کے پاس اقبال کے بے شمار خطوط تھے جو ہجرت کے دوران ضائع ہو گئے۔ صرف یہی ایک خط جس کا عکس اوپر پیش کیا گیا ہے..... اتفاق سے محفوظ رہ گیا۔

۱۹۲۰ء کے بعد ۱۹۲۷ء میں اقبال نے میر سید غلام بھیک نیرنگ کے نام اپنے ایک

مکتب میں جو کانفرنس کے لیے چندہ جمع کرنے کے بارے میں انہیں لکھا ہے۔ اس میں بھوپال اور والی بھوپال کا تذکرہ ملتا ہے جس سے ان کے تعلق خاطر کی نشان دہی ہوتی ہے۔
اقتباس ملاحظہ ہو:

” لاہور ۲۲ جنوری ۱۹۲۷ء ”

ڈیر میر صاحب السلام علیکم

..... اگر کچھ کمی چندے میں رہ گئی ہو تو والی بھوپال سے مدد کی

التحا کرنا بہتر ہو گا

محمد اقبال ۲۔۔۔

۱۔ اقبال کو حضرت گل حسن شاہ قلندر سے دلی عقیدت تھی آپ حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے خلیفہ و جانشین اور بڑے عارف کامل بزرگ تھے۔ تذکرہ غوثیہ آپ کی مشہور مقبول تایف ہے۔

۲۔ اقبال نامہ جلد اول و صفحہ ۲۰۹

واقع یہ ہے کہ ہندوستان کے دیگر علمی و ادبی مرکزوں کی طرح ریاست بھوپال بھی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایک وسیع مرکز بن چکی تی۔ یہ اگرچہ حیدر آباد کے بعد دوسری بڑی اسلامی ریاست تھی لیکن ریاست کے حکمرانوں کی علم و دوستی ادب نوازی اور خود حکمرانوں کے علم و ادب سے غیر معمولی شغف اور دلچسپی کے سبب اس کا ادبی مرتبہ کافی بلند اور در قیع تھا۔ اور یہ مرتبہ دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں اس حد تک قابل قدر تھا کہ اقبال تک اسکے حکمران سے مدد کی التحا کرنا مناسب سمجھتے تھے جیسا کہ اقتباس سے ظاہر ہے۔

اقبال اچھی طرح جانتے تھے کہ ریاست بھوپال نے ہمیشہ برصغیر کی مایہ ناز شخصیتوں کی ہر دور میں قدر دانی اور حوصلہ افزائی کو اپنا شعار بنائے رکھا ہے اور وقت پڑنے پر فراخ

حوالہ ملکی سے اہل علم کی مالی اعانت بھی کی۔ چنانچہ بھوپال سے اقبال کی ذہنی وابستگی کے لیے
رشته آگے چل کر قریبی تعلق میں تبدیل ہو گئے اور انہیں نواب حمید اللہ خاں کی ذاتی دوستی
اور قربت کا شرف حاصل ہو گیا۔

اسی سلسلے میں اقبال کے چار مطبوعہ خطوط کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ جو اقبال
نے قاضی تلمذ حسین کے نام تحریر کیے ہیں۔ ان میں سے ایک خط میں واضح طور پر اعلیٰ حضرت
نواب صاحب بھوپال کی اہل علم کی قدر دانی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور ایک خط نے بھوپال
کے قیام کے دوران لکھا ہے۔

یہ چار خطوط جواب تک غیر مطبوعہ تھے ڈاکٹر محمود الہی صدر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی
نے قاضی تلمذ حسین کے ایک عزیز محمد حامد علی سے حاصل کر کے نگار رام پور میں شائع کیے
ہیں۔ قاضی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر محمود الہی نے لکھا ہے:

”حیدر آباد کے دارالترجمہ کو جن اساتذہ علم و فن کی خدمات
حاصل تھیں ان میں قاضی تلمذ حسین کا نام سرفہرست ہے۔ قاضی
صاحب گورکھپور کی خاک سے اٹھے اور پھر وہیں پیوند خاک ہو۔ ان
کی ابتدائی تعلیم مشرقی نجح پر ہوئی لیکن انہوں نے جلد محسوس کر لیا کہ
اس تعلیم سے وہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکے جس میں ملک و قوم کی
فلاح مضمرا ہے۔ اس لیے انہوں نے ایم اے او کالج میں داخلہ لیا
اور وہاں سے ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ قاضی صاحب نہ تو
مغربیت کے دل دادہ تھے اور نہ مشرقیت کے اندر ھے مقلد وہ دونوں
میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اور ان کا کمال یہ ہے
کہ انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے برقرار رکھا بعض امور

میں شبی کے مخالف ہوتے ہوئے قاضی صاحب سیاسی مذہبی اور تعلیمی تحریکات میں شبی کے خوشہ چیز تھے اور غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انہیں ایک ممتاز عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شبی کے خطوط میں قاضی صاحب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں قاضی صاحب کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں..... لسان العصر ریاض رضوان اور مراءۃ المنشوی کا شمار قاضی صاحب کی ادبیات میں ہو گا۔ منشوی مولانا روم پر ہندوستان میں اب تک جتنا کام ہوا ہے ان میں مراءۃ المنشوی کو ہر لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم سے جیسا اور جتنا تعلق ہے اس کا علم اقبالیات کے مطابعہ کرنے والوں کو اچھی طرح ہے۔ مراءۃ المنشوی کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب نے علامہ اقبال سے خط و تکاتب تکی تھی۔ علامہ اقبال نے قاضی صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ قاضی صاحب کے ایک عزیر محمد حامد علی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔

لے نگار۔ رامپور۔ اپریل ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۲۹

اب ان خطوط کا متن ملاحظہ ہو:

(۱)

” لاہور ۳ جنوری ۱۹۳۵ء ”

جناب من تسلیم

آپ کا خط ابھی ملا ہے افسوس کہ میں ابھی تک علیل ہوں گو
پہلے کی نسبت کسی قدر آواز بہتر ہے۔

مجھے پہلے یہ اندیشہ تھا کہ کتاب اکی فروخت میں آپ کو زیادہ

کامیاب نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں فارسی کا مذاق اب بہت کم ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر مذہبی ذوق بھی مفقود ہے۔

بہاول پور کے نوجوان نواب اگرچہ خود فارسی تصانیف کا ذوق شاید نہیں رکھتا ہم قدر داں ضرور ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں ایک کتاب عمدہ جلد کرا کر بطور ہدیہ ارسال کریں۔ میں بھی کوشش کروں گا کہ ان کی توجہ آپ کی کتاب کی طرف مبذول ہو۔ افسوس کہ ان کے گرد و پیش اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن ممکن ہے کہ عنقریب کوئی خوش گوار تبدیلی ان کے مصاہبین میں ہو جائے اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہتر نتیجہ ہو۔

اس کے علاوہ آپ سر راس مسعود صاحب کو بھوپال لکھیں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال بھی اہل علم کے قدر داں ہیں۔ ان کی خدمت میں کتاب عمدہ جلد کروا کر بخیچے۔ سید راس مسعود صاحب اور شعیب صاحب قریشی منشی بھوپال کی خدمت میں بھی ایک ایک نسخہ ارسال کیجیے۔

والسلام..... محمد اقبال لا ہو ۲۲

(۲)

”جناب من..... السلام علیکم“

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ اپنی کتاب نواب صاحب کی

خدمت میں ارسال نہ کیجیے آتھ دس روز تک حج بیت اللہ کو جانے والے ہیں۔ ان کی واپسی تک انتظار کیجیے جو جلد ہوگی۔ یورپ جانے کا قصد نہیں ہے۔

محمد اقبال..... لاہور

۱۷ جنوری ۱۹۳۵ء ۳“

(۳)

”بھوپال..... مارچ ۱۹۳۶ء“

جناب قاضی صاحب..... السلام علیکم

میں ابھی تک علیل ہوں اور یہاں بھوپال میں برقی علاج کے لیے مقیم ہوں۔ اس وقت بہاول پور کی ریاست ہندو مسلم مناقشات میں ابھی ہوئی ہے۔

۱ مراد ہے مراد امثوی۔ (ڈاکٹر محمود الہی)

۲ نگار۔ رامپور۔ اپریل ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۲۹-۳۰

موقع موزوں نہیں تاہم اگر مراد امثوی وہاں بھیجا چاہیں تو عرض یادداشتہ کرنے مقبول حسن قریشی ہوم ممبر ریاست کے نام پھیجے میں نے ان کے نام ایک خط لکھا دیا ہے جو اسی لفافے میں بند ہے۔ خط بھی عرض داشت کے ہمراہ پھیجے۔

والسلام
محمد اقبال اے۔

(۲)

ذیل کا خط اگرچہ اس کتاب سے متعلق نہیں لیکن ایک غیر مطبوعہ خط کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز اس کے مطالعہ سے اقبال کی عام صحت اور مولانا رومیؒ سے متعلق ایک غلط اطلاع کی تردید کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی شمولیت ضروری سمجھی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

”جناب من“

آپ کا لفافہ بھی ملا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔
میری صحت عامہ تو اچھی ہے مگر آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی
ہے۔ میں نے کوئی مقالہ حضرت رومیؒ پر نہیں لکھا۔ آپ کوئی نے غلط
اطلاع دی ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۲۷ جولائی ۱۹۳۶ء

۱۔ مہنماہہ نگار۔ رام پور۔ اپریل ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۳۰



اقبال اور نواب حمید اللہ خاں

نواب سلطان جہاں بیگم ریاست بھوپال کی چوتھی اور آخری خاتون حکمران تھیں۔ ان کے تین صاحبزادے تھے نواب نصر اللہ خاں ولی عہد ریاست نواب کرمل حافظ عبد اللہ خاں اور نواب حمید اللہ خاں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے وہم و گماں میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دو بیٹوں کی موجودگی میں نواب حمید اللہ خاں ریاست کے حکمراں ہو سکیں گے چنانچہ انہوں نے نواب حمید اللہ خاں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ منذول فرمائی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا جہاں سے انہوں نے بی اے پاس کر لیا اور قانون میں داخلہ لیا۔ لیکن بوجوہ تکمیل نہ کر سکے۔ بھوپال والپ آنے کے بعد ان کی والدہ نے یہ کوشش کی کہ وہ ایک اچھے سیاسی لیڈر مبارکہ اور با اثر شخصیت کی حیثیت سے ہندوستان میں اپنی جگہ بنا لیں گے۔ چنانچہ بھوپال آنے والی سیاسی شخصیتوں سے انہیں متعارف کرایا گیا۔ علمی مجالس کی صدارت انہیں سونپی گئی اور ان گنت تقریبات میں انہیں صدارتی خطبات پڑھنے کیلئے مدعو کیا گیا۔ غالباً ۱۹۲۳ء میں جب رابندر ناتھ ٹیکور بھوپال آئے اور میوزیم ہال میں تقریبات میں انہیں صدارتی خطبات پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ غالباً ۱۹۲۳ء میں جب رابندر ناتھ ٹیکور بھوپال آئے اور میوزیم ہال میں ایک تقریری کی تو اس جلسے کے صدر بھی نواب حمید اللہ خاں تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب خواجہ کمال الدین جولندن میں تبلیغ کا کام کرتے تھے بھوپال آئے اور جلسہ عام سے خطاب کیا تو اس کی صدارت بھی نواب حمید اللہ خاں نے فرمائی۔

.....جس زمانہ میں ان کی والدہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی چانسلر تھیں۔ انہوں نے یونیورسٹی کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم بھی شروع کی، متعدد شہروں کا دورہ کیا اور مختلف رئیسین سے ملاقات کی جن میں نظام حیدر آبد بھی شامل تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تحقیقات کے سلسلے میں جو کمیٹی بنی تھی۔ اس میں بھی حمید اللہ خاں شامل تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھوپال آ کر شاہی مہماں ہوئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ مولانا محمد علی جو ہر مولانا شوکت علی مولانا حسرت موبانی، سر آغا خاں، مسز سرو جنی نائید و اور دیگر سیاسی لیڈروں کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہا تھا جن سے نواب حمید اللہ خاں نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ذاتی روابط بھی پیدا کر لیے۔ علماء و فضلا میں علامہ شبلی، مولوی عبدالحق خواجہ حسن نظامی علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری..... اور عطیہ فیضی کا بھی بھوپال سے ربط و تعلق تھا حمید اللہ خاں کو ان تمام شخصیتوں سے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کے خصوصی موقع حاصل تھے۔

۱۔ نواب حمید اللہ خاں کے لیکچر اور خطبات صدارت کتابی صورت میں بھوپال کے سرکاری مطبع نے شائع کیے تھے جو اب نایاب ہیں۔

اس کے علاوہ حمید اللہ خاں بہت اچھے سپورٹس میں بھی تھے۔ یوں تو انہیں ہاکی، کرکٹ اور ٹینس سے بھی دلچسپی تھی لیکن وہ پولو کے بہترین کھلاڑی تھے۔ جب ڈیوک آف ونڈسٹرن پرس آف ولیز کی حیثیت سے برطانوی ہند کا دورہ کیا تو بھوپال میں حمید اللہ خاں سے پولو کا مقیم کھیلا۔ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی سید وزیر علی کافی عرصہ بھوپال کی فوج سے وابستہ رہے۔ سابق نواب پٹودی ابھی برابر بھوپال آتے رہتے تھے۔ غرض کہ حمید اللہ خاں سیاسی اور ادبی میدانوں اور کھلاڑیوں کے حلقوں میں یکساں مقبول ہو چکے تھے اور جب یکے بعد دیگرے ان کے دونوں بڑے بھائیوں کا انتقال ہو گیا تو نواب سلطان جہاں بیگم ۱۹۲۶ء

میں اپنے لائق فرزند نواب حمید اللہ خاں کے حق میں دست بردار ہو گئیں اور زمام حکومت ان کے سپرد کر دی۔ نواب سلطان جہاں بیگم دستبرداری کے بعد تصنیف و تالیف اور یادابی میں مصروف ہو گئیں اور بالآخر ۱۹۳۰ء میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

نواب محمد حمید اللہ خاں عنان حکومت سنبھالتے ہی برصغیر کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی سے حصہ لینے لگے۔ پہلے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چانسلر اور دو مرتبہ ایوان روسائے ہند کے چانسلر منتخب ہوئے پہلی اور دوسری گول میز کانفرنسوں میں شرکت کی۔ اب ان کے تعلقات کچھ اور وسیع ہو گئے تھے قائدِ اعظم گاندھی جی چوہدری خلیق الزماں، مولانا حضرت موبہانی، سرفیروز خاں نون۔ اور دوسرے اکابر بھوپال آکر ان سے ملاقات کرتے تھے کانگرس اور خلافت تحریک کے کئی ممتاز حضرات نواب صاحب کے ایما پر ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ مولانا محمد علی کے داماد شعیب قریشی نواب حمید اللہ خاں کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ شعیب قریشی نے ابتداء میں گاندھی جی کے رفیق اور بینگ انڈیا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ کچھ عرصہ پہنچت نہرو کے ساتھ اٹلیں نیشنل کانگرس کے سیکرٹری رہے۔ بعد میں تحریک خلافت سے وابستہ ہو گئے اور خلافت کے طبعی و فد میں شامل ہو کر ترکی کا دورہ کیا۔ آپ کے علاوہ مشہور سیاسی رہنمای ڈاکٹر نصاری جو نواب صاحب کے طبعی مشیروں میں اور اکثر ویژٹر بھوپال آتے تھے) کے استٹنٹ ڈاکٹر سید عبدالرحمن اور حسن محمد حیات بھی بھوپال آگئے۔ اور ریاست بھوپال کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر سید عبدالرحمن جو عام طور پر ڈاکٹر رحمٰن کے نام سے مشہور ہوئے بعد میں علامہ اقبال کے نگراں معالج مقرر ہوئے۔ جس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے نواب حمید اللہ خاں نہایت روشن خیال عالی دماغ بالغ نظر

اور صاحب بصیرت حکمراں تھے انہوں نے اپنے اسلاف کی اعلیٰ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انہیں آگے بھی بڑھایا۔ انہوں نے ریاست کی علمی تعلیمی تہذیبی اور ثقافتی ترقی کے لیے بہت کچھ کیا۔ بلاشبہ ان کا دور حکومت ریاست بھوپال کے آخری فرمانروائی کی حیثیت سے ایک یادگار دور ہے جو ۱۹۲۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۶ء میں ختم ہو گیا جب بر صغیر کی تقسیم یکے بعد ریاست بھوپال کا وجود ختم ہوا اور اسے ہند پوتین میں ضم ہونا پڑا۔ لیکن ۲۲ سال کا یہ زمانہ اہم سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ادبی اور فکری انقلابات کا زمانہ ہے۔ جس کے چند عوامل کو مستقبل کا مورخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا مثلاً بر صغیر میں برطانوی اقتدار کے خلاف آزادی کی کشمکش کا گرس اور مسلم لیگ کی عوامی حیثیت اور سیاسی سرگرمیاں تحریک کی تحریک کا آغاز، ادب اور شاعری میں انقلابی روحانات اور ان کے اثرات، مسلمانوں کی تعلیم نو کے لیے اقبال کے مفکرانہ رہنمائی اور نواب حمید اللہ خاں کی مسلم معاشرہ میں عزت و تکریم اور ان کی رہنمائی میں اسلام کی نشأۃ الثانیہ کی جدوجہد بر صغیر کے سماجی اور اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے میں نمایاں تبدیلی وغیرہ۔

۱۔ کچھ عرصہ بعد آپ نواب حمید اللہ خاں کے داماد بھی بن گئے۔

اقبال بھی نواب حمید اللہ خاں کے مداحوں میں شامل تھے۔ اور انہیں یہ علم تھا کہ نواب صاحب اپنی گوناگوں خصوصیات اور صفات کی بنابرہیات اعلیٰ مقام پر فائز ہیں اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں اقبال اگرچہ خود عملی سیاست میں نمایاں حصہ نہیں لے رہے تھے لیکن حقیقتاً ان کی تمام تر مسامعی مسلمانوں کی تنظیم اور اتحاد ملت کے لیے وقت تھیں اور وہ بساط بھرا پنا فریضہ انجام دے رہے تھے۔

نواب حمید اللہ خاں سے اقبال کے ذاتی روابط کا اغاز کب ہوا۔ اس کا ۱۹۳۱ء سے پہلے ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ ان کے بارے میں خطوط اور آڑاء ضرور ملتی ہیں۔ جن سے یہ

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ والی ریاست کے فکر و تدبیر کے مترف اور دیگر والیان ریاست کے مقابلہ میں نواب حمید اللہ خاں کے سیاسی بصیرت، بالغ نظری اور سوچ بوجھ کے قائل تھے۔ چنانچہ نواب صاحب سے اقبال کی پہلی ملاقات کا دستاویزی ثبوت بھی ہمیں اقبال ہی کے ایک خط سے ہی ملتا ہے جو ۱۹۳۱ء میں انہوں نے نذر ی نیازی کو لکھا۔ لیکن یہ سمجھنا کہ ۱۹۳۱ء میں ہی اقبال کا نواب صحب سے پہلی بار ربط و تعلق قائم ہوا درست نہیں ہے کیونکہ ۱۹۳۱ء کی مشاورتی ملاقات تو دراصل گول میز کانفرنس کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جس کے پس منظر میں تحریک آزادی بھی تھی..... کانگرس کی مستحکم تنظیم بھی اس مسلمانوں کی شیرازہ بندی بھی مسلمانوں کے فکری اتحاد کے سلسلے میں اقبال کے واضح نظریات خطبه اللہ آباد اور نواب بھوپال کی سیاسی بصیرت وہ عوامل تھے جنہوں نے اس عہد کی ان دو عظیم شخصیتوں کو ذہنی اور سکری طور پر ایک دوسرے سے قریب اور وابستہ کر دیا تھا..... اور یہ قربت و وابستگی یقیناً ۱۹۳۱ء سے بہت پہلے کی ہے جس کے نتیجہ میں اقبال نے پہلی بار بھوپال جا کر نواب صاحب سے بالمشافہ ملاقات اور مشاورت کو ضروری سمجھا۔

اقبال نے نذر ی نیازی کو جو خط لکھا ہے اس کا اقتباس اور پس منظر اس استدلال کو مزید تقویت دیتا ہے..... لکھتے ہیں:

” لا ہو ر..... مئی ۱۹۳۱ء ”

ڈیر ی نیازی صاحب..... السلام علیکم

میں آپ کو خط لکھنے ہی والا تھا کہ آپ کا خط پہنچا۔ آپ کے بھائی کی علاالت کا افسوس ہے۔ خدا تعالیٰ اسے صحت مرحمت فرمائے کتاب اے کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے درست ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں غالباً میں نے بھی آپ کو اس سے پہلی یہی لکھا

تھا کہ کتابت، طبات، کاغذ کمیشن وغیرہ منہا کر کے باقی روپیہ ادا کر دیا جائے۔ البتہ یہ ضروری ہے..... (۱) اگر پہلے سے یہ بتا دیا جائے کہ خرچ کل کس قدر ہو گا (۲) کیا میں نے جو کمیشن لکھی تھی وہ انہیں منظور ہے (۳) کتاب کے تیار ہونے پر روپیہ پیشگی ادا کرنا ہو گا ان تمام امور سے آگاہی کی جائے۔ نیز یہ بھی لکھیں کہ جامعہ کی طرف سے یہ معاهدہ کون کرے گا۔ تاکہ یہ تمام خط ۲ انہیں صاحب سے ہو۔

۱۔ اقبال کے خطبات کا ترجمہ جامعہ ملیہ شائع کرنا چاہتی تھی۔ یہ استصواب اسی سلسلے میں کیا گیا ہے۔

۲۔ ”کتابت“ کا فقط سہوا رہ گیا ہے۔ (نذر نیازی)

میں پرسوں بھوپال جا رہا ہوں۔ دو چار روز وہاں قیام ہرے گا۔ اگر قومی سرمایہ مسلمان جمع کر سکیں تو میرا یہ اندازہ ہے کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت زیادہ مادہ قربانی اور اپنے حقوق کے لیے ابھی ٹیکش کرنے کی بہت وجرات موجود ہے..... والسلام

محمد اقبال..... لا ہورا۔

اس خط کا پس منظر بیان کرتے ہوئے نذر نیازی لکھتے ہیں:

”..... حضرت علامہ بھوپال جا رہے تھے۔ اور تقریب وہی سیاسی گفت و شنید..... مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ واقعی ایسا تھا کہ انہیں اپنے حقوق یا دوسرے لفظوں میں ملی تحفظ کے لیے مل کر آواز اٹھانی اور قلمے درمے، سخن کسی قربانی سے دربغ نہیں کرنا چاہیے تھے۔

حضرت علامہ کی اس رائے سے بھی شاید کسی کو اختلاف نہیں ہو گا کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت قربانی کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس خوبی سے فائدہ کس نے اٹھایا ہے؟۔

چنانچہ پروگرام کے مطابق اقبال مولانا غلام رسول کی معیت میں ۹ مئی کو لاہور سے روانہ کرنا کو بھوپال پہنچ۔ جہاں نواب صاحب کے ندیم خاص اے ڈی سی اقبال حسین خاں بی اے ایل بی اعلیٰ ریاستی افسران عمامہ دشہر اور شعیب قریشی مشیرالمہام رو بگاری خاص نے ان کا استقبال کیا اور انہیں سرکاری قیام گاہ گیٹ ہاؤس قصر راحت منزل ۲ میں ٹھہرایا۔

اقبال کے پہلی بار بھوپال جانے نواب صاحب سے ملاقات کرنے اور جن امور پر دونوں کے درمیان تبادلہ خیالات ہوا ان کے بارے میں کسی کو آج تک علم نہیں تھا۔ لیکن عجب اتفاق ہے کہ تلاش و تجسس کے بعد اس ملاقات کے تفصیلات مجھے قدسی صاحب کی معرفت اقبال کی پیشوائی کرنے والے اس کے ہم نام اقبال حسین خاں ندیم خاص سے دستیاب ہو گئیں جن کا مطالعہ اقبال کے سلسلے میں اہم انکشافات کی حیثیت رکھتا ہے۔
تفصیلی حالات اقبال حسین خاں کی زبانی سنئے:

بھوپال میں پہلی مرتبہ اقبال کے آنے کا سبب

انگلستان اور ہندوستان کے مدرب جب لندن میں گول میز کافنس ک آس پاس بیٹھ کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تو ہندوستان کے لیدروں میں آپس میں بڑگھر کے ساتھ اسی بات پر تبادلہ خیال کا آغاز ہوا کہ ہندوستان کیکیا کیا معاملات کس انداز میں اس میز پر کرھے جائیں اور یہ کہ اس کوشش میں ہندوستان کو کس بڑی حد تک

آزادی کی راہ پر آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ ملک کے جو رہنماءں غور و خوص میں منہمک تھے ہر لیٹ ہائنس نواب حمید اللہ خاں فرمازواۓ بھوپال بھی ان سے علیحدہ نہ تھے۔ نواب صاحب تدبر کے ایسے عالی مقام پر فائز تھے جس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کے سوانح حیات کا بغور مطالعہ کیا جائے۔

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۶۷-۶۸

۲۔ قصر راحت منزل جو کافوٹو شامل کتاب ہے بیرونی مہمانوں کے قیام کے لیے مخصوص تھی اور بطور گیست ہاؤس عرصہ تک استعمال ہوتی رہی۔ اب اس عمارت کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

کیونکہ نواب صاحب اس زمانہ میں چیمبر آف پرسنزر کے چالسر تھے۔ اس لیے ان کا دامن ہندوستان کے سیاسی حالات سے ایسا ہی وابستہ تھا جیسا کہ کے دوسرے لیڈروں کا

ہندوستان کا نقطہ نظر راؤ نڈیبل کانفرنس میں پیش کرنے کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کے لیے ملک کے بڑے بڑے رہنماء مسٹر جناح قائد اعظم گاندھی جی مسز سرو جنی نائید و ڈاکٹر انصاری وغیرہ سب ہی بھوپال آئے علامہ اقبال بھی اسی سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں دو مرتبہ بھوپال آئے۔

علامہ اقبال سے میری ملاقات

اس وقت ہر ہائنس کے پرنسپل سٹاف میں سے ایک اے ڈی سی یا ایک ندیم خاص باری باری سے ایک ایک دن اے ڈی سی ان وینگ کی ڈیوٹی انجام دیتا تھا اور ایک اے ڈی سی یا ندیم خاص گیٹ ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ یہ حسن اتفاق ہی تھا کہ دونوں موقوں پر میں ہی گیست

ڈیوٹی کے لیے نامزد کیا گیا اور اس طرح مجھے علامہ کے قریب ہونے کا افتخار حاصل ہوا۔ پہلی مرتبہ علامہ اقبال دو دن بھوپال ٹھہرے جب گاڑی ریلوے سٹیشن پر اتری تو صبح کا وقت تھا میں پیشوائی کے لیے پہلے سے سٹیشن پر موجود تھا۔ مہر صاحب بھی علامہ کے ساتھ تھے۔ جب علامہ ریل سے اترے میں نے سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا نام اور عہدہ بتایا۔ علامہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا خوب اور کچھ اپنا نیت کی نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے مصافحہ میں بھی یہی اپنا نیت محسوس کی۔ میں کیا بتاؤں میرے دل کو کس قدر مسرت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد علامہ مہر صاحب اور میں سرکاری کار میں قصر راحت منزلِ احمد آباد کیلئے روانہ ہو گئے۔

علامہ اقبال سے میری گفتگو اور شعروشاعری کا تذکرہ

جب ہم لوگ کار میں اسٹیشن سے احمد آباد روانہ ہوئے تو راستہ میں علامہ اقبال بھوپال کے بابت مختلف باتیں دریافت کرتے رہے۔ اور اسی دوران میں یہ بھی فرمایا کہ بھتی ہمارے خیال سے تو کشمیر نواب صاحب بھوپال کو دے دی جائے اور بھوپال کے مہاراجہ کو کشمیر کوہاں مسلمانوں کی کثرت ہے اور یہاں ہندوؤں کی کثرت۔ اس سے انداز ہوتا ہے کہ اس وقت بھی اقبال کے پیش نظر کیا کیا مصالح تھے اور وہ دو قومی نظریہ سے متعلق اپنے ذہن میں ہندوستان کا کیا نقشہ بنارہے تھے۔

قصر راحت پہنچ کر مہمانوں نے تھوڑی دیر اپنے اپنے کروں میں آرام کیا پھر ٹھیک ۸ بجے ناشتہ کی میز پر آ گئے اس وقت ہم تینوں ہی تھے ناشتہ شروع ہوا لیکن اس دوران علامہ جس شفقت سے مجھ سے گفتگو فرمائے تھے اس سے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کیا مجھے عرصہ سے علامہ کی خدمت میں شرف نیاز حاصل ہے۔ اس کی ایک وجہ ان کا اور میرا تم نام ہونا تھا

۱۔ اس قیام کی تصدیق علامہ اقبال کے ایک مکتوب بنا مولوی صالح محمد سے بھی ہوتی ہے۔ ۹ مئی ۱۹۳۱ء کو جب آپ بھوپال پہنچا اور ۱۹۳۱ء کو لاہور پہنچ کر یہ خط لکھا۔

”میں ابھی ابھی صحیح بھوپال سے واپس آیا اور آپ کا خط ملا۔ ریاست بھوپال میں بھی نواب صاحب کی دعوت پر میں اسی مطلب کے واسطے گیا تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اختلافات رفع کرنے کی کوشش کر کے ان کو ایک مرکز پر متعدد کیا جائے معاملہ امید افزائے مگر افسوس ہے کہ چونکہ ہر روز قریبًاً دو بجے رات تک کام کرنا اور جانپڑا میں وہیں بیمار ہو گیا۔ آج صحیح واپس آیا ہوں،“ (اقبال نامہ جلد دوم صفحہ ۳۳۸-۳۸۹)

جبیسا کہ میں نے شروع میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ اور دوسری وجہ علامہ کی وسعت قلب اور اخلاق کریمانہ مجھے اس بات پر اتنا اعتماد ہے کہ بلا خوف و تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ سے ہر ملنے والا یہی خیال لے کر اٹھتا ہو گا کہ اقبال میرے خاص کرم فرمائیں۔ اس کا راز وہی جذبہ اخوت ہے جس میں اقبال چور ہو رہے تھے اور جوان کے کلام کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتا ہے۔

باتیں کرتے کرتے علامہ نے مجھ سے پوچھا کچھ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے میں نے کہا کہ اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ کبھی کبھی تک بندی کر لیتا ہوں۔ شاعر نہیں ہوں، اور نہ کوئی میرا استاد۔ فرمایا استاد تو ہمارا بھی کوئی نہیں..... نالہ پابند نہ نہیں ہے سناؤ..... میں نے چھوٹی سی بھر کی ایک غزل پیش کی جو حسب ذیل ہے:

دل بنا دل کا ایک راز بنا
سامنے اک رہ نیاز بنا
اک تجلی سے کر ہی دے مدھوں
مجھ کو اک منکر نماز بنا

تیرے وعدے پہ اضطراب مرا
 نغمہ خامشی کا ساز بنا
 سر قلم کر کے زیر پا رکھ دے
 کر کے سجدہ سر نیاز بنا
 چشم دل سے نہ چھپ سکے گا کوئی
 بس حقیقت کا اک مجاز بنا
 خون دل چشم تر سے بہہ نکلا
 کیوں نہ طور ادائے ناز بنا
 کر کے اقبال سمت منزل گم
 عشق کی راہ کچھ دراز بنا

اس دوران میں علامہ کبھی خوب خوب داد فرمادیتے جس سے میرا دل بڑھتا رہا اور
 پڑھنے کا انداز بھی بدلتا رہا۔ آخر میں ارشاد ہوا کہ وہ بھائی کچھ اور سناؤ میں نے ایک غزل اور
 پیش کی جس کو میں تقریباً بھول چکا ہوں صرف تین شعر یاد ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

کوئی تمہا بھری نظر سے چھپے بھلا کیوں نقاب کیسا؟
 ضیاء الفت اگر سلامت حجاب کیسا حجاب کیسا؟
 نکل گئیں کیوں یہ بہکی باتیں، قدم مرے کیسے لڑکھڑائے؟
 نہیں کوچہ سے کس کے آئی، بہک رہا ہے گلاب کیسا؟
 کسی کی مست انکھریوں میں واعظ جھلک تلطف کی میں نے پائی
 تجھے مبارک تیری نصیحت میری خطا کا حساب کیسا؟

اس دوران اقبال میری طرف زیادہ متوجہ رہے اور آخری شعر کے پہلے مصرع کے

بعد جب میں نے دوسرے مصروع کے دولفظ تجھے مبارک کہے تو علامہ نے بڑی زور سے آہاہا کہا اور باقی الفاظ میرے کہنے سے پہلے خود ہی ادا فرمادیے۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے اور تھوڑی دریتک ان پر ایک کیفیت سی طاری رہی پھر فرمایا کہ آپ نے اپنی غزل کے مطلع کے دونوں مروں میں ایک ہی بات ادا کی ہے غزل کا مطلع لکھیے۔ میں قلم نکال کر لکھنے پر تیار ہوا توارشاد ہوا:

نگاہ ہے پرده سوز میری نقاب کیسا حجاب کیسا?
تمہاری ان پرده بندیوں کا ملا ہے تم کو جواب کیسا
میں خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ اور کھڑے ہو کر ادب سے عرض کیا۔
علامہ جھے آپ کی خدمت میں اب شرف شاگردی حاصل ہو گیا ہے۔ علامہ نے مجھے
بڑے پیار کی نظروں سے دیکھا اور مسکرا دیے اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ علامہ کی
شفقت مجھ پر اور بڑھ گئی۔

نواب حمید اللہ خاں سے علامہ کی ملاقات

اور نواب صاحب کے متعلق علامہ کے تاثرات

اسی دن گیارہ بجے نواب حمید اللہ خاں سے علامہ کی ملاقات کا پروگرام تھا علامہ کو قصر راحت منزل سے قصر سلطانی لے گیا۔ نواب صاحب کو اطلاع پیشتر کی گئی اور علامہ آڈینس ہال میں نواب صحاب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ میں اے ڈی سی روم میں علامہ کی واپسی کا منتظر ہا۔ ایک گھنٹہ یہ ملاقات جاری رہی۔ جب علامہ واپس آئے تو چہرہ سے تھکاوت کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ کچھ مسرو بھی تھے۔ ارشاد فرمایا میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان کا ایک والی ریاست ایسا عالی دماغ بھی ہو سکتا ہے نواب

صاحب قوم و ملک کی ایک قابل فخر ہستی ہیں۔

دوسری مرتبہ اقبال کی بھوپال آمد

اقبال دوسری مرتبہ بھی اسی سلسلے میں بھوپال تشریف لائے۔ صبح ہی کا وقت تھا اور قاس وقت بھی مہر صاحب علامہ کے ساتھ تھے۔ اٹیشن پر میں استقبال کے لیے موجود تھا۔ میرے سلام کا جواب دے کر علامہ نے بڑی شفقت سے مصافحہ کیا اور ذرا دیر تک میرے ہاتھ کو دبائے رہے اسی دن نواب صاحب سے ملاقات ہوئی اور دوسرے دن علامہ واپس تشریف لے گئے۔

علامہ کی فقیر دوستی اور قلندری جذبہ

دوسری مرتبہ بھوپال آنے پر جب واپسی ہو رہی تھی اس وقت علامہ نے مجھ سے فرمایا آپ نے یہاں کے کسی بزرگ کا ذکر رہی نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کو درویشوں سے بھی لگاؤ ہے۔ فرمایا کہ واہ بھتی قلندر کے پاس اس کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے اصل چیز تو یہی ہے اور باقی مصروفیات تو زندگی کے لوازم ہون کی وجہ سے دامن سے بندھی ہوئی ہیں۔ میں نے حضور عالیٰ کا ذکر کیا تو اقبال کچھ چونک پڑے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حضور کو پہلے ہی جانتے ہوں۔ کہا افسوس آپ نے ایسے وقت تذکرہ کیا کہ اسی وقت حاضری نہیں دے سکتا اگر زندگی ہے تو کسی وقت ضرور شرف نیاز حاصل کروں گا۔ اس کے بعد ہم لوگ اٹیشن کے واسطے روانہ ہو گئے اور میں نے علامہ کو ریل پر سوار کر دیا۔ چلتے چلتے پھر علامہ مجھ پر ایک شفقت بھری نظر ڈال گئے۔

علامہ اقبال اسی سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں دو مرتبہ بھوپال آئے۔

مزید تحقیق کی راہیں کھول گیں..... دوسری مرتبہ بھوپال جانے کا ثبوت اقبال کے کسی

خط میں مجھے نہیں مل سکا۔ چنانچہ میں نے مولانا غلام رسول مہر کولا ہو رخ ط لکھا کہ متی ۱۹۳۱ء میں اور پھر شاید ستمبر ۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال دوسری بار بھوپال تشریف لے گئے تھے اور سرکاری قیام گاہ راحت منزل میں قیام کیا تھا۔

۱۔ قدسی صاحب قبلہ کی جانب اشارا ہے جن کے حلقوہ ارادت میں اقبال حسین خان بھی شامل ہیں۔

آپ ان کے ساتھ تھے جس کا تذکرہ نواب صاحب کے ندیم خاص اقبال حسین خان نے اپنے تحریری بیان میں کیا ہے۔ مجھی ۱۹۳۱ کا تذکرہ تو مکتوبات اقبال مرتبہ نذرینیازی میں صفحہ ۲۸ پر موجود ہے۔ دوسری بار بھوپال جانے کا واضح تذکرہ کہیں نہیں۔ البتہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں وہ دہلی گئے ہیں اور فرنٹیئر میل سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ امکان یہی ہے کہ وہ اسی سفر کے دوران بھوپال میں ٹھہرے ہوں گے جس کی تصدیق آپ کے گرامی نامہ سے ہی ہو سکے گی۔

چنانچہ مولانا غلام رسول مہر نے اپنے خط مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۷ء میں وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

”حضرت علامہ مرحوم ممی میں یقیناً بھوپال گئے تھے یہ بھی صحیح ہے کہ میں ساتھ تھا۔ اس زمانے میں زیادہ تر دوستکے پیش نظر تھے۔ اول مسلمانان ہند کے مطالبات۔ دوم مسلمانان کشمیر کے متعلق بہتر سیاسی و ملکی حقوق کا انتظام۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم اور مہاراجہ ہری سنگھ والی کشمیر کے درمیان گھرے دوستانہ روابط تھے غالباً مہاراجہ نے نواب صاحب سے کہا تھا کہ کوئی صورت تصفیے کی پیدا کر دیجیے۔ انہی معاملات پر گفتو ہوتی رہتی۔“

جس حد تک مجھے یاد ہے دوسری مرتبہ علامہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں
بھوپال نہیں گئے تھے..... بلکہ گول میز کا نفرنس میں شرکت کے لیے
روانہ ہوئے تھے۔ میں ان کے ساتھ ولایت نہیں گیا تھا۔ کیونکہ وہ
گول میز کا نفرنس کے رکن کی حیثیت سے یہی مناسب سمجھتے تھے کہ
حکومت کے انتظامات سفر قبول فرمائیں۔ چنانچہ وہ پی اینڈ و کمپنی کے
جہاز میں جا رہے تھے، میں زیادہ تر آزاد فضائیں جانے کا خواہاں تھا۔
وہ مجھ سے کم و بیش ایک ہفتہ پیشتر چلے گئے تھے۔ میں بعد میں بھی
پہنچا تھا اور اطالوی جہاز جنیوا میں گیا تھا۔

میں نیپلز میں جہاز سے اتر اور پھر روم اور میلان ٹھہرتا ہوا پیرس
جا پہنچا جہاں پر چند روز گزارے پھر لندن گیا البتہ وہاں حضرت
علامہ کے ساتھ رہا۔ لندن ہی میں حضرت اقبال کو اٹلی سے دعوت
نامہ مل گیا۔ اروہ اس شرط پر دعوت قبول کر چکے تھے کہ میں بھی ان کے
ساتھ جاؤں گا۔ مجھے منظوری کے بعد انہوں نے اطلاع دی اس وجہ
سے ہسپانیہ دیکھنے کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ علاوه بریں مؤتمر عالم
اسلامی کی طرف سے ہم دونوں کو دعوت نامہ مل گیا تھا اور اس سلسلے
میں یروشلم جانا لازم تھا۔ بہرحال واپسی میں حضرت علامہ اقبال کے
ساتھ رہا۔ چھ سات روز روم میں ٹھہرے پھر نیپلز ہوتے ہوئے
برندسی سے اطالوی جہاز پر اسکندر یہ پہنچے۔ وہاں سے قاہرہ گئے آٹھ
روز تک وہاں گزارے پھر ٹرین کے ذریعہ یروشلم گئے۔ وہاں بھی
مؤتمر کے اختتام تک ٹھہرے بعد ازاں پورٹ سعید سے اطالوی جہاز

پرسوار ہو کر بمبئی آگئے۔

ستمبر ۱۹۳۱ء میں بمبئی کا سفر یورپ کے لیے تھا۔ کشمیر کے سلسلے میں نواب صاحب مرحوم کی طرف سے ایک دعوت سفر یورپ سے واپسی کے بعد بھی آئی تھی۔ جب نواب صاحب ولی میں تھے۔ حضرت علامہ تیار تھے مگر عزیزی جاوید کی علالت کے باعث جانہ سکے اور میں تنہا ولی گیا۔

اس وضاحت کے بعد میں نے اقبال حسین خاں سے ربط و تعلق قائم کرنے کی سعی و جہد کی لیکن نان کی شدید علالت کے باعث مجھے اقبال کو دوسری بار بھوپال جانے کی صحیح تاریخ کی تصدیق نہ ہو سکی چنانچہ میں نے پھر مولانا غلام رسول مہر سے رجوع کیا اور انہیں تفصیلی واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ ۱۹۳۱ء کے بعد یا اس سے پہلے اقبال کے بھوپال جانے سے پہلے کچھ اس بارے میں روشنی ڈال سکیں تو شاید یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

میرے دوسرے عریضہ کے جواب میں مولانا مہر نے از رہ شفقت جو وضاحت کی ہے اس سے کسی حد تک اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کی میں ۱۹۳۱ء سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ خط کا اقتباس یہ ہے:

”..... یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب حمید اللہ خاں مرحوم نے بعض مسلم اکابر کو بھوپال بلا یا تھا اور مقصود یہی تھا کہ سیاسی امور کے متعلق ان کے درمیان نیز کا نگرنس و لیگ کے درمیان مفاہمت کرا دیں۔ یہاں سے سر شفیع مرحوم یقیناً گئے تھے خیال ہوتا ہے کہ شاید علامہ مرحوم بھی گئے ہوں۔ لیکن یہ اس سفر سے پیشتر کا واقعہ ہونا چاہیے جس

کا مجھے ہم کابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ تو کوئی ایسا
آدمی ذہن میں نہیں آتا جوان حالات سے واقف ہوا اور حافظت کے
مدھم سے نقوش میں تازگی پیدا کر سکے۔

میں جس سفر میں علامہ کے ساتھ تھا اس میں دو ہی مسئلے تھے۔

اول مسلمانوں کے مطالبات کا مسئلہ دوم مسلمانان کشمیر کا مسئلہ۔

نواب حمید اللہ خاں مرحوم کے ذاتی روابط کا نگریسیوں سے بھی بہت
گہرے تھے۔ اور ان کی خواہش تھی کہ کانگرس اور لیگ یا اس زمانے
میں مسلم کانفرنس کے درمیان مفاہمت کرادیں۔

کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی نواب صاحب مرحوم کو
مصالحت و مفاہمت کے لیے کہہ رکھا تھا۔ اس بارے میں بھی گفتگو
ہوئی تھی۔ پھر یہ گفتگو دہلی میں ملاقات پر موقوف رکھی گئی تھی۔ نواب
صاحب دہلی آئے تو اس سے پیشتر مجھے اطلاع دے دی تھی۔ کہ
حضرت علامہ کو ساتھ لے کر دہلی پہنچوں یہ لیکن وہ نہ جاسکے میں گیا اور
تین چار روز تک وہاں رہا۔ اور لوگ بھی اس سلسلے میں بلائے گئے
تھے۔ ان میں صرف شعیب مرحوم نے گفتگو کی تھی۔

پھر نواب صاحب کشمیر آگئے۔ اس سلسلے میں بھی مجھے شعیب
صاحب نے پہلے اطلاع دے دی تھی کہ ہمارا سیلوں فلاں گاڑی کے
ساتھ آئے گا۔ کسی کو اطلاع نہ ہو حضرت علامہ کو ساتھ لے کر اٹیشن
پر آ جانا۔ چنانچہ ہم گئے اور نواب صاحب سے مل کر واپس چلے
آئے۔

اس زمانے میں نواب صاحب چمیر آف پنسنر کے صدر تھے
اس لیے انہیں عام مفاہمت کرادیئے کا خاص خیال تھا۔

اسی خط میں مولانا غلام رسول مہر نے خود اپنے کئی بار بھوپال جانے کا تذکرہ کیا ہے جس سے اس دور کی عام سیاسی فضا۔ نواب حمید اللہ خاں کے اثر و رسوخ اور ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کے ان سے قربتی اور خصوصی روایط پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ مولانا غلام رسول مہر نے رقم المحرف کے نام کیم ستمبر ۱۹۴۰ء کو ایک گرامی نامہ میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ علامہ اقبال سفر یورپ سے کوئی دو ہفتے پہلے نواب حمید اللہ خاں سے ملاقات کے لیے بھوپال تشریف لے گئے تھے۔

”..... خود میں ۱۹۳۱ء میں نیز اس کے بعد کئی مرتبہ بھوپال گیا

مثلًا ایک مرتبہ بھبھی سے مولانا شوکت علی مرحوم نے بلوالیا۔ اس وقت بھی نواب صاحب نے متعدد لیڈروں کو بلوار کھا تھا۔ مثلًا تصدیق احمد خاں شروانی مرحوم مولانا شفیع داؤدی مرحوم اس زمانے میں ہم احمد آباد میں ٹھہرے تھے پھر ایک مرتبہ گلیا وہیں ٹھہرا۔ ایک مرتبہ جہاں سے چند ایسے آدمیوں کو لے کر گیا جو بھوپال میں آباد کاری کے خواہاں تھے۔ اس کا تفصیلی جائزہ آندہ صفات میں شامل ہے۔ اور بہت بڑے قطعات سے لے کر کاشتکاری کرنا چاہتے تھے نیز کاشتکاروں کو لے جانے کے لیے تیار تھے۔ اس مرتبہ جہاں نگیر آباد میں قیام کیا تھا۔ پھر ۱۹۳۲ء میں غازی رووف بے مرحوم سے ملنے کے لیے گیا۔ اس مرتبہ بھی احمد آباد میں ٹھہرا تھا شعیب صاحب سے تعلقات بہت گہرے تھے۔ اس لیے وہ بعض اوقات ضروری کاموں

کے سلسلے میں بلوایتے تھے۔

گزشتہ صفحات میں ۱۹۳۱ء کے دوران اقبال کے بھوپال جانے کے بارے میں جن متفقہ شخصیتوں نے اظہار خیال کیا ہے ان میں نذرینیازی اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ خود اقبال کے دو مکتوبات بنام نذرینیازی اور مولوی محمد صالح ان کے سفر بھوپال کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ البتہ دوسری بار بھوپال جانے کا علم ہمیں صرف اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر نے تحریری بیانات سے ہوتا ہے۔ کوئی اور شہادت سے تadem تحریر پر نہیں ہو سکی۔

دوسرے ایڈیشن کی تکمیل کے دوران خوش نصیبی سے اقبال کا ایک ایسا بیان روزنامہ انقلاب لا ہور دستیاب ہوا جس کی نہ صرف بھوپال جانے کی غرض و غایت کا پہلی بار علم ہوا بلکہ اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر کے بیان کردہ بعض واقعات بھی مشتبہ ہو گئے۔ بھوپال کا نفرنس پر اقبال کے اس بیان سے ایک قطعی نئی صورت حال سامنے آئی ہے اس لیے تحقیقی دیانت کا تقاضا ہے کہ گزشتہ صفحات میں اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر کے حوالہ سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا از سرنو جائزہ لیا جائے تاکہ واقعات کا صحیح پس منظر روشنی میں آسکے۔

اقبال کا یہ بیان محمد رفیق افضل کی مرتبہ کتاب گفتار اقبال میں شامل ہے۔ اس کتاب میں جو مواد ترتیب دیا گیا ہے وہ کسی اور مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ یہ سب کا سب لا ہور کے دوروزناموں زمیندار اور انقلاب کی صرف ان جلدیوں سے لیا گیا ہے جو یہ رج سوسائٹی آف پاکستان کی لا بہریری میں محفوظ ہیں۔ تقاریر بیانات مکاتیب کا یہ مجموعہ تاریخ و ارتتیب دیا گیا ہے۔ سوائے آخر کی دوروں میں کے جن کا مواد بعد میں دستیاب ہوا۔ اس بیان کے سلسلے میں گفتار اقبال کے مقدمہ میں محمد رفیق افضل لکھتے ہیں:

”۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے مختلف اخیال

حقوق کو متحد کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۱ء میں نواب بھوپال کی دعوت پر جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے حامی مسلمانوں کی ایک کانفرنس بھوپال میں ہوئی۔ دیگر رہنماؤں کے علاوہ علامہ اقبال نے بھی اس میں شرکت فرمائی۔ کانفرنس کے اندر مختلف فارموں لے پیش ہوئے۔ آپ کو امید تھی کہ ان تجویزوں کی بنیاد پر ہونے والی مقاہمت کی صورت میں مسلمان متحد ہو کر ملک کی سیاسی ترقی اور نشوونما اور ارتقا میں حصہ لے سکیں گے..... مخلوط انتخابات کے حامی بجائے اس کے کہ مسلمانوں کا داخلی معاملہ سمجھتے وہ ان تجاویز کی منظوری سے پہلے گاندھی جی کے پاس لے گئے جس کی وجہ سے گفت و شنید کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا،۔۔۔۔۔

ذیل میں اقبال کے تین بیانات جو دراصل بھوپال کانفرنس سے ہی تعلق رکھتے

ہیں..... اور دو مختلف تواریخ میں چھپے ہیں ملاحظہ ہوں:

بھوپال کانفرنس پر بیان

نواب بھوپال کی دعوت پر جداگانہ طریق انتخاب اور مخلوط طریق انتخاب کے حامی مسلم رہنماؤں کی ایک کانفرنس بھوپال میں ۰۱۰۰ مئی کو منعقد ہوئی۔ کوشش یہ تھی کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے صورت حال کے تمام پہلوؤں کی چھان بین کی جائے۔ متعدد فارموں لے تیار کیے گئے اور فیصلہ ہوا کہ تمام ارکان ان فارموں کو اپنی اپنی جماعت کے سامنے پیش کریں دوسرا اجلاس ۱۲ جون کو قرار پایا۔ ۰۱۰۰ مئی کو علامہ محمد اقبال سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی

اور مسٹر شروانی کے سخنطبوں سے درج ذیل بیان شائع ہوا:

”ہم امیٰ کو بھوپال میں ایک غیر رسمی جلسہ میں جمع ہوئے تاکہ اختلافات کو مٹائیں جن کی بنابر مسلمان اس وقت دو سیاسی طبقوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ ہمارا مقصد ہندو مسلم سوال کے حل کرنے میں آسانیاں تقسیم پیدا کرنا تھا۔ ہماری متفقہ رائے ہے کہ اس منزل پر بحث و تحقیص کی تفصیلات شائع کرنا مفاد عامہ کے لیے اچھا ہمیں ہو گا۔ ہم خوشی سے بیان کرتے ہیں کہ طرفین کے درمیان انہائی خوش گوار اور دوستانہ جذبات میں گفتگو ہوتی رہی دوران گفتگو یا امر عیاں تھا کہ حاضرین میں سے ہر ایک کی بھی آرزو اور خواہش ہے کہ ایسے فیصلے پر پہنچ جائیں جو مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ بن جائے اور انہیں اس قابل بنا دے کہ وہ متحد ہو کر ملک کی سیاسی ترقی اور نشوونما اور ارتقاء میں حصہ لے سکیں جوں کا پہلا ہفتہ گفت و شنید کے لیے مقرر کیا گیا ہے امید کی جاتی ہے کہ اس وقت آخری اور تسلی بخش فیصلہ ہو جائے گا۔“



۱۳ امیٰ کو سر محمد اقبال اور نواب محمد اسماعیل خاں بھوپال سے واپس آتے ہوئے دہلی سے گزرے۔ ریلوے شیشن پر نمائندہ اسٹیٹسمن میں سے ایک ملاقات کے دوران انہوں نے فرمایا:

”بھوپال کا فنس کے متعلق اخبارات میں جواطلاءات شائع

ہوئی ہیں وہ اصول اساسی کے اعتبار سے اورست ہیں۔ لیکن ہم یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ بیان صحیح نہیں کہ ہم دونوں مولانا شوکت علی اور سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر جدا گانہ نیابت کے موید رہے اور ڈاکٹر انصاری اور مسٹر قعدق احمد خاں شیر و انی مخلوط نیابت کی حمایت پر اڑے رہے۔ ہم چاروں دہلی کی قراردادوں کے موید تھے۔ لیکن ہم مختلف جماعتوں میں منقسم ہو کر متضاد مقاصد کی خاطر جدوجہد نہیں کر رہے تھے۔

۱۔ انقلاب: ۱۹۳۱ء، جو الگفتار اقبال۔ صفحہ ۱۱۸-۱۱۹

جب واقعات کا سامنا ہوا تو ہمیں معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں میں بہت تھوڑا اختلاف رائے ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جس طریق پر یہ کام شروع ہوا ہے۔ اس طرح یہ خفیف اختلاف بھی جاتا رہے گا۔ ہم تفصیلات میں نہیں جا سکتے۔ البتہ ہم یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ اتحاد المسلمين کی طرف تسلی بخش ترقی ہوئی ہے۔ اب گفت و شنید ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی کہ ہم انفرادی حیثیت سے اسے جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس لیے ہمیں اپنی اپنی مجلس عاملہ کی طرف منتظری اور رہنمائی کے لیے رجوع کرنا پڑا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جب جون کے پہلے ہفتہ میں کافرنس کا اجلاس دوبارہ ہو گا تو اس وقت تک کوئی ایسا اصول تیار ہو جائے گا جو سب مسلمانوں کو قبول ہو گا اور موجودہ خفیف اختلاف بھی معدوم ہو جائے گا۔

بھوپال کافرنس کے فیصلوں کے متعلق علامہ اقبال نے اپنے ایک بیان میں مورخہ ۱۵

سمی میں فرمایا:

”شمل سے ایسو شی ایڈ پر لیس کا ایک پیغام ۲ یہ دیں مضمون شائع ہوا ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب قریشی شملہ پہنچتے ہی گاندھی جی کے مکان پر گئے۔ اور انہیں اطلاع دی کہ ہر ہائی نس والی بھوپال نے جن اصحاب کو مدعو کیا تھا انہوں نے ایک عارضی میثاق مرتب کر لیا ہے۔ اس پیغام میں بھی لکھا ہے کہ اس میثاق میں جو فارمولہ پیش کیا گیا ہے اس میں جدا گانہ اور مخلوط انتخاب والوں کا امتحان پایا جاتا ہے۔ اور تقریباً دس سال تک نافذ رہے گا اور اس کے بعد ہر جگہ مخلوط انتخاب جاری کر دیا جائے گا۔ چونکہ میں بھی مدعو تھا۔ اس لیے میں یہ ظاہر کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب نے بھوپال کا نفرنس کے غیر مباحثہ کو بنزولہ عارضی میثاق پیش کیا ہے تو انہوں نے یقیناً نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ ساتھ انہوں نے گفت و شنید کی بلکہ تمام مسلم قوم کے ساتھ برائی کی میں اسے کامل طور پر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کہ عارضی میثاق کی کسی قسم کی کوئی چیز حاضرین جلسے کے خیال میں بھی نہیں آتی تھی۔ اس جلسے سے زیادہ کوئی کارروائی نہیں ہوئی کہ نام نہاد مسلم نیشنلٹسٹوں کو انتخاب کے متعلق آں آں یا مسلم کا نفرنس کے فیصلوں کے قریب لانے کے لیے بعض تجویز پیش کی گئیں تاکہ یہ لوگ پھر کامل مسلم قوم میں شامل ہونے کے قابل ہو سکیں۔ جس نے جدا گانہ انتخاب کے بدستور بحال رکھنے کا ایسا درست فیصلہ کیا ہے کہ جس میں کسی قسم کے مغالطہ کی

گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۱۔ انقلاب: ۷ ائمی ۱۹۳۱ء، بحوالہ گفتار اقبال صفحہ ۱۱۹۔

۲۔ سہوکتابت ہے..... ”بیان“ ہونا چاہیے۔

اس جلسے میں ان تجاویز پر عملًا کوئی بحث نہیں کی گئی کیونکہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان تجاویز کے ردِ یا قبول کرنے کے لیے مختلف مسلم سیاسی جماعتوں کی مجالس عاملہ کے رو برو انہیں پیش کیا جائے۔ ایسی تجاویز کو گاہنگی بھی کے پاس بھاگے بھاگے لے جانے جن پر کسی فقہ کی بحث نہیں ہوئی تھی اور انہیں عارضی بیثاق کے نام سے تغیر کرنے سے شبهہ ہوتا ہے کہ بھوپال کانفرنس کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو مجھے کامل یقین ہے کہ بھوپال یا شملہ میں دوسرا جلسہ کرنا نہ صرف مفید ہوگا بلکہ لازمی طور پر مسلمانان ہند کے مفاد کے لیے ضرر سا ہوگا۔

اقبال کے مندرجہ بالا بیان سے جن حقائق کا پہلی بار انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہیں:

- ۱۔ بھوپال کے غیر رسمی اجلاس کو بھوپال کانفرنس کا نام دیا گیا۔
- ۲۔ ۱۲ ائمی ۱۹۳۱ء کا بیان اگرچہ صرف علامہ اقبال سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی اور تصدق احمد خاں شروعی کے سخنطلوں سے پر لیں میں شائع ہوا لیکن اس کانفرنس میں ان حضرات کے علاوہ ڈاکٹر انصاری نواب محمد اسمعیل خاں، شعیب قریشی اور نواب حمید اللہ خاں شریک تھے۔

- ۳۔ اس کانفرنس کا سب سے بڑا مقصد مسلم اتحاد کو مستحکم کرنا اور جدا گانہ اور مخلوط طریق انتخاب کے سلسلے میں کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنا تھا۔

۲۔ اس بیان کی رو سے کافرنس کا دوسرا جلاس کیم جون ۱۹۳۱ء کو ہونا طے پایا تھا لیکن

منعقد نہ ہو سکا۔

اب ان حقائق کا اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر کے بیان کردہ واقعات سے موازنہ کیجیے تو قطعی مختلف صورت حال سامنے آتی ہے۔ اقبال حسین خاں بیان کرتے ہیں کہ ”ہندوستان کا نقطہ نظر راؤ نڈیبل کافرنس میں پیش کرنے کے

سلسلے میں صلاح و مشورہ کے لیے ملک کے بڑے بڑے رہنماء مشر

جناح (قائد اعظم) گاندھی جی، مسز سرو جنی ناٹڈؤ ڈاکٹر انصاری

وغیرہ سب ہی بھوپال آئے۔ علامہ اقبال بھی اسی سلسلے میں ۱۹۳۱ء

میں دو مرتبہ بھوپال آئے“

آگے لکھتے ہیں:

”پہلی مرتبہ علامہ اقبال دو دن بھوپال ٹھہرے۔ جب گاڑی

ریلوے ٹیشن پر پہنچی تو صحیح کا وقت تھا۔ میں پیشوائی کے لیے پہلے سے

ٹیش پر موجود تھا۔ مہر صاحب بھی علامہ کے ساتھ تھے۔“

آگے چل کر کہتے ہیں:

۱۔ انقلاب: ۷ ائمی ۱۹۳۱ء بحوالہ گفتار اقبال صفحہ ۱۲۰-۱۲۱

”اقبال دوسری مرتبہ بھی اسی سلسلے میں بھوپال تشریف لائے

صحیح ہی کا وقت تھا اور اس وقت بھی مہر صاحب علامہ کے ساتھ تھے۔“

اب مولانا غلام رسول مہر کا بیان سنئے:

”حضرت علامہ مرحوم میں میں یقیناً بھوپال گئے تھے۔ یہ بھی صحیح

ہے کہ میں ساتھ تھا۔ اس زمانے میں زیادہ تر مسئلے پیش نظر تھے۔ اول

مسلمانان ہند کے مطالبات دوم مسلمانان کشمیر کے متعلق بہتر سیاسی و ملکی حقوق کا انتظام۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم اور مہاراجہ ہری سنگھ والی کشمیر کے درمیان گھرے دوستانہ روابط تھے غالباً مہاراجہ نے نواب صاحب سے کہا تھا کہ کوئی صورت تصفیے کی پیدا کر دیجیے۔ انہی معاملات پر گفتلوں ہوتی رہی۔ جس حد تک مجھے یاد ہے۔ دوسری مرتبہ علامہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں بھوپال نہیں گئے تھے بلکہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے تھے میں ان کے ساتھ ولایت نہیں گیا تھا۔

یہ اقتباس رقم الحروف کے نام مولا نامہ کے مکتوب مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۷ء کا ہے۔

اب ایک اور اقتباس ان کے مکتوب مورخ یکم ستمبر ۱۹۰۷ء کا ملاحظہ ہو:

”یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب حمید اللہ خاں مرحوم نے بعض مسلم اکابر کو بھوپال بلا یا تھا اور مقصود یہی تھا کہ سیاسی امور کے متعلق ان کے درمیان نیز کا نگرس ولیگ کے درمیان مفاہمت کر دیں۔ یہاں سے سرفیض یقیناً گئے تھے۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید حضرت علامہ مرحوم بھی گئے ہوں لیکن اس سفر میں بیشتر کا واقعہ ہونا چاہیے جس میں مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو کوئی ایسا آدمی ذہن میں نہیں آتا جو ان حالات سے واقف ہو اور حافظے کے مد ہم سے نقوش میں تازگی پیدا کر سکے۔“

اسی مکتوب کے حاشیے میں انہوں نے اس امر کی تصدیق کی ہے:

”علامہ اقبال سفر یورپ سے کوئی دو ہفتے پہلے نواب حمید اللہ

خاں سے ملاقات کے لیے بھوپال گئے تھے۔

بھوپال کا انفرنس پر اقبال کے بیان سے اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر کے بیانات کا موازنہ کیتے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ بھوپال کا انفرنس کے بارے میں دونوں حضرات قطعی لعلم تھے۔ اقبال حسین خاں اقبال کی بھوپال میں آمد کوراؤنڈ ٹیبل کا انفرنس کے سلسلے میں صلاح و مشورہ قرار دیتے ہیں جبکہ مولانا مہر..... اسے مسلمانان ہند کے مطالبات اور مسلمانان کشمیر کے متعلق بہتر سیاسی و ملکی حقوق کا انتظام تصور کرتے ہیں حالانکہ اقبال کے واضح بیان سے ان واقعات کی نفی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی مشکوک ہو گیا ہے کہ مولانا مہر اقبال کے ہمراہ دوبارہ بھوپال گئے تھے جیسا کہ اقبال حسین خاں بیان کرتے ہیں۔ مولانا مہر اقبال کے ساتھ ایک بار بھوپال جانے کا اقرار کرتے ہیں۔ (بروئے خط ۱۶ جنوری ۱۹۶۷ء) لیکن دوسری بار اقبال کے بھوپال جانے کو شاید علامہ مرحوم بھی گئے ہوں۔ کہہ کر یہ اظہار فرماتے ہیں:

”لیکن یہ اس سفر سے پیشتر کا واقعہ ہونا چاہیے۔ جس میں مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔“ اصل واقعات ان مختلف اور متفاہ بیانات سے پیچیدہ ہو گئے ہیں ”سر شفیع محمد مرحوم یقیناً گئے تھے“ کا گلزار نہایت معنی خیز ہے اور اسی عبارت سے یہ تیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۱ء کی جس بھوپال کا انفرنس میں سر شفیع اور دیگر اکابر شریک ہوئے تھے اس کا انفرنس میں مولانا مہر لا زماً اقبال کے ساتھ بھوپال نہیں گئے تھے ورنہ خود مولانا مہر یہ کیوں لکھتے کہ یہ اس سفر سے پیشتر کا واقعی ہونا چاہیے جس میں مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔“

بلاشبہ ۱۶ اور ۲۷ جولائی ۱۹۶۷ء کے دونوں مکتوبات مہر میں کوئی بڑا وقفہ نہیں ہے پھر بھی یہ امر

واضح ہے کہ مولانا مہر امیٰ ۱۹۳۱ء کو منعقدہ کانفرنس میں اقبال کے ہمراہ نہیں تھے۔ ۱۹۷۰ء کے مکتوب میں مولانا مہر کا یہ لکھنا کہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں سفر یورپ سے کوئیدہ ہفتے قبل نواب حمید اللہ خاں سے ملاقات کے لیے بھوپال تشریف لے گئے تھے۔ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ اس سفر میں بھی اقبال کے ہمراہ نہیں گئے تھے۔ ان حالات میں یہی گمان کیا جاسکتا ہے کہ مولانا مہر اقبال کے ہمراہ یا تو ۱۹۳۱ء سے پہلے یا بعد کے کسی سفر میں گئے ہوں گے جس کا دستاویزی ثبوت شاید آئندہ کبھی بھوپال کانفرنس کے بیان کی طرح دستیاب ہو جائے۔ بصورت موجودہ اقبال حسین خاں اور خود مولانا مہر کے دونوں بیانات کی صداقت مشتبہ ہو گئی ہے

اس سے قطع نظر کہ مولانا مہر اقبال کے ہمراہ کب بھوپال گئے تھے یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ خود ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۱ء کے دوران کئی بار بھوپال تشریف لے گئے تھے جیسا کہ ان کے کم ستمبر ۱۹۷۰ء کے خط کے حسب ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

”خود میں ۱۹۳۱ء میں نیزا سکے بعد کئی مرتبہ بھوپال گیا۔ مثلاً ایک مرتبہ بمبئی سے مولانا شوکت علی مرحوم نے بلوایا۔ اس وقت بھی نواب صاحب نے متعدد لیڈروں کو بلوار کھا تھا۔ مثلاً تصدق احمد خاں شروعی مرحوم مولانا شفیع داؤدی مرحوم اس زمانے میں ہم احمد آباد میں ٹھہرے پڑھ ایک مرتبہ گیا تو وہیں ٹھہرا۔ ایک مرتبہ یہاں سے چنداییے آدمیوں کو لے کر گیا جو بھوپال میں آباد کر اری کے خواہاں تھے..... پھر ۱۹۳۲ء میں غازی رووف بے (مرحوم) سے ملنے کے لیے گیا تھا..... شعیب صاحب سے تعلقات بہت گھرے تھے اس لیے وہ بعض اوقات ضروری کاموں کے سلسلے میں بلوایتے

تھے۔

اسی سلسلے میں سید نذرینیازی کے ایک خط کا حوالہ بھی پیش خدمت ہے جو اقبال اور بھوپال کے ربط و تعلق پر کسی قدر روشنی ڈالتا ہے۔ مولانا مہر اور نذرینیازی کی شخصیتیں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ دونوں حضرات اقبال کے خصوصی اور نیازمندوں میں شامل رہے ہیں اور ان کے پیشتر لمحے اقبال کی معیت اور رفاقت میں گزرے ہیں۔ یہ دونوں حضرات اقبال کے ہمیشہ قرب رہے اور انہیں اقبال سے استفادہ کے تمام موقع نصیب تھے۔ لہذا یہ حضرات جو اقبال کے مزاج وال بھی تھے۔ اقبال کے بارے میں جو کچھ اب تک لکھ چکے ہیں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری خوش نصیبی کہ مجھے ان دونوں بزرگوں سے اس کتاب کے سلسلے میں استفادہ کا موقع مل گیا۔ دونوں حضرات نے کمال شفقت و مہربانی سے مجھے بھوپال سے متعلق کچھ ایسی بتائیں کہیں جن کا علم کسی کو نہیں تھا چنانچہ نذرینیازی صاحب نے میرے عریضہ کے جواب میں مختصرًا جو بتائیں لکھیں ہیں ان کا اقتباس حاضر خدمت ہے۔

یہ خط ۱۲ جنوری ۱۹۶۷ء کا ہے:

”..... اقبال کو نواب صاحب مرحوم سے جوارادت تھی اسکا اندازہ مکتوبات اور ضرب کلیم سے ہو گیا ہوگا۔ دراصل اقبال کو اسلام کے عہدِ ماضی کی ہر یادگار سے دلی تعلق تھا۔ اس کا حال کچھ بھی ہو وہ اس ماضی کی جھلک دیکھتے اور یوں ان کا ذہن اس کے اصل الاصول کی طرف منتقل ہو جاتا۔ یعنی حضور رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی طرف جس نے تاریخ عالم کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ اور انسان کے فکر و نظر میں بحیثیت انسان وہ انقلاب پیدا کیا جس سے اس کا مستقبل وابستہ ہے۔ لہذا انہیں ان کی یادگاروں سے دلی

محبت تھی اور ان کا جی چاہتا تھا کہ ان افرادہ چنگاریوں میں سے پھر سے زندگی کی وہ آگ بھڑک اٹھے جس میں روشنی سے کبھی دنیا جمگا اٹھی تھی۔ ان کے کم نظر ناقیدین بالخصوص خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ان باقوں کو ان کی جاہ پرستی سے تعبیر کرتے اور نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اسی حال میں ماضی میں مستقبل کی تصویر ڈیکھ رہے ہیں۔

میں اس سطر میں لکھ رہا ہوں اور بھوپال دارالاقبال (جس کا اقبال بالآخر ختم ہو گیا) کی وہ شام میریسا منے ہے جب ۱۹۲۲ء میں جناب امین زیری کے درود لست پر بیٹھا ہوا محلات شاہی کے درود یوار لکھ رہا تھا۔ یہ خیال کس قدر تکلیف دہ ہے کہ اس بھوپال کا نام صفحہ ہستی سے مت گیا جس نے انتہاء زوال اور محکومی عالم اسلام کے زوال اور محکومی کے باوجود ماضی سے اپنا رشتہ نہیں توڑا بمقابلہ آج کا عالم اسلامی ہے تو آزاد اور خود مختار لیکن ماضی سے بے تعلق۔

اقبال حسین خاں مولانا غلام رسول مہر اور زیر نیازی کی ان تحریری شہادتوں سے جہاں اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے قربی اور خصوصی روابط کی نشان دہی ہوتی ہے وہیں ان دو عظیم شخصیتوں کی زندگی کے کئی منع گوشے بھی ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اور یہ باور کرانے کے معقول وجوہ ہیں کہ نواب حمید اللہ خاں اقبال کی بڑی عزت کرتے تھے اور نہیں اکابر کی صفائول میں شمار کرتے ہوئے سیاسی مسائل اور خصوصاً مسلمانوں کے مطالبات کے سلسلے میں ان سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے۔ اروان کی ملاقاتیں بھوپال کے علاوہ دہلی میں بھی ہوتی تھیں۔ جہاں نواب صاحب چیمبر آف پرسنzel کی صدارت کے لیے اکثر ویژہتر جاتے رہتے تھے۔ جیسا کہ مولانا مہر نے بھی لکھا ہے کہ ان تینوں حضرات کی تحریروں سے جو

واقعات روشنی میں آئے ہیں گز شتہ چالیس سال کے عرصہ میں ان کا کسی کو علم نہیں تھا۔ حق تو یہ ہے کہ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے ذاتی روابط اور تعلقات کی اصل و بنیاد کو تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ورنہ چالیس سال کا رعصہ اتنا بڑا نہیں کہ اس دور کے واقعات و حقائق کا احاطہ ممکن نہ ہوتا۔

نواب حمید اللہ خاں سے اقبال کی پہلی ملاقات کا یہ تاثر جیسا کہ اقبال حسین خاں نے بیان کیا ہے۔ یقیناً گہری معنویت کا حامل ہے ان کا یہ کہنا:

”میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کے ایک ولی ریاست ایسا عالی دماغ بھی ہو سکتا ہے کہ نواب صاحب تو قوم کی ایک قابل فخر ہستے ہیں،“

اس بات کا غمزہ ہے کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں نواب صاحب کے گرویدہ و شیدا ہو گئے تھے۔ یہ اظہار کسی معمولی شخصیت کا نہیں اقبال کا ہے جو خود اس عہد کے ایک بلند مرتبہ شخصیت تھے۔ ان کی یہ بر ملائیریف اس حقیقت کی ترجیحی بھی کرتی ہے کہ وہ حق گواہ حق پسند تھا اور نواب صاحب کی روشن خیالی اور عالی دماغی نے انہیں ذہنی طور پر ان کے قریب کر دیا تھا۔ عجیب بات یہ کہ اقبال ایک مردقلندر تھے اور نواب حمید اللہ خاں ایک ریاست کے حکمراں۔ لیکن سیاست تاریخ اور تہذیب کے جن رشتہوں نے دو منقاد شخصیتوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے مصدقہ کلیوں کی لنفی کی ہے انہیں میں اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے ذاتی روابط بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ اقبال نے زندگی کے کسی دور میں کسی حکمراں یا جا گیردار یا کسی بڑی شخصیت کا بھی کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ چہ جائیکہ ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کا حکمراں جس سے اقبال اس حد تک متاثر ہوئے کہ بے اختیار کہہ دیا۔

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است

دل تو بیند و اندیشہ تو می داند
بات صرف اتنی ہے کہ ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کا جو سودا اقبال کے سر میں تھا اسی
جنوں میں نواب حمید اللہ خاں صاحب بھی بتلا تھے۔ اس لیے دونوں کے درمیان پہنی ہی
ملاقات کے دوران عظیم مقاصد کے حصول کے سلسلے میں ڈھنی رشتہ قائم ہو گیا اور دونوں میں
قریبی اور گھرے رو اپٹ پیدا ہو گئے۔ سچ پوچھیے تو یہی ہم آہنگی ادبی تاریخ کا ایک ایسا موڑ
ہے جس کے اثرات اقبال نے بھی قبول کیے نواب حمید اللہ خاں نے بھی اور بھوپال کی ادبی
فضا اعلیٰ تدبیر سیاسی بصیرت اور مسلمانوں کے ایک رہنمای کی حیثیت سے بر صیر کی سیاسی
تاریخ میں نمایاں مقام پر فائز تھے۔ اور یہ فخر و منزلت اس دور کے کسی راجہ یا نواب کو نصیب
نہ تھی۔ اقبال نے اسلامی ریاست کا جو تصور الہ آباد میں پیش کیا تھا وہ بظاہر تو اس خواب کی سی
حیثیت رکھتا تھا اور اسے کانگریس اور خود مسلمان عام طور پر نظر انداز کر کے متحده قومیت کے
تصور کو فروع دینے کی سعی و جهد کر رہے تھے۔ سیاسی فضانہایت الجھی ہوئی تھی۔ مسلمان
لکھڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان حالات میں نواب بھوپال کا دم غنیمت تھا جنہیں
ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا کامل اعتماد حاصل تھا اور جو تحریک آزادی میں مفاہماہہ کردار
ادا کرنے کی تمام تر صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اقبال ان حقائق سے آگاہ تھے چنانچہ نواب
صاحب سے ملاقاتوں کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ نواب بھوپال کے تعاون سے ملت اسلامیہ
کا اتحاد اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے تمام امکانات موجود ہیں اور یہی وہ قدر مشترک تھی
جس نے ان دورہ نمائوں کو ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا جس کا سلسلہ آخر عمر تک قائم
رہا۔

۱۹۳۲ء، اور ۱۹۳۳ء میں اقبال بیشتر بلا د اسلامیہ اور یورپی ملکوں کے سفر میں
رہے اور ۱۹۳۴ء میں دفعتاً شدید بیمار پڑ گئے جس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ دراصل اقبال

اپنی صحت و تندرستی پر بہت کم توجہ دیتے تھے۔ انہیں گلے کی تکلیف بہت پرانی تھی۔ اکثر زور زور سے کھکھلتے اور پھر نزلہ اور زکام میں مبتلا ہو جاتے تھے لیکن ۱۹۳۲ء میں نقرس کی شکایت نے شدت اختیار کر لی تو عرصہ تک آپ نے دلی کے مشہور حکیم نایینا عبدالوہاب انصاری کا علاج کیا اور اس علاج معالجہ کے سلسلے میں نذر یعنیازی کو اقبال کی ہرگز من مذکور تر ہے خطوط کے ذریعہ اقبال اپنا حال نذر یعنیازی کو دلی بھیجتے وہ سارا حال حکیم نایینا کو جا جا کر سناتے۔ دوائیں حاصل کرتے اور بذریعہ پارسل لا ہو روانہ کر دیتے۔ مکتوبات اقبال کے وہ خطوط جو ۱۹۳۴ء صفحہ ۱۲۵ تا ۱۳۶ پر مشتمل ہیں۔ اقبال کی اسی عالالت علاج و معالجہ اور کیفیت مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ اوائل ۱۹۳۵ء میں نواب بھوپال اور راس مسعود کی خواہش پر پھر بھوپال آئے اور بھلی کے ذریعہ نقرس کا علاج شروع کرایا۔ علاج کے سلسلے میں وہ تین بار بھوپال آئے جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء تا ۷ مارچ ۱۹۳۵ء

۲۔ ۷ اگسٹ ۱۹۳۵ء تا ۲۸ اگسٹ ۱۹۳۵ء

۳۔ ۲ مارچ ۱۹۳۶ء تا ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء

بھوپال میں ان کی آمد اور ان کے قیام کا تفصیلی حال آئندہ ابواب میں پیش کیا گیا ہے کیونکہ یہ قیام اگرچہ علاج کے سلسلے میں تھا لیکن اس کے علاوہ بھی دیگر اہم متأخر کا حامل تھا اور ان روابط کے استحکام کا سبب بھی جو اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے درمیان راس مسعود کے بھوپال آنے کے بعد وقوع پذیر ہوئے۔

علاج کے سلسلے میں اقبال کے تین بار قیام بھوپال کی مدت اگرچہ تقریباً چار ماہ ہے لیکن حق پوچھیے تو ریاست بھوپال راس مسعود اور نواب حمید اللہ خاں سے ان کی ڈھنی فکری اور عملی وابستگی کی مدت تقریباً آٹھ سال پر محیط ہے۔ جس کی ابتداء بھوپال کے پہلے سفر ۹ مئی ۱۹۳۱ء

سے ہوئی اور آخر دم وفات ۱۳۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک قائم رہی۔ میں نے اس کتاب کے ذریعہ تاریخ کے ان گم شدہ نامعلوم اچھوتے اور بکھرے ہوئے واقعات کو سمینے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اقبال کی زندگی کے آخری دور کا احاطہ ہو جائے اور ان فراموش کردہ اور اُراق سے نئی نسل درس تپش حاصل کر سکے۔



بھوپال کا پہلا قیام

(۳۱ جنوری تا ۱۹۳۵ مارچ)

(۳)

۱۹۳۲ء میں حکیم نایبنا کے علاج سے اقبال کی عام صحت تو بحال ہو گئی لیکن گلے کی تکلیف میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی عرصہ میں ڈاکٹر لمعہ اور کئی احباب نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بھوپال جا کر بھلی کا علاج کرائیں بھلی کا علاج اس وقت جدید ترین اور کامیاب ترین علاج و سمجھا جاتا تھا۔ اور بھوپال کے حمید یہ اپنال ۲ میں اس کی تیقینی مشینیں لگ چکی تھیں۔ ماہر ڈاکٹر موجود تھے جن میں ڈاکٹر عبدالباسط ریڈیاں جو حست کا نام نامی بطور خاص قابل ذکر ہے۔ جنہیں علامہ خصوصی معانج کا شرف حاصل ہوا۔

نومبر ۱۹۳۲ء میں نواب صاحب کی خواہش کے احترام میں جب راس مسعود بھوپال آگئے تاوان ہوں نے علی گڑھ کے ناتے نواب صاحب کے ایک شریک کار کی حیثیت سے وزارت تعلیم و صحت و امور عامہ کا قلمدان سنپھالا تو بھوپال کی علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں میں جان پڑ گئی۔

۱۔ عباس علی خاں لمعہ اقبال کے عقیدت مندوں اور نیازمند میں سے تھے۔ اقبال نامہ میں کئی خط ڈاکٹر لمعہ کے نام شامل ہیں کیم ۱۹۳۲ء کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

مکرمی بندہ

تلیم آپ کا گرامی نامہ مل گیا ہے۔ میری طبیعت الحمد اللہ اب اچھی ہے حکیم نایبنا

صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں ضرور فرق ہے مگر عام گفتگو کرنے میں سخت فکلیف ہوتی ہے جناب کی گراں قدر رائے کا شکر یہ انشاء اللہ ضرور بھوپال جاؤں گا اور بھلی کے علاج سے بھی استفادہ حاصل کروں گا۔ میں نے صحت کی مجبوریوں کے باعث ولایت جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔

(اقبال نمہ جلد اول صفحہ ۲۸۱-۲۸۲)

۲ اس کا نام پہلے پنس آف ویز ہسپتال تھا جسے بعد میں تبدیل کر کے حمید یہ ہسپتال رکھا گیا۔ وسط شہر میں یہ وسیع و عریض ہسپتال قائم تھا جہاں جدید ترین ڈاکٹری علاج کی سہولتیں بھوپال کے عوام کو حاصل تھیں۔ ریاست بھوپال کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں انگریزی اور دیسی علاج مفت ہوتا تھا۔ خود شہر بھوپال میں حمید یہ اسپتال کے علاوہ پانچ دوسرے انگریزی شفاخانے تین یونانی شفاخانے اور ایک خواتین کا اسپتال قائم تھے۔

یہاں کی زندگی کا آخری اور زریں دور تھا۔ حیدر آباد کی طویل ترین ملازمت کے بعد علی گڑھ کی واں چانسلری کے زمانے میں انہوں نے جس خلوص لگن اور دیانت اور محنت سے اپنے آب و جد کی اس امانت کے لیے کام کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی دور میں انہوں نے مادر علمی کو نہ صرف اعلیٰ مرتبہ پر فائز کیا بلکہ ان کی بنیادوں کو بھی مالی اور فنی لحاظ سے مستحکم کر دیا۔ شبانہ روز جدوجہد کے نتیجہ میں ان کی صحت کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ اس عالم میں بھی انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا لیکن جب سازشیوں نے ان کے تاریخ ساز اور عہد آفریں کارناموں کو نظر انداز کر کے انہیں دل برداشتہ کر دیا تو ہو مستغفی ہو گئے۔ چنانچہ نواب صاحب بھوپال نے جو عرصہ دراز سے انہیں ریاست میں اعلیٰ عہدہ کی پیش کش کا منصوبہ رکھتے تھے ان کے مستغفی ہوتے ہی انہیں بھوپال آنے کی دعوت دی اکتوبر ۱۹۳۲ء میں وہ بھوپال گئے اور نواب صاحب سے تبادلہ خیالات کے بعد ریات کی خدمت پر تیار ہو گئے۔

اقبال اور راس مسعود کے تعلقات کی ابتداء ۱۹۲۹ء میں ریاست حیدر آباد میں ہوئی تھی۔

جب راس مسعود ناظم تعلیمات تھے اور اقبال تو سیمی پیغمبر کے سلسلے میں وہاں دوسری بار گئے۔ یہ روابط رفتہ رفتہ دوستی میں محبت سے تبدیل ہو گئے۔ پھر ۱۹۳۳ء میں اقبال راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کے ساتھ افغانستان کے سفر پر گئے جہاں یہ رشتہ اور مستحکم ہو گئے۔

نومبر ۱۹۳۲ء میں بھوپال آنے کے بعد راس مسعود کو اقبال کی علاالت کا علم ہو چکا تھا۔

دیگر نیازمندوں کی طرح انہیں بھی اقبال کی علاالت سے مسلسل پریشانی تھی۔ حمید یہ اپنا تال کے ماہر ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد انہوں نے اقبال سے بھوپال آنے اور علاج کرانے پر اصرار کیا۔ نواب صاحب بھوپال بھی اقبال کی علاالت سے فکر مند تھے۔ اور ان کی خواہش تھی کہ اقبال بھوپال آ کر اپنا علاج کر لیں۔ راس مسعود اور اقبال کے درمیان نومبر اور دسمبر ۱۹۳۳ء کے دوران مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی۔ بالآخر اقبال نے بھوپال جانے کا قصد کر لیا۔ لیکن کوشش کے باوجود ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء سے پہلے بھوپال نہ پہنچ سکے۔ اگرچہ اس سے قبل بھوپال جانے کے بارے میں وہ سید نذر نیازی کو مسلسل لکھتے رہے تھے جس کا تاریخ وار تذکرہ ہمیں مکتوبات اقبال میں ملتا ہے جو اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ نواب صاحب کی خواہش اور راس مسعود کے اصرار کے نتیجے میں انہوں نے بھوپال جا کر قیام کرنے اور علاج کرانے کا قصد کر لیا تھا۔

ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

” لاہور ۵ جنوری ۱۹۳۵ء ”

ڈر نیازی صاحب السلام علیکم

اس سے پہلے خط لکھ چکا ہوں یہ کارڈ اس امر کی اطلاع کے لیے

لکھتا ہوں کہ آج سات روز کی دو باقی ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت
میں عرض کر دیں کہ حالت میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ آواز بدستور
ہے شانوں کے درمیان رات کو درد ہوتا ہے جس سے نیند میں خلل
واقع ہوتا ہے..... میں یہاں سے اس ماہ کے آخر میں بھوپال جاؤں
گا آپ کو پہلے سے مطلع کر دوں گا تاکہ آپ دوائے کر مجھے سٹیشن پر
مل جائیں۔“

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۳۰

” لاہور ۶ جنوری ۱۹۳۵ء ”

ڈیرینیازی صاحب السلام علیکم

..... بھوپال انشاء اللہ جنوری کے اخیر تک آ جاؤں گا۔ اس
بارے میں آپ کو پھر خط لکھوں گا۔“

” لاہور ۹ جنوری ۱۹۳۵ء ”

ڈیرینیازی صاحب السلام علیکم

..... میں غالباً ۲۹ جنوری کو بھوپال جاؤں گا۔“

” لاہور ۱۲ جنوری ۱۹۳۵ء ”

ڈیرینیازی صاحب السلام علیکم

..... بھوپال جاتے ہوئے ممکن ہو تو ایک آدھ روز ٹھہر جاؤں گا

۔۔۔

” لاہور.....ے اجنوری ۱۹۳۵ء ”

ڈیرینیازی صاحب.....السلام علیکم

خالدہ ادیبہ خانم کے لکچر سننے کا میں خود مشتاق تھا۔ مگر
افسوں کے ایسا نہ ہو سکا۔ بہر حال میں ان سے انشاء اللہ ضرور ملوں گایا
بھوپال جاتے ہوئے یا وہاں سے آتے ہوئے ۔۔۔

” لاہور..... جنوری ۱۹۳۵ء ”

ڈیرینیازی صاحب.....السلام علیکم

بھوپال کے متعلق مفصل اطلاع دوں گا مگر ایک دو روز میں
جو اطلاع وہاں سے آئے گی اگر اس کی رو سے لیکھر کی صدارت ممکن
ہوئی تو اس سے بھی انکار نہیں بشرطیکہ اس امر کا لاحاظ رکھا جائے کہ میں
بولنے سے قاصر ہوں۔ یہی بات میں نے ڈاکٹر انصاری صاحب کو
بھی لکھی تھی اور کوئی امرمانع نہ تھا۔ دہلی ٹھہر سکا تو افغان کنسل خانہ
میں ہی ٹھہر جاؤں گا ۔۔۔

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۲۱

۲۔ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۲۳

۳۔ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۲۵

۴۔ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۲۷

۵۔ یہ خط دراصل ۲۳ جنوری ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے جو مکتوبات اقبال میں سہو کتابت

سے ۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء شائع ہوا ہے خط کی تاریخ کا راقم الحروف نے باغِ جناح میوزیم
کراچی میں اقبال کے اصل خط سے موازنہ کر لیا ہے۔

۶۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۵۰-۲۵۱

” لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۳۵ء ”

ڈیرینیازی صاحب السلام علیکم

..... میں ۲۹ جنوری کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۳۰ کی صبح کو
دہلی پہنچوں گا۔ فرنٹر میل سے سفر کروں گا۔ جیسے کہ پہلے لکھ چکا ہوں
کوئی خانے میں قیام کروں گا۔ افسوس کہ خالدہ خانم کے کسی لکھر کی
صدارت کرنا ناممکن ہوگا۔ کیونکہ دہلی صرف ایک روز ٹھہر نے کا موقع
ہوگا۔ باقی خیریت ہے وہ ابھی میرے پاس ہے۔ مزید دو اکے لیے
ائیشن پر گفتگو ہو گی پھر آپ سے بھوپال (معرفت سر راس مسعود۔
ریاض منزل) ارسال کر دیں । ”

چنانچہ پروگرام کے مطابق اقبال اقبال ۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے۔ کو ۳۰
صبح دہلی پہنچے۔ قیام زیادہ تر افغان کوئی خانے میں سردار صلاح الدین سلجوقی کے ساتھ رہا
جو آپ کے دریپنہ عقیدت مندوں میں سے تھے۔ شام کو آپ ڈاکٹر انصاری کی خواہش پر جامع
مسجد تشریف لے گئے اور خالدہ ادیبیت خانم کے ایک خطبے کی صدارت فرمائی اور رات کی
گاڑی سے روانہ ہو کر ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال پہنچے۔

بھوپال پہنچنے پر راس مسعودان کے پرشیل سیکرٹری ممنون حسن خاں اور نواب صاحب
بھوپال کے ملٹری سیکرٹری کرنل اقبال محمد کاں سی آئی ای نے ایشان پر ان کا استقبال کیا جس
کی تفصیلی رواد ممنون حسن خاں کی زبانی سنئے۔

”.....ڈاکٹر اقبال سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔

جب وہ سر راس مسعود کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے تھے اس زمانے میں ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ گلے کی تکلیف کا اثر شروع ہو گیا تھا۔ سر راس مسعود نے انہیں بلاں کے لیے تارو غیرہ میرے ہی ذریعہ بھجوائے تھے۔ جس گاڑی سے علامہ اقبال بھوپال آرہے تھے وہ رات کے وقت یہاں پہنچتی تھی انہیں لینے کے لیے میں اور سر راس اٹیشن پر گئے تھے نواب صاحب نے ملٹری سیکرٹری کرنل اقبال محمد خاں کو بطور اپنے نمائندے کے بھیجا تھا حالانکہ وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے تشریف نہیں لارہے تھے۔ اٹیشن پر ہم لوگ پنجاب میں کی آمد سے کچھ دیر پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ مجے یاد ہے سر راس مسعود بڑی بے چینی سے اقبال کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کا منتظر ہو جب گاڑی آئی تو ایک صاحب افغانی ٹوپی شلووار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اترے۔ سر راس کی نظر ان پر پڑی تو اس طرف تیزی سے آگے بڑھے۔ اور ان کے منہ اس قدر بو سے لیے کہ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ میں ان کے پیچھے کھڑا عجیب نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ جلدی ہی سر راس مسعود میری طرف متوجہ ہوئے اور علامہ اقبال سے کہا اس لڑکے سے ملو یہ میرا سیکرٹری ہے اور تمہارے کلام کا عاشق ہے اسے تم سے زیادہ تمہارا کلام یاد ہے۔ میں فرط سرست سے آگے بڑھا جھک کر سلام کیا اور انہوں نے مجھے گلے سے گالیا۔

۲۔ حضرت علامہ ادیب کے بجائے ہمیشہ ادیب ہی لکھتے تھے (نیازی)

.....اس کے بعد کرنل اقبال محمد خاں آگے بڑھے اور کہا نواب

صاحب نے سلام کے بعد یہ کہلوایا ہے کہ آپ اور سر راس مسعود
صاحب اجازت دیں تو شاہی مہمان خانے میں قیام کا انتظام کیا
جائے۔ آپ کے وہاں قیام سے نواب صاحب کو بے حد خوشی ہو گی۔
علامہ نے مسکراتے ہوئے نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ
میں تو اس وقت اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔ نواب صاحب سے
ضرور ملوں گا۔ ان کو میر اسلام اور شکریہ پہنچا دیجیے گا۔ علامہ اقبال کے
پاس بہت مختصر سامان تھا جو سر راس کی گاڑی کے پیچے ہی آگیا۔
سامان اٹھانے والی گاڑی اگرچہ آئی تھی لیکن اس کی ضرورت نہیں
پڑی اور وہ خالی واپس گئی

.....علامہ اقبال کا قیام ریاض منزل میں ہوا۔ یہ مکان بھوپال

کے مشہور تالاب بڑے تال کے کنارے ہے۔ بھوپال کا یہ مقام بڑا
حسین اور دل فریب ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ اس سر
زمین کے لیے قدرت کا یہ ایک حسین عطیہ ہے۔ اس مکان کے
بالائی حصے میں سر راس مسعود نے ایک کمرہ بنوایا تھا۔ اس میں انہیں
ٹھہرایا گیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بیٹھ کر اقبال نے اپنی نظم نگاہ تخلیق
کی تھی۔ ہم لوگ جیسے ہی ریاض منزل پہنچے بیگم مسعود نے علامہ کا خیر
مقدم کیا۔ علامہ اقبال ان سے بہت خلوص اور محبت کے ساتھ ملے۔

.....چونکہ سر راس مسعود کے کہنے پر نواب صاحب نے مجھے خاص طور پر ڈاکٹر صاحب کی پیشی میں مقرر کر دیا تھا۔ ار میری دفتر کی حاضری معاف فرمادی گئی تھی۔ اس لیے صحیح سے میں بجائے سر راس مسعود کے سیکرٹری ہونے کے اقبال کا خادم ہو کر کام کرنے لگا تھا۔ سر راس نے علامہ کو بتا دیا تھا کہ انہیں جس بات کی ضرورت ہو اس کی اطلاع منون حسن خال کو دیں۔ یہ اس کی تعییل کر دیں گے۔ رائٹلے کھانے کا انتظام سر راس مسعود نے خاص طور پر کیا تھا۔ علامہ نے سر راس مسعود کے ساتھ ہی ڈائنگ روم میں کھانا کھایا۔ کھانے کے درمیان ہی علامہ نے کہا کہ میرا کھانا سادہ ہونا چاہیے میں ڈائنگ روم میں کھانے کا عادی نہیں ہوں اس لیے کہ اگر میں ڈائنگ روم میں نہ آ سکوں تو برا نہ مانیے گا۔ مجھے جس وقت بھوک لگے گی کھالیوں گا۔ کھانے کے بعد میں علامہ اقبال کا کمرہ دیکھنے گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو سر راس مسعود نے اپنے مہمان عزیز کے لیے بھجوایا تھا اسے ان کے ملازم ہانے اٹھا دیا تھا اور اس کی جگہ اقبال کا معمولی بستر لگا دیا تھا۔ میں نے جب دریافت کیا تو ملازم نے بتایا کہ اقبال ہمیشہ اپنے بستر پر ہی سوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی ہیں ایک مشنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب۔ ملازم نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سفر میں زیادہ تر ان کتابوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کے پینگ کے قریب ایک پنجابی حقہ رکھا ہوا تھا۔

.....دوسرے دن علامہ اقبال نے فرمایا کہ نواب صاحب سے
ملنے کا وقت لے لیا جائے چنانچہ ملنے کا وقت مقرر کر دیا گیا۔ ٹھیک
وقت پر سر راس علامہ کے ساتھ نواب صاحب سے ملنے کے لیے
روانہ ہوا میں بھی بحیثیت خادم ان کے ساتھ تھا۔

۱۔ علی بخش۔ اقبال کا دیرینہ خادم جو سفر میں اکثر ان کے ساتھ رہتا تھا افسوس کہ گزشتہ
دنوں علی بخش کا بھی انتقال ہو گیا۔

یہاں سے پہلے ٹیلی فون کر دیا گیا تھا کہ قصر سلطانی کے لیے ہم
لوگ فلاں راستے سے آ رہے ہیں۔ جیسے ہی گاڑی محل میں آ کر رکی تو
لوگوں نے دیکھا کہ نواب صاحب نیچے کی سیڑھی پر علامہ سے ملنے
کھڑے ہیں نواب صاحب بڑے اختار اور محبت کے ساتھ علامہ
سے ملنے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بزرگوں سے مل رہے
ہیں۔ پھر نواب صاحب نے علامہ کو اپنے کمرے میں لے گئے۔

جہاں صرف ہم چار آدمی تھے میں سب سے پیچھے ایک گوشہ میں بیٹھا
ہوا تھا۔ جلد ہی کافی کا دور چلا۔ نواب صاحب نے دریافت کیا کہ
اقبال صاحب آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے جس پر علامہ نے
کہا کسی قسم کی بھی تکلیف نہیں ہے۔ نواب صاحب نے صحت کے
بارے میں پوچھا تو علامہ نے بیماری اور تمام علاج کی تفصیل بتائی۔

اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا..... نواب صاحب نے An
Interpretation of Holy Quran in the light
of modern philosophy کے بارے میں دریافت کیا۔

علامہ اقبال نے بتایا کہ اس کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں ہے
کچھ تیار بھی کیا ہے لیکن کچھ کتابیں پیروں ملک میں ہیں انہیں دیکھ
لینا چاہتا ہوں مجھے آکسفورد اور کمبرج میں Extension
Lecture کے لئے بلا یا جا رہا ہے۔ اگر میں وہاں گیا تو ان کتابوں
کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ نواب صاحب نے کہا کہ اگر یہ کتاب
مکمل ہو جائے تو ساری ملت اسلامیہ بلکہ ساری دنیا کے لوگ اسے
قدرت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور آنے مجھے جو تحفے دیے ہیں ان میں
سے سب سے بڑا تحفہ ہو گا۔ اگر اس میں کچھ امداد کی ضرورت ہو تو
جبیسا کہ میں نے مسعود سے کہا ہے کہ ہر طرح کی امداد کے لیے تیار
ہوں پھر دوسری باتوں کا ذکر چھپ گیا اس کے بعد نواب صاحب سے
علامہ اقبال نے جانے کے اجازت چاہی۔ انہوں نے کہا چونکہ آپ
مصروف ہیں اس لیے جانے کی اجازت دیجیے۔ نواب صاحب
گاڑی تک پہنچنے آئے۔ سر راس مسعود اور علامہ اقبال کے پیچے
کی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی ریاض
منزل کے لیے روانہ ہوئی۔

.....علامہ اقبال چونکہ یہاڑتھے اس لیے روزانہ کافی خطوط ایسے
آتے تھے جن میں صحت کے بارے میں دریافت کیا جاتا تھا۔ اس
لیے علامہ کے خطوط کے لیے سر راس مسعود کی طرح الگ
کیا جاتا تھا۔ تمام خطوط وہ اپنے پاس رکھتے تھے صحیح کے
وقت تمام خطوط علامہ کو سنا دیے جاتے تھے۔ اور پھر خطوط کے جو کچھ

وہ جواب لکھاتے تھے۔ پہلے پنسل سے لکھے جاتے تھے پھر صاف کر کے یا ٹائپ کر کے ان کے پاس دستخط کے لیے بھیج دیے جاتے تھے۔ یہ خطوط ان نوجوانوں سے لے کر والیان ریاست تک کے ہوتے تھے۔ خصوصاً علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کے خطوط زیادہ آتے تھے جو دریافت صحبت کے بارے میں ہوا کرتے تھے۔ بیرون ملک سے بھی اسی سلسلے میں زیادہ تر خطوط آتے تھے۔ آل انڈیا ریڈ یو سے علامہ کی صحبت کے بارے میں خبریں نشر ہوتی تھیں۔

۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں صفحہ ۱۳۳

جن حضرات کو ریاست بھوپال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ وسط ہند کی اس چھوٹی سی اسلامی ریاست کے حکمرانوں میں علم و ادب سے جتنا گہرا شغف پایا جاتا تھا اتنا ہی فن تعمیر سے بھی انہیں خاص لگاؤ تھا جس کے نتیجے میں وہاں ایک نہیں متعدد بلند و بالا پر شکو اور قابل دید عمارتیں اور محلات تعمیر کیے گئے۔ جوزبان حال سے مغل فن تعمیر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ قصر سلطانی نواب بھوپال کی قیام گاہ شملہ پہاڑی کے محلات (جہاں نواب صاحب کے بھتیجے سعید الظفر خاں اور رشید الظفر خاں رہتے تھے) عید گاہ کوٹھی اور ملحقة محلات صدر منزل شیش محل۔ موتی محل ہو محل قصر راحت منزل (سرکاری مہمان خانہ) گوہ محل۔ ریاض منزل اور قدسیہ محل وغیرہ وہ چند مشہور عمارتیں ہیں جن کے درود یوار آج بھی شاہانہ عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ ان شاہی عمارتوں کے مکین والیان ریاست کے عزیز واقارب بھی تھے شہر کے عوام اور معززین بھی اور اعلیٰ سرکاری عہدے دار اور افسر بھی۔ منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے سرکاری عمارتیں وزراء حکومت اور عہدے داران ریاست کے تصرف میں رہتی تھیں۔ جن کی تمام تر نگرانی اور دیکھ بھال ریاست کی

ذمہ داری تھی۔

”ریاض منزل“.....جہاں اقبال پہلی بار مقیم ہوئے شہر سے دور ایک وسیع اور پر شکوہ دو منزلہ عمارت تھی جو چہار جانب خوبصورت پہاڑیوں اور تالاب سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے عالی شان کمرے والاں کمپاؤنڈ ارڈگرد کے حسین منظر اور راس مسعود ایسے جاں نثار دوست کی قربت میں اقبال یہاں آ کر کافی مطمین ہوئے۔ ان کی عام صحت پر بھوپال کے حسین مناظر کا جس کا اکثر انہوں نے خطوں میں تذکرہ بھیکیا ہے، بہت اچھا اثر پڑا۔ ان کا یہ قیام اگرچہ علاج کے سلسلے میں تھا لیکن علاج سے پہلے مریض کو آسودگی طمانیت قلب خوش گوار ماحول اور پر سکون فضا کی جتنی ضرورت ہتی تھی وہ سب کچھ بلکہ توقعات سے کچھ زیادہ ہی اقبال کو بھوپال آنے کے بعد قیام گاہ مسعود یعنی ریاض منزل میں میرا آگئی۔ وہاں صرف راس مسعود ہی ان کے ہمدرد فیق و جلسی نہ تھے بلکہ ان کی بیگم بھی تھیں۔ جو راس مسعود سے زیادہ اقبال کی خبر گیری اور دیکھ بھال کے لیے ہمہ وقت موجود تھیں۔ پھر راس مسعود کے ارڈگرد بھوپال کی مشہور و ممتاز علمی و ادبی شخصیتیں بھی تھیں جن کے لیے اقبال کی بھوپال میں آمد باعث خخر و منزلت بھی تھی اور قربت واستفادہ کا ایک ذریعہ بھی.....خود شاعر مشرق کے لیے بھی بھوپال کا یہ قیام آسودگی خاطر کا سبب بن گیا جس کے عہد آفریں نتائج برآمد ہوئے۔ اور جن پرتارنخ ادب ہمیشہ نازاں رہے گی۔

بھوپال پہنچنے کے فوراً بعد راس مسعود نے اقبال کے علاج معالجہ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور حمید یہ ہسپتال میں ان کے خصوصی طبی معائنہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حمید یہ ہسپتال.....بھوپال کا بہترین اسپتال تھا جہاں ہر قسم کی سہولتیں فراہم تھیں۔ ڈاکٹر سید عبدالرحمن جو بھوپال کے چیف میڈیکل آفیسر اور اسپتال کے نگران تھے.....اپنے فنی تجربہ اعلیٰ قابلیت اور مرہار نہ تشخیص کے لیے دور دور تک مشہور تھے۔ ڈاکٹر رحمن کے علاوہ

حمدیہ ہسپتال میں خان بہادر ڈاکٹر احمد بخش ڈاکٹر سلطان، ڈاکٹر بوس، ڈاکٹر عبدالباسط وغیرہ بھی تھے جو اپنی اپنی جگہ پر بہترین صلاحیت کار کے مالک تھے۔ ان کے علاوہ بھوپال میں افسر الطباء حکیم سید ضیاء الحسن اور حکیم سلطان محمود ایسے طبیب حاذق بھی تھے۔ چنانچہ ان سب حضرات نے مشاورت کے بعد تین دن تک مسلسل اقبال کا طبی معائنه کیا تاکہ مرض اور علاج کی تشخیص سے قبل صحیح صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکے۔

۱۔ اس تاریخ ساز عمارت کی تصویر کتاب میں شامل ہے

بالآخر طبی معائنه کی رپورٹ کے بعد بھلی کا باقاعدہ علاج شروع ہو گیا۔ چنانچہ نذری نیازی نے بھوپال خط لکھ کر اقبال کی خیریت دریافت کی تو انہوں نے نہایت تسلی بخش جواب دیا۔

بھوپال سے یہ ان کا پہلا خط تھا جس میں انہوں نے طبی معائنه کے علاوہ ڈاکٹروں کی قابلیت کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے معینین کی تعریف کی تھی اور اس میں علاج کی تفصیل بھی ہے اور بھوپال کے خوش گوار موسم کا حال بھی:

”بھوپال.....ریاض منزل

۵ فروری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب.....السلام علیکم

آپ کا خط کل ملا۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ کھانسی کی شکایت اب باقی نہیں رہی۔ بھوپال کا موسم نہایت عمدہ ہے۔ امید ہے اس کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑے گا۔ طبی معائنه کل ختم ہوا۔ یہاں کے ڈاکٹر نہایت ہوشیار ہیں اور ہسپتال بھی نہایت عمدہ ہے۔ طبی معائنه سے جو نہایت مکمل تھا حکیم صاحب کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی بہر حال

آج گیارہ بجے سے Ultra Violet Rays کا نسل شروع ہو گا۔ جوابتدامیں صرف یہ منٹ روزانہ ہو گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے والسلام۔

محمد اقبال۔ ۵ فروری ۱۹۳۵ء۔ ۱

چار دن کے بعد ہی انہوں نے نیازی صاحب کو دوسرا خط لکھا۔

”ڈیر نیازی صاحب..... السلام علیکم“

اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں دوائی جو آپ نے ارسال کی تھی مل گئی ہے۔ امید ہے کہ آواز والی دوائی بھی لا ہو رپنچ گئی ہوں گی۔ بھلی اور Ultra Violet Rays سے علاج شروع ہے۔ ایک آدھہ ہفتہ کے بعد معلوم ہو گا کہ اس سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحبان یقین دلاتے ہیں کہ ضرور ہوا۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ بھوپال میں موسم نہایت عمدہ ہے فروری کے آخر تک بلکہ مارچ تک ایسا ہی رہے گا۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب اس وقت دہلی میں ہس سے افروری کو واپس آئیں گے والسلام۔

محمد اقبال۔ بھوپال

۹ فروری ۱۹۳۵ء۔ ۲

ان خطوط سے واضح طور پر متشرع ہے کہ وہ بھوپال کے موسم اور ڈاکٹروں کے علاج سے کافی مطمئن تھے۔ نواب صاحب ان دنوں پنسز چیمبرس کے اجلاس کی صدارت کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اقبال کی ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی البتہ افروری کے

بعد وہ راس مسعود کی معیت میں کئی بار نواب صاحب سے ملاقات کے لیے احمد آباد تشریف لے گئے۔

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۵۶ ۲۔ ماوراء نفسی شاعروں۔ (نیازی)

۳۔ ”میں“ سہوار گیا (نیازی) ۴۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۵۷

ان ملاقاتوں میں صحت و علاج سے لے کر سیاسی مسائل تک ہر موضوع پر تبادلہ خیالات ہوا۔ ذاتی مسائل بھی زیر بحث آئے۔ باہمی دلچسپی کے دیگر امور بھی موضوع گفتگو رہے اور اس طرح دیرینہ روایط کی تجدید ہوتی رہی سر راس مسعود اقبال سے بے حد محبت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اس امر کے لیے کوشش تھے کہ اقبال مالی پریشانیوں سے جلد نجات پا لیں چنانچہ مالی اعانت اور مستقل وظیفہ کی چند تجویز انہوں نے علی حیدر عباسی، مشیرالمہام صیخ سیاسیہ کے توسط سے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیں۔ جن کی تصدیق خود عباسی صاحب نے جوان دونوں کراچی میں ہیں امتحان سے گفتگو کے دوران فرمائی۔ راس مسعود کی ان مخلصانہ اور عقیدت مندانہ کوششوں کے نتائج جلد ہی سامنے آ گئے۔ اور وہ فخر و امتیاز جو ہندوستان کی کسی ریاست کو نصیب نہ ہوسکا۔ راس مسعود کی تہبا کوششوں سے ریاست بھوپال کے حصہ میں آ گیا۔ اور تاریخ کامٹ باب بن گیا۔

اقبال ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے اور راس مسعود بھی ملک کی مقتدر ترین شخصیتوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان دونوں کے قرب اور واپسی نے بھوپال میں چار چاند لاگا دیے تھے اراب جب کہ بسلسلہ علاج اقبال بھوپال میں مقیم تھے۔ ان کے ہزاروں بلکہ لاکھوں عقیدت مندوں اور نیازمندوں کی نگاہیں بھوپال پر لگی تھیں گویا ہندوستان سمٹ کر ایک مرکز بن گیا تھا اور وہ مرکز تھا بھوپال جس کے روح رواں اقبال بھی تھے اور ان کے معزز میزبان راس مسعود اور نواب حمید اللہ خاں بھی جن کے طفیل اس ریاست کی اہمیت اور

ادبی عظمت میں اضافہ ہوا تھا۔ اور وہ بھوپال سے دارالاقبال بن گیا تھا۔
اقبال کا علاج نہایت احتیاط اور توجہ سے جاری تھا۔ لیکن انہیں والدہ جاوید کی علاالت
سے بڑی تشویش تھی جو عرصہ سے بیمار تھیں۔ بھوپال میں رہتے ہوئے بھی اقبال جسم و جان
کے رشتہوں کو منقطع نہیں کر سکتے تھے۔ وہ حکیم نایبا کے زیر علاج تھیں چنانچہ جو خطوط اپنی بیگم
کی ادویہ کے لاہور بھینے کے سلسلے میں انہوں نے نذر نیازی کو لکھے ہیں ان کے مطالعے
سے کافی فکرمندی اور تردود کا اظہار ہوتا ہے۔ افروزی ۱۹۳۵ء کے دونوں خطوط دوالا ہورنے
پنچ کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔

”بھوپال۔ ریاض منزل“

۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب..... السلام علیکم

اس سے پہلے ایک اور خط لکھ چکا ہوں امید ہے پہنچا ہوگا۔ مجھے
یاد آتا ہے کہ آپ نے جاوید کی والدہ کے لیے دوائے کردہ بیلی سے اسی
روز روانہ کر دی تھی۔ جس روز میں دہلی سے بھوپال روانہ ہوا تھا۔ مگر
بھائی صاحب کا ایک خط ۶ فروری کا لکھا ہوا آج مجھے بھوپال میں ملا
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوا آج تک نہیں پہنچی۔ مہربانی کر کے فوراً
ڈاک خانہ سے دریافت کریں کہ کیا معاملہ ہے۔ اور اگر ممکن ہو تو اور
دوائے کر جلد ارسال کر دیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے
یہاں (کا) ۲ موم بہت اچھا ہے۔ بھلی کا علاج شروع ہے۔ میں
انشاء اللہ آخیر فروری تک واپس ہوں گا والسلام محمد اقبال اس خط کا
جواب جلد دیں۔“

۱۔ افسوس کے ۲۷ اکتوبر میں انتقال ہو گیا۔

۲۔ ”کا“ شاید سہوارہ گیا ہے (نیازی) میرے خیال میں ”کا“ کے بغیر بھی مفہوم ادا ہوتا ہے۔

۳۔ مکتوبات اقبال صحیح ۲۵۸

”بھوپال.....۱۹۳۵ء افروری“

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

میں نے آپ کو ابھی ایک خط دوا کے متعلق لکھا ہے۔ بھائی
صاحب کا خط لا ہور سے آیا تھا کہ دو ارسل نیازی صاحب ابھی تک
نہیں پہنچی۔ مجھے اس سے بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ آپ نے مجھ سے کہا
تھا کہ دو ارسل کر دی ہے مگر اب معلوم ہوا کہ آپ کی مرسلہ دوا کا
پارسل لا ہور پہنچ گیا تھا۔ مگر وہاں سے ڈاک خانہ لا ہور نے اسے
بھوپال بھیج دیا۔ کیونکہ میں آتی دفعہ ڈاک خانہ کو ہدایت دے آیا تھا
کہ میرے خطوط اور پارسل بھوپال بھیج دیے جائیں چونکہ آپ نے
یہ پارسل میرے پتے پر بھیجا تھا اس لیے ڈاک خانہ والوں نے وہیں
اس کو بھوپال کر دیا۔ لہذا آپ متعدد نہ ہوں۔ میں یہ پارسل یہاں
سے لا ہور بھیج ہوں.....والسلام

محمد اقبال،

بھوپال کی آب و ہوانے اقبال کی صحت پر اچھا اثر ڈالا تھا بھلی کا علاج بھی وقفہ وقفہ
سے ہو رہا تھا۔ ڈاکڑوں کی خصوصی توجہ سے اقبال بے حد مطمئن تھے۔ لیکن ڈاکڑوں کا یہ کہنا
تھا کہ وہ کم سے کم تین ماہ جنم کر علاج کریں جو فی الوقت ممکن نہ تھا کیونکہ انہیں والدہ جاوید کی

مسلسل عالالت سے خاصی تشویش تھی۔ پھر بھی انہوں نے راس مسعود اور ڈاکٹروں کے مشورہ پر عمل کیا اور بھلی کا علاج کا ایک کورس مکمل کرنا ضروری سمجھا۔

ابھی ان کا صرف چار مرتبہ بھلی سے علاج ہوا تھا جس سے آواز میں نسبتاً فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ کم سے کم ۸ سے ۱۰ مرتبہ بھلی کا علاج ہو جانے کے بعد اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ جس کا اظہار ۱۳ افروری ۱۹۳۵ء کے خط میں بھی انہوں نے کیا تھا۔

”بھوپال۔ ۱۳ افروری ۱۹۳۵ء“

ڈیرینیازی صاحب..... السلام علیکم

آپ کو میں نے کل دو خط لکھے ہیں۔ امید ہے کہ پہنچے ہوں گے۔ دوا کا پارسل جو جاوید کی والدہ کے لیے تھا لا ہور سے واپس ہو کر بیہاں آگیا تھا۔ اب میں نے وہاں بھیج دیا ہے بھلی کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا ہے۔ کچھ خفیف سا فرق آواز میں ہے مگر زیادہ وضاحت سے آٹھ دس دفعہ کے علاج کے بعد معلوم ہو گا اس واسطے آپ ابھی حکیم سا حب والی دوا ارسال نہ کریں۔

موسم بہت اچھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صبح و شام دیکھتے ہیں اور بہت پر امید ہیں کہ مہینے کے اختتام تک نمایاں فرق ہو گا۔ بعض کی حالت اور دل اور پھیپھڑوں کی حالت بہت عمدہ ہے میں انشاء اللہ اس ماہ کے آخر تک واپس ہوں گا۔ بشرطیکہ کوئی خاص امر مانع نہ ہوا

۲.....

محمد اقبال،“

اس خط میں بھی انہوں نے بھوپال کے موسم کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے اپنی عام صحت کے بارے میں اطمینان کا اظہار کیا ہے اور آخر ماہ فروری تک بھوپال میں قیام و علاج کے قصد سے بھی نیازی صاحب کو اطلاع دی ہے۔ لیکن وہ آخر فروری کے بجائے ۷ مارچ ۱۹۳۵ء تک بھوپال میں قیام پذیر رہے۔ اور راس مسعود اور بیگم راس مسعود کے علاوہ بھوپال کی کئی مشہور و ممتاز شخصیتوں کو بھی اقبال سے ملنے تباہ لے خیالات کرنے اور استفادہ کرنے کے موقع نصیب ہو گئے ان شخصیتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممنون حسن خاں پرنسل سیکرٹری سر راس مسعود مولا نا ارشد تھانوی سید محمد یوسف قیصر بھوپالی۔ مائل نقوی علی حیدر عباسی۔ مولوی شکر اللہ سہیل۔ قاضی ولی محمد۔ سہبا مجددی۔ ذکری دارثی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قیام ”ریاض منزل“ کی چند جگہیاں آپ کو ذیل کے واقعات میں بھی مل جائیں گی جن کو محفوظ کرنے کا سہرا مشہور اہل قلم فقیر سید وحید الدین مرہوم کے سر ہے۔ انہوں نے روزگار فقیر جلد اول میں مختلف عنوانات کے تحت جس خلوص و محنت سے اقبال کی عام زندگی کے ان گنت ممتد واقعات کو جمع کر کے شاعر مشرق کی جتنی سمجھ اور پچی تصویر کشی کی ہے اس کا علم اس سے پہلے کسی کو نہیں تھا۔ فقیر سید وحید الدین کا یہ کارنامہ تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس لیے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہی اقبال کی عظیم خصوصیت کے خدو خال مکمل ہوتے ہیں۔ وہ آفاقی شاعر بے شک تھے لیکن وہ ایک انسان بھی تھے اور ان کی زندگی بھی عام انسانوں کی طرح دکھ سکھ رنج و راحت آسودگی و بے اطمینانی سے ہم کنار تھی..... چنانچہ روزگار فقیر میں جو واقعات انہوں نے سید راس مسعود مرہوم کی بیگم و سے جو

اب نواب زادہ راحت سعید چھتاری کی رفیقة حیات ہیں براہ راس تحاصل کر کے شامل کتاب کیے ہیں ان کے اقتباسات سے ”ریاض منزل“ کے شب و روز کی جیتی جاگتی تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ اقبال پہلی بار علاج کے سلسلے میں ایک ماہ سات دن قیام پذیر رہے۔ ایک ماہ سات تن کا عرصہ معمولی عرصہ نہیں ہے۔ بلکہ اس عرصہ کو اقبال نے جاوداں کر دیا ہے۔ جس کا ثبوت یہ چند مستند واقعات بھی ہیں اور وہ یادگار نظمیں بھی جو ”ریاض منزل“ میں اقبال نے کہیں اور ”ضرب کلیم“ میں شامل ہوئیں۔ روزگار فقیر جلد اول میں بھوپال میں عنوان سے سید فقیر وحید الدین لکھتے ہیں:

”.....ڈاکٹر محمد اقبال اور راس مسعود کے دوستانہ روابط وقت

کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور مضبوط ہوتے چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی عالالت نے جب طول کھینچا تو سر راس مسعود نے ان کے علاج معاملہ کا بھوپال ہی میں معقول انتظام کیا۔ ان دونوں ڈاکٹر صاحب کے گلے کی تکلیف بڑھ چکی تھی۔ اور ان کی آوازاتی خفیف اور مدھم ہو چکی تھی کہ دوسروں کی سماعت تک بڑی مشک اور دشواری سے پہنچتی تھی۔“

بھوپال میں ڈاکٹر صاحب کا زیادہ تر وقت سر راس مسعود کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال میں گزرتا بیگم راس مسعود بھی اس گفتگو میں حصہ لیتیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اکثر معموم اور فکر مند پایا گیا اور یہم اور فکر اپنے لینے نہیں بلکہ قوم کے لیے ہوتی تھی۔ بڑے ہی پرسوں لہجے میں اکثر و پیشتر ڈاکٹر صاحب یہ فقرہ دہراتے۔

”قوم کا تاریک مستقبل خود اپنی ہی غلطیوں سے ایک مستقل حقیقت بنتا جا رہا ہے۔ اور افراد کی بے حسی دیکھ کر میری مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب بسا اوقات رات کو دیر تک کوٹھی کے شہنشین پر تہبا بیٹھے رہتے اور زار و قطار روتے رہتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر سوز غم کی بھٹی سلگ رہی ہے جو انہیں چین سے نہیں رہنے دیتی۔ ڈاکٹر جانسن جن کا ذکر اس کتاب میں پڑھنے والوں کو ملے گا۔ بھوپال میں آ کر ہی ڈاکٹر صاحب سیکلے اور بہت سے مسائل پر تابادلہ خیال کیا۔ لیڈی راس مسعود جو شعروادب کا نہایت ہی پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں ڈاکٹر صاحب کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں ہر وقت مصروف رہتیں۔ راس مسعود اور ان کی بیگم دونوں میاں بیوی ڈاکٹر صاحب کے نہ صرف یہ کہ قدر شناس تھے بلکہ ان کی ذات سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ لیڈی مسعود ان گزرے ہوئے واقعات کا ذکر فرماتی ہیں تو ڈاکٹر صاحب کے اس فقرے کو اکثر دہراتی ہیں۔

انگریزی نے اپنی سلطنت کی بنیاد مسلمانوں کی ہڈیوں پر رکھی ہے۔

شعر کا مفہوم

..... ڈاکٹر صاحب کی شہرہ آفاق کتاب ”بال جبریل“ جب منظر عام پر آئی تو انہوں نے سر راس مسعود کو ایک جلد پیش کی اور کتاب پر اپنے دستخط ثبت فرمادیے۔ بیگم مسعود بھی اس وقت موجود تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب آپ کا کلام ان سے بہتر سمجھتی ہوں اور آپ کتاب ان کو عنایت فرمائے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب اس نظرے سے بہت محظوظ ہوئے اور دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں اپنا شعر سناتا ہوں تم میں سے جو کوئی اس کی زیادہ صحیح اور بہتر تشریع کرے گا وہی اس کتاب کا مستحق قرار پائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھا۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا
سر راس مسعود اور ان کی بیگم صاحبہ دونوں نے اپنے اپنے الفاظ میں اس شعر کا مفہوم
بیان کیا لیکن وقت کی بات کہ بیگم راس مسعود کی شرح و ترجمانی زیادہ بہتر ارو شاعر کے مانی
اضمیر سے قریب تر نکلی چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے بال جبریل کے سروق پر راس مسعود کے
بجائے بیگم راس مسعود لکھ دیا اور کتاب ان کو دے دی۔

محبت کی شادی

.....ایک دن بیگم راس مسعود اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان اس موضوع پر بحث چل
نکلی کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح و شادی کے دائرے میں آنے سے قبل فریقین کے مابین
محبت و انس کی کسی حد تک جھلک اور آمیزش ضرور ہونی چاہیے ڈاکٹر صاحب نے اس
موقع پر فرمایا:

۱۔ روزگار فقیر۔ (جلد اول) صفحہ ۱۵۳-۱۵۲

۲۔ روزگار فقیر۔ (جلد اول) صفحہ ۱۵۵

”شادی کا بنیادی مقصد صالح تو ان اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا

ہے اور رومان کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔“

بیگم راس مسعود نے کہا آج کل والدین لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اپنی پسند اور مرضی

سے رشتوں کا جس طرح انتخاب کرتے ہیں اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا عموماً ان تمام ضروری باتوں کو پیش نظر رکھ کر ہی والدین ا
رشتے طے کرتے ہیں۔

الہامی شاعری

ڈاکٹر صاحب اس وقت شعر کہتے جب ان پر خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ یہی سبب تھا
کہ ان کے واردات قلبی کسی زحمت و تکلیف کے بغیر اشعار کے قالب میں ڈھلنے جاتے وہ جو
فرمایا گیا ہے:

شاعری پیغمبری جزویست از

تو اقبال کی شاری اس مصروف کا صحیح مصدقہ ہے۔

ٹھیک یہی رائے بیگم راس مسعود کی بھی ہے ڈاکٹر صاحب نے ان کے یہاں طویل
قیام فرماتے تھے۔ بیگم صاحبہ ان کی میزبانی اور خاطر مدارت میں لگی رہتیں۔ ڈاکٹر صاحب
یکوں ہوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کی عادات مشاغل، اور رجحانات کے مطلع
کے موقع انہیں میسر آتے رہے ہیں۔

بیگم راس مسعود فرماتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی شعر گوئی کی کیفیت و حالت دیکھ کر ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کے وجدان پر الہام کی بارش ہو رہی ہے۔ جب ایسا وقت آتا تو
ڈاکٹر صاحب خلوت و تہائی کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس فرماتے توہ ایسے میں کسی کو
اپنے پاس بیٹھانا پسند نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے عزیز ترین دوست سے بھی بلا تکلف
کہہ دیتے کہ بھائی اس وقت تو میں تہائی چاہتا ہوں۔ ہاں کل کسی وقت آنا۔ پھر فرصت سے
بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔

دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر صاحب کے تکیہ کے نیچے سے جو کاغذ برآمد ہوتا وہ تازہ ترین
شعر و لمحوں سے مزین ہوتا۔

مخلوط تعلیم

صنف نازک کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ کہ خواتین کا کام گھروں میں رہ کر نسل کو تربیت دینا ہے۔ کہ اس طرح معاشرے میں اعتدال و سکون قائم رہ سکتا ہے۔
دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب عورت کو شمعِ الجنم نہیں چرا غخانہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے یورپ کی زندگی کی تھی کہ عورت نے وہاں جب گھر یا ذمہ داری تبدیل منزل اور خانہ داری کو خیر باد کہا ہے۔ یورپ کا معاشرہ تباہ واپس ہو کر رہ گیا ہے۔ اور گھر یا زندگیاں بے مزہ اور بے سکون ہو گئی ہیں ایک دن بیگم راس مسعود نے قدرے شکایت کے انداز میں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مرد خود تو تفریح کرنے اور دل بہلانے کے لیے رقص و سرود کی مغلولوں اور کلب گھروں میں چلے جاتے ہیں۔

۱۔ سہو کتابت سے رہ گیا ہے۔

۲۔ روزگار فقیر (جلد اول) صفحہ ۱۵۶

۳۔ روزگار فقیر۔ (جلد اول) صفحہ ۱۵۸

لیکن بیچاری عورتوں کو چہار دیواری میں مقید رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔
ڈاکٹر صاحب نے نہات ہی متین لہجہ میں کہا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس میں تمام تر خواتین کا ہی فائدہ ہے۔ سفر افغانستان سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب سے مزید دریافت کیا گیا کہ جب قرآن کریم تمام انسانوں کو علم و آگہی حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی جدید یعنی سہولتوں پر کیوں قدنگانی جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا بے شک قرآن کریم میں حصول علم پر بڑا زور دیا گیا ہے لیکن اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ بڑے کے اور بڑے کیاں ایک مکتب میں مل کر تعییم حاصل کریں

پرده اور مخلوط تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات بڑے واضح تھے۔ اور وہ اپنے اس موقف تھے بال برابر ہٹانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے خود اپنی زندگی میں اس کا عملی ثبوت دیا کہ اپنی پچی منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لئے بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد علی گڑھ سے ایک معلمہ بلوائی جس نے گھر میں رہ کر پچی کو تعلیم دی۔

ڈاکٹر صاحب منطقی اور فلسفیانہ انداز میں مردوں اور عورتوں کو ایسے مختلف خوش رنگ اور مہکتے پھولوں سے تعبیر کیا کرتے تھے کہ جن کو پروان چڑھانے کے لیے جدا گانہ اقسام کی کھاد درکار ہوتی ہے۔ وہ زن و مرد کی ترقی نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لیے جدا گانہ میدان عمل کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے سے مختلف بنایا اور فرائض کے اعتبار سے بھی۔ فولاد اور پھول کی ڈالی سے ایک جیسا کام نہیں لیا جا سکتا۔ چند اور دلچسپ واقعات ہمیں غلام السید یعنی کی کتاب آندھی میں چراغ میں مل جاتے ہیں جو ”ریاض منزل“ سے ہی تعلق رکھتے ہیں ملاحظہ ہو:

”.....بھوپال میں ابھی چند روزان کے ساتھ ٹھہر نے اشرف

نصیب ہوا میں عمر بھرا سمیز بان عزیز کی مہمان نوازی کے لطف اور خلوص و محبت کے سلوک کو نہ بھولوں گا۔ اس زمانے میں ان کا اور لیڈی راس مسعود کا قیام ریاض منزل میں تھا۔ یہ وہ مکان ہے جس کے دل کش پر فضا منتظر اور ماحول نے اقبال کے تغزل کو باوجود دان کی علالت کے از سر نوبیدا رکر دیا تھا جہاں انہوں نے یہ اشعار لکھتے تھے:

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
 یہ بحر یہ فلک نیگوں پہنائی
 سفر عروس قمر کا عماری شب میں
 طلوع مہر و سکوت سپہر بینائی
 سر راس مسعود اور لیڈی راس مسعود کی شفقت بھری میزبانی
 اب ایک حسین خواب معلوم ہوتی ہے۔ وہ مہمان کی پذیرائی پر اس
 حد درجہ اہتمام کرتے تھے کہ یہ زمانہ بعض لحاظ سے ان کی مجلسی اور
 خانگی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ ذاتی افکار سے بہتر حد تک نجات پا
 کر ان کا دماغ بھوپال اور اہل بھوپال کی بہتری کی تدبیریں سوچنے
 میں مصروف رہتا تھا۔ اپنی علمی اور ادبی دلچسپیوں کی طرف بھی وہ
 زیادہ توجہ کر سکتے تھے۔ ایک روز صبح کے وقت کوئی کتاب لینے کے
 لیے میں ان کے کتب خانے کا دروازہ کھولا تو آٹھ دس پنڈت بڑی
 بڑی پگڑیاں باندھے ان کے گرد بیٹھے تھے۔ میں نے دریافت کیا
 سید صاحب یہ کیا ہو رہا ہے معلوم ہوا کہ ان کی نگرانی میں سنکریت کی
 بعض کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جا رہا ہے۔

۱۶۲ تا ۱۶۳ صفحات (جلد اول) روزگار فقیر

آٹھویں دن یہ سب ودواں اپنے اپنے ترجمے کر کے لائے ہیں
 اور مسعود صاحب ان سب کو پڑھوا کر سنتے اور ان کا مقابلہ کرتے
 ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی علمی اور ادبی دلچسپیاں غیر معمولی طور پر
 وسیع تھیں۔ حافظ، میر، انس، حالی، اقبال کا بہت سا کلام انہیں حفظ تھا۔

انگریزی اور فرانسیسی کے ہزاروں اچھے اچھے شعر ان کی زبان پر تھے۔ انیں کے بعض مرثیوں کا ترجمہ انہوں نے انگریزی نظم میں اس قابلیت سے کیا تھا کہ اہل زبان اس کی داد دیتے تھے۔ ان کی تحریر کردہ تقریر دونوں میں ایک خاص شکافتنی اور جدت تھی۔ موسیقی اور مصوری دونوں میں بہت عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ اور مشرق و مغرب کی آرٹ کی تحریکیوں سے باخبر تھے۔

ان آخری بے تکلفی کی ملاقاتوں میں ان سے گھنٹوں باقیں ہوئیں ان کے دل میں کیا کیا منصوبے تھے۔ کتنے بڑے بڑے علمی اور ادبی کام کرنے کی امنگ تھی۔ خیالات میں ختنی بلندی اور وسعت تھی۔ دل میں ملک اور قوم کا کتنا دردھا لوگوں سے کام لینے کی کتنی اچھی صلاحیت تھی ان سے گفتگو کر کے دل شیر ہو جاتا تھا۔ جس قوم میں ایسے انسان موجود ہوں اس کے مستقبل کی طرف سے ماپوں ہونے کی ضرورت نہیں۔

”ان کی طبیعت سے فقر اور بے نیازی کا ایک خاص انداز تھا۔

جو صرف ان لوگوں کے حصے میں آتا تھا جو دراصل بڑھتے ہیں۔ انہیں کبھی یہ فکر نہ ہوتی کہ دوسروں پر اپنی عظمت کا نقش قائم کریں اور فکر کیوں ہوتی؟ ہمالہ پہاڑ کبھی خود اپنی بلند کا اعلان نہیں کرتا۔ ان کو نہ سر بلندوں سے انسار تھا نہ خاکساروں سے سر بلند نہ ہر شخص انسان ہونے کی حیثیت سے انسانی سلوک کا مستحق تھا۔ بلکہ ہم میں نے کبھی کبھی یہ دیکھا کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ گرم جوشی اور آمادگی سے

ملتے اور جن لوگوں کو دولت اور منصب کی وجہ سے دنیا بڑا سمجھتی ہے ان سے ملنے میں تامل کرتے۔ انتقال سے کوئی دوسال پہلے جب وہ بھوپال میں مقیم تھے سر راس مسعود کے مقامید وست اور پیروں عائدین برابر ان کے ہاتھ آتے جاتے رہتے تھے۔ اور جب آئے قدرتاً اقبال سے ملنے کی خواہش کرتے اقبال اکثر یہ کہتے کہ کیوں بھتی مسعود کیا یہ ممکن ہے کہ ان کو کسی طرح ٹال دو۔ برخلاف اس کے جب وہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو وہاں اکثر معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور باقی میں کرتے۔

خیر و خوبی برخواص آمد حرام

دیدہ ام صدق و صفا اندر عوام ۲

اقبال کے انگریزی خطبات میں ایک چھوٹا سا معنی خیز جملہ ہے جو اس بارے میں اس کی بنیادی پوزیشن کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے

۱ آندھی میں چراغ، یا کستانی ایڈیشن ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۳۷-۱۳۵

۲ آندھی میں چراغ۔ صفحہ ۱۳۳

اور افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کے لیے ایک صحیح بنیاد اور ایک صالح اصول کا تعین کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خودی کو قائم رکھنے کے لیے ہم جو کام بھی کریں اس میں ایک اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے یعنی اپنی خودی کا بھی احترام کریں اور دوسروں کی خودی کا بھی۔ اپنی خودی کا احترام یہ ایک ایسا سر ہے جو اقبال کے کلام میں شروع سے آخر تک سنائی دیتا ہے۔ اس عقیدے کی روشنی میں اقبال نے انسان کے بلند مقام کو پہچانا۔

اسے ایک امید اور حوصلہ آفریں پیغام دیا اور ان راستوں کی جھلک دکھائی جو اس کو ہم دوش
ثریا کر سکتے ہیں۔

ریاض منزل..... دولت کدہ راس مسعود کے قیام میں ایک واقعہ کا تذکرہ بھی خالی از
دلچسپی نہ ہو گا پر وفیر شید احمد صدیقی جواباً اور راس مسعود کے نیازمند اور عقیدت کیش
تھے بیان کرتے ہیں:

”.....مرحوم کو سید راس مسعود سے بڑی شیفتگی تھی۔ اسی طرح

سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم
سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا
موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر
مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری
مقرر کر دیا تھا جو صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو قرآن پاک سناتے
۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لیڈی موصوف کی دوسری بچی نادرہ
پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش ہجہ
قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر
پڑے گا ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارمغان حجاز
میں دختر ان ملت کو یوں مخاطب کیا ہے۔

زشام مابروں آور سحر را
بہ قرآن باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرات تو
دگرگوں کرد تقدیر عمر را

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو
لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لیے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی
دیکھتے ہیں کہ یہ فریضہ پورا ہوتا ہے یا نہیں ایک دن کا واقعہ ہے کہ
مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں لیڈی
مسعود کہاں ہیں؟ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تنخ ہو کر اپنی زبان
سے کہا قرآن کیا سینیں گی وہ تصحیح ہی صحیح باغ میں پھول کائے چلی
جاتی ہیں وہاں سے فرصت ملے تو آئیں میں کیا کروں مرحوم خاموش
ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ صبر علی بخش صبر یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے!
اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کی نظر کہاں تھی؟ میرے نزدیک تو
اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ ان کی فکر و فرزانگی شاعری و
شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان

ہے۔

۱۵۳ صفحہ غیر چار آندھی میں

یہ وہی مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے
دوسرے لوگوں سے جو ہم سے بڑے ہیں منفرد ملتے ہیں اور جدا ہو کر
ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا
تصور بھی دشوار ہوتا ہے۔

اسی واقعہ کو فقیر الدین (مرحوم) نے بغوان نادرہ مسعود^۲ قدرے وضاحت سے بیان
کیا ہے جس کی بیگم راس مسعود نے بھی حرف بہ حرف تصدیق کی ہے۔
”ریاض منزل“ کے زمانہ قیام کے ان چند واقعات کے علاوہ ایک معمولی واقعہ کا

تذکرہ سید نذرینیازی کے مضمون بعنوان علامہ اقبال کی آخری علاالت میں ہمیں ملتا ہے وہ لکھتے ہیں:

بھوپال می حضرت علامہ کا قیام بالعموم سر راس مسعود ہی کے یہاں رہتا ہے اس سر راس مسعود ان کے آرام و آسائش کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ خود حضرت علامہ کو بھی تعجب ہوتا۔ انہوں نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک روز جب انہیں پیٹھ کے درد کا ہلاکا سادورہ ہوا تو ڈاکٹروں نے سر راس مسعود سے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس درد کا اصلی سبب ضعف قلب ہے لہذا انہیں چاہی کہ نقل و حرکت میں احتیاط رکھیں حضرت علامہ کہتے ہیں:

”..... ”ریاض منزل“ میں میرا قیام بالائی کمروں میں تھا۔ میں

جب اوپر جاتا تو سید صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ دونوں ہاتھوں سے مجھے سہارا دیتے تاکہ میں زینہ چڑھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک آدھ روز تو خیر میں سے اپنے شفیق دوست کی پاسداری کے خیال سے کچھ نہ کہا لیکن تیسری مرتبہ جب پھر یہی صورت پیش آئی تو میں نے کہا۔ آپ اور لیڈی صاحبہ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔ اسی دن یا شاید اگلے روز میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ سر راس مسعود دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور گھبرا کر کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کیا غضب کرتے ہیں آرام سے لیٹے رہیے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کے نزدیک میری بیماری کس قدر خطرناک ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ جس کا تذکرہ محمد عبداللہ قریشی نے اپنے ایک مضمون بعنوان حقیقت وحی اور اقبال میں ڈاکٹر ظہیر الدین احمد

الجامعی صدر شعبہ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کن کے حوالے سے کیا ہے ڈاکٹر
صاحب کا بیان ہے:

”ایک مرتبہ لاہور جاتے ہوئے میں راس مسعود سے ملنے
بھوپال اتر گیا۔ اتفاق سے اقبال بھی مسعود ہی کے مکان پر فروش
تھے۔ لیکن بیماری کا ان پر غلبہ تھا۔ تقریباً فریش تھے۔ معراج کی شب
تھی مسعود کا مدارالمہام امور مذہبی کی حیثیت سے مسجد شاہجہانی میں
منعقدہ تقریب میں شرکیک ہونا شاید ضروری تھا۔ تقریب معراج میں
جاتے ہوئے مسعود نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔

۱۔ گنج ہائے گرانیمایہ صفحہ ۱۸۲، ۱۸۵

۲۔ روزگار فقیر (جلد اول) صفحہ ۱۲۲-۱۲۳

۳۔ رسالہ اردو ہلی اقبال نمبر اکتوبر ۱۹۳۸ء صفحہ ۳۰۸

۴۔ ماہنامہ ادبی دنیا لاہور میں ۱۹۶۵ء صفحات ۱۲ تا ۱۳

منبر پر فروکش ایک مولانا واعظ فرم رہے تھے۔ انہوں نے وہی
اور نبوت کے اسرار جس عالمیانہ ادنیٰ میں پیش کیے اور جد دریدہ و فتنی
کے ساتھ اس موقع پر اقبال نے کلام سے استناد کیا۔ راس مسعود کو اس
جہل و جرأت نے بہت دکھ پہنچایا۔ وہ ان مہملات کو سننے کی تاب نہ لے
سکے زیادہ دریتک وہاں نہ ٹھہر سکے اور جلد ہی لوٹ آئے۔ گھر پہنچ تو
اقبال جاگ رہے تھے اور قلبی دورے کی وجہ سے کسی قدر بے چین
تھے۔ مسعود جن کی سحر بیانی خوش کلامی اور ادبیانہ انداز گفتگو فطری
ظرافت اور خوش طبعی اقبال کے لے ہزاروں دواویں کی ایک دواہوا

کرتی تھی اقبال کی مزاج پرسی کے لیے ان کے کمرے میں چلے گئے
اور ان کا دل بہلانے کی خاطر نہایت ہی دلچسپ اور شیریں انداز
میں مولانا کی اس ہرزہ سرائی کا ذکر کیا جس سے خود مسعود تو پر دل
ہوئے تھے لیکن اقبال کو خوش دل کر دیا۔

اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ مسعود کی گفتگو نے تریاق کا کام کیا
ہے۔ یک بارگی شکفتگی کے آثار پیدا ہوئے اقبال کے چہرے پر
بشاشت پھیل گئی اور انہوں نے بڑے ہی طریف لیکن متین انداز میں
کہا۔

اگر مولانا نے میرے کلام کو حسب منشا استعمال کیا ہے تو اس
میں تجب کی کون سی بات ہے؟

اس موقع پر اقبال نے امام غزالی کا بھی ایک واقعہ بیان کیا فرمایا کہ طویل سفر کی مشقتیں
برداشت کرنے کے بعد غزالی دمشق پہنچے جمعہ کا دن تھا جمعہ پڑھنے کے لیے جامع امویہ کا
قصد کیا مسجد بھری ہوئی تھی سیڑھیوں کے قریب جو تیوں کے پاس جگہ پائی صفائیں چیر کر آگے
بڑھنے کی بجائے درویشانہ انداز میں وہیں بیٹھ گئے۔ نماز کے بعد ایک واعظ نے اپنی چرب
زبانی کے جوہر دکھائے شروع کیے۔ ایک موقع پر اپنے کسی قول کی تائید میں اس نے امام
غزالی کا نام استعمال کیا۔ غزالی چونکے ہوئے اور برے حیران ہوئے انہوں نے اپنی نیک
نفسی سے واعظ کے متعلق بدگمان ہونے کے بجائے یہ خیال کیا کہ کسی غلط روایت پر اعتماد
کر کے میری جانب یہ قول منسوب کر دیا ہے۔

آداب فقر و درویشی نے امام غزالی کو فوراً واعظ کی اس غلطی کی تصحیح کی اجازت نہ دی مگر
جب واعظ ختم ہو گیا اور مجمع حچٹ چکا تو انہیانی تواضع اور انگسار کے ساتھ آگے بڑھے اور

واعظ سے تخلیہ میں کچھ کہنے کی درخواست کی غزالی عمر میں واعظ کے باپ ہو سکتے تھے۔ مگر
واعظ نے ان کو پچھہ کہہ کر مخاطب کیا اور کہا۔
”میاں ہم سے تخلیہ کیا جو چاہو کہہ دو۔“

غزالی نے جب واعظ کو اس غلط انتساب پر متنبہ کیا تو وہ یک دم طیش میں آگئے کہا:
کچھ دماغ میں خلل تو نہیں ہوا ہے کہ خود کو غزالی سمجھنے لگا ہے۔ ارے تیرے باپ نے
تیرا نام غزالی رکھ دیا ہے تو کیا تو امام غزالی بن گیا ہے؟
امام غزالی اس کا جواب تو کیا دیتے صبر کیا اور خاموشی کے ساتھ لوٹ آئے۔ یہ واقعہ
سنانے کے بعد اقبال نے مسکراتے ہوئے فرمایا:
”اگر میں مولانا سے یہ کہتا کہ میرا یہ منشا ہرگز نہیں تھا جس کا
انطہار آپ فرمائے ہیں تو شاید غزالی سے کچھ بہتر سلوک میرے
ساتھ نہ کیا جاتا۔“

مسعود سے اس تھوڑی سی گفتگو کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقبال بالکل تدرست ہو
چکے ہیں لیکن مسعود نے زیادہ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور ان کو آرام کی نیند سونے کے لیے
خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑھ ہوئے۔
اقبال کے لیے ملاجی کی اس ہرزہ سرائی نے مہیز کا کام کیا اور ایک بہترین الہام کا
سامان مہیا کر دیا۔

خدا شرے بر انگیزد کہ خیر مادر آں باشد
ڈاکٹر ظہیر فرماتے ہیں کہ جب ہم اقبال کے ساتھ صبح چائے پی رہے تھے تو اقبال نے
کہا کہ رات کو حقیقت وحی کے متعلق ایک بے ساختہ ایک خیال نظم ہو گیا۔ مسعود جن کے لیے
اقبال کا ہر لفظ الہام کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نئے الہام کے سننے کے لیے سراپا اشتیاق اور مجسم

گوش دکھائی دینے لگے۔ اقبال نے حسب معمول اپنے پرتمکین اور باوقار لمحہ میں فرمایا:

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تجھیں تو بون کار حیات
فکر بے نور ترا اور عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات لے

حقیقت وحی کے متعلق اس ملہمانہ خیال کو اور خود اقبال کی زبانی سن کر ایک عجیب وجود اور سرشاری کی کیفیت تھی جو صرف محسوس ہی کی جاسکتی ہے۔ مسعود تو تقریباً جھوم رہے تھے اور مزے لے لے کر اس قطعہ کو دھرا رہے تھے اور اس نادر تجھیں نے وحی کے متعلق تمام پردے ہٹا دیے ابھیت کے ہر گونہ احساس کو یک لخت دور کر کے یہ محسوس کر دیا کہ وحی باہر سے مسلط کیا ہوا ہوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ خود انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے ابلا ہوا چشمہ ہے۔ پغمبری کا ضمیر انسانیت کے لیے مجاہ اور شفاف آئینے کا کام دیتا ہے۔ اس میں ہر فرد انسانی کے ضمیر اور زندگی کے فطری احتیاطات کا انعکاس ہوتا ہے۔ پیاسی فطرت کی آبیاری کے لیے اس کے ضمیر کی گہرائیوں سے عل و عرفان کے چشمے ابل پڑتے ہی۔ جو پوری انسانیت کے ضمیر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ان واقعات کی قدر و اہمیت اس لیے مسلم ہے کہ یہ ایک عظیم شاعر و مفکر کی عام زندگی کی چند ایسی جھلکیاں پیش کرتے ہیں جن سے ایک منفرد خصیت کی تغیر ہوتی ہے ان واقعات کے پہلو بہ پہلو ریاض منزل کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ یہاں مغرب مشرق نے اپنے عزیز ترین دوست سید راس مسعود اور ان کی باشур اور مہماں نواب بیگم کی رفاقت و معیت میں

انہائی مسرت انگیز اور یادگار لمحے بسر کیے ہیں دونوں میاں یہوی ہمہ وقت اقبال کی خدمت میں حاضر ہتے اور ہر ممکن آسائش اور راحت کا سامان بھم پہنچاتے۔

ایک ماہ سات دن کے قیام بھوپال کا عرصہ پلک جھکتے گزر گیا۔ لیکن ”ریاض منزل“ اور سید راس مسعود کو دوام بخش گیا۔ ”ضرب کلیم“ کی سات نظمیں جو اس ذیلی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔

.....ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے۔

۱۔ نظم بعنوان وحی ضرب کلیم صفحہ ۳۳ یا ”شعار“ ریاض منزل دولت کدہ سر راس مسعود)
بھوپال میں لکھے گئے۔

۲۔ اقبال کی کہانی۔ کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی۔ صفحہ ۵۵

.....اقبال کی وہ یادگار اور تاریخ ساز نظمیں جو ہمیشہ ریاض منزل بھوپال اور سر راس مسعود کی یاد تازہ کرتی رہیں گی یہ مشہور و معروف نظمیں ”ضرب کلیم“ میں جس ترتیب سے شامل کی گئی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

عنوان نظم ۱ سلطانی صفحہ ۲۶

عنوان نظم ۲ تصور صفحہ ۲۹

عنوان نظم ۳ وحی صفحہ ۳۳

عنوان نظم ۴ مقصود صفحہ ۲۶

عنوان نظم ۵ حکومت صفحہ ۷۶

عنوان نظم ۶ نگاہ صفحہ ۱۰۲

عنوان نظم ۷ امید صفحہ ۱۰۸

یہ نظمیں ان آسودہ اور پر سکون لمحوں کی امین ہیں جو اقبال کو ریاض منزل میں میسری

آئے۔ ان کا بیشتر وقت مطالعہ اور فکر شعر میں گزرتاں صح وہ ہسپتال جاتے۔ دن بھر مطالعہ اور آرام کرتے۔ شام کو سراس مسعود اور ان کی بیگم کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے۔ بھوپال اپنی خوبیوں اور خوبصورتویں کے لیے جو شہرت رکھتا تھا اس سے اقبال کی تخلیقی صلاحیتیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں چنانچہ ان نظموں کے مطالعہ سے اقبال کی فکری سمت اور ان کی مدت تخلیق پاسانی معتین کی جاسکتی ہے۔

ان سات نظموں میں اگر ”سلطانی“، اور ”تصوف“، ان کے مخصوص حکیمانہ انداز فکر کی ترجمانی کرتی ہیں تو ”مقصود“، ان کے منفرد فلسفہ خودی کی غماز ہے۔

نظرِ حیات پر رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سور و نور و وجود
پھر ”فلاطون“ کے ذیلی عنوان سے حیات و موت کی تشریح کرتے ہیں:
نگاہِ موت پر رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات ہے شبِ تاریک میں شر کی نمود
اور پھر

حیات و موت نہیں النفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصد
کہکروہ ذات و کائنات کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور اپنے مخصوص لمحہ میں جوانان ملت کو
اپنی نظم حکومت میں یہ پیغام دیتے ہیں:

قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
انگیں جس کے جوانوں کو ہے تنخابِ حیات
حیات و موت مردِ دانشمند، خودی اور مقصود خودی ملت جوانان ملت..... اقبال کی ان چند

نظموں کے مخصوص موضوعات ہیں یہ تخلیقی سرمایہ ریاض منزل ہی کا یادگار فکری سرمایہ ہے جو آج اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آخری دو نظمیں نگاہ اور امید..... بھوپال کے خوش نضا منظر اور اقبال کے جذب و سرود کی آئینہ دار ہیں..... ”نگاہ“ کے یہ تین شعر ملاحظہ ہوں:

بہار قافلہ لالہ ہائے صحرائی
شب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر یہ فلک نیلوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عمار نتی شب میں
طلوع مہر و سکت سپہر مینائی
اور امید کے یہ دو شعر

مجھے خبر نہیں شاعری ہے یا کچھ اور
عطा ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہر کبود
سچ پوچھیے تو بقول رشید احمد صدقی:

”.....اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج تھی۔ انہوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بنخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور یقان دوش بدوش کا فرماملہ ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کا کلام پڑھ کر ہم کو محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں بلکہ حکیم

اور شاعر (البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے
برخلاف لیکن بالآخر دونوں ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے
سے مر بوط نظر آتے ہیں۔)

یہی کچھ ان چند نظموں میں ملتا ہے۔ حکمت و فلسفہ کے ساتھ ساتھ شاعرانہ صداقتیں بھی
اور عالمانہ بصیرتیں بھی۔

۳۱ جنوری تا ۷ مارچ ۱۹۳۵ء کے پہلے قیام بھوپال کے دوران سید نذرینیازی کے
علاوہ اقبال کا ایک خط ہمیں اقبال نامہ میں ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام بھی ملتا ہے جو
انہوں نے بھوپال سے ہی لکھا تھا۔ اس خط کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا چند اس دشوار نہیں
کہ ”ریاض منزل“ کے پرسکون اور مسرت بخش ماحول میں وہ نہ صرف مطالعہ فلکر شعر اور اصلاح
ح شعر میں مصروف رہتے تھے بلکہ اپنے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کو جو پورے
ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے خط و کتابت میں بھی یاد رکھتے تھے۔ اور اپنے قیمتی مشوروں
سے انہیں نوازتے تھے۔ گویا شاعر مشرق کی فکر کا مرکز بھوپال تھا جس سے پورا ہندوستان
فیض یاب ہوا تھا۔ ان کی صحبت و عافیت ان کی آفاق گیر عظمت ان کی شاعرانہ بصیرت کا
ایک محور بھوپال بن گیا تھا جس کے تانے بانے سید راس مسعود نے بنے تھے

۱ گنجائے گر انہا یہ۔ صفحہ ۱۰۸

اور جو بالآخر نواب حمید اللہ خاں اور اقبال کے قریبی اور دوامی رشتہوں میں مسلک ہو کر
حیات اقبال کا ایک درخشندہ باب بن گیا۔ یہ درخشندہ اور تابناک باب تاریکی میں تھا اور دنیا
کو ان کی تفصیلات کا بہت کم علم تھا۔ تاریخ صرف صداقت کا نہیں اظہار صداقت کا نام ہے۔
اور یہ واقعات اظہار صداقت سے محروم تھے۔

ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ جا گیر دار ٹو نڈہ پور۔ مشرقی خاندیش اقبال کے بے حد

عقیدت مند تھے۔ ٹیگور سے ان کے خاص مراسم تھے۔ اور ناکے ایما پر وہ اقبال سے ملنے لا ہو رکھی گئے تھے۔ وہ بیک وقت شاعر اور نشر نگار تھے انگریزی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ اور اردو نظم و نثر سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ وہ اقبال سے مشورہ بھی لیتے تھے جس کا اقبال نامہ کے خطوط (صفحات ۲۸۸-۲۸۹ اور ۲۸۹) کے مطابع سے ظاہر ہوتا ہے ان کا یہ لکھنا کہ کبھی کبھی جب طبیعت لگے ضرور شعر کیا۔ آپ کی طبیعت شاعری کے لیے امناسب ہے اور آپ کی نظموں میں مجھے کو لطف آتا ہے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی نثر میں لکھیے۔ آپ کی نثر بھی دلچسپ ہوتی ہے۔ اس بات کا غماز ہے کہ وہ لمعہ کی صلاحیتوں سے کافی متاثر تھے اور انہیں برابر مشورے دیتے تھے۔

اردو کلام وہ اقبال کو صحیح تھے اور اقبال اس پر مناسب اصلاح کر کے انہیں لوٹا دینے تھے۔ لمعہ جو حیدر آباد میں رہتے تھے۔ خود حیدر آباد میں بہت کم مشہور تھے۔ جس کا تذکرہ ہمیں نظر حیدر آبادی کی کتاب..... اقبال اور حیدر آباد میں ملتا ہے:

”..... یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ ک نام سے ”اقبال نامہ“ کی اشاعت سے قبل خود اہل حیدر آباد میں بہت کم واقف تھے۔ لیکن ان خطوط کے مطالعے سے ان کی صلاحیتوں سے تعارف حاصل ہوتا ہے افسوس کہ اقبال سا شاعر جن کی صلاحیتوں کا معرفت ہے وہ حیدر آباد میں اتنے گم نام رہے۔“

بھوپال سے تحریر کردہ یہ خط نہ صرف اقبال سے لمعہ کے قریبی روابط کی نشاں دہی کرتا ہے بلکہ اس بات کا انکشاف بھی کہ اقبال لمعہ کو اپنے ثقیتی مشوروں سے برابر نوازتے تھے۔ اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے دل دے معرفت تھے لکھتے ہیں:

”مندوی۔ تسلیم“

میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں اس سے قبل بھی آپ کو
 ایک خط لکھ چکا ہوں۔ ملا ہوگا۔ آپ کی تازہ نظم پڑھ کر بہت خوش
 ہوا۔ اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔ میں یہ سن کر بہت خوش
 ہوا کہ آپ مثنوی مولانا نے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں دنیا
 کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ آپ کی عمر کے لحاظ سے بالکل
 درست ہے مگر آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ دنیا ایک بہت اہم مقام
 ہے اور اس سے صحیح استفادہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں انسان کامل
 بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مولانا روی کو بغور پڑھیے اور اس بات کا
 ہمیشہ خیال رکھیے کہ جو کچھ آپ کا خمیر اس خصوص میں آپ کو مشورہ
 دے اس سے انکار نہ ہو میرے گلے کی حالت رو بصحت ہے آپ
 کے گراں قدر مشوروں کا شکر یہ:

۱۔ لیے سہوارہ گیا ہے۔

۲۔ اقبال اور حیدر آباد صفحہ ۲۳۱

نگہدار آنچہ در آب و گل تست
 سرور و سوز و مستی حاصل تست
 تھی دیم سبوئے این و آں را
 منے باقی بہ مینائے دل تست

آپ نے میرا حال دریافت فرمایا ہے شکر یہ۔

زندہ ہوں، دل مضمحل، مسرت فنا، اللہ اللہ، خیر صلا، خدا حافظ

مخلص محمد اقبال لاہور

۲۰ فروری ۱۹۳۵ء“

خط کے آخر میں مخلص اقبال لاہور شاید اس لیے لکھا ہے کہ فروری کے آخر میں وہ بھوپال سے روانہ ہونے والے تھے یہ خط ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے اور خط کے آغاز میں ہی انہوں نے لکھا ہے کہ میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ ملمعہ انہیں لاہور کے پتے پر جواب دیں۔ اگر بھوپال میں طویل قیام ممکن ہوتا تو سید نذر ی نیازی کے خطوط کی طرح وہ بھی ریاض منزل کا پتہ اس خط پر تحریر ضرور فرماتے۔ لمحہ سے ان کی مستقل خط و کتابت تھی جیسا کہ اقبال نامہ کے خطوط بنام ڈاکٹر عباس علی خاں لمحہ (صفحات ۲۶۲ تا ۲۹۸) کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔

آخر فروری ۱۹۳۵ء تک اقبال کا پابندی سے علاج جاری رہا۔ ان کی صحت و توانائی میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ علاج کا پہلا کورس مکمل ہونے کے بعد انہیں ڈاکٹروں نے لاہور جانے کی اجازت دے دی چنانچہ ۲۷ فروری اور ۳ مارچ ۱۹۳۵ء کے خطوط میں نیازی صاحب کو قدر روانگی سے مطلع کرتے ہیں لاہور کی روانسگی اسپ اس لیے ضروری تھی کہ اقبال کی اپنی صحت پہلے سے نسبتاً اچھی تھی..... لیکن والدہ جاپیو کی تشویشناک علاالت کے سبب وہ بے حد فکر مند اور متعدد تھے جس کی اطلاعات انہیں برابر مل رہی تھیں:

”بھوپال۔ ۲۷ فروری ۱۹۳۵ء“

ڈیر نیازی صاحب میں ۷ یا ۸ مارچ کو شام سے یہاں سے چلوں گا۔ اور ۸ یا ۹ کو ساڑھے نوبجے دہلی پہنچوں گا۔ وہاں ایک دور روز قیام کروں گا۔ آپ سردار صلاح الدین سلجوقی صاحب کو بھی مطلع کر دیں بعد میں پھر میں آپ کو ان کے بذریعہ خط یا تار مطلع کر دوں گا۔ باقی بروقت ملاقات والسلام محمد اقبال ۲۔“

”بھوپال.....۲ مارچ ۱۹۳۵ء“

ڈینیا زی صاحب.....السلام علیکم

میں کے کی شام کو یہاں سے چلوں گا..... ۸ کی صبح دہلی پہنچ جاؤں

- 6

۱- اقبال نامہ (جلد اول) صفحات ۲۸۳-۲۸۴

۲۶۱ صفحہ اقبال مکتبات

یہ گاڑی ۹ بجے یا ساڑھے نوبجے دہلی پہنچتی ہے۔ ۸ کا دن دہلی
ٹھہرول گا اور ۹ کی شام کولا ہور روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ سردار صلاح
الدین سلجوقی کو بھی مطلع کر دیں میں نے ان کو علیحدہ خط بھی دیا ہے۔
اس کے علاوہ حکیم صاحب سے بھی ۹ کی صحیح کا وقت ۸ یا ساڑھے آٹھ
مقرر کر دیں ان سے ملے بغیر لا ہور جانا ٹھیک نہیں..... ہاں راغب
حسن صاحب کو مطلع کر دیں ان کا پتہ یہ ہے:

2, Canning Lane

New Delhi

باقی انشاء الله بوقت املاقات والسلام

محمد اقبال

چنانچہ پروگرام کے مطابق اقبال ۸ مارچ ۱۹۳۵ء کی صبح دہلی پہنچنے تو نیازی صاحب نے ان کا سٹیشن پر استقبال کیا۔ ان کی صحت پہلے سے بہت اچھی تھی۔ دورانِ گفتو بھوپال کے معجین کی خصوصی توجہ اور علاج کا ذکر بھی آپ چنانچہ سیدنڈیر نیازی لکھتے ہیں:

حضرت علامہ کی صبح دہلی تشریف لائے صحت نہایت اچھی تھی.....
معجین بھوپال کو یقین تھا کہ ان کے علاج سے حضرت علامہ کا مرض جاتا رہے گا۔
دوسرے روز وہ حکیم ناپینا صاحب سے ملے۔ انہیں بعض دکھائی اور بیگم صاحبہ کی عالت
اور دواؤں کے بارے میں گفتگو کی اور شام کی گاڑی سے لاہور تشریف لے گئے۔

۱ (یوقت) نیازی

۲ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۶۲

۳ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۶۳



اقبال اور وظیفہ

۹ مارچ ۱۹۳۵ء کو اقبال دہلی سے روانہ ہو کر لا ہور پہنچ تو رفیقة حیات کو شدید علیل پایا۔ گھر کاظم درہم برہم تھا۔ جاوید اور منیرہ ابھی بہت کم سن تھے۔ ان حالات میں ان کی قہنی پر یثانی اور ان کے قلبی انتشار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ بیگم صاحبہ کی دوائیں دہلی سے آتی تھیں۔ اور وہ پابندی سے ان کے امراض کی تفصیلات سے نیازی صاحب کو مطلع کرتے تھے۔ اب بھوپال سے واپسی کے بعد بیگم صاحبہ کو نہایت کمزور حالت میں پایا تو لا ہور پہنچنے، ہی نیازی صاحب کو صورت حال سے مطلع کرتے ہوئے تاکید کی کہ جلد حکیم صاحب سے مشورہ کر کے جواب دیں:

”لا ہورا اما مارچ ۱۹۳۵ء“

ڈیر نیازی صاحب..... السلام علیکم

میں بخیریت لا ہور پہنچ گیا۔ جاوید کی والدہ نے ادوا آج سے شروع کر دی ہے۔ چل پھر سکتی ہے اور بوسیر کی شکایت بھی نہیں ہے مگر اور شکایتیں بہت ہیں۔ ان کی طرف حکیم صاحب کی توجہ دلائیے اور مجھے مطلع کیجیے۔

(۱) جگر بہت بڑھ گیا ہے۔ اس پہلو پر لیٹنا بھی مشکل ہے۔

(۲) رات کو کھانسی بہت آتی ہے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے جواب جلدی..... السلام

محمد اقبال،

اس خط کے ساتھ ہی انہوں نے نیازی صاحب کو دوسرا خط لکھا جس میں بیگم صاحبہ کے عوارض اور شکایات کا کچھ اور تفصیل سے ذکر تھا۔ چنانچہ نیازی صاحب نے تمام تفصیلات حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر کے ضروری ہدایات سے اقبال کو مطلع کر دیا پھر کچھ عرصہ خاموشی رہی۔

حکیم صاحب کی ادویہ سے بیگم صاحبہ کی تکلیف میں کچھ نہ کچھ کی ضرور ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں دہلی لے جا کر حکیم صاحب کو دکھادیں لیکن ابھی ان میں چلنے پھرنے کی اور سفر کرنے کی سکت نہ تھی۔

۱۔ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۶۳

اقبال کو اپنی صحت اگرچہ اچھی تھی لیکن بیگم صاحبہ کی لگاتار اور پر پریشان کن یماری کے باعث وہ بے حد متعدد تھے۔ کیونکہ انہیں بھلی کا مزید علاج کرانے کے لیے پھر بھوپال جانا تھا جیسا کہ روائی سے قبل بھوپال کے معالجین نے انہیں مشورہ دیا تھا اور بتایا تھا کہ کم از کم ایک سال تک پابندی سے علاج ضروری ہے۔ چنانچہ حکیم محمد حسین عرشی کے نام ایک خط میں اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں:

” لاہور ۱۹۳۵ء ”

جناب عرشی صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میری صحت عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے
مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اٹھنیں ہوا۔ علاج بر قی ایک سال تک
جاری رہے گا۔ دو ماہ کے وقفے کے بعد پھر سے بھوپال جانا ہو گا!
خانگی مسائل کے ساتھ ساتھ انہیں قومی اور ملی مسائل کا بھی سامنا تھا۔ چنانچہ ان

پریشان کن حالات میں بھی وہ اپنا بیشتر وقت نیازمند اور عقیدت مندو سے صلاح و مشورہ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے چند در چند مسائل کو حل کرنے میں صرف کر رہے تھے۔ انہیں دنوں انجم حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کی تیاری ہو رہی تھی۔ انجم حمایت اسلام سے ان کی وابستگی اور مسلمانوں کے اس نمائندہ ادارہ کی ترقی و بقا سے ان کی خصوصی ڈلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسی سلسلے میں وہ بھوپال کے قیام کے دوران نواب صاحب بھوپال سے بھی تفصیلی گفتگو کر چکے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ نواب صاحب لاہور آ کر انجم حمایت اسلام کے ایک اجلاس کی صدارت فرمائیں تاکہ مسلم قوم کی شیرازہ بندی کے لیے کچھ اور فضاسازگار ہو سکے اور یہ ادارہ مالی استحکام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی علمی و فکری ترقی میں نمایاں حصہ لے سکے۔ چنانچہ راس مسعود کے نام ایک خط میں جو ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ کا تحریر کردہ ہے اس کا اظہار بھی کیا ہے:

”لاہور..... ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء“

مائی ڈبیر مسعود

امید ہے آپ اور لیڈی مسعود صاحب بخیریت ہوں گے۔ میں بھی بفضل خدا خیریت سے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اعلیٰ حضرت کی لاہور تشریف آوری کے لیے ۲۱ اپریل موزوں ہو گی۔ ۲۰ اپریل کو تو گورنر پنجاب اجلاس میں رسی شمولیت فرمائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ۲۱ اپریل کو تمام تر اعلیٰ حضرت اور مسلمانان پنجاب کے لے ہی مخصوص رہے۔ اگر اعلیٰ حضرت انگلستان تشریف نہیں لے جا رہے ہیں تو اس انتظام کی طرف توجہ کیجیے۔ امید ہے اعلیٰ حضرت کے لیے ایک دن مخصوص کرانے میں میرے منشا کو آپ نے پالیا ہو گا۔ میرا

خیال ہے کہ اب یہ قطعی طور پر طے پا گیا ہے کہ اعلیٰ حضرت عازم انگلستان نہ ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو تارکے ذریعے اطلاع دے دیجیے۔ اور یہ اطلاع بھی بذریعہ تارہی دیجیے کہ ۲۱ اپریل اعلیٰ حضرت کو منتظر ہے۔ معاملہ معلومہ کی نسبت آپ کو کوئی اطلاع ملی ہے میں اس خط کا جواب ماہ کے آخر میں آپ مجھے لکھنا چاہتے ہیں بے تابی سے منتظر ہوں۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۷

لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں سلام اور انور کو دعا
محمد اقبال اے۔

بھوپال میں ان کے عزیز ترین دوست راس مسعود کی موجودگی ان کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھی۔ انہیں کامل یقین تھا کہ نواب صاحب افغانستان نہ جانے کی صورت میں لاہور ضرور تشریف لائیں گے جیسا کہ ملاقات کے دوران نواب صاحب نے بھی ان سے وعدہ کیا تھا۔ جب ایک ہفتہ تک راس مسعود کا جواب نہ آیا تو انہیں تشویش لاحق ہوئی کیونکہ انہم کے سالانہ اجلاس کی تاریخیں قریب آ رہی تھیں۔ اروتیاریاں زورو شور سے جاری تھیں۔ مولوی غلام محی الدین مرحوم سیکرٹری انہم حمایت اسلام برابر اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال سے انہیں مطلع کر رہے تھے۔ چنانچہ اقبال نے ۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء کو راس مسعود کو دوسرا خط لکھا جس میں دیگر امور کے علاوہ خصوصیت سے نواب صاحب کی لاوہر میں آمد کے سلسلے میں استصواب کیا گیا تھا:

”لاہور..... ۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء“

ضروری

ڈیر مسعود کئی دن ہوئے ہیں میں نے ایک خط آپ کو لکھا تھا مگر
تھا حال جواب نہیں آیا۔ شاید یہ خط آپ کو نہ ملا ہو۔ کیونکہ ان دونوں
آپ بھوپال میں نہ تھے۔ والدہ ماجدہ کی علاالت کی وجہ سے علی گڑھ
چلے گئے تھے۔ بہر حال اگر وہ خط مل گیا ہو تو جواب دلکھیے۔ شاید آپ
حیدر آباد سے کسی جواب کے منتظر ہوں۔ آپ کا خیال تھا کہ مارچ
کے آخر میں آپ قطعی کسی فیصلہ کی اطلاع دے سکیں گے۔ میرے
حالات اس امر کے متყصی ہیں کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو گو میں آپ سے
چھپا نہیں سکتا کہ مجھے اس طرف سے نامیدی ہے غرض کہ میں آپ
کے جواب کا شدت سے منتظر ہوں۔

اس امر کی اطلاع آپ نے نہیں دی کہ آیا ہر ہانس جلسہ انجمن
میں جلوہ افروز ہوں گے یا نہیں اور مجھ سے ہر ہائی نس نے خود
فرمایا تھا کہ اگر انگلستان نہ گئے تو ضرور تشریف لا کیں گے۔ یہاں
اس خبر سے جوش مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ مہربانی کر کے مطلع
فرما کیں کہ آیا ہر ہائی نس ولایت تشریف لے جائیں گے مولوی غلام
محی الدین سیکرٹری انجمن نے دو تین روز ہوئے مجھے اطلاع دی کہ
آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مہربانی کر کے جلد اطلاع
دیجیے۔

جب سے میں بھوپال واپس آیا ہوں لوگ زمینوں کے متعلق
دریافت کرتے ہیں۔ میرے پاس کوئی ان شرائط کی کاپی نہیں ہے
جن کے مطابق اراضی دی جاتی ہے۔ اس وقت بھی جبکہ میں یہ خط لکھ

رہا ہوں کہ ایک صاحب اسی غرض کے لیے بیٹھے ہیں۔ میں نے ان کو خط لمحک دینے کا وعدہ کیا ہے اور وہ خود بھوپال حاضر ہوں گے۔ شرائط کی کاپی ارسال کروادیجیے۔ تاکہ میں زمین کے خواستگاروں کو دکھان سکوں۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۵۲-۳۵۳

زیادہ عرض کیا کروں امید ہے آپ کا مزاج بغیر ہو گا۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ میں ان کے لیے دعائے صحت کرتا ہوں۔ انور میاں کو دعا اور حکیم صاحب کو بھی سلام کہیے.....

والسلام

محمد اقبال،

کتاب کی نظر ثانی کے دوران خوش قسمتی سے راس مسعود کے چھ نادر خطوط بنا۔ اقبال اور ان کے وظیفہ کے سلسلے میں نواب صاحب بھوپال کی قیمتی یادداشت کا مسودہ جلیل قدوائی نے بیگم چھتاری سابق لیڈی مسعود اور ڈاکٹر احسان رشید کے تعاون سے راس مسعود کے کاغذات میں سے ڈھونڈ کالا اور وضاحتی نوٹ کے ساتھ ماہنامہ قومی زبان کراچی میں شائع کر دیا۔ یہ خطوط یادداشت کا مسودہ انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ جلیل قدوائی نے کیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس کی ہے جو اسی لکھ دیے ہیں۔

اس گم شدہ سرمایہ کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ آپ کو اقبال کے خطوط اور راس مسعود کے جوابات سے ہو گا۔ جو اس دور سے عام حالات اقبال کے ذاتی مسائل وظیفہ کے سلسلے میں نواب صاحب اور راس مسعود کی مخلصانہ سمعی کاوش پر روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ خطوط اور وظیفہ کی یادداشت پہلی بار اس کتاب میں شامل ہو رہے ہے۔ ورنجھے یہ اظہار

کرتے ہوئے مسرت ہے کہ اس بات میں میں نے جن واقعات اور حقائق کا تجزیہ کیا ہے اور جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ ان نایاب خطوط وظیفہ کی یادداشت سے بھی درست ثابت ہوئے۔

راس مسعود کے حسب ذیل خطوط مورخہ ۳۱ مارچ اور نقل خط مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۵ء کے مطالعہ سے جہاں اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ راس مسعود اقبال کے سچے عاشقوں اور رجال ثاروں میں تھے وہیں یہ سراغ بھی ملتا ہے کہ وہ اور نواب صاحب بھوپال کی آسودہ و مطمین زندگی کے لیے در پردہ کیا کچھ عملی کوششیں کر رہے تھے۔ جن کا نتیجہ اپریل تک برآمد ہونے کی توقع تھی۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۵۳ تا ۳۵۵

(۱)

ریاض منزل

بھوپال، سی آئی

۳۱ مارچ ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

مجھے تمہارا خط مورخہ ۲۶ مارچ اسی لمحے ملا اور تمہاری اس شکایت

پر کہ میری طرف سے تمہیں کوئی خبر نہیں ملی تعجب ہوا۔ میں اس خط کی

ایک نقل بھیجا ہوں جو یہاں سے تمہارے نام ۲۵ مارچ کو ڈاک میں

ڈالا گیا ارجو تمہیں ۲۶ سے جب تم نے مجھے اپنا موجودہ خط لکھا بہت

پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ جہاں تک تمہارے ذاتی معاملہ کا تعلق ہے

میں سر دست اپنے خط مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۵ء کے مضمون میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ انشاء اللہ اپر میں کسی وقت ہم قطعی نتیجہ تک پہنچ سکیں گے۔ ہر ہائی نس سے زیادہ تمہاری بہتری کا کوئی خواہش مند نہیں ہے۔ اور میں پھر کہتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں جو کچھ ان سے ممکن ہے کر رہے ہیں۔

میں نے ۲۵ مارچ کو مولوی غلام مجی الدین صاحب کو ایک حسب ذیل مضمون کا تاریخ بھیجا تھا:

”افسوں کے غیر متوقع مصروفیات کے سبب ہر ہائی نس اس بار سالانہ جلسے میں شرکت نہیں کر سکتے آئندہ سال شرکت کی توقع رکھتے ہیں۔ یہی مضمون اقبال کو بھی لکھ بھیجا ہے۔“

جہاں تک یہاں کے شرائط تقسیم اراضی کا تعلق ہے اس سلسلے میں ضروری کاغذات تمہیں بھجوار ہاہوں۔

آج میں سرکاری کام سے پانچ دن کے لے ان دور جارہا ہوں اور واپسی پر تمہیں پھر خط لکھوں گا۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور مایوس نہ ہو مجھے یقین رے کہ جتنی کچھ بھی کوششیں ہو رہی ہیں ان کا نتیجہ قابلِ اطمینان نکلے گا۔

صمیم قلب کے ساتھ

تمہارا ہمیشہ

سید راس مسعود

ڈاکٹر سر محمد اقبال

بَارَايِٹ لامِيكُوڈ روڈ۔ لاہور
(نقل خط منسلک)

(۲)

ریاض منزل
بھوپال سی آئی
۱۹۳۵ء مارچ

میرے نہایت پیارے اقبال
میں علی گڑھ میں سے آج ہی صبح واپس آیا ہوں اور تمہارے اس
مشقانہ تار کے جواب میں جو مجھے علی گڑھ میں عین اس وقت ملا تھا
جس میں بھوپال کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ میں نے ایک تار بھیجا ہے
جس میں تمہیں والدہ صاحبہ کی حالت سے مطلع کیا ہے۔ امثلہ اور
میں سخت فکرمند اور پریشان رہے اور مارا مارا علی گڑھ کا سفر کرنے اور
وہاں سے واپس آنے کے سبب تھک کر چور ہو گئے ہیں۔

آج صبح ہر ہائی نس نے مجھے شرف بازیابی بخشنا مگر تمہیں مایوس
کرتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت اپنی چند غیر متوقع اہم مصروفیات کی
وجہ سے امسلا انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت نہ کر
سکیں گے۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے ہدایت کی ہے کہ تمہیں مطلع کر
دوں۔ اگر کوئی ناگہانی مجبوری نہ آ پڑی تو وہ انجمن کے اجلاس
۱۹۳۶ء میں تم سب کے ساتھ موجود ہونے کی پوری کوشش کریں

گے۔ لہذا تمہیں دیر آید درست آید۔ کی مثل کی صداقت پر یقین رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ جب آخرتہ سال اعلیٰ حضرت لا ہو تشریف لا تیں گے تو وہ سب کے لیے اپنی آمد کو موجب مسرت بنادیں گے۔

اب سنو معاملہ معلوم کی بابت۔ بس کچھ دن ہی کی بات ہے ذرا اور انتظار کرو کیونکہ ہر ہائی نس تمہیں کوئی قابلِ اطمینان بات اپریل کے مہینے میں کسی وقت لکھ سکتیں گے۔ اعلیٰ حضرت تمہارے لیے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک انسان سے ممکن ہے اور کم از کم میں تو نتیجہ کی طرف سے پرامید ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مجھے اجازت نہیں۔ تمہارے ان محبت خاص نے جن کی طرف سے خلیفہ عبدالحکیم نے تمہیں اطمینان دلا یا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ تبادل تجویز پر عمل درآمد آج سے شروع ہو گیا ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ ہم لوگ تمہارے عاشق ہیں ہم تو تمہارے لے اپنی امکانی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلا یا ہوں کہ آج دنیا بھر میں ہر ہائی نس..... نواب صاحب بھوپال سے بڑھ کر تمہارا کوئی بھی خواہ موجود نہیں۔ میں نے حقیقتاً یہ خط خوشی کی کیفیت میں لکھا ہے ارو میں نہیں چاہتا کہ تم ہماری تجویز نمبر ۲ کے نتیجے میں ذرا بھی مایوسی سے کام لو۔

۱۔ سابق لیڈی مسعود جو شادی سے قبل امته الرشید تھیں اور جنہیں اپنا شریک حیات بنانے کے بعد مسعود لاڈ میں امتنل کہتے تھے۔ (جلیل قدوائی)

میری ابدی محبت اور میری والد صاحبہ تمہاری صحت کی بھالی کے
لیے بہترین دعاوں نیز امتل کی نہایت مودبانہ تسلیم کے ساتھ۔

میں ہوں ہمیشہ تمہارا چاہنے والا
سید راس مسعودا

بخدمت سر محمد اقبال - نائٹ

بیرونی ایڈ لاءِ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

اقبال کے ۲۰ مارچ اور ۲۹ مارچ ۱۹۳۵ کے خط اور راس مسعود کے ۳۱ مارچ اور ۲۵ مارچ ۱۹۳۵ کے جوابات نہ صرف اقبال کے..... راس مسعود اور نواب صاحب بھوپال کے قربی روابط و تعلق کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ تین مختلف مسائل روپ بھی روشنی ڈالتے ہیں جن کیوضاحت تجزیہ کے بغیر اقبال کی بھوپال سے خصوصی وابستگی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔
پہلی بات انجمان حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس سے تعلق رکھتی ہے جس کا ان خطوط میں تذکرہ ہے۔ اقبال کی ولی خواہش تھی کہ نواب صاحب بھوپال انجمان کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوں۔ کیونکہ جس سے یہ اطلاع پنجاب والوں کو ہوئی تھی تو وہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن جیسا کہ راس مسعود کے خط اور مندرجہ تاریخی مضمون سے ظاہر ہے کہ نواب صاحب چند غیر متوقع اور اہم..... مصروفیات کے سبب انجم کے سالانہ اجلاس جلسہ میں شرکت سے قاصر ہے۔

دوسرے مسئلہ بھوپال کی تقسیم اراضی سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کے ۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء کے خط کا یہ حصہ:

”..... جب سے میں بھوپال سے واپس آیا ہوں لوگ

زمینوں کے متعلق دریافت کریت ہیں میرے پاس کوئی ان شرائط کی

کاپی نہیں ہے جن کے مطابق اراضی دی جاتی ہے۔ اس وہ بھی جب کہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں ایک صاحب اسی غرض کے لیے بیٹھے ہیں کہ میں نے ان کو خط لکھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور وہ خود بھوپال حاضر ہوں گے۔ شرائط کی کاپی ارسال کروادیجیے تاکہ زمین کے خواستگاروں کو دکھان سکوں،“۔

در اصل اس تجویز کا ایک حصہ ہے جو اقبال نے بھوپال کے پہلے قیام (۳۱ جنوری تا ۷ مارچ ۱۹۲۵ء) کے دوران نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ انہوں نے نواب صاحب سے درخواست کی تھی کہ ریاست کے غیر آباد علاقوں میں مسلمانوں کو آباد کر دیا جائے اور انہیں ریاست کی جانب سے آباد کاری کی سہولتیں بھی پہنچائی جائیں تاکہ آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ غیر آباد زمینوں کی کاشت سے پیدا اور اور عوام کی خوش حالی میں اضافہ ہو سکے اس تجویز کو نواب صاحب نے پسند فرمایا اور ضروری احکام جاری ہوئے۔

عجیب اتفاق ہے کہ اس واقعہ کے ایک عینی شاہد حسن عزیز جاوید مرحوم جو حضرت قدسی کے ارادت مندوں میں شامل ہیں مجھے کراچی میں مل گئے اور انہوں نے مجھے آباد کاری کے سلسلے میں اقبال کی تجویز کی پسندیدگی کے علاوہ آباد کاروں کے لیے جو انتظامات خصوصی ریاست کی جانب سے کیے گئے تھے ان کی تفصیلات مہیا کر دیں

۱۔ ماہنامہ قومی زبان کراچی اپریل ۱۹۳۵ء صفحہ ۷ تا ۹

جن کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

حسن عزیز جاوید ۱۹۰۵ء میں ریاست بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حاجی محمد عمر دراز خاں صاحب نواب صاحب صدق حسن کے ایما پر سندیلہ (یو۔ پی) سے بھوپال آ کر آباد ہوئے۔ جاوید صاحب نے اردو اگریزی ہندی مرہٹی زبان میں دستگارہ حاصل

کرنے کے بعد صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ اور ابتدأ خواجہ حسن نظامی سے تربیت حاصل کی پھر لا ہور کلکٹہ اور دہلی کے متعدد اردو انگریزی اخبارات و رسائل سے مسلک رہے۔ تقریباً اپنے سال تک حکومت ہند کے مکملہ اطلاعات میں خدمات انجام دینے کے بعد آپ کلکٹہ کے مشہور انگریزی اخبار ^{سٹی ٹائمز} میں میں ٹرائیں آف بہادر شاہ جس کا ایک ہی نسخہ لال قلعہ میں تھا کا اردو ترجمہ بعنوان اسٹی ٹائمز میں بہادر شاہ کا مقدمہ ”غدر دہلی کے اخبار نویس“ اور ”غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط“ آپ نے خواجہ حسن نظامی کے ایما پر کیا۔ مختصر افسانوں کے چار مجموعے اور کئی غیر مطبوعہ مسودات شامل ہیں۔

آپ کو نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ چنانچہ دریافت رآپ نے جو تفصیلات بتائیں ان سے اقبال کے مندرجہ بالا خط کی نہ صرف تصدیق ہوتی ہے بلکہ کئی نئی بتائیں بھی ہمارے علم میں آتی ہیں۔

صحیح تاریخ اب یاد ہے غالباً ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔ سلطان پور نیل گڑھ کی آباد کاری کی سکیم کا حکومت ریاست بھوپال نے اعلان کیا تھا۔ اور میں اس سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اخبار ^{سٹی ٹائمز} میں نمائندہ و وقاریع نگار کی حیثیت سے بھوپال گیا تھا علامہ اقبال الرحمن اللہ علیہ اس وقت ریاض منزل بھوپال میں قیام فرماتھے علامہ سے بھی ملا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ مسلم ریاستوں میں اگر مسلمان اکبریت کی کوشش نہ کی گی تو آئندہ یہ ریاستیں ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گیل۔ اور میں نے نواب صاحب بھوپال کو آمادہ کر لیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو باہر سے بلا کر ریاست میں آباد کرائیں۔

پھر اسی ضمن میں نواب حمید اللہ خاں مرحوم والی ریاست بھوپال کے ہاں باریابی کا شرف حاصل کیا تھا۔ اور میرے استفسارات کے جواب میں نواب حمید اللہ خاں صاحب نے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا حوالہ دے کر فرمایا تھا کہ میری حکومت نے ان کا مشورہ بطيیب

خاطر قبول کر لیا ہے اور اب زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ریاست میں آ کر آباد ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔

سلطان پور نیل گڑھ کا علاقہ بھی دیکھنے گیا تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں سرسبز و شاداب و سیع و عریض خطہ ارض تھا۔ اس علاقہ میں ایک دریا بھی بہتا تھا۔ مگر ان اعلیٰ افسروں آبادیات نواب زادہ سعید الظفر خاں نواب صاحب کے بھتیجے مقرر ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے قافلے کے قافلے شماں ہند سے وارد ہو رہے تھے۔ کوئی ٹرین آباد کاروں سے خالی نہ جاتی تھی۔ پلیٹ فارم پر ٹرین رکتی تو اللہ اکبر کے غرے بلند ہوتے۔ ان لوگوں کا شاندار اور پرتپاک استقبال کیا جاتا۔ نواب زادہ صاحب بہ نفیس ان کی قیادت کرتے۔ اور مبتکہ علاقوں میں پہنچاتے۔ ان کے خود دنوش کا معقول انتظام ہوتا تھا۔

میں نے یہ دیکھا کہ جب یہ قافلے اور جماعتیں وہاں پہنچ جاتیں اور ان کے لیے اراضی اور جائے مسکن کی نشان دہی کر دی جاتی تو یہ لوگ سب سے پہلے درختوں کو کاٹ کر ان کی لکڑی کے ستون کھڑے کر کے اور پتوں سے چھپر بنایتے اور پھر اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائبلند ہوتی۔ باقاعدہ نماز ادا کی جاتی۔ اس کے بعد آبدی کی اس مسجد کے اطراف میں لوگ اپنے جھونپڑے بنایتے۔ حکومت انہیں سال بھر کے کھانے کے قابل غدہ بولنے کے قابل بیج جو تاء کے قابل بیل اور ضروریات کے لیے مختص رقم دیتی۔

آباد کاری کی یہ سکیم جیسا کہ حسن عزیز صاحب نے بیان کیا ہے کہ اقبال کی تحریک پر نواب صاحب نے شروع کی تھی۔ جو عرصہ تک کامیابی سے جاری رہی لیکن کچھ مدت کے بعد بھوپال کے متعدد ہندوؤں نے کانگریس کی پشت پناہی سے اس کی مخالفت شروع کر دی اور لاکھوں روپیہ تقسیم کر کے ایک مخالف آباد کاری جماعت کھڑی کر دی۔ جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ اس پروپرینٹر سے بھوپال صرف بھوپالیوں کا ہے کانٹرہ لگا کر ایمجی ٹیشن

شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں فسادات ہوئے اور سیاسی فضا مکدر ہو گئی۔ انجام آباد کاری کی یہ سکیم محض کانگریسیوں اور شور پیدہ سروں کے ہاتھوں ناکام ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح حیدر آباد حیدر آبادیوں کا ہے۔ کے نعرے لگا کر حیدر آباد میں بھی ناعقبت اندیشوں نے سر علی امام صدر المہماں ریاست دکن کی آباد کاری کی تجویز کونا کام بنادیا تھا۔ جس کا خمیازہ تقسیم ملک کے وقت بھگنا پڑا۔

آباد کاری کی اس سکیم کی کامیابی اور ناکامیابی سے قطع نظر غور کرنے کی بات ہے کہ اقبال کی اس تجویز کا حقیقی منشا مقصد کیا تھا۔ وہ دراصل مسلم ریاستوں میں مسلم اکثریت دیکھنا چاہتے تھے۔ بھوپال میں ہندو اکثریت میں تھے اور کشمیر میں مسلمان۔ اسی سلسلے میں انہوں نے بھوپال کے پہلے سفر کے دوران اقبال حسین خاں سے یہ دلچسپ بات بھی کہی تھی:

”ہمارے خیال سے تو کشمیر نواب صاحب بھوپال کو دیے جانے اور بھوپال مہاراجہ کشمیر کو وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت۔“

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ دو قومی نظریے سے متعلق اپنے ذہن میں کیا نقشہ بنائچے تھے۔ اور نواب صاحب بھوپال کو کدن دور رسم تابع کے تحت انہوں نے آباد کاری کی یہ سکیم پیش کی تھی۔ بہر طور اقبال کے ان نظریات کے علاوہ ان کی دورانیتی ہندوستان کی تقسیم مسلم اکثریتی علاقوں کی وحدت اور اس کی سیاسی اثر و نفوذ پر ان کی بالغ نظری سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے۔

ان خطوطوں کا تیرا حصہ خود اقبال کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کے پس منظر میں راس مسعود کی وہ مساعی تھیں جوان کی خصوصی امداد و اعانت کے سلسلے میں خاموشی سے کر رہے تھے اور جن کا تھوڑا بہت علم اقبال کو بھی تھا۔ اگرچہ فوری طور پر ان کو ششوں سے ننانج

برآمدہ ہو سکے۔ لیکن خطوط کے ان اقتباسات سے اقبال کی ڈھنی اور مالی پریشانیوں کی واضح طور پر نشان دہی ہوتی ہے۔

۲۰ مارچ کے خط کا یہ اقتباس:

”..... معاملہ معلومہ کی نسبت آپ کو کوئی اطلاع ملی ہے؟ اس خط کا جو اس ماہ کے آخر میں آپ مجھے لکھنا چاہتے تھے بے تابی سے منتظر ہوں.....“۔

ارو ۲۹ مارچ کے خط کا یہ واضح حصہ طور پر ان مسامی پر روشی ڈالتا ہے جو راس مسعود کے مستقل وظیفہ کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ تاکہ وہ جن مالی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں ان سے نجات مل جاتی اور وہ آسودگی..... طہانیت قلب اور یکسوئی کے ساتھ فکر و تخلیق کا فریضہ انجام دے سکتے۔

”..... شاید آپ حیدر آباد سے کسی جواب کے منتظر ہوں گے۔

آپ کا خیال تھا کہ مارچ کے آکر میں آپ کسی قطعی فیصلہ کی اطلاع دے سکیں گے۔ میرے حالات اس امر کے مقتضی ہیں کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو گو میں آپ سے چھپا نہیں سکتا کہ مجھے اس طرف سے نامیدی ہے۔ غرض کہ میں آپ کے جواب کا شدت سے منتظر ہوں“۔

راس مسعود سے اقبال کے ذاتی اور خانگی مسائل پوشیدہ نہ تھے۔ قیام بھوپال کے دوران ان مسائل پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی تھی۔ اور راس مسعود کو شاہ تھے کہ ریاست بھوپال کے علاوہ حیدر آباد ریاست بھاول پور اور سر آغا خان ان کا مالہانہ وظیفہ مقرر کر دیں تاکہ وہ قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے نوٹ تیار کر سکیں جن کس تذکرہ

انہوں نے بھوپال کے قیام کے دوران راس مسعود سے کیا تھا۔

ان اقتباسات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ انہیں حیدر آباد سے کسی وظیفے یا اعانت کی توقع نہ تھی کیونکہ اس سے قبل وہ دوبار حیدر آباد کے نظم دکن سرا کبر حیدری اور مہاراجہ کشن پرشاد سے مل چکے تھے۔ مہاراجہ اور سرا کبر حیدری نے اقبال کو حیدر آباد بلانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن انہیں کامیابی نہ ہو سکی تھی۔ ارو یہ اطلاعات صرف افواہ کی حد تک ہی ہیں کہ اقبال ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہو کر آرہے ہیں یا انہیں جامعہ عثمانیہ کی وائس چانسلری کی پیش کش کی گئی ہے۔ یہی صورت وظیفے کے سلسلے میں رونما ہوئی۔ حیدر آباد کی باقتدار اور اقبال سے دلی عقیدت رکھنے والی شخصیتیں بھی ریاست سے ان کے وظیفے کا اجرانہ کر سکیں جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے..... اقبال اور حیدر آباد میں نظر حیدری آبادی نے جگہ جگہ اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ حیدر آباد کی ملازمت کے سلسلے میں افواہ پھیلنے پر اقبال نے جو خط مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھا ہے اس کے اقتباس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

”..... یہاں پنجاب اور یوپی کے اخباروں میں چرچا ہوا تو دور

دور سے مبارک باد کے تاریڑ گئے اور اضلاع پنجاب کے اہل

مقدمات جن کے مقدمات میرے سپرد ہیں ان کو گونہ پریشانی ہوئی

بہر حال مرضی مولا زہمہ اولیٰ“

لیکن بقول نظر حیدر آبادی:

”..... مرضی مولا کو یہ منظور نہ تھا کہ اقبال حیدر آباد میں ہوتے۔

اگرچہ حیدر آباد میں بھی اکثر یہ افواہ ہیں پھیلتی رہتی تھیں کہ اقبال ہائی

کورٹ کے چیف جسٹس بنادیے گئے کبھی یہ سننے میں آتا کہ وہ جامعہ

عثمانیہ کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں۔ علی ہذا القیاس لیکن ان میں سے

کوئی خوبی حقیقت نہ بن سکی حالانکہ اہل حیدر آباد اور خصوصاً مہاراجہ کشن پرشاد اور اکبر حیدری وغیرہ جیسے ذی اثر حضرات دل سے چاہتے تھے۔ کہ اقبال حیدر آباد آجائیں۔

حیدر آباد میں اقبال کے شایان شان ملازمت کی پیش کش اور اقبال کا وظیفہ مقرر نہ ہونے کے اسباب پر نظر حیدر آبادی ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

۱۔ اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۱۸۲

۲۔ اقبال اور حیدر آباد صفحہ ۱۳۷

”.....حضور نظام سے لے کر ایک عام حیدر آبادی کی خواہش اور تمباکے باوجود اقبال اور حیدر آباد میں مستقل قیام نہ کر سکے۔ لیکن اس کا ملال سمجھی کو رہا کہ اقبال کے شایان شان عہدہ کے اختراع اور تجسس نے جو سر کار عظمت مدار برطانیہ کے نمائندہ حیدر آباد کے اشرے سے کبھی وجود میں نہ آ سکا۔ ایک سامنے کی بات کو اکابر دکن کی نظروں سے او جھل کر دیا اور وہ سیدھی سی بات تھی کہ ان کے لیے معقول وظیفہ کا اجر اور یہ بات کچھ ایسی مشکل نہ تھی۔ اور نہ اس سے کسی کو خوف ہو سکتا تھا۔ دیگر مشاہیر کے قطع نظر خود پنجاب کے ایک اور شاعر حفیظ ایں جس ریاست سے ماہانہ وظیفہ پاسکتے تھے وہاں اقبال کے لیے کسی وظیفہ کا اجر اکوئی بڑی بات نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی کو سوچتا ہی نہیں اور سوچتا بھی تو اس وقت جب ریاست بھوپال نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔“

اس پس منظر میں اقبال کا یہ لکھنا:

”.....شاید آپ حیدر آباد سے کسی جواب کے منتظر ہوں گے“

اور پھر فوراً ہی ماضی کے تلخ تجربوں کی روشنی میں اپنی واضح رائے کا اظہار کر دینا۔

”.....گوئیں آپ سے چھپا نہیں سکتا کہ مجھے اس طرف سے

نامیدی ہے۔“

اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ انہیں حیدر آباد کی ابھی ہوتی سیاست اور حیدر آبادی اور

غیر حیدر آبادی کے نعروں سے آلو دھنی اندازہ ہو چکا تھا حالانکہ خون ان کی دلی

خواہش تھی کہ وہ حیدر آباد میں رہ کر ریاست کی خدمت انجام دیتے جیسا کہ سرکش پرشاد کے

نام خط کے اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

”.....حیدری صاحب تو اقبال کو بلا تے بلا تے رہ گئے یونیورسٹی

کے کاغذات ان کی طرف سے کبھی کبھی آ جاتے کہ یہیں سے مشورہ

لکھوں۔ ادھر سے مولوی عبدالحق صاحب اصطلاحات علمیہ کی ایک

طویل فہرست ارسال کر دینے کے ان کے تراجم اردو پر تقدیم کروں گویا

ان بزرگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اقبال کو کوئی اور کام نہیں“۔

میرا جذب دل تو بوزھا ہو گیا۔ آپ کا جذبہ تو بفضلہ بھی جوان

ہے اور ہمیشہ رہے گا پھر کیوں اقبال کو وہاں نہیں کھینچ لیا جاتا۔“

لیکن اقبال کو کھینچ لے جانے کا خواب کبھی شرمندی تعبیر نہ ہو سکا۔ چنانچہ یہ تھی وہ تلخ

حقیقت جس کے نتیجہ میں انہوں نے حیدر آباد سے کسی اعانت کی توقعات ختم کر دی تھیں۔

لے دے کر اب راس مسعودتی ان کے موسیں جلیں اور غم خوار تھے۔ جنہیں وہ بلا تکلف اپنا

حال دل لکھ دیا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں سخت مشکلات میں اور مصائب میں بتلا تھے۔ ان

کے مالی حالات بھی بے حد پریشان کرن تھے۔ بیوی کی مسلسل علالت نے ان کی پریشانیوں

میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ نذرینیازی صاحب کو بھوپال سے لوٹ کر جو خط انہوں نے حکیم نایمنا صاحب کو لاہور بلانے کے سلسلے میں لکھا ہے اس کے اقتباس سے ان کے ذاتی اور ذہنی اجھنوں کا مختوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱۔ ابوالاشر حفیظ جالندھری سے مراد ہے ۲۰۔۲۱۔ اقبال اور حیدر آباد صفحہ

۳۔ اقبال نامہ (جلد دوم) صفحہ ۱۹۱۔۱۹۲

”.....ایک سال سے زیادہ مدت ہوئی کہ میں اپنی علاالت کی وجہ سے کچھ کام نہیں کر سکا آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے ہیں۔ تاہم جہاں تک ممکن ہو گا میں حکیم صاحب کے سفر کا باراٹھانے کے لیے حاضر ہوں!“۔

ان حالات میں اقبال کا راس مسعود کو اپنے ذاتی مسائل کے سلسلے میں بار بار متوجہ کرنا اس بات کی نشاندھی کرتا ہے کہ انہیں راس مسعود کی بے ریاد وستی، سچی ہمدردی اور بے پناہ عقیدت مندی پر ناز ہی نہیں ان کی مخلصانہ سعی و کوشش پر اعتماد بھی تھا۔

چنانچہ ایک اور خط میں جو ۱۹۳۵ء پر میں اکتوبر کا تحریر کر دہ ہے ہمیں ریاست بھاول پور کا تذکرہ ملتا ہے اس کا تعلق بھی غالباً وظیفہ کے متعلق ہے۔ کیونکہ خط عبارت واضح نہیں ہے اس لیے یہ گمان کرنے کے معمول وجوہ ہیں کہ راس مسعود نے نواب صاحب بھوپال سے جو خط نواب بھاول پور کو لکھوا یا تھا وہ یقیناً وظیفہ ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مندرجات کا اقبال کو پہلے کوئی علم نہ تھا۔ لیکن اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال نے کسی دوست کے ذریعہ اس خط کے مضمون سے آگاہی حاصل کر لی چنانچہ لکھتے ہیں:

”لاہور

۱۹۳۵ء پر میل ۱۱۳

مائی ڈیر مسعود

امید ہے کہ آپ کو میرا وہ خط جس میں مس فر کو ہرن کا خط مل گوف
تحال گیا ہو گا۔ خط کشیدہ پیرا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا وہ
کاغذات بھی آپ کو مل گئے ہیں جو مس موصوفہ نے آپ کو بھیجے تھے۔
میں اور چند دوسرے احباب اعلیٰ حضرت کے استغفاری کے متعلق
ایک بیان اور نتھل پر لیں میں بھیج رہے ہیں۔

میرے متعلق آپ کو جو تجویز ہے اس کا سراغ مجھے انجام کارہی
مل گیا۔ مجھے یہ اطلاع ایک بہاول پوری دوست کی معرفت ملی ہے
اور یہ معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بھوپال نے نواب صاحب
بہاول پور کے نام ایک خط لکھا ہے۔ اس خط کے مضمون سے تھوڑی
سی بہت آگاہی ہوئی ہے۔ کیا میری اطلاع درست ہے؟ اس خط کا
جواب موصول ہونے پر میں اس سلسلے میں اپنی رائے آپ پر ظاہر کر
سکوں گا۔

انور کو پیار

محمد اقبال ۲، -

اس خط کا راس مسعود نے فوراً جواب دیا اور اس خط کے مندرجات کے بارے میں بھی
مختصرًا وضاحت کر دی۔ ساتھ ہی اس امر کی تصدیق بھی کہ بہاول پور خط بھیجے جانے کی خبر
درست ہے۔

سطور بالا میں میں نے وظیفہ کے سلسلے میں نواب صاحب بہاول پور کے نام خط کا
تذکرہ کرتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے تھے وہ راس مسعود کے جواب مورخہ ۱۹۳۵ء پر میں

اور وظیفہ کی یادداشت سے لفظ بے لفظ صحیح ثابت ہوئے۔ راس مسعود کا یہ خط اور مسودہ یادداشت کتاب کی نظر ثانی کے دوران دستیاب ہوا۔ ملاحظہ ہوا:

”بھوپال“

۱۹۳۵ء پر میل

میرے نہایت پیارے اقبال

تمہارا مہربانی نامہ مورخہ ۱۲ اپریل مجھے ابھی ابھی ملا ہے۔ ہاں
بہاول پور خط بھیجے جانے کی خبر درست ہے۔ تمہاری دوست مس
فر کو ہر سن اکے کاغذات بھی مجھے مل گئے ہیں جن کا میں توجہ کے ساتھ
مطالعہ کروں گا۔ میں متعدد امور میں بری طرح الجھا ہوا ہوں۔ ہر
ہائی نس کے بھوپال واپس آجائے کے بعد میں ان سے تمہاری خط
کشیدہ عبارت پرتادلہ خیال کروں گا مگر مجھے نہیں معلوم موصوف کی
اس کے بارے میں کیا رائے ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئے دستور
کے سلسلے میں طریق کارکی کسی تبدیلی کے لیے اب بہت تاخیر ہو چکی
ہے۔

تم ہمارے پاس اپنا علاج جاری رکھنے کے لیے کب واپسی کا
ارادہ رکھتے ہو۔ امید ہے کہ جیسا میں نے پچھلے خط میں عرض کیا تھا تم
علی گڑھ جاؤ گے۔

محبت کے ساتھ
ہمیشہ تمہارا مخلص دوست

سید راس مسعوداً،

اقبال کے وظیفہ کے بارے میں یادداشت

”قومی زبان“ کے پچھلے اقبال نمبر اپریل ۱۹۷۵ء میں اپنے مضمون خطوط راس مسعود بنا م اقبال کے ایک فٹ نوٹ میں میں نے عرض کیا تھا کہ ہر ہائی نس نواب حمید اللہ خاں والی بھوال کے ایما پر علامہ اقبال کے لیے ایک ہزار روپیہ ماہوار کے وظیفہ کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں سر راس مسعود نے ہزاری ہائی نس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں نیز دیگر مسلم والیاں مسلم ریاست کو ارسال کرنے کی غرض سے ایک خط کا مسودہ تیار کیا تھا جس میں نے ۱۹۷۰ء میں خیابان مسعود کے انگریزی حصہ میں شائع کر دیا تھا۔ اس نوٹ میں یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ اس مسودہ کا اردو ترجمہ بشرط حیات آئندہ کبھی شائع کیا جائے گا۔

چنانچہ علامہ اقبال پر قومی زبان کی موجودہ اشاعت خاص میں یہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ فٹ نوٹ مذکورہ صدر میں کہا گیا تھا کہ اس سکیم پر عمل نہ ہوا۔ مراد یہ تھا کہ یہ مراسلہ جاری نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ علامہ اقبال نے نواب صاحب بھوپال کے پانچ سور و پیہ ماہوار ہی کو اپنے لیے کافی سمجھا۔ محترمہ بیگم صاحبہ چختاری سابق لیڈی مسعود سے بعد کی گفتگو میں معلوم ہوا کہ نواب صاحب بھوپال کی مقررہ رقم اسی سکیم کا حصہ تھا اور موصوف کی منظوری کے بعد مسودہ مذکور کی ترسیل بھی ہوئی تھی۔

۱۔ مس فرگوسن نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی طرف سے رائل کمیشن کی روپرٹ بابت فلسطین پر علامہ سے ان کے اور جمیع مسلماناں غیر منقسم ہندوستان کے خیالات معلوم کرنے کی غرض سے خط و کتابت کر رہی تھیں (جلیل قدوانی)۔

چنانچہ صرف ہر رائل ہائی نس آغا خاں مرعم نے بقیہ پانچ سور و پیہ ماہوار مہانہ کی

اعانت منظور فرمائی تھی مگر علامہ نے یہ اضافی رقم قبول نہیں کی۔ یہ ضرور ارشاد فرمایا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسے قبول کرنے پر غور کریں گے لیکن اس قسم کی کوئی ضرورت پیش آنے سے قبل ہی وہ معبدود حقیقی سے جاملے۔
(جلیل قدوامی)۔

مسودہ

آج میں یورہائی نس کو ایک ایسے موضوع پر مخاطب کرنے کی جسارت کرتا ہوں جس پر پچھلے کچھ عرصے سے بڑی سنجیدگی سے غور کرتا رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ مسلم والیان ریاست کو موروثی اعلیٰ روایات کے عین مطابق ہونے کے باعث وہ آپ کے فطری جذبہ فیاضی کو متاثر کرے گا۔

دور حاضر کے سب سے بڑے مسلم زندہ شاعر سر محمد اقبال کے نام نامی سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ ان کا نہ صرف ہماری قوم کی ذہنی و فکری زندگی میں بلند ترین مقام ہے بلکہ مغربی دنیا میں بھی انہیں ادب و فلسفہ کے ہر دو کے میدان میں مسلمانان ہند کی ثقاافت کا عظیم نہاد تسلیم کرتی ہیں۔ بدعتی سے گزشتہ بارہ ماہ سے وہ خلق کے ایک خطرناک مرض میں مبتلا تھے اور اس کی کوئی امید باقی نہیں کہ وہ آئندہ کبھی اپنی بیرونی کی پریکش جاری رکھ سکیں گے۔ جوان کی معاش کا واحد وسیلہ تھا۔ جب تک اردو زبان ہمارے ملک میں بولی جاتی رہے گی۔ آئندہ نسلیں اقبال کا نام ایک ایسے صاحب کمال کی حیثیت سے جس نے ہماری شاعری میں ایک نئی روح پھونکی اور جس کے سبب ہماری مادری زبان کے ثقافتی معیار اور اس کی شہرت میں اضافہ ہوا مجبت و افتخار کے ساتھ یقینی رہے گی۔

یہ امر ہمارے لیے شایان ہو گا کہ ان تاریک ایام میں جو بدعتی سے اب ان کے آنے

والے ہیں ہم سے جس قدر ممکن ہوان کی خدمت کریں تاکہ یہ کہنے کو نہ ہو کہ ہندوستان میں اس وقت کے والیان ریاست موجود تھے تا ہم موصوف کو ناداری اور مصائب کی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہماری نسل کے طولانی وقار عالم و ثقافت کے لیے ہمارے عظیم الشان حکمرانوں کی امداد سرپرستی کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں اور انہیں اسباب کی بنابر ان کے نام نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ مہذب دنیا میں قدر و منزلت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ شعراء و اہل علم کے ساتھ اس قسم کی امداد کو مغرب کے ان نکتہ چینوں نے بھی مسلم ثقافت کا بنیادی جزو تعلیم کر لیا ہے جنہوں نے اسلامی ثقافت کی عظمت کو گھٹانے کی زادہ سے زیادہ کوشش کی ہے۔ ہمیں دنیا کو دکھانا چاہیے کہ ایسے افراد کی ہر امکانی امداد کے سلسلے میں جنہوں نے ہماری ثقافت کی خدمت کی ہے آج کے مسلم والیان ریاست اپنے معزز پیش روؤں سے کسی طرح پچھئے نہیں ہیں۔

ان امور کے پیش نظر میں اپنے برادر شہزادگان سے جو مسلم والیان ریاست بھی ہیں اپیل کر کے سر محمد اقبال کے لیے ایک ہزار روپے ماہوار کی آمدنی کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتا ہوں۔ اس سے وہ نہ صرف اپنی باقی ماندہ محقر زندگی نسبتاً اطمینان سے گزار سکیں گے بلکہ اپنے مفید ادبی مشاغل بھی جاری رکھ سکیں گے۔

مجھے توی امید ہے کہ آپ میری تجویز سے اتفاق کریں گے اور مندرجہ بالا مقصد کی خاطر بخوبی مبلغ روپیہ ماہانہ کا عطیہ منتظر فرمائیں گے۔ میں قین کرتا ہوں کہ مسلم والیان ریاست کی طرف سے سر محمد اقبال کی شاندار خدمات کا متفقہ اعتراف جمیع مسلمانان ہند کے لیے مسرت کا باعث ہو گا اور مسلم ریاستیں ان تمام امور کی ترقی و تحفظ کی راہ میں جنہیں ہماری قوم کی زندگی میں ثقافتی اہمیت حاصل ہے آج بھی جو عظیم الشان کردار ادا کر رہی ہیں یہ واقعہ اس کی ایک اور مثال ہو گا۔

میں خود مبلغ روپیہ ماہوار اس کے مد کے لیے نکال رہا ہوں اور شکر گزار ہوں گا کہ اگر آپ بھی اپنا عطیہ ہر ماہ کی کم تاریخ کو مجھے ارسال کر دیا کریں تاکہ سر محمد اقبال کو ہر ماہ باقاعدگی سے ایک ہزار روپیہ کی رقم پہنچتی رہی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یورہائی نس از راہ کمال فیاضی جو قم عطا کرنا منظور فرمائیں گے حضرت موصوف کو اس سے مطلع کر دیا جائے۔

اس نایاب یادداشت کی فراہمی کے بعد اقبال کے ان خیالات کی صداقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس کا اظہار انہوں نے ریاست حیدر آباد اور ریاست بہاول پور کے بارے میں کیا۔

۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء کا یہ اقتباس:

”میرے متعلق آپ کی جو تجویز ہے اس کا سراغ مجھے انجام کار مل ہی گیا۔ مجھے یہ اطلاع ایک بہاول پوری کی معرفت ملی ہے کہ اور یہ معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بھوپال نے نواب صاحب بہاول پور کے نام ایک خط لکھا ہے اس خط کے مضمون سے بھی تھوڑی بہت آگاہی ہوئی ہے۔“

اس حقیقت کے غماز ہین کہ انہیں ان دونوں ریاستوں سے کسی امداد اور سرپرستی کی ہرگز توقع نہیں جیسا کہ آئندہ کے واقعات سے بھی ثابت ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب بھوپال کی اس قابل قدر یادداشت کا ریاست حیدر آباد یا ریاست بہاول پور نے کوئی ثبت جوامنہیں دیا بجز آغا خاں مرحوم کے۔

یہ تھیں راس مسعود کی وہ مخلصانہ کوششیں جو وہ اپنے عزیز اور بہترین دوست کے لیے کر رہے تھے۔ تاکہ انہیں جلد از جلد مالی اچھنوں اور ذہنی پریشانیوں سے چھٹکارا نصیب ہو

سکتا۔ اور وہ اپنا تمام ترقیتی وقت اس عظیم خدمت کے لیے وقف کر سکتے جس کا تعلق قرآن مجید کے حوالی میں تھا اور جس کی تکمیل کی اقبال کو دلی آرزو تھی۔

راس مسعود اور اقبال کے درمیان اس عرصہ میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا راس مسعود نے اقبال کو دوبارہ بھوپال آنے کی دعوت دی۔ خود راس مسعود کی صحت ان دنوں اچھی نہیں تھی اس کے باوجود وہ اپنے محترم دوست کے ہر خط کا جواب دے رہے تھے۔ راس مسعود اور اقبال کے حسب ذیل خطوط سے ان امور کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء سے قبل اقبال نے جو خط راس مسعود کو لکھا ہے۔ افسوس کہ وہ نہ اقبال نامہ میں شامل ہے نہ کہیں دست یاب ہو سکا۔ اس کے باوجود راس مسعود کے خط مورخ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء پر اقبال کے جواب مورخ ۲۶ مئی ۱۹۳۵ء سے اقبال کے صبر آزم حالات کا اندازہ لگانا چند امشکل نہیں:

”ریاض منزل
بھوپال۔ سی۔ آئی
۱۹۳۵ء میں ۲۳ مئی“

میرے نہایت پیارے اقبال
تمہیں محبت نامے کا شکریہ مجھے افسوس ہے کہ تم علی گڑھ نہ جا
سکے اور یہ معلوم ہو کہ بیگم صاحبہ سخت علیل ہیں تکلیف ہوئی۔ تم نے
محترمہ کی پیاری کی نوعیت نہیں لکھی۔ ایسی حالت میں اتنے فاصلے
سے سخت یابی کی دعا کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔

تمہارے ذاتی معاملہ کی بابت صورت حال ذرا کچھ اور واضح ہو
تو خبر دوں کہ پچھلے چار روز سے میں خود میریا کے شدید حملے کی وجہ

سے بستر پر پڑ گیا ہوں اور اس نے جاتے جاتے مجھے کچھ بہرا اور
خاصابے حال کر دیا ہے۔ مجھے صحیح تجھ بتاؤ کہ اپنا اعلان جاری رکھنے
کے لیے یہاں کس تاریخ کو پتچر ہے ہو۔

امتنل کی طرف سے مودبانبہ سلام اور لیڈی اقبال کے لیے دعا
قبول ہو۔ میری طرف سے علی بخش کو سلام اور جاوید کو دعا۔

ہمیشہ تمہارا چاہنے والا

سید راس مسعود اے

ڈاکٹر سر محمد اقبال

بارا یٹ لا

میکلوڈ روڈ لا ہور

یہ خط ملتے ہی اقبال نے جواب لکھا:

(انگریزی)

”لا ہور.....۱۲۶ پر میل ۱۹۳۵ء“

مائی ڈپ مسعود.....

نواڑش نامہ موصول ہوا۔ آپ کی علالت کی اطلاع باعث
تنویش ہوئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد آپ کو سخت کلی عطا فرمائے۔

۱۔ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۳۶

میں انشاء اللہ می کے آخر تک بھوپال آکسوں گا۔ میری بیوی

گز شستہ دس سال سے بیمار اور تلی اور جگر کے عوارض میں بنتا ہے اور

اب بوجہ بخار زیادہ کمزور ہو گئی ہے۔

ہم لوگ انشاء اللہ وسط میں تک اپنے نئے مکان میں چلے جائیں گے۔ خدا کرے کہ اس وقت تک میری بیوی چلنے پھرنے کی ہمت یادا ہو جائے۔ اگرچہ مجھے آپ سے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلے میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں۔ مجھے کچھ عرصہ پہلے تو اس خیال کی مسرت تھی کہ آپ کی اس کوشش میں کامیاب ہونے کی قوی امید تھی اور اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر گور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئے پیش کش مسلماناں ان عالم کو نہیں کر سکتا۔

بہر حال دیدہ باید ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لیے مقدر ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لیے ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں سلام کہیے علی بخش آپ دونوں کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔ جاوید بھی آپ ارولیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہے۔

محمد اقبال،

اس خط سے مئی میں ان کے دوبارہ بھوپال آنے کا ارادہ کاظہ بھی ہوتا ہے اور بیوی کی عالت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ نئے مکان سے مراد جاوید منزل ہے جو تکمیل کے آخری مراحل میں تھی اس خط میں واضح طور پر راس مسعود کی کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ان خطوط کی طرف اشارہ کر کے اپنی ماہی کاظہ بھی کیا ہے جو راس مسعود نے نواب صاحب بھوپال سے حیدر آباد اور بہاول پور بھجوائے تھے۔ ان کا یہ لکھنا.....

مجھے اس سلسلہ میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں ہے.....

اور پھر انہائی ماہی کے عالم میں یہ اظہار کرنا:

لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا یہ.....

خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا.....

اگر مجھے حیات مستعار کی باقی گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان

میرا یے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہترمی

ل کوء پیش کش مسلماناں عالم کو نہیں کر سکتا.....”

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۵۶ تا ۳۵۸

ان کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن اقبال کی ماہی اور دل برداشتگی کے باوجود راس مسعود نے اپنی پر خلوص مسامی جاری رکھیں۔ حیدر آباد اور بہاول پور سے توقعت کے مطابق کامیابی نہ ہوئی۔ تو انہوں نے نواب صاحب بھوپال اور سر آغا خاں سے رجوع کرنا مناسب سمجھا جس کی اطلاع انہوں نے اقبال کو بھی نہیں دی۔ کیونکہ ان ہی دنوں نواب صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی کی چانسلری سے استعفی دے دیا تھا۔ اور علی گڑھ کے حالات ایک بار پھر الجھ گئے تھے ۲۰ مئی کے خط سے بیوی کے آپریشن بھوپال آخر مئی میں پہنچنے کے قصد

اور نواب صاحب کے چانسلری سے استغفاری کے متعلق مسائل پر واضح روشنی پڑتی ہے۔

(انگریزی)

”لا ہور.....۱۹۳۵ء میں“

مائی ڈیر مسعود.....

امید ہے آپ اور لیڈی مسعود صاحبہ دونوں بخیریت ہوں گے۔

الحمد للہ میری تشویش ذرا کم ہو گئی ہے۔ میری بیوی کو ایک آپریشن کروانا پڑا ہے۔ اگرچہ یہ بڑا ہی ہولناک اور ناقابل برداشت منظر تھا لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی بچ گئی۔ میں انشاء اللہ ماء کے آخر میں آپ دونوں کے پاس پہنچ جاؤں گا آپ نے کوئی اطلاع نہیں دی اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ معاملہ جوں کا توں ہی ہے۔

یونیورسٹی کا چانسلر اب کون ہو گا؟ کاش اعلیٰ حضرت نواب بھوپال نے اپنے استغفار پر دوبارہ غور فرماسکتے۔ لیکن شعیب صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ اس کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ممکن نہیں بلکہ اغلب ہے کہ لا رڑ ویلنگڈن نواب صاحب کو استغفار پر مکر غور کرنے پر ضرور مائل کر لیں گے۔

مجھے اطلاع دیجیے کہ اعلیٰ حضرت کا اس سلسلے میں کیا ارادہ ہے اگر اعلیٰ حضرت رضا مند نہ ہوں تو پھر کیا آپ کی رئے میں نواب صاحب بہاول پوراں منصب کے لیے موزوں ہوں گے.....

محمد اقبال

علی بخش آپ اور لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض

کرتا ہے۔“ -

اقبال کا خط پا کر راس مسعود نے پہلی فرصت میں جواب دیا اور انہیں مئی کے آخر تک بھوپال آ کر اپنا علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ ساتھی یہ اطلاع بھی کہ اس باروہ نواب صاحب بھوپال کے مہمان ہوں گے۔ اور اعلیٰ حضرت بہ نفیس ان کے آرام دہ قیام کا انتظام فرمائیں گے۔ اسی خط میں یہ بات بھی واضح ہوئی کہ نواب صاحب بھوپال نے جن حالات کے تحت مسلم یونیورسٹی کی چانسلری سے استعفی دیا تھا ان پر نظر ثانی کا زیادہ امکان نہیں تھا۔ خط کے آخر میں اقبال کے ذاتی معاملہ کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ خط کا متن ملاحظہ ہو۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۵۸-۳۵۹

”بھوپال“

۹ مئی ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

تمہارے نہایت پیارے خط مورخہ ۲ مئی کو پا کر مجھے بڑا اطمینان ہوا جس میں یہ خوش خبری تھی کہ خداوند تعالیٰ اکی مہربانی سے تمہاری نیک بیگم صاحبہ کا آپریشن کامیاب رہا۔

ہاں مئی کے آخر تک یہاں ضرور پہنچ جاؤ اور اپنا علاج جاری رکھو۔ شاید میری بیوی سے تمہاری ملاقات نہ ہو اس لیے کہ کم و بیش اسی زمانے میں وہ ان دور چلی جائیں گی اور اس کے بعد جلد ہی مجھے بھی ان کے پاس جانا ہو گا مگر میں نے ہر ہائی نس سے ساری

باتیں کر لی ہیں اور انہوں نے فرمایا ہے کہ وہ تمہیں بڑی خوشی سے اپنا مہمان بنائیں گے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اعلیٰ حضرت نفس نفسیس یہاں تمہارے آرام دہ قیام کا مناسب انتظام فرمائیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس امر کا زیادہ امکان نہیں کہ ہر ہائی نس مسلم یونیورسٹی کی چانسلری سے اپنے استغفے پر نظر ثانی کری گے۔ اعلیٰ حضرت کسی اقدام میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے اسی لیے میرے خیال میں وہ اپنی رائے نہیں بد لیں گے۔ تم چانسلری کے لیے جس شخص کو مناسب سمجھواں کی سفارش کر دو۔

ہر ہائی نس اپنی چھوٹی شہزادی کو سوٹر لینڈ رخصت کرنے کے لیے یہاں آنیں بغرض علاج جانا پڑ رہا ہے۔ بہمی تشریف لے گئے ہیں۔ ان کی واپسی پر مجھے معلوم ہو سکے گا کہ تمہارا معاملہ کس مرحلے میں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کا تصفیہ ابھی تک نہ ہو سکا اور حالیہ ہر ہائی نس و مراسلہ ہذا کے ادنیٰ رقم سے زیادہ کوئی اور دواشخاص اس معاملے میں دلچسپی نہیں لے سکتے۔

مکر۔ براہ کرم علی بخش کو میرا سلام پہنچائیں اور انہیں کہیں کہ جتنی گرمی انہیں اپنے پیارے لاہور میں لگ رہی ہوں گی یہاں اس کی آدھی بھی نہیں۔

بہترین پیار کے ساتھ

تمہارا ہمیشہ

راس مسعوداً۔

راس مسعود کے اس خط کے جواب میں اقبال نے ۱۲ اور ۱۳ مئی ۱۹۳۵ء کے بعد دیگرے دو خط انہیں ارسال کیے جو بدقسمتی سے دست یاب نہ ہو سکے۔ البتہ نظر ثانی کے دوران راس مسعود کا خط مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء میں گیا جس سے اقبال کے خطوط کے مندرجات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنے ان خطوط میں قرآن مجید کے حواشی سے متعلق جو تجویز پیش کی تھی اس راس مسعود نے اس سے کلیتاً اتفاق کیا ہے اور انہیں کوئی دس دن اور صبر سے کام لینے کی تلقین کی ہے تاکہ اس عرصے میں وہ نواب صاحب بھوپال سے بات کر سکیں۔

راس مسعود کے خط مورخہ ۲۰ مئی اور اقبال کے جواب مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء سے ان مسائل پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے:

”بھوپال۔ سی آئی“

۱۹۳۵ء میں

میرے نہایت پیارے اقبال
مجھے تمہارے ۱۲ اور ۱۳ مئی ۱۹۳۵ کے دونوں خط ملے ہر ہائی نس
کل ہی سے پھر کو وہ اپس تشریف لائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے تمہارے
معاملے پر اعلیٰ حضرت سے تبادلہ خیال کا وقت نہیں ملا مگر اس ہفتے
باریابی کا موقع بخشے جانے پر جلد ہی اس سوال کو اٹھاؤں گا۔ میں
تمہارے دونوں خط اعلیٰ حضرت کے ملاحظہ میں گزار دوں گا۔ اس
لئی کہ تم نے امیں جو تجویز پیش کی ہے اس سے مجھے کلی اتفاق ہے۔
میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے تمہیں ایسی خبر سنانے کے قابل

بنائے جس سے تمہاری موجودہ مشکلات رفع ہو جائیں۔ خدار کوئی
دشمن اور صبر سے کام لو۔

امتل کے بارے میں یہ ضرور ہے کہ انہیں ابتدائے ماہ جون
میں ان دور ضرور چلا جانا ہے اور میں غالباً ان تک ۱۲ تاریخ کے لگ
بھگ پہنچ جاؤں گا یہاں تمہارے با آسائش قیام کے سلسلے میں میں
نے جیسا کہ ۹ مئی کے خط میں لکھا چکا ہوں ہر ہائی نس مناسب
انتظامات فرمائیں گے۔ براہ مہربانی مجھے اپنی متوقعہ آمد کی صحیح تاریخ
سے مطلع کریں۔

مکر را بھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہر ہائی نس چند دن کے لیے

پھر باہر تشریف لے جا رہے ہیں۔

صمیم قلب کے ساتھ

تمہارا ہمیشہ

سید راس مسعوداً،

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی زندگی کا یہ دور بڑی ابتلا و آزمائش کا تھا۔ ان کے سچے رفیق اور
قدردار..... راس مسعود انہیں تقریباً ہر خط میں جلد بھوپال آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔
لین اقبال اپنی بیگم کی خطرناک علالت کے سبب اس وقت لاہور سے باہر نہیں جاسکتے
تھے..... چنانچہ راس مسعود کا خط ملتے ہی انہوں نے فوراً جواب دیا:

۱۔ ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی۔ اپریل ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۱

”لاہور..... ۱۹۳۵ء مئی ۲۳۔“

مائی ڈیر مسعود

نواہش نامہ کے لیے جس ایک گونہ اطمینان ہوا سر پا سپاس
ہوں میری خواہش ہے کہ تو میں اس انسان کی خواہش ہے جو قبر میں
پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ اور سر آخرت سے پہلے کچھ نہ کچھ خدمت
انجام دینے کا تمنا ہے مجھے امید ہے کہ آپ اعلیٰ حضرت کی خدمت
اقدس میں اس مسئلے کو پیش کر دیں گے۔ اعلیٰ حضرت کے مرام
خسر وانہ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ بھوپال میں میری
آسائش کا ان کو اس قدر خیال ہے۔ میری یوں خطرناک طور پر بیمار
ہیں شاید اس کے آخری لمحات ہیں لہذا میرے لیے لاہور سے
باہر جانا ممکن نہیں آپ کو بعد میں اطلاع دے سکوں گا مجھے اطلاع
دیجیے کہ آپ اور لیڈی مسعود صاحبہ کب بھوپال واپس آئیں گے۔
میرا خیال ہے کہ لیڈی مسعود صاحبہ تو کچھ دیر ان دور میں مزید قیام
فرمائیں گی۔ اور آپ جوں کے آخر میں بھوپال واپس پہنچ جائیں
گے۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں میر اسلام کہیں اور انور کو دعا۔
کیا حکیم صاحب ابھی وہاں ہی ہیں امید ہے انہیں ملازمت مل گئی ہو
گی۔

والسلام محمد اقبال

سائز ہے پانچ بجے میری یوں کا انتقال ہو گیا..... اقبال!

ابھی اقبال بھوپال جانے کے پروگرام کو آخری شکل دینے بھی نہ پائے تھیکہ ۲۳ مئی کو
ہی ان کی رفیقہ حیات کا انتقال ہو گیا۔ اور خط بند کرتے ہوئے آخری سطر میں انہوں نے
راس مسعود کو اس المناک حادثہ کی اطلاع دے دی۔ اور دوسرے ہی روز انہوں نے نیازی

صاحب کو بھی جو اس علالت کے دوران برابر ان کی خدمت میں مصروف رہے تھے۔ اس دردناک واقعہ سے مطلع کیا۔

” لاہور ۲۲ مئی ۱۹۳۵ء ”

ڈیرینیازی صاحب السلام علیکم

کل شام چھ بجے والدہ جاوید اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں۔ ان کے آلام و مصائب کا خاتمہ ہوا اور میرے اطمینان قلب کا اللہ فضل کرے۔

ہر چہ از دوست می رسد نیکو است
باقی رہا میں سو میری حالت وہی ہے جو بھوپال سے آتے وقت تھی۔

بھوپال نہ جاسکوں گا۔ جب تک بچوں کے لیے کوئی معقول انتظام نہ ہو جائے۔

اس حادثہ جانکا ہ پرندیزیرینیازی تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
”..... جاوید منزل منتقل ہوئے ابھی تین دن گزرے تھے کہ یہ

حادثہ المیہ پیش آیا

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۰-۳۶۱

۲۔ مکتوبات اقبال - صفحہ ۲۷۳-۲۷۵

اور ٹھیک اس وقت جب حضرت علامہ کوئی گم صاحبہ کی رفاقت اور معیت کی شدید ضرورت تھی لیکن عمر بھر کا یہ ساتھ اسی وقت ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا مشیت ایزدی یونہی تھی۔ میں نے تعزیت کا تاریخ بھیجا۔

جامعہ نے بھی تعزیت کی۔

بچوں کی پرورش اور نگہداشت اب ایک دوسرا مسئلہ تھا جس نے
حضرت علامہ کے لیے مستقل پریشانی کی صورت اختیار کر لی۔ یہ
صورت حالات بڑی یا س انگریز تھی۔ باقی رہا میں۔ ان الفاظ کو پڑھ
کر بڑی تکلیف ہوئی..... بھوپال جانا بھی رہ گیا۔

بیوی کی رحلت کے بعد اقبال نے سب سے پہلے گھر کے بگڑے ہوئے نظام پر قابو پایا
بچوں کی پرورش و نگہداشت پر توجہ دی اور پھر اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔
۳۰ مئی کو انہوں نے پھر راس مسعود کو انہتائی مایوسی کے عالم میں خط لکھا:

(انگریزی)

”لاہور..... ۱۹۳۵ء مئی ۳۰“

ڈیر مسعود

چراغ سحر ہو بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے کہ مر نے سے پہلے قرآن
کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت اور
طااقت مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا
ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جدا مجد..... (حضور نبی کریمؐ) کی
زیارت مجھے اس طمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان
دین کی جو حضور نے ہم تک پہنچایا ہے کوئی خدمت بجالا سکا.....
خالص محمد اقبال،

عجب اتفاق ہے کہ اس خط کو سپرد ڈاک کرنے کے فوراً بعد انہیں دوسری ڈاک سے

راس مسعود کا وہ خط بالآخر مل گیا جس میں انہوں نے نواب صاحب کو پانچ سورو پے ماہوار تا حیات وظیفہ مقرر کرنے کی اطلاع دی تھی ۳۰ مئی ہی کو انہوں نے یہ دوسرا خط راس مسعود کو ارسال کیا:

” لاہور ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء ”

ڈیر مسعود

آپ کا والا نامہ بھی ملا ہے میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں انہوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی کہ جب میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے ہندوستان کے مسلمان شرفاء میں سے کون ہے جو اعلیٰ حضرت کا اور ان کے دودمان عالیٰ کام ممنون احسان نہیں ہے:

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۷۶-۲۷۵ ۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ

۳۶۲-۳۶۱

دور دستاں رابہ احسان یاد کردن ہمت است
ورنه ہر نخلے بہ پائے خود شرمی افگندے
یہ عریضۃ اعلیٰ حضرت کو سنادیجیے۔ میں خود حاضر ہو کر شکریہ ادا کروں گا۔ اب میری درخواست صرف اس قدر ہے کہ احکام اس پیشن کے توجاری ہوں گے ہی سرکار عالیٰ اپنے ہاتھ سے ایک مضمون کا ایک خط بھی مجھے لکھ دیں جو آپ نے مجھے لکھا ہے۔ یہ خط میری اولاد میں بطور یادگار کے رہے گا۔ اور وہ اس پر پختہ کریں گے۔ میں

انشاء اللہ تو چالیسویں کے بعد حاضر ہوں گا۔ یا جب آپ اور لیڈی مسعودا بتدا اگست میں مع الخیر ان دور سے بھوپال واپس آ جائیں گے تو مہربانی کر کے مجھے یہ لکھ دیجیے کہ اگر میں جون کے آخر میں آؤں تو اپنے بھوپال پہنچنے کی اطلاع کس کو دوں۔ ممنون کو اطلاع دے دوں یا جس کو آپ لکھیں۔ لیڈی مسعود کی خدمت میں سلام۔ جاوید آداب کہتا ہے..... باقی آپ کا شکریہ کیا ادا کروں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی سادات کی آبائی میراث ہے۔ بالخصوص آپ کے خاندان کی.....

آپ کا

محمد اقبالؒ۔

را مسعود کو خط لکھنے کے بعد انہوں نے اپنے لاکف پیشن کے سلسلے میں نذر ی نیازی صاحب کو بھی مطلع کیا:

”ڈی رینیازی صاحب..... السلام علیکم

..... اعلیٰ حضرت نواب صاحب جنے میری لاکف پیشن پانچ سو روپے ماہوار کر دی ہے۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔

والسلام

محمد اقبال..... لا ہور کیم جون

اس خط کی وضاحت کرتے ہوئے نیازی صاحب لکھتے ہیں:

”.....عجلت میں حضرت علامہ پانچ کے بعد سو کا اضافہ کرنا
بھول گئے۔ یہ امر کہ حضرت علامہ کو مالی پریشانیوں سے نجات ملی بڑا
اطمینان بخش تھا۔ پھر مسرت بالائے مسرت یہ کہ حضرت علامہ
تعلیمات قرآنی کی تشریح اور ترجیحی کا عزم رکھتے ہیں ہے۔“

۱ یہ شعر اسی طرح مشہور ہے لیکن مطبوعہ کلیات صائب میں جہاں یہ شعر آیا ہے وہاں
افگند کی جگہ آورد ہے۔

۲ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۲ تا ۳۶۴

۳ ”سو“ سہوا رہ گیا (نیازی)

۴ مکتوپات اقبال صفحہ ۲۷۶۔ ۲۷۷

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی زندگی میں ان کی سچی رفاقت قدر دانی اور لگاتار سعی و کوشش
کے بعد ان کی بروقت اعانت کا سہرا صرف راس مسعود کے سر پر ہے جسے اردو ادب کی تاریخ
اور آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گی نواب صاحب کے متعلق اقبال کا یہ کہنا.....

”.....انہوں نے ایسے وقت میں میری دشیگیری فرمائی ہے کہ جو
میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی
عمر و دولت میں برکت دے۔ ہندوستان کے مسلمان شرفا میں سے
کون ہے جو تعالیٰ حضرت کا اور ان کے دو دو مان عالیٰ کام منون احسان
نہیں ہے۔“

ان صداقتوں کا اظہار ہے جن سے اس چھوٹی سی اسلامی ریاست کے ہر حکمران نے
تاریخ ادب میں انہیں نقش چھوڑے ہیں۔ لہذا اقبال کا اظہار عقیدت مندی کسی خوشنامدی
تملق سے عبارت نہیں۔ راس مسعود ان کے انتہائی مخلص اور عزیز ترین نیاز مندوں

میں سے تھے۔ اور انہوں نے اس سلسلے میں جتنی کچھ مسامعی کی تھیں وہ اس لیے نہیں کی تھیں کہ اقبال سے ان کی کچھ اغراض وابستہ تھیں وہ تو ان گھری وابستگیوں اور دلی ارادت مندوں کا نتیجہ تھا جو راس مسعود کو اقبال سے تھیں اور اقبال کو راس مسعود سے جن کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”..... باقی آپ کا شکریہ کیا ادا کروں مسلمانوں کے ساتھ
ہمدردی مساوات کی آبائی میراث ہے بالخصوص آپ کے خاندان
کی.....“

یہ اظہار بھی ان سچائیوں کا امین ہے جن سے سر سید کے اس جانشین نے درس تپش لیا تھا اور بھوپال کے ساتھ اقبال کی وابستگی کو نقشِ دوام بخش گیا تھا۔ اقبال جو خود حیاتِ دوام تھے راس مسعود کے ناتے ریاست بھوپال کو بھی اور نواب حمید اللہ خاں کو بھی حیاتِ دوام بخش گئے۔ تاریخِ تہذیب کے ان صداقت آفرین ابدی رشتہوں سے کون ہے جو ان کار کر سکے۔ ادیب و مفکر بھی انسانی تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے اس لیے ان کی دینگیری اور اعانت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ زندگی کے لیے ہر سانس کی..... اس حقیقت پر کتنے لوگوں کی نظر رہی اور اقبال ایسی عظیم شخصیت کو آزمائش کے انتہائی صبر آزمالمحسوں میں کس کس نے کتنی مدد دی؟..... یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں..... نواب صاحب اور راس مسعود کے علاوہ شاید ہی کوئی اور شخصیت ایسی مل سکتے جس نے اقبال کی بجا طور پر قدر دانی اور حق نیاز مندی ادا کیا ہو یہ افتخار سچ پوچھیے تو نہ حیدر آباد کو حاصل ہو سکانے کسی اور ریاست کو مجzen بھوپال کے جس نے اقبال ایسے آفاقتی شاعر کو اس کی زندگی میں ہی نواز کر زندہ دوستی اور اعتراض عظمت کی ایک عہد آفرین مثال قائم کی جو آج اور ہمیشہ زندہ رہے گی اور بقول رشید احمد صدقیقی:

”..... بھوپال کا تھا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں

میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گی۔ اگر افراد کے مانند اداروں کو بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجات اخروی متین ہے۔ اقبال کو غم روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے چنانچہ اقبال کے بعض عقیدت مند سر راس مسعود مرحوم اور نواب حمید اللہ خاں بالقباب کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیز و گرامی ہنسٹیوں اور بہت سی منزلتوں پر مافق رکھتے ہیں۔

۱۔ گنج ہائے گرانما یہ۔ صفحہ ۱۸۳



بھوپال کا دوسرا قیام

(۷ اجولائی تا ۱۲۸۵ گست ۱۹۳۵ء)

نواب حمید اللہ خاں کی اقبال شناسی، ادب دوستی اور علم پروری کے باعث اقبال بڑی حد تک مالی اور ذہنی پریشانیوں سے نجات پا چکے تھے اور اب ان کی تمام تر توجہ بھوپال جانے پر مرکوز تھی تاکہ وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے وہ اپنے بھلی کے علاج کا دوسرا کورس مکمل کر سکیں اور فرصت اور یک سوئی کے ساتھ اس عظیم کام یعنی قرآن مجید کے حواشی لکھنے کا کام بھی شروع کر دیں جس کی انہیں بڑی تمنا تھی اور جس کی تکمیل کے لیے وہ اپنے عزیز ترین دوست راس مسعود کو اس سے قبل بار بار لکھ چکے تھے۔ راس مسعود سے ان کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس دوران انہیں لندن سے رہوڈ زیکھر ز کے سلسلے میں بھی دعوت موصول ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ ملک سے باہر جانے پر تیار نہ تھے..... والدہ جاوید کی رحلت کے بعد جاوید اور منیرہ کی پرورش و پرداخت کا تمام تر بار انہیں کے کاندھوں پر آن پڑا تھا۔ علاوه ازیں رفیقة حیات کی وصیت کے مطابق وہ اپنیوں کو تنہا بھی نہ چھوڑ سکتے تھے۔ چنانچہ انہیوں نے ایک خط میں اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اسی خط میں انہیوں نے لاکھ پیش کے سلسلے میں نواب حمید اللہ خاں بھوپال کی قلمی تحریر کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ تاحیات و نظیفہ کے احکام اعلیٰ حضرت اپنے قلم سے لکھ کر انہیں بیچھ جیسے تاکہ وہ اسے فریم میں کرا کے رکھ لیں..... یہ عجیب سی خواہش بظاہر اس جذبے کی غمازی کو ظاہر کرتی ہے جو بلا امتیاز ہر انسان میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ اسے جذبہ ممنونیت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اور اسے انسان کے فطری جذبے

سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اقبال کے بعض ناقدین نے اس پر اعتراض کیا مثلاً عزیز احمد کا یہ لکھنا:

”..... باوجود ”فقر“ کے فلسفہ کو مکال تک پہنچانے کے اقبال کسی نہ کسی طرح کی شاہ پرستی سے آخر تک اپنے دماغ کو چھکارا نہ دلا سکے۔ چنانچہ امان اللہ خاں، نادر شاہ شاہ افغانستان ظاہر شاہ یہاں تک کہ فرمائ روانے بھوپال و بھی مخاطب کر کے انہوں نے نظمیں لکھی ہیں اقبال کی حمایت میں زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کی نظموں سے مدح کا پہلو بالکل خارج ہوتا گیا اور موعظمت اور عمل اک پہلو بڑھتا گیا۔ لیکن موعظمت اور خیر کی تلقین سعدی کی زبانی اچھی معلوم ہوتی ہے اور سعدی کے زمانے کے لحاظ سے موزوں بھی تھی۔ بادشاہوں کا ذکر اور ان کا گوارا کر لینا ہی اقبال کی تعلیم میں خارج ہوتا ہے اور اس سے ایک ایسا تضاد پیدا ہوتا ہے جس کی تاویل نہیں ہو سکتی۔“

عزیز احمد کے ان اعتراضات کا جواب نظر حیدر آبادی کی کتاب اقبال اور حیدر آباد میں

ہمیں مل جاتا ہے وہ لکھتے ہیں:

”..... موعظمت اور عمل کی تلقین کے لیے ہر زمانہ میں کسی نہ کسی سعدی نے کسی بغداد پر آنسو بہائے ہیں اور ما یوس دلوں میں امید کی کرن دوڑا دی۔ اقبال نے جس زمانے میں افرض ادا کیا اس وقت پوری ملت اسلامیہ بغداد کی تباہی کا سر اپا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس مسلسل اندر ہیرے میں اقبال جن کھوئے ہوئے کی جتوں میں نکلے

تھے انہیں جہاں کہیں کوئی روشنی کوئی کرن، کسی نادر، کسی ظاہر شاہ، کسی
نواب بھوپال یا کسی نظام دکن کی شکل میں سر آتی تھی۔ وہ
اسید لیل را سمجھتے تھے۔ چراغ منزل نہیں۔ اقبال کو شاہ پرست یا
قصیدہ گو قرار دینے سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ کس کس کا وظیفہ
خوار اور کس کا مصاحب رہا ہے اور کہاں کہاں اتراتا پھرا۔ مرض
الموت کے زمانہ میں گوشہ نشینی اور جہد معاش کے لیے ناقابل ہو
جانے کی وجہ سے اگر انہوں نے ناب بھوپال کی دوستانہ اعانت قبول
کر لی تھی تو یہ کوئی جرم نہیں ایسے فعل مجبوری کی مثال دے کر یزداں
شکار اقبال کی پیشانی پر شاہ پرستی کا لیبل چسپاں کرنا نامناسب ہے
 بلکہ تکلیف دہ ہے:

فقر کے ہیں مجرمات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ ۲“
عمر کے آخری حصے میں اقبال اپنی مسلسل علالت بیوی کی اگاتار بیماری مالی حالت کی
ابتری اور محدود وسائل کے جن صبر آزماء مرحلوں سے گزرے تھے۔ عزیز احمد نے شاید ان کا
تجزیہ ضروری نہیں سمجھا اور اقبال کو صرف ایک عظیم مفکر، بلند پایہ فلسفی، اور انقلابی سمجھ کر شاہ پرستی کا
رسی اعتراض کر دیا حالانکہ اپنی گوناگوں شاعرانہ خصوصیات و صفات کے باوجود اقبال ایک
انسان بھی تھے اور ان کو بھی ایک عام انسان کی طرح مادی ضرورتوں کا سامنا تھا۔ اس لیے یہ
کہتا کہ:

”..... بادشاہوں کا ذکر اور ان کا گوارا کر لینا ہی اقبال کی

انقلابی تعلیم میں حارج ہوتا ہے اور اس سے ایک ایسا تضاد ہوتا ہے

جس کی تاویل نہیں ہو سکتی،۔

دost نہیں مخداقبال ایسے بلند پایہ مفکر کی بجا طور پر قدر دانی ایک علیحدہ بات ہے اور شاہ پرستی ایک جدا گانہ موضوع سوال یہ ہے کہ اقبال کو مالی پریشانیوں سے نجات دلانا کیا معاشرہ افراد معاشرہ کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اور کیا نواب بھوپال سے وظیفہ ہونے کے بعد اقبال کی ساری فکر قصیدہ گوشا عروں کی طرح شاہ پرستوں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی۔

۱۔ اقبال نئی تشکیل۔ صفحہ ۸۲-۸۳

۲۔ اقبال اور حیدر آباد۔ صفحہ ۸۷

اور پھر کیا اقبال کا آخری سرمایہ شعری تمام تربادشا ہوں کے ذکر پڑھی مشتمل ہے۔ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر اس کی واضح تاویل یہ ہے کہ اقبال نے نواب بھوپال کو کبھی شاہوں کے زمرے میں نہیں رکھا۔ اقبال اور نواب صاحب کے قریبی روابط کا تفصیلی تذکرہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ الہذا قا یک ذمی حیثیت دost کی بروقت رفاقت کو شاہ پرستی کا الزام دینا حق گوئی نہیں ہے نہ تنقیدی دیانت۔ زیادہ سے زیادہ اعتراض برائے اعتراض کا نام دیا جاسکتا ہے اور بس۔

اقبال کی خودداری شان قلندری اور ان کے فقر غیور کے بے شمار واقعات ان کے نیاز مندوں اور قدردانوں نے بیان کیے ہیں جن کے پیش نظر بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کے کسی دور میں بھی انہوں نے شاہ پرستی کو اختیار نہیں کیا۔ اس کے عکس ان کا سارا کلام اور ان کی تمام ترقیاتی کی نفی کرتی ہے۔

اقبال کے ایک نیازمند اور ارادو ادب کے نہایت معبر اور ممتاز ادیب و نقاد خواجہ گلام السیدین کے پیش کردہ صرف دو واقعات ہی عزیز احمد کے عاید کردہ الزام کی تردید کے لیے کافی ہیں:

”..... بت شکنی کتنی ہی ضروری ہو وہ بت شکن کو ہر دل عزیز نہیں
بنتی۔ یہ اقبال کی شاعری کا اعجاز ہے کہ با وجود عمر بھراں ناگوار فرض
کو انجام دینے کے انہوں لے ان کے فکر نے ان کے کلام نے
ہماری نسل کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ اور وہ ہماری قہقہی جذباتی اور
روحانی میراث کا ایک جزو عزیز بن گئی ہے۔

آخری عمر میں ان کا فقر اور بے نیازی کا انداز اور بڑھ گیا تھا
جس نے ان کو دنیا کی اوچھی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بے
نیاز کر دیا تھا۔ اور خود شناسی اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی
منزل تک پہنچا دیا تھا۔ جب وہ خلوص کے ساتھ کہہ سکتے تھے:

میرا نشیمن نہیں در گھہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخ نشیمن بھی تو
اس شان فقر کے ایک دو دل چھپ واقعات قابل ذکر ہیں۔ سر
راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبال کو آخری عمر میں اطمینان کے ساتھ
ادبی اور اعلیٰ کام کرنے کا موقع ملے اور کسی طرح فکر معاش سے
آزادی حاصل ہو جائے۔ ان کے توجہ دلانے سے نواب صاحب
بھوپال اور ایک دوسرے دولت رئیس مند نے یہ سعادت حاصل
کرنی چاہی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ اقبال بہ مشکل بھوپال کی
کمتر قم کو اس سے دو چند رقم کے مقابلے میں قبول کر لینے پر راضی ہو
ئے اور وجہ یہ بیان کی کہ اول تو اتنی رقم میری ضروریات کے لیے کافی
ہے میں زیادہ کیوں لوں۔ دوسرے جب تک میرے دل میں کسی

شخص کی کوئی خاص و قوت نہ ہواں کی امداد قبول نہیں کر سکتا۔ یہ تھا
غیرت فقر کا تقاضا ایک ایسے زمانے میں جب روپے کے بازار میں
تقریباً ہر شخص کی قیمت لگائی جاسکتی ہے۔ اور بڑے بڑے مشاہیر
منصب جادہ دولت کی خاطر ہر قسم کا ایشار کرنے کو تیار ہیں۔

”..... ایک اور واقعہ انہیں (علامہ اقبال کو) سراکبر حیدری کے
ساتھ پیش آیا۔ واقعہ جانا بوجھا لیکن قابل ذکر ہے۔ انہوں نے یوم
اقبال پر تو شہ خانہ حضور نظام کی طرف سے ایک ہزار روپے کی رقم
خطیر بطور توضیح پیش کی۔ جب وہ چیک اس تمہید کے ساتھ اس قلندر
کے پاس پہنچا تو اس نے اسے ان اشعار کے ساتھ واپس کر دیا جو بعد
میں ”ارمنغان حجاز“ میں شائع ہوئے:

تھا یہ فرمان الٰہی کہ شکوه پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے ارو شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سردوش
کام درویش میں تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہیں سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی ذکات
اقبال اس بہت سی غیر معمولی ذاتی خوبیاں تھیں۔ لیکن میرے
دل میں بڑی عقیدت ہے اس شان فقر کے لیے جس کی تفسیر

انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کی تھی۔ لیکن اس کا خطاب
در اصل عصر حاضر کے تمام نوجوانوں سے ہے:

ہمت ہے اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے ججازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شان بے نیازی
حاصل اس کا شکوه محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
یہ فقر غیور جس نے پایا
بے تنق و سنان ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری
اقبال نے اس فقیری کو اللہ سے مانگا تھا اور اس کی بدولت وہ
ایمان کی دولت سے مالامال تھا،۔

بات کچھ دور جا پڑی ہے۔ عرض یہ کہ رہا تھا کہ اب اقبال جلد سے جلد بھوپال جانے
کے لیے بے تاب تھے اور اس مسعود کے جواب کے منتظر جیسا کہ اس خط کی عبارت سے
ظاہر ہے:

” لاہور ۱۵ جون ۱۹۳۵ء ”

ڈیر مسعود

امید ہے آپ اور لیڈی مسعود بہمہ وجہ خیریت سے ہوں

گے۔ میں آپ کے خط کے انتظار میں ہوں۔ امید ہے کہ ضروری احکام کے متعلق پیش جاری ہو گئے ہوں گے۔ اب صرف مجھے اس خط کا انتظار ہے جس کا ذکر میں نے اپنے گزشتہ خط میں کیا تھا۔ اگر اعلیٰ حضرت پچھڑی ۲ واپس تشریف لے آء ہوں تو وہ خط لکھوا کر بھجوa دیجیے۔ کل اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کا تاریخی آیا تھا اور آج سردار صلاح الدین سلووقی اعلیٰ حضرت کا زبانی پیغام لائے تھے، بہت حوصلہ افزای اور دل خوش کن پیغام ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں سوائے دعا و ترقی مراتب۔

۱۔ آندھی میں چراغ۔ صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۶

۲۔ قدیم صوبہ متوسط کا پر فضائی مقام

لارڈ لودین کا خط ابھی لندن سے آیا ہے وہ پوچھتے ہیں کہ رہو ڈز لیکھرز کے لیے کب آؤ گے؟ اب بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں؟ ان کی ماں کی وصیت ہے کہ ان بچوں کو اپنے سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہ کرنا۔ لیڈی مسعود کی خیریت سے آگاہ تکھی۔ اور میری طرف سے انہیں سلام کہیے۔

آپ کا۔ محمد اقبالؑ،

تقریباً ایک ہفت کے بعد راس مسعود کا تفصیلی جواب موصول ہو گیا۔ اور نواب صاحب ہو پال کی وظیفہ سے متعلق قلمی تحریر بھ۔ لیڈی مسعود کی علاالت سے انہیں تشویش تھی چنانچہ ۲۷ جون ۱۹۳۵ء کے خط میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اور بھوپال جانے کے قصد کا اظہار بھی۔ وہ بھوپال جانے کے لیے بے چین تھے اس کا اندازہ اس خط کی اس عبارت سے:

”.....زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ آپ سے ملنے

کے واسطے تڑپ رہا ہوں.....“

واضح طور پر لگایا جا سکتا ہے خط کا پورا متن ملاحظہ ہو:

” لاہور ۲۲ جون ۱۹۳۵ء ”

ڈیر مسعود

آپ کا خط مل گیا ہے اور اعلیٰ حضرت کا والا نامہ بھی موصول ہو

گیا ہے جسے میں نے سادہ اور خوبصورت فریم میں لگوادیا ہے۔ آپ

شاہید ان درود تشریف لے گئے ہوں میں لیڈی مسعود کے لیے دست

بدعا ہوں۔ جب ان کو فراغت ہو تو مجھے ان کی خیریت سے بذریعہ

تاریخ مطلع کیجیے۔

میں انشاء اللہ وسط جو لائی تک بھوپال پہنچوں گا۔ جاوید کو ہمراہ

لانا ہوگا۔ علی بخش بھی ہمراہ ہو گا۔ وہ آپ کو ہر روز ایک دو دفعہ یاد کرتا

ہے شعیب صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع دوں گا مگر یہ توفیر مائیے کہ

میرا ایڈریس بھوپال میں کیا ہو گا تاکہ میں گھر میں وہ ایڈریس چھوڑ

جاوں۔ اس طرح بچی منیرہ کی خیریت کی خبر مجھے روز ملتی رہے گی۔

جس جگہ مجھے ٹھہرنا ہو گا اس جگہ کا مجھے پتہ لکھ دیجیے۔ زیادہ کیا عرض

کروں سوائے اس کے کہ آپ سے ملنے کے واسطے تڑپ رہا

ہوں..... والسلام

محمد اقبال

ہاں آپ کا سیکرٹری پرائیویٹ ممنون حسن ریاض منزل ہی میں

ہو گا یا کہیں اور..... میں اپنے آنے کی اطلاع اسے بھی دے دوں گا
سم،۔

اقبال اور راس مسعود اور لیڈی مسعود سے کتنی گہری وابستگی اور قربت تھی اس کا ثبوت ۳ جولائی کے اس خط سے بھی ہو جاتا ہے جو انہوں نے لیڈی مسعود کی شدید علاالت کے سلسلے میں بھوپال بھیجا تھا۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۵-۳۶۲

۲۔ ان دور جانے آنے کا سلسلہ دراصل لیڈی مسعود کے والد کرمل عبدالرشید خاں کے سبب تھا جو ان دونوں ریاست ان دور میں تھے۔

۳۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۵-۳۶۲

اسی خط میں اس جذبہ احسان مندی کا اظہار بھی ہوتا ہے جس کا تعلق ان کے پہلے قیام بھوپال سے ہے جب کہ وہ ریاض منزل میں راس مسعود اور لیڈی مسعود کے مہمان تھے۔ لیڈی مسعود نے اقبال کی دیکھ بھال اور خبر گیری میں جس دلچسپی اور انہاک کا ثبوت دیا تھا اس کی کچھ جھلکیاں گز شستہ صفات میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اب وہ پھر بھوپال جا رہے تھے اس لیے ولادت کے سلسلے میں راس مسعود کی پریشانی کے لیے بھی پریشانی کا موجب تھی چنانچہ وہ ان کے لیے دعاۓ صحت بھی کرتے رہے اور جب تک راس مسعود کا تار انہیں مل نہیں گیا بے حد مرد و فکر مندر رہے:

” لا ہور ۲۔ جولائی ۱۹۳۵ء ”

ڈیر مسعود..... ابھی آپ کا تار ملا ہے جس سے اطمینان خاطر ہوا۔ خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ کا خط ملنے سے اس وقت تک میری طبیعت نہایت پریشان تھی۔ گز شستہ رات بھی میں دریتک

ان کے لیے دعا کرتا رہا۔ دوران قیام بھوپال میں انہوں نے جو توجہ
مجھ پر مبذول رکھی میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ امید ہے کہ
اب وہ جلد صحت یا ب کامل حاصل کر لیں گی۔ اور آپ کی طبیعت کو
بھی اطمینان نصیب ہو گا۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ
موسم سخت گرم ہے اور بارش کا انتظار ہے۔ کل سے مطلع غبار
آلود ہے۔ میری طرف سے انہیں سلام کہیے اور دوائے
صحت.....آپ کا
محمد اقبال،۔

لیڈی مسعود پہلے سے بہتر تھیں اور اس لیے انہیں ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔
ہفتہ عشرہ میں ہی وہ بھوپال جانا چاہتے تھے چنانچہ اس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔
راس مسعود کو اپنے پروگرام سے مطلع کرنے کے علاوہ بھوپال انہوں نے نیازی صاحب کو
بھی بھوپال روائی کے بارے میں اطلاع دی:

”ڈی نیازی صاحب“

میں دو چار روز تک بھوپال جاؤں گا اور قریباً ڈیڑھ ماہ وہاں
ٹھہراؤں گا۔ شاید اب تک چلا جاتا مگر بارش نہیں ہوئی۔ برسات
شروع ہو جائے تو جاؤں۔ بہتر ہے آپ بھی لاہور میں نہ آئیں اور
مجھے دہلی کے ریلوے سٹیشن پر ملیں ہاں اگر آپ کو کوئی ضروری کام ہو
تو مضاف نہیں ہے۔ میں غالباً ۱۵ جولائی تک یہاں سے چلوں گا
بشرطیکہ بارش ہو گئی.....

والسلام محمد اقبال

۱۱ جولائی ۱۹۳۵ء ” ۳۔

۱۱ جولائی کے اس خط کے دو دن بعد ہی انہوں نے رخت سفر باندھ لیا اور نیازی صاحب کو اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا:

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۷

۲۔ میں زائد ہے (نیازی)

۳۔ مکتوبات اقبال - صفحہ ۲۷۹

” لاہور - ۱۳ جولائی ۱۹۳۵ء ”

ڈیر نیازی صاحب السلام علیکم

اس سے پہلے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو مل گیا ہو گا یہاں سے ۱۵ جولائی کی شام فرمنٹر میں بروز سموار روانہ ہو کر ۱۶ کی صحیح کو دہلی پہنچوں گا۔ وہاں تمام دن قیام رہے گا کہ جاوید دہلی دیکھ سکے آپ مجھے ریلوے شیشن پر ملیں اور بھوپال کی گردی جو وہاں سے شام کو چلے گی میرے لیے دو سیٹ سینئنڈ کلام اور بر تھر ریز روکروا دیں باقی بروقت ملاقات۔

والسلام - محمد اقبال، ۱۔

چنانچہ پروگرام کے مطابق اقبال ۱۵ جولائی کو لاہور سے روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں جاوید اور ان کا دیرینہ خدمت گزار علی بخش ان کے ہمراہ تھا۔ ۱۶ کو دہلی پہنچنے تو شیشن پر نیازی صاحب اور دیگر معتقدین نے ان کا استقبال کیا۔ دن بھر انہوں نے دہلی میں قیام کیا جاوید نے دہلی کی سیر کی۔

۱۶ کی شام کو وہ دہلی سے روانہ ہوئے اور ۱۷ اجولائی کو دوسری بار بھوپال پہنچے۔ راس

مسعود شعیب قریشی نواب صاحب کے ندیم ممنون حسن خاں پرائیویٹ سکرٹری راس مسعود اور کئی عقیدت مندوں نے شیش محل پران کا خیر مقدم کیا۔ اراہیں سرکاری قیام گاہ شیش محل میں ٹھہرایا۔ شیش محل وسط شہر کی ایک عالی شان اور پر شکوہ عمارت تھی اس کے سامنے مشہور کھرنی والا میدان واقع تھا۔ شیش محل کے متصل کئی اور عالی شان محل کھڑے تھے جن میں صدر منزل جو سرکاری تقریبات اور بھوپال کے یادگار سالانہ مشاعر کے باعث شہرت دوام رکھتی تھی قابل ذکر ہے شیش محل کے سامنے قدیمہ محل تھا جہاں اقبال کے خصوصی ڈاکٹر عبدالباسط رہتے تھے۔ میدان کے دوسرا طرف بڑا تالاب تھا۔ اور یہ سارا اعلاقہ فتح گڑھ کھلاتا تھا۔ دائیں جانب ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلہ پر حمید یہ اسپتال تھا دوسری جانب بھوپال کی مشہور موتی مسجد تھی جو فتح تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی۔

”شیش محل“، میں اقبال کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ انہیں یہاں ہر طرح کی آسودگی اور راحت مل سکے اور علاج و معالجہ کے سلسلے میں بھی سہولت رہے..... اس کے علاوہ وہ ریاست کے وظیفہ یا بھی تھے اس لیے شاہی محل میں ان کے قیام کا انتظام نوب صاحب بھوپال کی خواہش پر کیا گیا تھا تاکہ انہیں علاج اور قیام کے دوران کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ شیش محل میں صرف مقتدر و معزز شخصیتیں ہی قیام کرتی تھیں ورنہ عموماً محل مغل رہتا تھا محل کی تاریخ میں اب پہلی بار اسے حکیم الامت اور مفکر مشرق ایسی باعظمت شخصیت کے مکین ہونے کا شرف ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کی شان و عظمت بی دوچند ہوئی اور ان کے شاہکار تخلیقات سے جو اقبال نے شیش محل کے قیام کے دوران کہیں اسے تاریخی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ یہی وہ شیش محل ہے جس کے قیام کے دوران اقبال نے اپنے عزیز ترین دوست راس مسعود کی ہمہ وقت رفاقت اور نواب صاحب کی خصوصی توجہات سے فیض یاب ہوئے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں انہوں نے فرصت اور آسودگی کے بہترین لمحات بر سر کیے۔

۲۔ اس مشہور اور قابل دید مسجد کی تصویر شامل کتاب ہے

اور یہی وہ مقام ہے جہاں انہوں نے قرآن مجید کے حواشی لکھنے کے لیے باقاعدہ کام کا آغاز کیا..... ریاست بھوپال کا یہ فخر ہے جانہیں کہ اس نے اقبال ایسے آفاقت شاعر کو جسم و جاں کی راحتوں کا سامان ہی مہیا نہیں کیا فکر و تخلیق کے نئے گوشے اجاگر کرنے کے موقعے بھی بہم پہنچائے۔

بھوپال آنے کے بعد دوسرے ہی دن سے ان کا معاشرہ اور علاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے معالجین نے پہلے سے زیادہ احتیاط اور توجہ ان کے علاج پر صرف کی پہلی بار مختصر علاج کے بعد ان کی صحت سنبھل گئی تھی۔ مگر لا ہول و لٹنے کے بعد وہ مسلسل پر پیشانیوں کا شکار رہے۔ چنانچہ ان کی صحت پہلے سے بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ان کے معمولات میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ علاج اپنی جگہ پر تھا اور ان کے فکر و استغراق مطالعہ کتب احباب اور نیازمندوں سے خط و کتابت کا سلسلہ اپنی جگہ پر تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو مصروف رکھ کر صحیح معنوں میں عالم با عمل ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ چنانچہ اس قیام کے دوران میں ان کی تحریروں سے جو انہوں نے وقتاً فوتاً علامہ سلیمان ندوی، سید نذری نیازی، ڈاکٹر محمد دین تاثرا اور پروفیسر شجاع وغیرہ کے نام لکھی ہیں ان کے علمی و فکری مشاغل کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے یوں کہنے کو وہ صرف علاج کے سلسلے میں بھوپال آئے لیکن حق پوچھیے تو بھوپال کا دوسرا قیام فرصت و آرام کے علاوہ ایک سوئی کے ان لمحوں میں اس عظیم کام کا آغاز کرنا ہے جس کا انہوں نے نواب بھوپال سے وعدہ کیا تھا یعنی قرآن مجید کے حواشی کی تیاری۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ روقا دیانی پر بھی مضامین کی تیاری کر رہے تھے۔ چنانچہ بھوپال پہنچنے کے تیسرا ہے ہی دن انہوں نے سید سلیمان ندوی کو تفصیلی خط لکھا جس کے

مطالعہ سے اقبال کی فکر و جستجو کے کئی گوشے کھل کر سامنے آتے ہیں:

”بھوپال، شیش محل..... ۱۹۳۵ء جولائی“

مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب..... السلام علیکم

میں گلے کے بر قی علاج کے لیے مدت سے بھوپال میں مقیم

ہوں۔ اس خط کا جواب یہیں مذکورہ بالا پتے پر عنایت فرمائیے۔

۱۔ کیا فقہ اسلامی کی رو سے تو ہین رسالت قابل تعزیر جرم ا

ہے اگر ہے تو اس کی تعزیر کیا ہے؟

۲۔ اگر کوئی شخص جو اسلامی کا مددوی ہو یہ کہے کہ مرزا غلام احمد

قادیانی کو حضور رسالت مآب پر جزوی فضیلت حاصل ہے اس واسطے

کہ مرزا قادیانی ایک زیادہ متمدن زمانے میں پیدا ہوئے ہیں تو کیا

ایسا شخص تو ہین رسول کا مرتكب ہے؟ بالفاظ دیگر اگر تو ہین رسول جرم

قابل تعزیر ہے تو عقیدہ مذکورہ تو ہین رسول کی حد میں آتا ہے یا نہیں؟

؟

۱۔ بے شبہ

۲۔ تعزیر حسب رائے امام قید سے لے کر تقلیل تک

۳۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو جزوی فضیلت حاصل ہونا جائز ہے اور ایسا کہنا نہ کفر ہے نہ تو ہین ہی کا باعث ہے البتہ متقاضائے محبت کے خلاف ہے اور پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ جزوی فضیلت حقیقت میں فضیلت کے شمار میں ۃے بھی مثلًا زیادہ ممتعن زمانہ میں ہونا کوئی فضیلت نہیں کیونکہ خود تمدن نہ کوئی دینی فضیلت ہے۔ نہ اخلاقی نہ عقلی بلکہ ممکن ہے یکہ اس کے بعد اور بھی دنیا زیادہ متمدن ہو جائے اور اس زمان کیے آدمی پر بھی کیا اس

زمانے کے آدمی کو فوقيت ہو جائے گی۔ اور اگر یہ امر باعث فضیلت ہو تو غلام احمد قادریانی کیا اقبال سیالکوٹی کو بھی یہ جزوی فضیلت حاصل ہے۔ بلکہ غلام احمد سے زیادہ کیونکہ مرزا صاحب نے صرف اس کو دور سے دیکھا ہے چکھا اور آزمایا ہیں۔

(سید سلیمان ندوی)

۳۔ اگر تو ہین رسول کی مثالیں کتب فقہ میں مذکور ہوں تو
مہربانی کر کے ممنون فرمادیجیے! - امید ہے اس عریضہ کا جواب جلد
ملے گا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ میری صحت پہلے سے بہتر ہے امید
ہے کہ اس دفعہ علاج سے زیادہ فائدہ ہوگا..... والسلام
خالص محمد اقبال لا ہور

حال وار دبھوپال لے،

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پنجاب میں فتنہ قادریانی نے پھر سراٹھیا تھا اور اقبال ردقادریانی کے سلسلے میں مضا میں لکھ رہے تھے اور اس خط کے مندرجات سے اقبال کی ذہنی مصروفیت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔

”.....میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ امید ہے اس دفعہ علاج
سے زیادہ فائدہ ہوگا“

انہوں نے اس خط کا جواب بھوپال کے پتے پر ہی طلب کیا تھا اور مقصد یہ تھا کہ سید صاحب کی رہبری کے بعد وہ اپنے مضمون کی تکمیل کر لیتے چنانچہ حسب توقع انہیں جلد جواب مل گیا۔ اس دوران قادریانیوں سے متعلق کچھ اور مسئلے زیر بحث آگئے تو انہوں نے کیم اگست کو دوسرا خط بھی بھوپال سے روانہ کیا۔ جس میں چند اور مسائل کے بارے میں استھنواب کیا گیا تھا:

”بھوپال.....شیش محل

کیم اگست ۱۹۳۵ء

مخدوم مکرم جناب مولانا السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مجھے بھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس

ہوں۔ چند امور اور بھی دریافت طلب ہیں ان کے جواب بھی ممنون

فرمائیے۔

۱۔ تکملہ مجمع البخار صفحہ ۸۵ میں حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل

کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ حضور رسالت مآب گو خاتم النبیین کہو۔ لیکن یہ
نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہو گا۔

مہربانی کر کے کتاب دیکھ کر یہ فرمائیے کہ آیا اس قول کے اسناد

درج ہیں۔

۱۔ نقل فرمجھ سے نہ ہو گا۔ آپ السیف الامسال علی شاتم الرسول کو دیکھ لیجیے۔

۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۸۸ تا ۱۹۰

۳۔ اس وقت وہ رد قادیانی یہا پنا مضمون تیار کر رہے تھے۔

۴۔ جی ہاں اس کتاب میں یہ روایت ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ سے لی گئی ہے۔
لیکن اس کی سند مذکور نہیں جو روایت کی صحت و صنف کا پتہ لگایا جائے اور اگر صحیح بھی ہو تو یہ
حضرت عائشہؓ کی محض رائے ہے کہ رسول اللہ صلعم نے بار بار جو فرمایا ہے کہ لانبی بعدی
میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حضرت عائشہؓ کے خیال میں اس لیے ایسے کہنے سے منع کیا کہ
حضرت عیسیٰ کا نزول کا انکار اس سے لوگ نہ سمجھنے لگیں۔ بہرحال ان کا خیال ہے کہ جس کا صحیح
ہونا ضروری نہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب خود حضور صلعم کے قول کے خلاف ہو۔

اور اگر ہیں تو آپ کے نزدیک ان کی اسناد کی حقیقت کیا ہے۔ ایسا ہی قول درمنشور جلد پنجم صفحہ ۲۰۳ میں ہے۔ اس کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے۔ میں نے یہاں بھوپال میں یہ کتاب تلاش کیں افسوس اب تک نہیں ملیں۔

نج اکرامہ صفحہ ۳۲۷۔ ۳۲۸ حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے۔ من قال بسبب نبوۃ کفر هقا اس قول کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہے۔

۳۔ لوماش ابراہیم لakan نبیا۔ اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے نو دی اسے معتبر نہیں جانتا ملائی قاعری کے نزدیک معتبر ہے جیکیا اس کے اسناد درست ہیں۔ بخاری کی حدیث وامکم منکوم میں داؤ حاليہ ہے کیا اگر حالیہ ہو تو اس حدیث کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے دوبارہ آنے سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ جس وقت وہ آئیں گے مسلمانوں کا امام خود مسلمانوں سے ہو گا۔

۴۔ ختم نبوت کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہے تو اس سے آگاہ فرمائیے زیادہ کیا عرض کروں..... امید ہے

مزاج بخیر ہو گا..... والسلام
محصل محمد اقبال ہے،

۱۔ جی ہاں وہی روایت بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ اس کتاب میں بھی ہے۔ اور اس کی

نسبت پہلے لکھ چکا۔

۲۔ حج الکرامی فی آثار ایقیامہ نواب صدیق حسن خاں کی کتاب ہے۔ حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی بصفت نبوت ہو گی یا بلا صفت نبوت اس باب میں علماء کا اختلاف ہے نواب صاحب کی یہ راء معلوم ہوتی ہے کہ وہ بصفت نبوت ہو گی۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کی آمد ثانی میں ان کی صفت نبوت سے انکار کرتے ہیں ہو مرتكب کفر ہیں بہر حال یہ رائے ہے۔

۳۔ یہ ابن ماجہ کی روایت ہے۔ اس روایت کو بعض محققین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرض ہے واقعہ نہیں کیونکہ لوفرض اور عدم وقوع کے لیے آتا ہے ای یہ معلوم ہوا کہ محمد رسول صلعم کے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔ اس لیے ابراہیم بن محمد چونچپن، ہی میں اٹھالیا گیا تھا۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں یہی مذکور ہے۔ چنانچہ خود ابن ماجہ میں اور بخاری میں ۃ وقظ ان میکون بعد محمد نبی لعاش انہے لکن لا نبی بعدہ (ابن ماجہ جنائز بخاری انبیاء) یعنی یہ کہ اگر فیصلہ الہی یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو وہ آپ کے صاحزادے زندہ رہتے۔ لیکن یہ فیصلہ الہی ہو چکا تھتا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔ ملا علی قادری نے اس کو موضوعات میں لیا ہے اس کو معتبر نہیں کہا۔ ضعیف کہا ہے۔ اس میں ابو شیبہ ابراہیم راوی ضعیف ہے۔ بلکہ وہ متروک الحدیث..... منکر الحدیث..... باطل گو اور دروغ گو تک کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بشرط صحت ملانے اس کی تاویل کی ہے کہ بہر حال اس حدیث کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث کا ہے لوگان بعدی نبیا لکان عمر (مند احمد) ترمذی، یعنی یہ کہ اگر میرے بعد ع نبی ہونا ممکن ہوتا تو عمر بن خطابؓ نبی ہوتے لیکن چونکہ ممکن نہیں اس لیے نہ وہ ہوا اور نہ کوئی اور نبی ہو سکتا ہے۔

۴۔ صحیح یہی ہے کہ داؤ دحالیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ عیساً یوں پرجت ہوں گے اور مسلمانوں کی تائید فرمائیں گے۔ مسلمانوں کا ہو گا حضرت عیسیٰ نہ ہوں گے۔

۵۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۴

بھوپال کی آب و ہوا بہاں کی خوش گوار فضا پر سکون ماحول راس مسعودا یسے جا شار
مخلص دوست کی قربت نواب حمید اللہ خاں کی رفاقت اور معین کی خصوصی توجہ سے اقبال
کی صحت عامہ برابر رو به ترقی تھی چنانچہ اسی دور کے دو خط اور ملتنے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا
ہے کہ بھوپال کے قیام اور بجلی سے علاج سے انہیں خاطر خواہ فائدہ ہو رہا تھا کیم اگست ۱۹۳۵
ء کا خط سید نذرینیازی کے نام ہے لکھتے ہیں:

”کیم اگست ۱۹۳۵ء“

شیش محل، بھوپال

ڈیرینیازی صاحب..... السلام علیکم

میری صحت ترقی کر رہی ہے الحمد للہ..... اگر آلا ہور سے واپس آ

گئے ہوں تو اطلاع دیں.....

والسلام

محمد اقبال ا۔

اور یہ دوسر اخط پروفیسر شجاع کے نام ہے اس میں بھی اقبال نے اپنے قیام بھوپال اور
صحت کی بحالت کا ذکر کیا ہے:

”بھوپال..... ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء“

ڈیر مسٹر شجاع

میں بغرض علاج بر قی بھوپال میں مقیم ہوں۔ اور اگست کے

آخر تک یہیں رہوں گا۔ میری صحت عامہ پہلے کی نسبت بہت اچھی

ہے۔ اور آواز میں بھی کسی قدر فرق ہے امید ہے کہ اس دفعہ کے علاج سے بہت فائدہ ہوگا۔ رب شہتوت کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ لیکن بعض لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ مفید ہے بہر حال آزمائے پر معلوم ہوگا کہ میں آپ کا نہایت شکرگزار ہوں کہ آپ نے محض میرے لیے اس درخت کی حفاظت کی اگر اس کا پھل فائدہ نہ بھی کرے تو بھی ممکن ہے آپ کے اخلاص کی برکت سے فائدہ ہو جائے باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے.....

والسلام
محمد اقبال ۲۰

انہیں دنوں لاہور کی فضابہت مکدر ہو گئی تھی۔ مسجد شہید گنج کے انہدام اور مابعد اثرات کے سبب حکومت نے مارشل لانافڈ کر دیا تھا نیازی صاحب نے اقبال کو لاہور کی صورت حال سے مطلع کیا تو انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ اور انہوں نے ۱۶ اگست ۱۹۳۵ء کو اس کا جواب دیتے ہوئے اس امر سے بھی آگارہ کیا کہ ان کے علاج کا کورس ۲۸ اگست تک مکمل ہو جائے گا۔ نیازی صاحب نے انہیں طلوع اسلام کے اجراء کی خوشخبری سنائی تھی چنانچہ اس خط میں اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ نیازی صاحب یہ ملی اسلامی مجلہ اقبال کے ایماء پر نکال رہے تھے۔ اور جب ان کی موجودگی میں بعض نیازمندوں نے رسالہ کا نام ان کی مشہور نظم طلوع اسلام پر رکھنے کی تجویز پیش کی تو انہوں نے نہایت فراخ دلی سے اس کی اجازت دے دی۔

خط کا پورا متن یہ ہے:

”بھوپال۔ ۱۶ اگست ۱۹۳۵ء“

ڈیرینیازی صاحب..... السلام علیکم

آپ کا خطاب بھی ملا ہے الحمد للہ خیریت ہے۔ میں نے خدا کے
فضل سے اچھا ہوں۔ جاوید بھی راضی اور خوش ہے۔ لاہور کے
حالات پر افسوس ناک بین خدا تعالیٰ رحم کرے مجھے یہ سن کر خوشی
ہوئی کہ طوع اسلام کے لیے فضاساز گار ہے آپ جب دہلی واپس
آئیں تو مجھے اطلاع دیں میں ۱۲۸ اگست تک اپنے علاج کا کورس ختم
کر لوں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ سلامت اللہ شاہ
صاحب سے سلام کہہ دیں علی بخش بھی آداب لکھواتا ہے.....

والسلام

محمد اقبال - بھوپال“

اس خط کے بعد انہوں نے پھر نیازی صاحب کو خط لکھا جس میں صحبت عامہ کی بحالی
روانگی کے پروگرام اور طلوع اسلام کے سلسلے میں قیمتی مشورے دیے تھے۔ اس خط سے یہ
اندازہ ہوتا ہے کہ وہ طلوع اسلام کے اجراء میں کتنی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

”بھوپال ۱۰ اگست ۱۹۳۵ء“

ڈیرینیازی صاحب..... السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے الحمد للہ خیریت ہے۔
صحبت خوب ترقی کر گئی ہے۔ آواز میں بھی فرق ہے۔ امید ہے
کہ اب کے علاج سے فائدہ ہو گا۔ شاید ایک دفعہ اور بھوپال آنا

پڑے گا۔ یعنی اس ہفتے کے بعد آپ دہلی پہنچ جائیں تو وہاں پہنچتے ہی مجھے خط لکھ دیں میں غالباً ۲۶ اگست کو یہاں سے روانہ ہوں گا۔

طلوع اسلام کے متعلق آپ نے جو کچھ مجھے لکھا ہے اس سے بڑی خوشی ہوئی صوراً سرا فیل ۲ کا ایک ٹکڑا پہنچ دوں گا۔ یاد ہلی پہنچ کر خود لکھ دوں گا۔ میرے خیال میں ایک نئی فوج جو طلوع اسلام کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ سکھوں کے دور سے پہلے کی تاریخ پنجاب پر مفصل مضمون لکھے جائیں۔ چودھری محمد حسین صاحب اس بارے میں مشورہ کریں۔ انہوں نے حال ہی میں مسلمانوں کی تاریخ کے اس حصے کا مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں کہ میں اسے پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ پنجاب کے مسلمانوں کی بیداری کے لیے اس حصہ تاریخ پر لکھنا ضروری ہے۔ باقی خیرت ہے۔ طلوع اسلام کے پہلے نمبر میں ہی ایک مضمون تاریخی ضروری ہے..... والسلام

محمد اقبال (۱۹۳۷ء)۔

۱۔ مکتوبات اقبال - صفحہ ۲۸۱

۲۔ صوراً سرا فیل کا نام بعد میں ضرب کلیم رکھا گیا

۳۔ میں سہوارہ گیا (نیازی)

۴۔ مکتوبات اقبال - صفحہ ۲۸۳

خط و کتابت اقبال کے معمولات کا ایک اہم حصہ تھی۔ وہ مطالعہ کرنے کے علاوہ نہایت پابندی سے ہر خط کا جواب خود ہی لکھتے تھے بھوپال کے قیام کے دوران انہوں نے مجوزہ کتاب کے سلسلے میں بھوپال کی مشہور اور مستند حمید یہ لاہوری اور دیگر لاہوری یوں سے

استفادہ کیا۔ نیز سید سلیمان ندوی سے جن کے وہ بے حد عقیدت مندا اور معتقد تھے خط و کتابت کے ذریعے اپنے بعض شکوک و شبہات رفع کی اور بعض اہم دینی امور میں ان سے مشورے لیے خود اپنی نظر میں ان کی شاعرانہ حیثیت کیا تھی۔ یہ بات بھی انہوں نے بلا تکلف سید صاحب کو ۲۰ اگست ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں لکھ دی جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ خط اقبال کی فکری عظمت کے ساتھ ساتھ ان کے عجز و انکسار کا بھی آئینہ دار ہے۔

”بھوپال..... ۲۰ اگست ۱۹۳۵ء“

مندومی..... السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے۔ جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میں بھی یہاں حمید یہ لاہوری کے بعض پرائیویٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا۔ الحمد للله کہ بہت سی باتیں مل گئیں اس مطالعہ سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا۔ اور آپ کے خط نے تو اور بھی راہیں کھول دی ہیں۔

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقبہ نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقبہ تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ:

نہ بنی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ برمن تھبت شعر و سخن بست
(زبور جنم)

مخلص محمد اقبال اے۔

راس مسعود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے حیدر آباد ہو یا علی گڑھ یا بھوپال جہاں بھی وہ رہے سب کے کام آتے رہے۔ اقبال کے قیام بھوپال کے دوران مولانا حالی کے صاحزادے خوجہ سجاد حسین نے انہیں لکھا کہ حالی مسلم ہائی سکول پانی پت شدید مالی مشکلات میں گھرا ہے۔ اس کی مدد کی جائے۔ راس مسعود ایسے عالی ظرف در دمندا اور علم و ادب کے شیدائی بھلا کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ چنانچہ انہوں نے نواب صاحب کو بھوپال کو پانی پت میں تقریب کے لیے رضامند کر لیا اور پھر اقبال کو آمادہ کیا۔ مولوی عبدالحق کو حیدر آباد دکن خط لکھا اور سارے انتظامات پلک جھکتے مکمل کرادیے۔ علم و تعلیم کی سچی لگن جوانہیں ورنے میں مل تھی اس سے ان گنت شخصیتیں بہرہ مند ہوئیں۔ ان کے جہاں اور کارنا مے زندہ ہیں وہاں پانی پت ایسے دور افتادہ مقام پر حالی کا صد سالہ جشن بھی ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔ کہ اس کے روح روای راس مسعود اور تھا راس مسعود تھے۔ جن کے خلوص و جوش نے پانی پت میں اقصائے ملک کی مقدار شخصیتوں کو آن کی آن میں جمع کر کے ایک مثالی تقریب منعقد کرادی اور اتنا عظیم فرائم کیا کہ حالی مسلم ہائی سکول کو دوام نصیب ہو گیا۔ اس جشن کا تذکرہ پہلی بار ہمیں اقبال کے اس خط میں ملتا ہے جوانہوں نے نیازی صاحب کو تحریر کیا۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۹۵۱ء ۱۹۷۶ء

”بھوپال..... ۲۱ اگست ۱۹۳۵ء“

ڈیر نیازی صاحب..... السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اس سے پہلے ہی ایک خط آپ کو دہلی کے پتہ پر لکھ چکا ہوں۔ شاید یہ خط اسی کا جواب ہے۔ سفارشی تحریر

ملفوظ ہے اس کو ٹائپ کروالیں۔ یا ایسے ہی ساتھ ٹانک دیں۔ عبد العلی اصحاب کو میں نہیں جانتا۔ مسعود ۲ سے دریافت کروں گا۔ اگر وہ جانتے ہوئے تو ان کو لکھوادوں گا۔

”طلوع اسلام“ کا پہلا نمبر سید راس مسعود کے نام بھی ارسال فرمائیے۔ مولانا حاملی کی سینٹری ۳۱ اکتوبر کے آخر میں ہو گی۔ ان پر ایک مضمون آ کے پہلے نمبر میں ہو جائے تو بہت اچھا ہے یا دوسرے نمبر میں بشرطیکہ دوسرا نمبر اکتوبر کے وسط سے پہلے نکل آئے۔ تاکہ آپ کا رسالہ سینٹیزی کے موقع پر تقسیم ہو سکے۔ سینٹیزی پانی پت میں ہو گی۔ اعلیٰ حضرت نواب بھوپال صدر ہوں گے۔ میں بھی پانی پت اس موقع پر جاؤں گا۔ بلکہ اعلیٰ حضرت کے متعلق بھی اس رسالے میں کچھ ہو جائے تو اور بھی اچھا ہو۔ مولانا حاملی پر جو مضمون ہو کسی اچھے مبصر کے قلم سے ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ آپ کا پہلا نمبر ہی وسط اکتوبر میں نکل۔ میں انشاء اللہ ۲۸ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ کی صبحو دہلی پہنچوں گا۔ روانگی سے پہلے اطلاع دوں گا۔

محمد اقبال

آپ دہلی پہنچ کر مجھے کارڈ مکھیں جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ آپ دہلی پہنچ گئے ہیں؟

راس مسعود کے پروگرام کے مطابق حاملی کی صد سالہ بر سی آخر اکتوبر ۱۹۳۵ء میں زیر صدارت نواب صاحب بھوپال منعقد ہو رہی تھی جیسا کہ اقبال کے خط سے ظاہر ہے۔

اس خط سے واضح طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں صد سالہ برسی کی تقریبات سے کتنا گھر الگ اٹھا۔ نیازی صاحب کو طلوعِ اسلام کے سلسلے میں یہ لکھنا کہ مولانا حاملی پر بھی ایک مضمون کسی اچھے مبصر سے لکھوا کر شامل کریں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بھی راس مسعود کی طرح اس جشن میں کامیاب دیکھنے کے آرزو مند تھا۔ ساتھ یہ انیں نواب صاحب بھوپال کی معارف پروری اور علم دوستی کا بھی اعتراف تھا۔ چنانچہ خط کا یہ ٹکڑا اعلیٰ حضرت کے متعلق بھی اس رسالہ میں کچھ ہو جائے تو اور بھی اچھا ہو۔ واضح طور پر ان کے پر خلوص اور دلی جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ انہیں طلوعِ اسلام سے کتنی گہری دلچسپی تھی اس کا اظہار بھی اس خط کے متن سے ہوتا ہے۔ وہ راس مسعود کے نام یہ جملہ بھیجنے کی تاکید بھی کر رہے تھے کہ اس کی سرپرستی کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔ یہ ساری باتیں ان کے جذبہ ہمدردی در دمندی کی غمازی کرتی ہیں۔ جن کی صداقت سے انکا ممکن نہیں۔

۱ عبد العلی خاں کسی زمانے میں جامعہ ملیہہ اسلامیہ کے نائب مسجدی تھے اور اس وقت بھوپال میں تھے۔ (نیازی)

۲ سر راس مسعود مرحوم

۳ صد سالہ برسی (نیازی) Centenary

۴ مکتبات اقبال صفحہ ۲۸۵-۲۸۶

اقبال کو بھوپال آئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ان کا علاج بڑی توجہ سے ہو رہا تھا۔ اور ان کی عام صحت بھی پہلے سے کہیں بہتر تھی۔ ان کا بیشتر وقت آرام و مطالعہ اور خط و کتابت میں صرف ہوتا تھا۔ راس مسعود کی خصوصی ہدایت کے مطابق ملنے جلنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ تین حضرات کو خصوصیت کے ساتھ راس مسعود نے اقبال کی دلیکھ بھال پر متعین کر دیا تھا جو صبح و شام پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی معیت

میں گزارتے تھے تاکہ اقبال کو تہائی کا احساس نہ ہو۔ ان تین شخصیتوں میں سے دو حضرات خوش نصیبی سے پاکستان آ گئے اور مجھے ان سے اقبال کی مصروفیات اور مشاغل کا علم ہو گیا جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔ ان تین حضرات میں ایک تو ممنون حسن خاں تھے جواب بھی بھوپال میں ہیں۔ ان کے نام اقبال کے چند خطوط بھی اقبال نامہ میں شامل ہیں دوسرے صاحب محمد خلیل اللہ خاں تھے اور تیسرے سید مسیح الدین۔ محمد خلیل خاں ابتدأ خورجہ سے آ کر بھوپال میں بحیثیت تحصیل دار مقرر ہوئے تھے۔ اور علی گڑھ کے ناتے راس مسعود کے خاص نیازمندوں میں سے تھے سید مسیح الدین بھوپال کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور وہیں بر سر کار تھے اور راس مسعود کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ممنون حسن خاں ان کے پرائیوٹ سیکرٹری تھے۔

یہ تینوں حضرات اپنی اعلیٰ علمی و ادبی خصوصیات کی بنا پر اقبال کی خصوصی دیکھ بھال کرتے تھے۔ دیگر حاضر باشوں میں سہما مجددیؒ ملام رموزیؒ مولانا ارشد تھانویؒ مولانا محمد یوسفؒ قیصر بھوپالی بھوپال کے بزرگ و محترم شارع ذکی وارثیؒ مولوی شکر اللہ سہیلؒ دیرالملک قاضی ولی محمدؒ سر لیاقت علیؒ شعیب قریشیؒ راس مسعودؒ اور محمد احمد سبز واری وغیرہ شامل ہیں۔ وقتاً فوتاً یہ حضرات علمی و ادبی موضوعات پر اقبال سے تبادلہ خیالات کرتے اور انہیں کسی طور تہائی کا احساس نہ ہونے دیتے تھے آنے جانے والوں سے جو وقت بچتا اسے مطالعہ اقبال میں صرف کرتے یا فکر شعرو ادب میں۔ چنانچہ ریاض منزل کی طرح شیش محل کو بھی یہ امتیازی حاصل ہوا کہ اس کی پر سکون فضا میں جہاں اقبال نے دیقت علمی و فکری مسائل پر قلم الٹھایا وہیں ان کی فکر تازہ نے چند شاہکار نظموں کی تخلیق بھی کی جو اس خصوصی ایونٹ کے ساتھ ضربِ کلیم کی زینت ہیں۔

”بھوپال (شیش محل) میں لکھے گئے۔“

پہلی نظم صحیح اے ہے جو صرف چار مصروعوں پر مشتمل ہے:
یہ سحر جو کچھی فردا ہے کبھی امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذال سے پیدا
بھوپال جس کی صحیحیں اور شامیں جادو جگاتی تھیں اقبال کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ
شہر مسجدوں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ جہاں اعلیٰ سرکاری انتظام کے سبب مساجد ہمیشی آباد اور پر
رونق رہتی تھیں۔ مومن کی آذال کے پس منظر میں سچ پوچھیے تو اس چھوٹی سی ریاست کا وہ
شکوہ نظر آتا ہے جو کہیں اور بکشکل سے مل سکے گا۔

۱۔ افسوس کہ یہ شخصیتیں اب اس دنیا میں نہیں ہیں ورنہ حیات اقبال کے کئی اور
گوشے نمایاں ہو سکتے۔

۱) ضربِ کلیم صحفہ ۶

لہذا اقبال کے تاثرات کے پس منظر میں شعر کی صداقت بھی ہے۔ اور حقیقت کی
ترجمانی بھی۔ شیش محل کے گرد تقریباً چودہ پندرہ مسجدیں تھیں جنمیں صحیح کے وقت اذانوں کا
سلسلہ دیریکت جاری رہتا تھا۔ اس نظم میں وجود و انساب کی حقیقی کیفیت نمایاں ہے۔ وہ چار
مصروعوں میں امروز و فردا کی عقدہ کشائی ہی نہیں کرتے بلکہ شبستان وجود کو اس سحر کی کارفرمائی
قرار دیتے ہیں جو بندہ مومن کی اذال سے عبارت ہے۔ دوسری نظم مومن اے ہے جس کا پہلا
 حصہ دنیا میں ذیلی عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ اور دوسری حصہ جنت میں کے عنوان سے نظم کا
پہلا شعر یہ ہے:

ہو حلقة یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
آخری شعر ہے:

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت کہ کم آمیز ہے مومن
پہلی نظم صحیح کی طرح یہ نظم بھی ان کے مخصوص موضوع سخن کی آئینہ دار ہے۔ تیسرا نظم
ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام پر چھاشعار پر مشتمل ہے۔

چوتھی نظم جمیعت اقوام مشرق ہے جس کا مشہور شعر ہے:

طہراں ہو اگر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے
کسی توضیح و تشریح کا محتاج نہیں خہبی کچھ ان کی شاعری کا مقصود تھا۔ اقوام مشرق کی
ملوکیت افرنگ پر برتری کا خواب جوانہوں نے دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر جلد یا بدیر دنیا کے
سامنے آگئی۔ پانچویں اور آخری مشہور نظم جو بقید تاریخ ۱۲۲ اگست ۱۹۳۵ء شیش محل بھوپال
میں انہوں نے لکھی ہے اس کا عنوان مسو لینی ہے اور نظم میں بھا قبائل کی شاعرانہ فکر معاراج پر
ہے اور یہاں بھی وہ معصومان یورپ کو لالکارتے نظر آتے ہیں اور ان کی تہذیبی برتری کے
کھوکھلنعروں کا اپنے منفرد لامپ میں پردہ چاک کرتے ہیں:

میرے سو دائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس ملوکیت کے ہیں
راج دھانی ہے مگر باقی نہ راجہ نہ راج
اور آخر میں واضح طور پر یہ اعلان کر دیتے ہیں:

تم نے لوٹے بے نوا صمرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقال تم نے لوٹے تخت و تاج
پرده تہذیب میں غاری گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

۱۔ ضرب کلیم صفحہ ۳۱

۲۔ ۳۔ ۴۔ ضرب کلیم صفحہ ۱۳۸ - ۱۳۹ - ۱۵۱ - ۱۵۲

ان پانچ نظموں کے موضوعات اور قیام شیش محل کی ذہنی اور فکری و سعتوں کا احاطہ کرنا
چند اس دشوار نہیں ان میں شعری حسن سے زیادہ صداقت آفرینی ہے۔ معاملہ بندی اور زبان
کے چٹھا رہ کے بر عکس ٹھوں حقیقتیں ہیں جو غلام ہندوستان کا مقدور بنی ہوئی تھیں اور جن کے
خلاف اقبال کی رباعی گلگر بر سر پیکار تھی۔

کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

یہ بات صرف اقبال ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں جب سفید آقا کا لے غلاموں کو پابے
زنجیر کھنے پر تلا بیٹھا تھا۔ ضرب کلیم کی تقریباً تمام نظمیں سوچنے والے ذہن کے لیے فکری
سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ اقبال بحیثیت شاعر کبھی اپنے فن پر ناز اہ نہیں ہوئے جیسا کہ گزشتہ
اوراق میں ۲۰ اگست ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو بھی انہوں نے لکھا ہے
شاعری سے انہیں صرف اسی حد تک دلچسپی تھی کہ وہ اسے بعض مقاصد خاص کی ترجمانی کا
ایک ذریعہ سمجھتے تھے ارو بس۔ انہیں تو ہر مسلم قوم کی شیرازہ بندی اسلام کی عظمت اور
مسلمانوں میں احساس بیداری پیدا کرنے کا جذبہ ہر وقت ستاترا رہتا تھا۔ چنانچہ ظم ہو یا نشر
وہ اظہار کے لیے سے زیادہ حقیقی مقصد پر توجہ صرف کرتے تھے۔

شیش محل بھوپال کے قیام کے دوران ہمیں صرف یہی پانچ نظمیں جن کا تذکرہ کیا جا چکا

ہے، ”ضرب کلیم“ میں ملتی ہیں یہ مجموعہ کلام اشاعت کی منزل میں تھا۔ چنانچہ ان نظموں کے موضوعات اور ان کے پس منظر سے نہ صرف ان نظموں کے عرصہ تخلیق کا ہمیں علم ہو جاتا ہے بلکہ اقبال کی سوچ اور فکر کے مربوط گوشے بھی کھل کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔

اس قیام کے دوران سید سیلمان ندوی کے نام اقبال کا خط ملتا ہے جس سے اس کی مخصوص طرز فکر کے کچھ اور پہلو نمایاں ہوتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ان کے علاج کا کورس ۲۸ اگست ۱۹۳۵ء تک ختم ہو رہا تھا۔ اور وہ اسی روز لاہور کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔

”بھوپال.....۱۲۳۔ ۱۹۳۵ء“

محمد و مکرم جناب مولانا..... السلام علیکم

ایک عریضہ لکھ چکا ہوں۔ امید ہے کہ پہنچ کر ملاحظہ عالی سے گزر ہو گا۔ ایک بات دریافت طلب رہ گئی تھی۔ جواب عرض کرتا ہوں کہ کیا علمائے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو حیات و نزول مسیح کے اور ابن مریم کے مفکر ہوں؟ یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلہ میں کیا نہ ہب اے؟ امید ہے آپ کا مزاج بتیر ہو گا۔ میں ۲۸ اگست کی شام کو رخصت ہو جاؤں گا۔ علاج کا کورس اس روز صبح ختم ہو جائے گا۔ اس خط کا جواب لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیے۔

والسلام

مخصل محمد اقبال

اس خط کے دوسرے روز ہی انہوں نے نیازی صاحب کو بھی روائی کے پروگرام سے

مطلع کر دیا:

۱۔ مجھے جہاں تک علم ہے نزول مسیح کا انکار کسی نہیں کیا۔ معزلہ کی کتابیں نہیں ملتیں
جو حال معلوم ہو۔ البتہ ابن حزم وفات مسیح کے قائل تھے اور ساتھ ہی نزول کے بھی (سید
سلیمان ندوی)

۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۹۶ - ۱۹۷

”ڈیرینازی صاحب..... السلام علیکم

آپ کا خطاب بھی ملا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میں ۲۸
اگست کی شام کو سات بجے یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ کی صبح آٹھ بجے
دہلی پہنچوں گا۔ دن بھر یلوے ٹشیشن پر قیام رہے گا۔ رات کی گاڑی
سے دہلی روانہ ہو کر ۳۰ اگست کی صبح کو انشاء اللہ لا ہور۔ دہلی سے
میرے لیے دو سیٹ سینئر کلاس لوئر برتحر ریز روکرو چھوڑیں۔
ہمارے وہ ہندوستان جنہوں نے دہلی سے پانچ بجے شام چلنے کا
مشورہ دیا تھا ان سے مدد بھی باقی وقت ملاقات.....

والسلام

محمد اقبال

۱۹۳۵ء ”۱۲۳“

اب اقبال بھوپال سے واپس لا ہو رہا ہے تھے۔ بھلی کے علاج کا دوسرا کورس ۲۸ تک
ختم ہوا تھا۔ ان کی صحت عامہ پر اس علاج کا خاطر کواہ اثر پڑا تھا۔ پہلی بار وہ ایک معزز
سرکاری مہماں کی حیثیت سے شیش محلِ منٹھرے تھے جہاں ریاست کی طرف سے بھی اور
راس مسعود ایسے جاں نثار دوست کی خصوصی توجہ کے سبب بھی ان کی آسانیش و راحت کا ہر

مکمن انتظام کیا گیا تھا۔

اس قیام سے انہوں نے نہ صرف ہنی آسودگی حاصل کی بلکہ فکر و تخلیق کے علاوہ بیش از بیش مطالعہ بھی کیا اور استفادہ بھی۔ اسی قیام کے دوران انہوں نے فتنہ قادریانی پر اپنے مشہور مضمایں لکھے۔ قرآن مجید کے حواشی کے سلسلے میں ابتدائی خاکہ تیار کیا راس مسعود کی معیت میں وہ ایک سے زائد بار نوب صاحب بھوپال سے بھی ملاقات کرنے لگے اور مختلف مسائل پر ان سے گفتگو کی۔ ان کے معلمین ان کی صحت کی بحالی سے بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ اور انہیں بتاچکے تھے کہ بھلی کے علاج کا تیسرا کورس بھی وہ جلد بھوپال آ کر مکمل کر لیں چنانچہ انہوں نے پھر جلد ہی بھوپال آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ فی الوقت ان کا لا ہور جانا ضروری تھا کیونکہ جاویدتوان کے ساتھ ہی آئے تھے لیکن منیرہ لا ہور میں تھی اور وہ زیادہ عرصہ اسے تھا انہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جاوید نے بھوپال کے دوران قیام وہاں کے تاریخی اور تفریجی مقامات کی خوب سیر کی ڈاکٹر عبدالباسط کے بچوں کے ساتھ ان کا بیشتر وقت کھیل کو دیں صرف ہوتا تھا۔ اقبال کے ساتھ انہیں بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں حاضر ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اس وقت وہ بہت کم عمر تھے۔ پھر بھی بھوپال کے اس سفر و قیام کی یادوں کے جو دھندے نقش محفوظ رہ گئے..... ان کا احوال آپ جاوید اقبال کی زبانی سینے:

”اماں جان کی وفات کے عرصہ بعد وہ (مراد اقبال) مجھے اس خیال سے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے کہ ان کی عدم موجودگی میں منیرہ سے لڑتا نہ رہوں۔ اس سفر کی دھندلی سی یادداشت اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے بہت لمبا سفر تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن اور کئی راتیں گیل کی گاڑی میں ہی گزریں۔ رات کو علی بخش مجھے اوپر بر تھ پر سلا دیتا تھا۔ اور ابا جان نیچے کی بر تھ پر سوتے

تے۔ ناشتہ دو پھر رات کا کھانا بھی وہیں منگوالیا جاتا۔

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔

جب ہم بھوپال شیشن پر پہنچ تو محمد شعیب استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہم موڑ کار میں شیش محل پہنچ جہاں ابا جان کی رہائش کا انتظار کیا گیا تھا۔ شیش محل ایک پرانی وضع کی عمارت نہایت وسیع و عریض تھی۔ اتنے بڑے بڑے کمرے تھے کہ مجھے رات کو ان سے گزرتے ڈر آیا کرتا تھا۔

ہم بھوپال میں کوئی دو ایک ماہ ٹھہرے وہاں ڈاکٹر باسط ابا جان کے معانج تھے اور ان کے گلے کا علاج برتو شعاعوں سے کرتے تھے۔ مجھے روز پڑھانے کے لیے ایک استاد بھی شیش محل میں آیا کرتے۔ شیش محل کے قریب ایک جھیل اے کے کنارے میں ڈاکٹر باسط کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ڈاکٹر باسط کا گھر شیش محل کے مقابل تھا اور اس کے سامنے غالباً ایک وسیع میدان تھا۔

تقریباً ہر دوسرے تیسرا روز میں ابا جان کے ساتھ سید راس مسعود کے ہاں ریاض منزل جایا کرتا تھا۔ وہ میری زندگی میں دوسری ایسی شخصیت تھے جنہیں میں نے ابا جان کو اقا کہہ کر پکارتے سناتا۔ سید راس مسعود قد میں ابا جان سے بہت اوپنے قوی ہیکل اور گورے چٹے بزرگ تھے۔ مجھ سے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ میں اور ابا جان ہفتہ میں دو ایک بار رات کا کھانا سید راس مسعود اور بیگم امت المسعود کے ساتھ ریاض منزل میں کھاتے بسا اوقات ہم اور جگہوں پر

بھی کھانے پر مدعو ہوتے۔

ایک مرتبہ ہم کسی کھانے سے واپس لوٹ رہے تھے اور گاڑی میں اباجان کے ساتھ ایک ادھیر عمر کی فربہ سی ہنس مکھ خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ مجھ سے نہایت شفقت سے پیش آئیں بعد میں اباجان نے مجھے بتایا کہ وہ سرو جنی نائید تھیں۔

اسی طرح ایک شام بیگم صاحبہ بھوپال کے ہاں چائے پر مجھے اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ بیگم صاحبہ نے فرمائش کی تھی کہ جاوید کو ساتھ لایئے۔ سید راس مسعود بھی ہمارے ہمراہ تھے جب ان دونوں بزرگوں نے بیگم صاحبہ کو فرشی سلام کیے تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بہر حال بھوپال میں میرا بیشتر وقت اباجان کی نگاہوں کے سامنے ہی گزرتا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر مجھے سکھایا کرتے کہ چمچا اس طرح پکڑنا چاہیے کہ کاشایوں میں فطرتاً کچھ شرمنیلا واقع ہوا تھا۔ اس لیے جب کبھی انہیں لوگ وہاں ملنے آتے یا وہ لوگوں کے ہاں جاتے تو ہمیشہ مجھ سے کہا کرتے کہ لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھنے کے بجائے ان سے بات چیت کرنی چاہیے۔ بھوپال سے واپسی پر ہم چند دنوں کے لیے دہلی ٹھہرے وہاں اباجان بذات خود مجھے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لیے لے گئے پہلے لال قلعہ دیکھا پھر نظام الدین اولیاء گئے اور پھر نئی دہلی سے ہوتے ہوئے قطب پہنچے۔ میرا دل چاہا کہ قطب مینار کے اوپر چڑھ جاؤں اور میں نے اباجان کو بھی ساتھ آنے کے لیے کہا لیکن وہ بولے کہ تم جاؤ۔ میں اتنی بلندی پر

نہیں چڑھ سکتا۔ اور جب اوپر پہنچو گے تو نیچے کی طرف مت دیکھنا
کہیں دہشت سے گرنے پڑو۔ بالآخر ہم لا ہو را گئے سن،۔

۱ بھوپال کا مشہور بڑا تالاب جس کے قریب قدیم محل تھا جس میں ڈاکٹر عبدالباسط
رہتے تھے۔

۲ یہ کھرنی والا میدان تھا جہاں اکثر بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے۔

۳ مئے لالہ فام۔ صفحہ ۵۷۷۷



جشن حالی اور اقبال

(۲۶ ستمبر ۱۹۳۵ء)

لا ہو رپنچتے ہی اقبال کی صحت پھر متاثر ہو گئی۔ زکام ہوا تو انہوں نے بہدیانہ اور شربت بنفشه کا استعمال شروع کر دیا۔ جس بے بلغم پک گیا اور خفیف سے دمہ کا اثر بھی محسوس ہوا۔ نیازی صاحب کے نام ۵ ستمبر ۱۹۳۵ء کا مکتوب اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ۸ ستمبر کو انہوں نے پھر ایک خط لکھا اور کھانسی زکام اور بلغم کی شکایات کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا:

”بھوپال میں بھی یہی کیفیت تھی مگر وہاں بلغم پختہ نہ تھی۔ یہ

بات صرف بہدیانہ اور شربت بنفشه پینے کے بعد ہوئی ہے۔“

پھر ۱۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں انہوں نے بھوپال میں پھیپھڑوں کے معائنہ کا حال لکھا

بھیجا:

”.....بھوپال میں دو دفعہ پھیپھڑوں کا امتحان کرایا تھا معلوم ہا کہ

پھیپھڑے بالکل صاف ہیں۔“

اسی طرح ۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط کی یہ عبارت:

”.....وہ معمولی بلغم جوز کام سے پہلے آتی تھی ابھی آتی ہے۔“

محقر آئیہ کہ جیسا میں بھوپال سے آتے وقت تھا۔ اب وہی حالت عود

کر آئی ہے۔“

ان خطوط کے جواب میں نیازی صاحب حکیم ناپینا صاحب سے ان کے حیدر آبداد دکن چلنے کے سبب مشورہ نہ کر سکے نہ ادویہ پہنچ سکے لیکن جب وہ حیدر آباد (دکن) سے لوٹ آئے تو تمام خطوط انہیں پڑھ کر سنائے اور ادویہ لا ہو روانہ کر دیں۔ اسی خط کے آخری اقتباس میں پانی پت میں مولانا حالی کے جشن صد سالہ کی تواریخ اور اقبال کے قصد رو انگلی کا بھی علم ہوتا ہے:

”.....مولانا حالی کی سالگرد کی تاریخ ۲۶/۱۲ اکتوبر مقرر ہوئی

ہے۔ میں غالباً ۲۵ تا ۲۶ اکتوبر وہاں پہنچ جاؤں گا۔

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۹۱

۲۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۹۲-۲۹۳

آپ کے رسائل کے (لیےسموارہ گیا ہے) یہ بہتر ہوگا کہ اگر ممکن ہو تو آپ خود وہاں پہنچ جائیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ اگر ممکن ہو تو آپ خود وہاں پہنچ جائیں۔ اور اگر فوٹو گراف (مطلوب ہے فوٹو گرافر) کا بھی انتظام کر سکیں تو اور بھی بہتر ہوگا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ وہاں میں آپ کو سید راس مسعود سے بھی انٹروڈیویس کراؤں گا۔ غالباً چوہدری محمد حسین اور جاوید بھی ساتھ ہوں گے۔ ۱۔

اس دوران راس مسعود سے بھی ان کی خط و کتابت جاری رہی جشن حالی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ پروگرام کے مطابق اقبال کو بھی نظم پڑھنا تھا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۵ء کا یہ خط ان امور پر روشنی ڈالتا ہے۔

”لا ہور.....۱۹ ستمبر ۱۹۳۵ء“

ڈیم مسعود تمہارا خط جس میں دونا مے ملوف تھے ابھی ملا ہے۔
الحمد للہ کے خیریت ہے۔ میں بھی خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔
انشاء اللہ یا ۱۲۵ اکتوبر کو پانی پت پہنچوں گا۔ جو چند اشعار فارسی کے
لکھے تھے وہ میں نے خواجہ سجاد حسین کی خدمت میں ان کی درخواست
پڑھنے دیے تھے۔ جاوید کے ماموں کو بھی آج قالین کے لیے پھر لکھ
دیا ہے اطمینان فرمائیے۔

باقی رہا وہ معاملہ سواس میں تمہارے اس خط کے بعد میں کیا
عرض کروں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پیش قبول
کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئین جواں مردی نہیں ہے۔
لیکن میں آپ کو اپنا دوسرا خیال کرتا ہوں اس واسطے جو کچھ آپ لکھتے
ہیں اس پر عمل کرتا ہوں۔ اخباروں میں اس کا چرچا مناسب
نہیں معلوم ہوتا۔ اور اس کی ادائیگی بھی معرفت اعلیٰ حضرت ہی ہونی
چاہیے جیسا کہ آپ نے مجھ سے زبانی کہا تھا۔ زیادہ کیا عرض
کروں۔

لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ جاوید سلام عرض کرتا ہے اور اعلیٰ
بخش آداب کہتا ہے۔

والسلام۔ محمد اقبال۔ لا ہو ۲۲،

اس خط سے جہاں ۱۲۵ اکتوبر کے پانی پت پہنچنے کا علم ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم
ہوتا ہے کہ فارسی اشعار انہوں نے خواجہ سجاد حسین (پر مولانا الطاف حسین حائل) کو روانہ کر
دیے تھے۔

خط کا دوسرا حصہ..... جس میں نواب صاحب کی لاکن پنشن قبول کرنے کا تذکرہ ہے۔ دراصل اس وظیفہ کی پیش کش سے تعلق رکھتا ہے جو سر آغا خاں نے راس مسعود کی تحریک پر کی تھی ان کی یہ کہنا:

”.....اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے

کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئین جواں مردی نہیں.....“

اس عظیم درویش صفت احسان کیش مردانہ اور مفکر مشرق اقبال کے ان خدوخال کو نمایاں کرتا ہے جن سے ایک سچے مسلمان کی ساری زندگی عبارت ہے۔

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۲۹۳

۲۔ اقبال نامہ..... (جلد اول) صفحہ ۳۶۸-۳۶۹

وہ نواب صاحب کے وظیفہ کے بعد کسی مزید وظیفہ کے طالب نہیں تھے کیونکہ ان کی زندگی نہایت سادہ و درویشانہ تھی۔ پھر ان میں صبر و رضا فنا عنعت و توکل مہر و مروت اور جذبہ احسان مندی کی اعلیٰ صفات بھی موجود تھیں۔ چنانچہ راس مسعود کو جنہیں وہ اپنا دوسرا سیلوف خیال کرتے تھے۔ بلا تکلف آئین جواں مردی کا اشارہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے دوست کو صحیح راستہ کی جانب متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ بہر طور اس ضمن میں اقبال اور راس مسعود کے درمیان جو مزید مراسلات ہوئی ہے۔ اس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں پیش ہوں گی۔
یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ اقبال نواب صاحب کے وظیفہ کی تشییر کو بھی ناپسند کرتے تھے جیسا کہ خط کی اس عبارت اخباروں میں اس کا چرچا مناسب نہیں سے ظاہر ہے۔ وہ وظیفہ کی ادائی بھی اعلیٰ حضرت کی معرفت چاہتے تھے اور اس سلسلے میں راس مسعود سے بھوپال کے قیام کے دوران گفتگو بھی ہو چکی تھی۔

ستمبر کا پورا مہینہ بیماری کی نظر ہو گیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں انہوں نے نیازی

صاحب کو پورا حال لکھ کر پھر بھیجا اور یہ خواہش کی کہ حکیم صاحب سے ان تین امور پر مشورہ کریں:

(۱) بلغم کا استیصال

(۲) قوت جسمانی میں ترقی

(۳) آواز

بھوپال سے لوٹے کے بعد ان کی شکایات نے انہیں پھر اجھن میں ڈال دیا ہتا۔ بعض ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ وہ ویانا تشریف لے جائیں نیازی صاحب نے حکیم صاحب سے مشورہ کیا اور دوائیں میں روانہ کر دیں اسی زمانے میں انہیں لاہور کے ایک دوست نے جو ویانا سے علاج کراکے لوٹے تھے ویانا چلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے خط میں وہ راس مسعود سے مشورہ طلب کرتے ہیں:

”لاہور۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء“

ڈیر مسعود۔ ایک خط اس سے پہلے لکھ چکا ہوں جو امید ہے تم کو مل گیا ہوگا۔ جواب کا بھی تک انتظار ہے۔ امید ہے کہ آپ اور بیگم مسعود مع الخیر ہوں گے۔ میرے ایک دوست جو یہاں کے سادات میں سے ہیں اور مرض ذیابطس کے پرانے بیمار تھے حال میں تندرست ہو کر واٹنا آسٹریا سے واپس آئے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ دوران علاج میں انہوں لے اپنے ڈاکٹر سے میرے مرض کا بھی ذکر کیا۔ جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر وہ بیمار یہاں آجائے تو میں گارنٹی دیتا ہوں کیہ بالکل تندرست ہو جائے گا۔ شاہ صاحب فروری میں پھر واٹنا جو انے والے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ میں بھی ان

کے ساتھ چلوں اور وہاں چل کر علاج کراؤ۔ آپ اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ فی الحال میری صحت ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی قدرے امپرومنٹ ہے۔ ڈاکٹر عبدالباسط نے جو فوٹو میرے سینے کا لیا تھا۔ اسے ڈاکٹر حسن و انناس بھیجنے والے تھے

۱۔ مرادویانا

معلوم نہیں ابھی تک بھیجا ہے یا نہیں میں نے ڈاکٹر صاحب عبدالباسط کو خط لکھ کر دریافت کیا تھا وہاں سے اسپرٹ اوپنین آ جانے پر آخری فیصلہ کروں گا۔ فی الحال آپ کی رائے چاہتا ہوں باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے جاوید آزاد عرض کرتا ہے۔ اور علی بخش سلام لکھواتا ہے۔

والسلام۔ محمد اقبال

بیگم مسعود صاحب سے سلام عرض کیجیے۔ انشاء اللہ پانی پت میں ملاقات ہوگی۔ کل سے کوئی کے بقا یا حصے کی تعمیر ہوگی امید ہے کہ پانی پت جانے تک کام ختم ہو جائے گا۔

اپنی بیماری سے قطع ظرائفیں جشن پانی پت کی شرکت سے بھی خصوصی دلچسپی تھی جس کا اس خط کے آخر میں بطور خاص تذکرہ کیا ہیں کوئی (جاوید منزل) کے بقا یا حصے کی تعمیر بھی جاری تھی۔ جسے وہ پانی پت جانے سے قبل مکمل کر لینا چاہتے تھے۔ علاوه ازیں میں ڈاکٹر عبدالباسط اور ڈاکٹر حسن کا بھی ذکر ہے جو پہلے ہی ان کے سینے کے فوٹو لے چکے تھے۔ اور مشورہ کے لیے ویانا بھیجنے والے تھے۔

علامہ اقبال نے ڈاکٹر باسط کے نام اس سلسلے میں پانچ خطوط تحریر کیے جو آئندہ صفحات

میں پیش کیے جائیں گے۔ یہ خطوط اب تک غیر مطبوعہ تھے جو خوش نصیبی سے مجھے ان کے صاحبزادے سید عبدالحی سے کراچی میں دستیاب ہو گئے سید عبدالحی کی اقبال سے ملاقات کا احوال بھی اگلے صفحات میں شامل ہو گا۔

واقعتاً اقبال کی موجودہ تکلیف پھر تردد کا سبب بن گئی تھی۔ وہ اپنی علاالت کا تذکرہ سید محفوظ علی بدایوں کے نام ایک اور خط میں کرتے ہیں جس میں ویانا جانے کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے:

” لاہور۔ ۲ آگسٹ ۱۹۳۵ء ”

حمدومی السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ مع الخیر ہیں میں گز شستہ ۱۸ ماہ سے علیل ہوں سفر بہت کم کرتا ہوں ہر تیرے ہی میتے بھوپال جاتا ہوں۔ وہاں برقی علاج ہے جس سے کچھ فائدہ ہے اب وائنا (آسٹریا) جانے کی فکر میں ہوں۔ یہ ظاہری علاج ہے باطنی علاج صرف اس قدر ہے کہ آپ کے جد پر درود پڑھتا ہوں آپ بھی دعا فرمائیے اگر بدایوں ہوتا تو ضرور آپ کے ہی ہاں ٹھہرتا..... اور آپ کے روحانیات سے مستفیض ہوتا.....

والسلام

مخلص محمد اقبال سے۔

اس خط کے دوسرے دن انہوں نے نیازی صاحب کو بھی ویانا جانے کے بارے میں

خط تحریر کیا:

”ڈینیازی صاحب ”

میرا خط آپ کو ملا ہے یا نہیں۔ آپ لکھتے تھے کہ آپ خود لا ہور
آنے کو ہیں مگر نہ آپ آئے نہ میرے خط کا جواب آیا۔ آپ کا رسالہ
نکلا۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۰۔ ۳۷۱

۲۔ مرادویانا

۳۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۸۴

بہر حال حکیم صاحب قبلہ سے پوچھ کر جواب لکھیے میں نے ابھی
تک دوا کا استعمال شروع نہیں کیا۔ کہ آپ کے خط کا انتظار تھا۔ وائنا
(اسٹریا) جانے کا خیال ہے ڈاکٹر انصاری صاحب سے خط و کتابت
کر رہا ہوں۔ انہوں نے نہایت مہربانی سے مدد کا وعدہ کیا ہے۔
اگر گیا تو فروری یا اپریل ۱۹۳۶ء میں جاؤں گا.....

والسلام

محمد اقبال۔ لا ہور

۱۱۵۔ ۱۹۳۵ء۔ ۲۔

نذر ی نیازی صاحب کا بیان ہے کہ وہ حضرت علامہ کی خواہش کے باوجود اجتماع پاپی
پت سے پہلے نہ طلوع اسلام شائع کر سکے نہ لا ہور ہی پہنچ سکے۔ اسی طرح علامہ کے ویانا
جانے کا ارادہ بھی افسوس کہ پورا نہ ہو سکا۔

پروگرام کے مطابق جشن حالی کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے اقبال ۲۵
اکتوبر کو پانی پت گئے لیکن ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ نذر
نیازی نے پانی پت پہنچ کر حضرت علامہ کو جس ضعف کے عالم میں دیکھا اس کا حال

انہیں کے الفاظ میں سنئے:

”.....اکتوبر کے آخری ہفتہ میں پانی پت پہنچا لیکن یہ دیکھ کر
کہ حضرت علامہ کے چہرے پر زد ری چھار ہی ہے اور آواز کا ضعف
بھی کچھ بڑھ گیا ہے۔ بڑا دکھ ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ لاہور سے پانی
پت کا سفر بھی ان کی برداشت سے باہر ہے۔ حالانکہ ابھی چند ہفتے
پیشتر جب آخر اگست میں وہ بھوپال سے واپس آئے ہیں تو ضعف و
اضمحلال کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ پانی پت میں علامہ کا قیام دو روز رہا
انہوں نے تقریب میں شرکت فرمائی حضرت شاہ بولی فندر کے مزار
پر عقیدت مندانہ حاضری دی۔ احباب اور نیازمندوں سے باکرام و
التفات پیش آئے اور پھر چودھری محمد حسین صاحب مرحوم راجہ حسن
آخر، جاوید سلمہ اور علی بخش کی معیت میں لاہور واپس تشریف لے
گئے۔ مگر پھر یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ اس تقریب میں حضرت علامہ
اگرچہ مندرجہ پر تشریف فرمائے ہے لیکن نہ اپنا مشہور قطعہ:

مزاج ناقہ رامانند عرفی نیک می دام
چو محمل را گران ینم حدی را تیز تر خوانم
خود پڑھ سکنے ان تعریفی کلمات کے جواب میں بطور تشكیر ہی
کچھ فرمایا جو اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال اور دوسرے حضرات
نے ان کی شان میں کہے تھے۔

پانی پت میں مولانا حاملی کے جشن کے سلسلے میں جو وسیع انتظامات کیے گئے تھے نواب
صاحب بھوپال نے جو خطبہ وہاں پڑھا تھا برصغیر کی جن مایہ ناز اور بلند پایہ شخصیتوں نے اس

میں شرکت کی تھی۔ ان کی واضح تفصیلات چار سال کی لگاتار سعی و کوشش کے باوجود مجھے کہیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔ لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہا را ارتلاش و جستجو جاری رکھی نواب صاحب بھوپال کا خطبہ صدارت اصولاً بھوپال کے کسی لا بصری یا نواب صاحب کے محکمہ خاص میں ملنے کی توقع پر میں نے بھوپال کے کئی حضرات کو خطوط لکھے۔

۱۔ مرادویانا

۲۔ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۹۸-۲۹۹

۳۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۰۱

لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ البتہ بھوپال کے ایک ایم اے اور یسروچ کے طالب علم شیمیم احمد نے جو اورنگ آباد بھارت میں لیکھ رہیں کافی سعی و تلاش کے بعد مجھے جو معلومات بھم پہنچائیں اس سے جشن کا کچھ نہ کچھ حال ضرور معلوم ہو گیا اور اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ نواب صاحب نے حالی مسلم ہائی سکول کے لیے بیس ہزار کی گراں قدر امداد فرمائی تھی۔ ان کے ایک خط مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۲۳ء کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”.....نواب صاحب کے خطبہ کو تین دن تک ریکارڈ آفس

بھوپال میں خود تلاش کیا۔ ان کے ۱۹۲۹ء ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے کچھ
مطبوعہ خطبات جواندورو اور علی گڑھ میں پڑھے گئے تھے ملے۔ لیکن
مطلوبہ خطبہ نہ مل سکا۔ ریکارڈ آفس میں اس قدر بے ترتیبی اروپھو ہڑ
پن ہے کہ کوئی بھی چیز آرڈر سے نہیں ہے۔ وہاں سے ما یوس ہو کر
اس معیل صاحب کے کتاب گھر گیا۔ وہاں آسمعیل صاحب نے
زمانہ کا نپور دسمبر ۱۹۳۵ء جلد نمبر ۲۵ شمارہ نمبر ۶ دیا۔ یہ حالی کے اس
جشن صد سالہ کی یادگار کے بطور شائع کیا گیا تھا۔ اس کے شروع میں

نواب صاحب بھوپال کی تصویر یو ہے جس کے نیچے مرقوم ہے کہ آپ
نے حالی کے جشن صد صالہ کی صدارت فرمائی۔ مگر اس میں وہ خطبہ
نہیں ہے۔ البتہ صفحہ ۳۲۲ پر مندرجہ ذیل تحریکی ہے:

مولانا حالی کے صد سالہ یادگاری جشن کے سلسلے میں سب
سے بڑا جلسہ اعلیٰ حضرت ہزاری نس نواب صاحب بھوپال کی
صدارت میں آخری ہفتہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مولانا کے خاص مولد و
نشاپانی پت میں منعقد ہوا جس میں ملک کے بڑے بڑے معززین
موجود تھے اعلیٰ حضرت نواب صاحب نے بیس ہزار کی گراں قدر
امداد حالی میموریل سکول کے لیے منظور فرمائی۔

بھوپال سے خطبہ کی فرایہمی کے امکانات جب تقریباً ختم ہو گئے تو میں نے شیخ محمد
اسمعیل پانی پتی^۲ سے استصواب کی اور میری خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جب قبلہ شیخ
صاحب نے مجھے یہ لکھا کہ نواب صاحب کا خطبہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ جس خطبہ کی تلاش
چار سال تک جاری رہی۔ وہ مجھے حسن اتفاق سے لا ہو رہی میں مل گیا اور شیخ صاحب از رہ
شفقت نواب صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری کا قلمی خطبہ رجسٹری سے مجھے عنایت فرمادیا۔
اس سلسلے میں قبلہ شیخ صاحب کے گرامی نامہ مورخہ ۱۳۸۴ھ قعدہ ۱۵ مطابق ۱۹۶۵ء کے اقتباس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

”.....حضرت محترم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ..... گرامی

نامہ باعث اعزاز ہوا۔

۱۔ اسمعیل صاحب بھوپال کے ایک صاحب علم اور باذوق انسان ہیں جن کا ذاتی
کتاب گھر اور نایات اور قیمتی مسودات قدیم اخبارات و رسائل کی فائلوں اور نادر کتابوں

کے لیے شہرت رکھتا ہے۔

۲ عرصہ دراز تک شیخ صاحب نے مسلم ہائی سکول کے لاپتھریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

۳ میں نے شیخ صاحب سے خطبہ کی نقل طلب کی تھی۔ یہ جواب اسی سلسلے میں دیا۔

میں آپ کے حکم کی بڑی خوشی سے تعییل کرتا ہوں مگر کمزوری نقابت اور اضمحلال اب قوی میں اتنا زیادہ پیدا ہو گیا ہے کہ اتنی لمبی چوڑی تقریر کی نقل میرے لیے ناممکن ہے۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کا کام میری کم ہمتی اور ناطقتنی کے باعث رک جائے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ وہ تقریر شاید کہیں اور نہ مل سکے۔ یقیناً نواب صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں یا ان کے پرائیویٹ کافندات میں تو ضرور ہو گی۔ اس لیے ایک آخری تدبیر میری سمجھ میں اس مشکل کے حل کی یہ آئی ہ کہ میں بزریعد رجسٹری نہایت احتیاط کیسا تھا وہ اصل تقریر جو مرحوم نواب صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی آپ کو بھیج دوں اور آپ تکلیف فرماس کی نقل وہاں کسی سے کروالیں اور پھر اصل تقریر مجھے واپس فرمادیں۔ میں نے آج تیس برس سے اس تقریر کو اور اس جلسہ کی مفصل کارروائی کو بڑی حفاظت کے ساتھ اپنی جان کے برابر کھا ہوا ہے۔ مگر میں صرف اس وجہ سے وہ آپ کو بھیجنے کے لیے تیار ہوں کہ اگر آپ کو کام بن جائے تو اس میں میرا کیا نقصان ہے۔ اس حقیر فقیر ک گوشت پست کو موت کے بعد تو کتنے بھی نہیں کھائیں گے لہذا اپنی ذات سے کسی کی مشکل حل ہو

جائے تو بسا غمیت ہے افسوس ہے کہ آج کل کی دنیا میں اخلاقی
قدر میں بالکل بدل گئی ہیں مگر مجھے امید ہے کہ اس معاملہ میں جو اعتبار
اور اعتماد میں آپ پر کرنے لگا ہوں وہ قائم رہے گا۔
اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو بھی صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت
فرماتے۔

اگر میں اس وقت تک زندہ رہتا تو آپ کا جواب آنے پر وہ تقریر
میں انشاء اللہ آپ کو صحیح دول گا.....“

خط ملتے ہی میں نے شیخ صاحب سے بصدق عجز و نیاز درخواست کی کہ انہیں یقین دلایا
کہ نقل کرنے کے بعد ذریعہ جزئی نواب صاحب کا خطبہ لوٹا دوں۔ چنانچہ شیخ صاحب نے
نواب صاحب کے دو خطبے جو علی الترتيب جشن صد سالہ کی تقریب اور ایڈریس میجانب میونپل
کمیٹی پانی پت کے جواب میں نواب صاحب نے پڑھے تھے مجھے عطا فرمادیے جنہیں میں
نے نقل کر کے محفوظ کر لیا یہ خطبات آئندہ صفحات میں شامل ہیں۔ اور اصل خطبات شیخ
صاحب کو لوٹا دیے۔ جشن صد سالہ کے انتظامات کے بارے میں دریافت پر شیخ صاحب
نے ایک اور گرامی نامہ میں لکھا:

”.....اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حضرت مولانا مرحوم کی یادگار میں جو

جلسہ پانی پت میں ہوا تھا اس کا سارا انتظام اس احقر نے اور میرے
نہایت ہی عزیز ترین دوست شیخ محمد بدرا اللسلام صاحب فضیل
(مرحوم) ہیڈ ماسٹر جالی مسلم ہائی سکول پانی پت نے کیا تھا۔

نواب صاحب کے خطبہ کی فرائیمی کے بعد مجھے اب اس امر کی تلاش رہی کہ جشن صد
سالہ میں شرکت کرنے والی کوئی ایسی شخصیت مل جائے جو وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بتا

سکے۔ اتفاق سے اسی دوران میں علی گڑھ کانج لج کے مایہ ناز فرزند جلیل قد وائی نے راس مسعود اکیڈمی قائم کر کے اس موقع پر مرقع مسعود کے عنوان سے چند قیمتی اور نایاب مضامین شائع کر دیے۔ اور از رہ کرم اس کی ایک کاپی مجھے بھی عطا فرمادی۔ کتاب کے مطالعہ سے دوران جہاں تقریباً سب مضامین نے میرے علم و مطالعہ میں اضافہ کیا وہاں خصوصیت کے ساتھ جمیل نقوی کے سیر حاصل مضمون بعنوان سر سید راس مسعود نے جشن پانی پت کے کئی ڈھنکے چھپے گوشوں کو اجاگر کر دیا اس مضمون کے دو اقتباسات بطور خاص قبل مطالعہ ہیں:

”..... اسی زمانے میں آپ نے ایک اور قوی خدمت انجام

دی۔ یہ واقعہ بھی ہماری ادبی و تعلیمی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقع ہے۔ مولانا حالی کی یادگار میں بمقام پانی پت ایک سکول عرصہ سے قائم تھا لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی مالی حالت بڑی سیقیم ہو گئی۔ خواجہ سجاد حسین مرحوم خلف مولانا حالی نے جو اسکول کے سیکرٹری تھے اس باب میں راس مسعود صاحب سے رجوع کیا اور آپ کے مشورے سے ۱۹۳۵ء میں مولانا حالی کی صد سالہ جو بلی منائی گئی۔ مرحوم کونہ صرف یہ کہ خود پانی پت جا کر اس یادگار اجتماع میں شریک ہوئے بلکہ نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ اطراف ہند سے مولانا حالی کے بے شمار شیدائیوں پانی پت پہنچے۔ نواب صاحب نے ایک گراں قدر رقم بطور امداد سکول کو عطا کی۔ دوسرے مخیر حضرات نے بھی معتقد بر قیں نذر کیں اس موقع پر بابائے ارد و مولوی عبدالحق مرحوم اپنے ہمراہ حیدر آباد سے بہت سے لوگوں کو لے کر آئے۔ دہلی علی گڑھ اور دوسرے

مقامات سے بھی معزز مہمان پہنچے تھے۔ علامہ نے اس یادگار موقع کے لیے ایک نظم لکھی تھی جو جلسے میں سنائی گئی تھی۔ ابوالاثر حفظہ بھی وہاں موجود تھے اور نظم پیش کی تھی لیکن یہ سب کچھ راس مسعود کے پر خلوص تعاوون سے نمکن ہو سکا تھا۔“

اسی مضمون میں پانی پت کے دوران قیام کا ایک لطیفہ بھی قابل ذکر ہے۔ جس سے راس مسعود کی ذہانت علمیت، اقبال دوستی اور جشن صد سالہ کی ایک جھلک ہمارے سامنے آ جاتی ہے جمیل نقوی لکھتے ہیں:

”.....ان ۲ کا ادبی مذاق بڑا سترہ اور پاکیزہ تھا۔ اور ادب و شعری کے دل دادہ تھے۔ اردو ادب تو خیر اہل زبان کی شان تھی۔ فارس انگریزی فرانسیسی، عربی، اطالوی ادب پر بھی زبان داں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مطالعہ بے حد و سعیج تھا انگریزی اور فرانسیسی زبان میں خود اہل قلم ان کا لوبہ مانتے تھے۔ اہل زبان کی طرح ان دونوں زبانوں کے حسن و فخر پر بے تکان گفتگو کرتے تھے۔ ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔

فارسی میں مولانا روم سے عشق تھا۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ تقریباً ساری مشنوی حفظ تھی۔ علامہ اقبال کا پورا کلام یاد تھا۔ اس طرح کہ خود علامہ کو بھی اتنا یاد نہ تھا۔ سینیٹریزی کے موقع پر ہر صبح کو سارے سر برآ اور دہ مہمان ان کے خیے میں جمع ہو جاتے اور ان کی گفتگو اور ان کے لطفاء سے ان کے طنز یہ جملوں سے لطف انداز ہوتے تھے۔

ایک صحیح بیٹھے جامت بنارہے تھے کہ چہرے پر صابن کے
جھاگ لگے تھے۔ مسہری پران کی پشت پر علامہ اقبال نیم دراز لیٹے
تھے۔

۱ مرقع مسعود۔ صفحہ ۱۳۲-۱۳۵

۲ مرادراس مسعود

علامہ اقبال نے کسی نظم کا ذکر چھیرا..... میں بھی وہاں حاضر تھا
راس مسعود صاحب نے جو اقبال کا کلام سنانا شروع کیا ہے تو تقریباً
ایک گھنٹیک ساتے رہے۔ ایک شرع پر خود وجد میں آگئے پیچھے کی
طرف جھک کر علامہ کامنہ چوم لیا۔ ان کا رخسار صابن سے لਹڑ گیا۔
راس مسعود صاحب نے ایک فرمائی تہہ لگایا۔ باقی حاضرین بھی
اس ہنسی میں شریک ہو گئے۔

ان دو اہم واقعات کی نشان دہی کے بعد جمیل نقوی سے جو ”افکار“ کے اور میرے
دیرینہ رفیق وہم دم ہیں میں اے کراچی میں رابطہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ اس جشن
کی کچھ اور تفصیلات مجھے فراہم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک خط کی صورت میں انتہائی
دلچسپ یادداشت مجھے لکھ کر عنایت کر دی جس کی تفصیلات پیش خدمت ہیں۔ ان تفصیلات
سے سچ پوچھیے تو جشن کی جیتی جا گئی اور چلتی پھرتی تصویریں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔
جمیل نقوی ایک ممتاز ادیب و شاعر ہیں اور خوش نصیبی سے سید احمد خاں کے خانوادے سے
تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسی نسبت سے وہ راس مسعود کو نانا کہتے تھے اس جشن میں وہ بہ نفس
نفیس شریک تھے۔ انہوں نے نو عمری کے زمانے میں اس جشن میں کیا کچھ دیکھا اس کی
روادا نہیں کی زبانی سینے جو حیات اقبال اور جشن حالی کے کئی نئے گوشے اجاگر کرتی ہے:

مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ

”.....صہبای بھائی ہدیہ مسنون بات بہت پرانی ہو گئی۔

اس تقریب کی بہت سی تفصیلات ذہن سے نکل چکی ہیں جس قدر و اقدامات ذہن کے مختلف گوشوں میں بکھرے پڑے ہیں انہیں سمیٹ کر یہ مختصر سی روکندا پیش خدمت ہے:

اس تقریب کی تیاریاں کافی عرصہ پہلے شروع کی گئی تھیں۔ اس کا مقصد اول تو یہ تھا کہ مولانا مرحوم کی خدمت میں ہدیہ عقیدت پیش کیا جائے۔ اور دوسرا غرض عوام و خواص کو اس سکول کی طرف متوجہ کیا جائے جو عرصہ دراز سے مولانا کی یادگار میں قائم تھا اور بہت سے شعبوں میں توسعہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

اس موقع کے لیے مسدس حالی کا صمدی ایڈیشن بڑی آب وتا ب سے شائع کیا گیا تھا۔ حالی بک ڈپو کی جانب سے۔ اور اس کا منافع غالباً حالی سکول کے فنڈ میں دیا جانا طے پایا تھا۔ اور مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ یہ کتاب بڑی تعداد میں فروخت بھی ہوئی تھی۔

جلسہ میں شرکت کے لیے کسی ہزار دعوت نامے ہندوستان کے منتخب گوں کو جاری کیے گئے تھے اور ان کے ٹھہرنے کھانے پینے کا بڑے پیمانے پر بندوبست کیا گیا تھا۔ حالی سکول کے سامنے کھیل کے میدان میں لا تعداد خیمے نصب کیے گئے تھے اور مہماںوں کی دیکھ بھال کے لیے سکول کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ شہر پانی پت کے

بوڑھے جوان سب ہی موجود تھے۔

جلسے سے دو روز قبل مہمانوں کی آمد کا تانتابندھ گیا تھا۔

۱۔ مرقع مسعود۔ صفحہ ۱۲۵-۱۳۶

لا ہور۔ دہلی۔ علی گڑھ۔ بدایوں۔ میرٹھ۔ الہ آباد۔ لکھنؤ۔ ناگ پور۔ حیدر آباد دکن۔ بمبئی۔ بھوپال اور بہت سے شہروں سے ادیب شاعر، صحافی ماہرین تعلیم اور دوسرے معتقدین حالی پانی پت پنجھ تھے مہمانوں میں جو لوگ خاص طور پر مجھے یاد رہ گئے ہیں ان میں حسب ذیل بزرگ شامل تھے۔ ڈاکٹر اقبال۔ ڈاکٹر سر راس مسعود۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہویری ہند) ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ پروفیسر مجیب۔ رشید احمد صدیقی۔ مولانا سید علی احسن ماہروی۔ مولوی محمد امین زبیری۔ مرتضیٰ ابراہیم بیگ۔ سرگزشت علی گڑھ نواب کرناں۔ مولوی محی الدین۔ خواجہ غلام السید یعنی۔ مولوی بشیر الدین اثاوہ ابوالاشر حفظ جا لندھری۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔ شاہد احمد دھلوی۔ انصار ناصری۔ فضل حق قریشی۔ ظفر قریشی۔ آل احمد سرور۔ سید نذیر نیازی۔ جاں ثاراختر وغیرہ۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ لا ہور۔ علی گڑھ۔ دہلی حیدر آباد دکن سے خصوصاً بہت بڑے لوگ آئے تھے۔ جن میں علی گڑھ کے طالب علم اور دہلی کا نوجوان ادیب طبقہ پیش پیش تھا۔ یہ سب حضرات جلسے سے ایک روز قبل پانی پت پنجھ چکے تھے۔ رات کو بڑی بہار رہی۔ لوگ خیمه بخیمه گھومتے پھر رہے تھے۔ اور ایک عجیب

خوشی اور یگانگت کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ بڑے چھوٹے سب ہی خیموں میں مقیم تھے کسی کی تخصیص بھی نہ تھی۔ کچھ لوگ مولوی عبدالحق کے خیمے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ کچھ راس مسعود کے یہاں برائے جماں ہوئے تھے۔ مرزابراہیم بیگ کا خیمه زعفران زار بنا ہوا تھا۔ مرحوم بڑے زندہ دل صحافی تھے۔ اور علیگ برادری میں بڑے مقبول تھے۔ ڈھیر سا حلود اور نہ معلوم کیا تیار کرا کے اپنے ساتھ لائے تھے۔ جو آتا اس کی خوب خاطر ہوتی۔ اور یار لوگ کئی کئی بار آتے ارو بہانہ بازی سے خوب کھاتے۔ انہوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار کا جو (علی گڑھ اور علیگ برادری کے کارناموں کی پبلیٹی کے لیے مخصوص تھا) حالی نمبر نکالا تھا۔ اسے میں نے ایڈٹ کیا تھا۔ میرا کام یہ تھا کہ خیمه خیمه جا کر وہ پرچ تقسیم کروں۔ اس طرح مجھے سب ہی مہمانوں سے ملنے کا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔

مولوی صاحب (بابائے اردو) کے خیمہ میں اخبار دینے پہنچا تو بڑے بڑے بڑھے بیٹھے تھے۔ میں جھانک کر ٹھہڑک گیا۔ مولوی صاحب نے آواز دے کر اندر بلایا اور کہا کہ بھی خوب آئے ہم سوچ ہی رہے تھے کہ کوئی چھوٹا پھنسنے تو حقہ کی تواضع کرائیں۔ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میں حقہ لے کر باہر نکل آیا اور ایک والنیر کو پکڑ کر حقہ تازہ کرایا۔ مطین میں چلم بھروائی اور اسے ساتھ لے کر دروازے کے خیمے تک آیا۔ اور ہاں پہنچ کر اس سے حقہ لے کر اندر گیا۔ مولوی صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے حقہ خیمے کے دروازے پر آ کر لیا

ہے۔ اندر سے چھنے دیکھ لیا ہے۔ سب لوگ جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے
چونکا ہو گئے اور جھانک کر باہر دیکھنے لگے میں سہما سہما اندر گیا۔ اور
حقہ مولوی صاحب کے رو برو رکھ دیا۔ اسی دوران میں مولوی
صاحب سرگزشت کے پرچہ کی ورق گردانی کر چکے تھے۔ میں اندر
پہنچا تو کہا بیٹھ جاؤ۔

۱۔ اس جشن میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بھی شریک
ہوئے تھے۔

مولوی محمد امین زیری مرحوم بھی وہیں بیٹھے تھے۔ دراصل
مولوی صاحب کے خیمه میں جتنے حاضرین تھے وہ سب حقہ کے چکر
ہی میں وہاں تشریف فرماتے تھے۔ تب مولوی صاحب نے محمد امین
صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھئی یہڑکا توابھی سے اچھا لکھتا ہے۔
خاندان کا اثر اس کے انداز بیان اور زبان سے ظاہر ہوتا ہے۔ تم اس
کی طرف توجہ کرو یہ آگے چل کر اچھا لکھنے لگے گا۔ مگر دیکھوا سے کنبہ
مت بنالینا۔

مولوی صاحب سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ حیدر آباد والپیں
پہنچ کر مولوی صاحب نے جو مجھے خط لکھا اس میں بھی اس مضمون کی
تعریف کی اور بعد میں والپیں حیدر آباد میں میں نے اس مضمون کو
پڑھا کر تذکرہ حالی کی شکل دے دی تو اس پر مولوی صاحب نے
تعارف لکھا اور بہت خوش ہوئے سور و پیغام دیا اور کہا کہ باقی پیسے
اپنے پاس سے لگا کر اسے چھپو والو۔

اس زمانہ میں چھپائی کافی سستی تھی۔ شاید ڈھائی سوروپے میں
وہ تذکرہ چھپ گیا تھا۔ خوب دوستوں میں تقسیم کیا باقی کا پیاں
۱۹۷۲ء کے ہنگاموں میں ضائع ہو گئیں۔

ذکر مسعود میں ڈاکٹر اقبال کے ساتھ جو سراس کا لطیفہ تھا وہ میں
تفصیل سے لکھ چکا ہوں جسے گزشتہ صفحات میں آپ ملاحظہ کر چکے
ہیں۔ سراس کا خیمه کافی بڑا تھا۔ اس کے پہلوؤں میں دو چھوٹے
چھوٹے پارٹیشن تھے ایک میں میں مقیم تھا۔ دوسرا میں حفیظ
جاندھری صاحب حفیظ صاحب نے اپنی نظم اجلاس میں پڑھ کے
لیے اسی ختمہ میں رات کو لکھی تھی۔

اجلاس والے دن صبح کو آٹھ بجے لوگ نواب حمید اللہ خاں مرحوم
والی بھوپال کے استقبال کیلئے پانی پت ٹیشن پہنچے۔ استقبال کے
لیے جانے والوں میں سراس مسعود سید یعنی صاحب نواب کرنال
خاء، اسکول کے پرنسپل فضیلی صاحب اور چند اور عمامہ دین شہر میں
شامل تھے۔ میں بھی سراس مسعود کے ساتھ تھا۔ باقی لوگ اجلاس گاہ
پہنچے۔ معزز زمہانوں سے ہاتھ ملایا۔ تلاوت کا سلسلہ سے اجلاس کا آغاز
ہوا۔ اس کے بعد خواجه سجاد حسین مرحوم خلف مولانا حافظ نے سپاس
نامہ پیش کیا جو تختی کے قلم سے لکھا گیا تھا۔ خواجه صاحب کی بینائی
کمزور تھی۔ ہاتھ میں رعشہ تھا۔ ایک صاحب جوان ہیں سہارا دیے
کھڑے تھے۔ عجیب منظر تھا ہر شخص متاثر نظر آتا تھا۔ اس کے بعد
ابوالاثر حفیظ جاندھری نے اپنی نظم سنائی۔ ان کی نظم کے بعد سید یعنی

صاحب نے اعلان کیا کہ علامہ اقبال کی نظم ایک اور صاحب سنائیں گے کیونکہ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی آواز پر کشی عارضہ کا اثر تھا۔ اور بہت آہستہ بولتے تھے نظم سنانے والے صاحب بڑے خوش المان تھے حالی سکول کے اسٹاف کے آدمی تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی گئی کہ نظم خوانی کے دوران ڈائس پر تشریف رکھنے کی زحم گوارا کریں۔ پہلے ہی شعر پردا دکا شعر بلند ہوا؛؛؛

۱۔ حفیظ جالندھری کی یہ نظم اس باب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔

مزاج ناقہ مانند عرفی نیک می داغم
چوں محمل راگراں یغم حدی را تیز تر خوام
خصوصاً یہ شعر تو بے پناہ تھا۔

طوف مرقد حالی سزاوار باب معنی را
نوائے او بجا نہا افگند شورے کہ من داغم
خوادنواب صاحب بھوپال نے جھک کر ڈاکٹر صاحب کو داد
دیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس وقت کیا جذبات تھے ان کا
اندازہ لگانا مشکل تھا۔ البتہ چہرہ پر سرخی دوڑ گئی تھی لوگ اس بات پر
نازاں تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں ان کا کلام سننے کا موقع
ملا۔ میرا شعور اس وقت زیادہ بیدار نہ ہوا تھا۔ طالب علمانہ ذہنیت
تھی۔ جب نواب حمید اللہ خاں کی شان میں ان کا یہ شعر پڑھا گیا:
حید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروع از تو
ز الطاف تو موج لاله خیزد از خیا باسم

تو مجھے شعرِ الجم کا وہ حصہ یاد آگیا کہ جس میں علامہ شبلی نے اکبر اعظم ک دربار میں فیضی کی قصیدہ خوانی کا منظر پیش کیا تھا۔ اور میں سوچنے لگا کہ حضرتِ اقبال نے یہ شعر لکھ کر حمید اللہ خاں کو زندہ جاوید کر دیا۔ وہ پہلے اور آخری فرماں رو تھے جن کی شان میں خود اقبال نے خود نہ سہی اپنی موجودگی میں مدحیہ شعر پڑھوا یا۔ نواب بھوپال ان خوش قسمت لوگوں میں س تھے جن کی مدح میں ان کی زندگی میں اقبال نے ایسا شعر کہا ورنہ ان کے دو اوین ایسی کسی دوسری مثال باشنا شہر یارِ دکن سے غالباً خالی ہیں شعر خوانی کے بعد میں نے اپنے مضمون کا ایک ٹکڑا پڑھا پھر سید یعن صاحب ڈاکٹر ڈاکٹر حسین صاحب کے مضامین پڑھے گئے۔ آخر میں صدر کے خطبہ سے قبل مسدرسہ حالی صدی ایڈیشن کا وہ مختصر دیباچہ پڑھا گیا جو سر راس مسعود نے لکھا تھا۔ صدر کے خطبہ کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ نواب صاحب نے کئی ہزار کی گرانٹ مدرجہ کو دی اور اس کا اعلان سر راس نے کیا۔ اس کے بعد سب لوگ مزارِ حالی پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گئے۔ شام کی گاڑی سے نواب صاحب واپس دہلی تشریف لے گئے۔ غالباً اسی شام کو راس مسعود ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر ڈاکٹر حسین صاحب اور دوسرے عوام دین بھی واپس چلے گئے۔

مدتوں تک اس جلسہ کی باتیں موضوع بحث رہیں جن بزرگوں سے اس موقع پر نیاز حاصل ہوا تھا وہ بڑھ کر عقیدت اور تعلق میں تبدیل ہو گیا۔ میں اس تقریب کو اپنی زندگی کا سنگ میں سمجھتا ہوں۔

یہیں سے میں نے بزرگوں سے استفادہ کرنا اور لکھنا سیکھا۔ بزرگان ادب و سیاست سے ملنے کے جو موقع آئندہ مجھے نصیب ہوئے وہ بھی مولانا حالی کا ہی فیضان سمجھتا ہوں۔ پانی پت میں ہی میں ادبی طور پر متعارف ہوا اور بزرگوں کی ہمت افزائی بھیشہ میرے لیے شمع راہ رہی۔

۱۔ یہ رقم بیس ہزار تھی جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

آپ سوچیں گے کہ ایسے مہتمم بالشان مجمع میں مجھ جیسے نو عمر کو مضمون پڑھنے کا موقع ملنا بڑی عجیب بات سی تھی لیکن مسعود نانا کی یہ عادت تھی کہ اپنے خاندان کے نوجوانوں کو وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موقع فراہم رکتے تھے۔ میں سے مرحوم سے ایک دفعہ عرض کیا کہ وہ ایسا نہ کیا کریں مجھے بڑی شرم آتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ابھی تماس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں۔ بڑے ہو جاؤ گے اور جب ہم نہ ہوں گے تو محسوس کرو گے کہ ایسا کیوں کیا گیا اور یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی کم از کم میری اپنی حد تو باللک سچ ثابت ہوئی ان کے اس عمل نے میرے اندر جذبہ اعتماد اور خاندانی فخر کو بھاڑا جس نے میری شخصیت کی تشکیل میں بڑا کردار ادا کیا۔

مجھے بھوپال کئی دفعہ حاضر ہونے کا موقع ملا۔ غالباً دو مرتبہ علامہ اقبال وہاں تشریف فرماتے۔ شام کو سر راس کے یہاں محفل جنتی تھی۔ مخصوص لوگ روزانہ جمع ہوتے۔ علامہ اقبال بھی وہاں اگر ہوتے تو شامل ہو جاتے۔ خالص ادبی و علمی محفل ہوتی تھی۔ ادب

فلسفہ تاریخ اور دوسرے عام موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ مذہب اور سیاست اس بحث سے یک سرخارج تھے۔

علامہ اقبال کو جو مالی امداد بھوپال سے ملی وہ کیلتہ سر راس کی وجہ سے تھی۔ میں نے وہ سارے خطوط دیکھے تھے جو علامہ اقبال کو اس سلسلے میں لکھتے رہتے تھے۔ شیخ عطا اللہ نے مکاتیب کے پہلا ایڈیشن میں تو سارے خطوط بھوپال شامل کر دیے تھے۔ لیکن بعد میں ایڈیشن میں کچھ لوگوں کے اعتراض پر وہ خطوط نکال دیے اور آپ کی کتاب کا خاصاً ہم مواد پر دھنفا میں چلا گیا مجھے معلوم نہیں کہ پہلا ایڈیشن کہاں ملے گا؟

میرے پاس ایک نسخہ تھا جو مولوی محمد امین زیری مرحوم نے اپنی کتاب اقبال کی تدوین کے سلسلے میں لیا تھا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد وہ سارا مواد کہاں چلا گیا مجھے معلوم نہ ہوسکا۔ مرحوم نے علامہ اقبال کے تعلقات حیدر آباد اور بھوپال پر دوالگ الگ باب مرتب کیے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ مسودہ سید ہاشمی فرید آبادی کے پاس تھا۔ اب وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے کس سے پوچھا جائے۔

ماہانہ وظیفہ سے قبل راس مسعود کی مسامی سے ڈاکٹر اقبال کو یک مشت بھی کئی ہزار کی رقم نواب صاحب نے عطا کی تھی۔ تاکہ وہ قرآن مجید کے حوالی لکھنے کے لیے کتب کی خریداری کر سکیں۔ اس رقم کا حوالہ اقبال نے ممنون حسن خاں کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے جو اقبال نامہ کے پہلا ایڈیشن میں شامل تھا۔ بعد میں اسے بعض وجود

کی بنابر پہلے ایڈیشن سے خارج کر دیا گیا۔

جمیل نقوی نے جشن صد سالہ کے جو چشم دید واقعات بیان کیے ہیں ان کی صداقت اور اثر آفرینی سے انکار کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ انہوں نے اقبال کے مدحیہ شعر کے سلسلے میں شعر الحجم کے قصیدہ کا جس اندازہ سے تذکرہ کیا ہے وہ غالباً اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے دوستانہ اور قریبی روابط کی علمی کے سبب معلوم ہوتا ہے۔ یہ مدحیہ شعر ہرگز قصیدہ خوانی کے ذیل میں نہیں آتا اور نہ آنا چاہیے کہ اقبال فطرتاً قصیدہ گو شعر اکی صاف میں کبھی شامل نہیں رہے۔ جذبہ ممنونیت انسان کی اعلیٰ صفات کی قدر دانی اور علمی و تعلیمی کاموں کے سلسلے میں نواب بھوپال کی عہد آفرین خدمات کا حقیقی اعتراف نہ کرنا بھی یقیناً ناپاسی کوڈوئی، اور محسن کشی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہذا اقبال ایسے سچے اور حقیقت پسند شاعر کا مدحیہ شعر میں اعتراف خدمت آج اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

جشن کی ان جھلکیوں سے جہاں ایک طرف پانی پت کے اس تاریخ و عظیم اجتماع کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہیں چند ایک انکشافت بھی ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہیں مثلاً دنیاۓ ادب کا ب تک صرف یہی علم تھا کہ بھوپال سے اقبال کو پانچ سورو پے ماہانہ وظیفہ متاثرا۔ اس سے قبل راس مسعود کی مسائی سے انہیں یک مشت رقم بھی دی گئی تھی جس کی تصدیق اقبال نامہ کے پہلے ایڈیشن سے ممکن تھی۔ جو افسوس کہ دستیاب نہ ہو سکا۔ دویم یہ کہ مولوی محمد امین زیری نے اقبال پر کتاب کے دو باب لکھے۔ جن میں ایک باب بھوپال سے متعلق تھا کتاب کا یہ مسودہ بھی اب کہیں دستیاب نہیں۔

جشن پانی پت کی ایک اچھوٹی تصویر جمیل نقوی نے پیش کی جو آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب اس تصویر کا دوسرا رخ جو بیشتر اقبال سے متعلق ہے۔ ملاحظہ فرمائیے یہ واقعات سید نذری نیازی نے مکتوبات اقبال میں تحریر کیے ہیں:

اجماع پانی پت

”اکتوبر ۱۹۳۵ء میں خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم و مغفور کی صد سالہ بر سی منائی گئی تو میں پانی پت اس وقت پہنچا جب منتظمین جلسہ اعلیٰ نواب صاحب بھوپال کے خیر مقدم کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حضرت علامہ بھی نواب صاحب کی تشریف آوری سے ایک روز پہلے تشریف لائے تھے۔ اور پھر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں انہوں نے پانی پت آتے ہی حضرت شاہ بولی قلندرؒ کے مزار کی زیارت کی اور بعض دوسرے مقامات بھی دیکھے۔

۱۔ کوشش کے باوجود اقبال نامہ کی پہلا ایڈیشن کہیں دستیاب نہ ہو سکا۔ جس سے یہ مشت رقم کی ادائی کی تصدیق ہو سکتی۔ ممنون حسن خاں اب بھی بھوپال میں موجود ہیں اور معترض ذرائع کے بہوجب چند غیر مطبوع خطوط ان کے پاس محفوظ ہیں لیکن وہ یہ خطوط جو قطعی ذاتی ہیں کسی کو تیار نہیں۔ یہ مشت رقم کے سلسلے میں بھی وہ تصدیق یا تردید کے لیے تیار نہیں اس لیے اگر کہیں لا بھری ی میں یا کسی صاحب ذوق کے پاس اقبال نامہ کا پہلا ایڈیشن موجود ہو گا تو آئندہ اس واقعہ کی تصدیق یا تردید ممکن ہو گی۔

ملاحظہ، ہود یا چیخ طبع ثانی

اگلے روز والی بھوپال تشریف لائے اور جلسہ منعقد ہوا تو اس میں حضرت علامہ نے بھی شرکت فرمائی۔ یہ جلسہ بڑا پر رونق تھا۔ پھر جب منتظمین جلسہ کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ مولانا حالی کی اس صد سالہ بر سی کا یہ اجماع تین دن تک جاری رہے گا تو اور اس کا ایک

اجلاس ہر روز صبح و شام منعقد ہوا کرے گا تو لوگ یہ سمجھے کہ حضرت علامہ بھی ان میں شرکت فرمائیں گے۔ اس غلط فہمی سے قدر دانان اقبال کو جو پریشانی ہوئی اس کی کیفیت صاحب نوائے فردا حضرت ایوب اکی زبانی سنیں وہ اپنے ایک حکومت نامے میں لکھتے ہیں:

”۱۹۳۵ء میں جب کہ اس بری کا انعقاد ہوا میں بسلسلہ

ملازمت دہلی میں مقیم تھا بری کے اجلاس تین دن تک ہونا تھے اور ہر روز صبح اور شام کے وقت الگ الگ نشتوں کا اہتمام تھا ایک مجبوری کے باعث میں دن کے صبح کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکا۔ میری گاڑی پانی پت میں بعد دو پھر پہنچی جب کہ پہلی نشست ختم ہو چکی تھی۔ پانی پت پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اس نشست میں جس کی صدارت نواب حمید اللہ خاں صاحب والی بھوپال نے کی تھی علامہ اقبال بہ نفس نفیس موجود تھے چونکہ ان کے گلے کی تکلیف بدستور قائم تھی اس لیے وہ اپنا اشعار جوانہوں نے حالی کی بری کے سلسلے میں کہے تھے کسی دوسرے صاحب نے ان کی جانب سے پڑھ دیے تھے۔ جب شام کے وقت پہے دن کی دوست نشست منعقد ہوئی تو اہل مجلس کی نظریں پوری بےتابی کے ساتھ ڈاؤس کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ کہ علامہ صاحب تشریف لاتے ہیں جب پنڈال پر ہو گیا تو جلسہ کی کارروائی کی ابتدا کا وقت آیا تو ڈاؤس سے یہ اعلان ہوا کہ علامہ صاحب کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔ اس لیے وہ اجلاس میں تشریف نہیں لاسکتے۔ لیکن وہ کل صبح کے جلسے میں ضرور تشریف آور

ہوں گے۔ اس اعلان نے دعوت شوق کو تلخ انتظار کی دعوت دی۔
دوسرے دن صبح میں کشیدگان انتظار کی نظریں پوری تیزی کے ساتھ
پھر ڈائس کی طرف منہک تھیں امید کو یہ سہارا تھا کہ کل کا وعدہ غلط
نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج بھی ہزار ہاتھناوں کا خون ہوا جب مند کی
جانب سے یہ آواز آئی کہ علامہ اقبال ایک ضروری کام کے سلسلے میں
دلی گئے ہیں دوپہر تک واپس تشریف لائیں گے۔ اور شام کے
اجلاس میں شرکت فرمائیں گے شوق کو اگرچہ خوفزدگی کا شکار ہونے
سے بھی کبھی باک نہیں ہوتا۔ تاہم آرزومندوں کو محسوس ہوا کہ یہ سب
اعلانات محض محفل کی رونق افزائی کے وسیلے یا حیلے ہیں اقبال تو غالباً
اب کسی نشست میں شریک ہونے والے نہیں ہیں اس احساس کی
رہنمائی میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب پانی پت میں رکنا بے سود ہے
اور مناسب ہے جکہ دوپہر کی گاڑی سے دلی واپس جایا جائے۔

۱ (سابق) نائب مشیر مالیات (مواصلات) حکومت پاکستان کراچی (نیازی)

میری یہ چند احباب نے جو دلی سے میرے ساتھ آئے تھے۔
میری رائے سے اتفاق کیا اور ہم گاڑی کی آمد سے کوئی بیس منٹ
پہلے ہی پانی پت ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی کے انتظار میں
وینگ روم میں جو داخل ہوئے تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی
جب ہم نے دیکھا کہ اقبال وہاں تشریف فرمائیں۔ تھوڑی دری بردا
ایک گاڑی دلی کی جانب سے آنے والی تھی۔ جس میں لامہ لاہور کا
سفر اختیار کرنے والے تھے۔ علامہ موصوف کو دیکھنے کا عمر بھر میں یہ

میرا پہلا اور آخری موقع تھا۔ جب میری نظر ان پر پڑے تو مجھے ایسا
محسوس ہوا جیسے انسانی عظمت کا کوئی ہمالہ میرے سامنے آگیا ہو۔
اس وقت میری عمر کوئی چوبیس برس کی تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں
سے علامہ سے مصافحہ کیا اور کوئی ڈیڑھ گز کے فاصلے پر ایک بیٹھ پر دم
بنود بیٹھ گیا۔ کمرے میں چند نقوش اور بھی تھے ایک صاحب نے جو
غالباً ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے جرات کے سلسلہ گفتگو کا آغاز
کیا۔ ہم نے سنا تھا کہ جناب واسرائے سے ملاقات کی غرض سے دلی
تشریف لے گئے ہیں آپ نے دلی تشریف لے جانے کا اعلان تو
آج صحیح ہی ہوا تھا۔ اس سوال کے جواب میں علامہ نے اپنی بیٹھی مگر
جلال آگیں آواز میں فرمایا فقیر کا واسرائے سے کیا کام اس کے بعد
ایک صاحب نے علامہ کو ایک کاغذ پر لکھے ہوئے ان کے چند اشعار
دکھائے جوان کی جانب سے بر سی کے اولین خطاب میں پڑھے گئے
تھے۔ اور عرض کیا کہ یہ اشعار میں نے جلسہ میں سن رکھے تھے آپ
انہیں ملاحظہ فرمائی یہ فرمائیں کہ میں نے لکھنے میں کوئی غلطی تو نہیں
کی۔ علامہ نے سید نذرینیازی کی جانب سے جو ایک گوشہ میں کرسی
پر بیٹھے ہاتھ میں تھامے ہوئے چند کاغذات کو گھور رہے تھے اشارا
فرمایا اور نیازی صاحب کو دیکھا بیٹھے۔ ادھر نیازی صاحب نے ان
اشعار کی صحت پر صاد کیا اور ادھر لا ہو رجاء نے والی گاڑی پلیٹ فارم پر
آپنی۔ علامہ وہاں سے اٹھے اور گاڑی میں تشریف فرمائے ہوئے۔ چند
منٹ بعد گاڑی جا چکی تھی اور اساتفاقی ملاقات کے ناقابل فراموش

تاثرات و تصورات اپنی جگہ پر قائم تھے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ صد سالہ برسی کی تقریب حالی مسلم ہائی سکول میں منائی گئی تھی۔ اور حضرت علامہ کے قیام کا بھی اسی مدرسہ میں ایک عمارت میں انتظام کیا گیا تھا۔ صاحب نوازے فردا کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ یہ والی بھوپال واپس تشریف لے گئے تو حضرت علامہ بھی جوان دنوں خلاف خلاف امید بہت زیادہ نقاہت اور ضعف محسوس کرتے تھے جلسہ گاہ سے اٹھ آئے۔ انہیں اس وقت بے حد آرام کی ضرورت تھی چنانچہ حضرت علامہ نے اول تو کچھ آرام فرمایا پھر کھانا کھایا۔ علی بخش حقہ بھر کر لے آیا۔ چوبڑی صاحب مرحوم راجہ صاحب اور رقم الحروف خدمت کے لیے حاضر تھے۔ مجھے سے حکیم صاحب قبلہ کے بارے میں استفسار فرمایا اپنے خطوں اور دوا و پرہیز کا ذکر کرنے لگے۔ میں حکیم صاحب قبلہ سے مل کر سب حالات عرض کر چکا تھا۔ دوائیں بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ دو اور پرہیز کے بارے میں ان کا اطمینان ہوا تو حسب معمول کچھ نیندیں پھر باٹیں ہونے لگیں۔ سہ پھر میں دارالاقامے کے میدان میں نشست رہی چائے کا اہتمام ہوا۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔ شام کو میدان سے اٹھ کر پھر کمرے میں تشریف لے آئے۔ اس دوران میں بھی جو حضرات ملنے کے لیے آئے ان کی باتوں کا اپنی دھیکی اور کمزور آواز میں جواب دیتے ہیں۔ اس اثنامیں ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک صاحب بار بار آتے اور ہم لوگ جہاں بیٹھے تھے

وہیں پاس ہی کچھ کاغذ اور پھلفٹ پھینک دیتے۔ یہ صاحب شلوار کوٹ پہنے تھے خشکی ڈاڑھی تھی سر پر چھوٹی سی پگڑی۔ ان کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی تبلیغی جماعت کے کارکن ہیں چنانچہ ایک مرتبہ جو مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے تو کسی نے کہا یہ آپ کیا پھینک رہے ہیں۔ ان کا یہ عجلب پھلفٹوں کو تپائیوں پر رکھنا اور اٹے پیرول جانا پھینکنے ہی کے متراوف تھا۔ کہنے لگے یہ ہماری جماعت کا لشیچر ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا یہ کون صاحب ہیں؟ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے عرض کیا مبلغ ہیں۔ فرمایا یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اور پھر ارشاد ہوا کہ ان سے کہیے کہم سے اتنا خائف کیوں ہی۔ بار بار تکلیف فرماتے ہیں کیوں نہ ہم سے بیٹھ کر بات کریں ہمیں سمجھائیں ہم ان سے کچھ سیکھیں۔ لیکن ہمارا ان کے کہنا بھی کہ وہ مسکرانے اور تیزی سے جس سے اس مرتبہ انہوں نے جھلک دکھانی تھی غائب ہو گئے۔

شام کے اجلاس میں حضرت علامہ کی شرکت ناممکن تھی۔ سفر کی کلفت سے ان کے ضعف و اضطراب بہت کافی بڑھ گیا تھا بلکہ تشویش تھی کہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو جاوے۔ ۔۔۔

حالی اور اقبال

یہ اشعار جو حالی کی صد سالہ بر سی پر نواب صاحب بھوپال کی موجودگی میں پڑھے گئے اور اب تک اقبال کی کسی کتاب میں درج نہیں ہوئے حسب ذیل ہیں۔

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می یعنی
 چو محمل را گرائیں حدی را تیز تر خوانم
 حمید اللہ خان اے ملک و ملت فروغ از تو
 ز الاطاف تو موج لالہ خیزد از خیا بام

۱۔ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۳۶ تا ۳۵۱

۲۔ مندرجہ بالا اشعار ابتدأ حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کے سالانہ حیات نومیں شائع ہوئے تھے۔ جو جشن حالی کے مضامین نظم و نثر پر مشتمل تھا۔ اقبال نامہ کے علاوہ یہ اشعار باقیات اقبال میں صفحہ ۲۲۵-۲۳۶ پر بھی شامل ہیں۔ باقیات اقبال کی ترتیب اول سید عبدالواحد معینی ایم اے آکسن کی ہے جس میں ترمی و اضافہ محمد عبداللہ قریشی نے کیا ہے۔

طاف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
 نوائے او بجا نہا افگند شورے کہ من داغم
 بیاتا فقر و شاہی در حضور دبھم سازیم
 تو برخاش گہر افشاں و من برگ گل افشاں ۱
 ایک دوسرے موقع پر حالی سے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا:

آں لالہ صحرا کے خزان دید و بیفسرد
 سید دگر اور انے از اشک سحر داد
 حالی از نوا ہائے جگر سوزینا سود
 تا لالہ شبتم زده اداغ جگر داد

۲۔ جون ۱۹۳۵ء

جشن حالی کے موقع پر نواب صاحب بھوپال نے بحیثیت صدر جلسہ جو یادگار خطبہ

ارشاد فرمایا تھا وہ پیش خدمت ہے۔ یہ خطبہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کئی سال کی سعی و تلاش کے بعد مجھے مل سکا تھا۔ اس خطبہ میں اواب صاحب نے اقبال کی گراں مایہ خدمات کا اعتراف ہی نہیں کیا اس کا اختتام بھی ان کی مشہور نظم کے ایک بند پر کیا ہے۔

تقریر ہر ہائی نس اعلیٰ حضرت حضور نواب صاحب بہادر والی

بھوپال خلد اللہ ملکہ

بجواب

ایڈر لیس مینگ کمیٹی حالی مسلم ہائی سکول و کمیٹی استقبالیہ حالی

سنیٹیزی پانی پت

۱۹۳۵ء اکتوبر

”صاحبان..... سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پانی پت کے احباب نے بلا امتیاز مذہب و ملت جس پر خلوص پر جوش اور محبت کی سرگرمی سے میرا خیر مقدم کیا ہے۔ اس سے میرا دل جذبات مسرت و اتنان سے لبریز ہے اور میں تدل سے آپ سب صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ حالی کی صد سالہ سال گرد کے جلسے کی انجمن استقبالیہ نے اس تقریب میں دعوت دے کر میرے لیے آپ کے اس قدیم اور تاریخی شہر میں آنے کا ایک موقع مہیا کر دیا جس کی سرز میں پر بارہا ہندوستان کی قسمت کا

فیصلہ ہوا ہے اور جس کی گزشتہ صدی کی سب سے بڑی خصوصیت اور افضلیت یہ ہے کہ وہ مولانا مرحوم کا مولد و مدفن ہے۔ اسی واسطے جب مجھے اس جلسہ کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ ایک ایسے شخص کی یادگار میں منعقد ہو رہا ہے جو کسی ایک خطے یا طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ جس کی ذات پر ہر زمانہ میں ملک فخر کر سکتا ہے اور اس کی اتنی عالمگیر اہمیت کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس میں شرکت کو اپنی دیگر گونا گوں مصروفیتوں پر

مقدم رکھا۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۹

۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۰

کیونکہ جیسا کہ آپ نے کہا کہ میری ہمیشہ یہ کوشش اور خواہش رہی ہے کہ حتی الامکان ہر ایسی تحریر میں ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ لیا جائے جو اہل ملک اور اہنائے وطن کے واسطے مفید نہ ہو۔ اور یہ نتیجہ ہے میری اس تعلیم و تربیت کا جس کے لیے میں سب سے زیادہ اپنی والدہ محترمہ حضور سرکار عالیہ مرحومہ فردوس آشیان کا اور اس کے بعد اپنی مادر درس گاہ علی گڑھ کا ممنون منت ہوں۔ اس لیے میں حالی کی صد سالہ سالہ گرہ کی تقریب میں نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ بالخصوص اہل ریاست بھوپال اور بالعموم تمام مسلمانان ہند کی جانب سے مبارک باد دینے کے لیے یہاں آیا ہوں۔

صاحب..... یہاں مجھے حالی مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح

حیات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ صاحبان ان سے میری نسبت بدر جہاز یادہ واقف اور باخبر ہیں میں ان کی قومی اور ملکی خدمات کا اعتراف بھی ذکر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ ملک ان کو اچھی طرح جانتا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ میں ان کے ادبی کارناموں پر بھی کوئی تنقید اور تبصرہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس وقت مجھے ان مختلف پہلوؤں اور نہایت خلیل اللہ علیہ ش السلام اسلوبی سے کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ البتہ مجموعی طور پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالی مرحوم کے یوم ولادت کی صد سالہ سال گرہ منانے کے لیے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ملکے ایک سچے بھی خواہ اور قوم کے ہمدرد تھے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر اپنائے وطن کی اصلاح اور تربیت کی کوشش میں صرف کی۔ ان کی ہربات وعظ و نصیحت کی تھی اور ان کا ہر کام خلوص و محبت کا میرا یقین ہے اور غالباً اس سے کسی شخص کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔ کہ ان تمام پہلوؤں سے مرحوم گزشتہ صدی کے اکابر ملک کی صفات اول میں تھے۔ اور وہ ہر حیثیت سے اس کے مستحق ہیں کہ ان کی احسان شناس قوم ہر ممکن طریقہ سے ان کی یادگار کو قائم رکھے۔ تاکہ نوجوانوں میں ان کی تقلید اور ت segue کی تحریک ہو۔

بلاشبہ ان کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت اردو شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ہے۔ حقیقت میں انہوں نے اردو شاعری کے اصل مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور یہ محسوس کیا کہ شاعر کا کام یہ ہے کہ قدرت کی نیرگلیوں کے مشاہدہ سے نجاشیان کے حساس اور

ذکی دل و دماغ پر مرتب ہوا ہے اسے ایسے دل کش انداز اور موزوں الفاظ میں ادا کرے کہ جس سے سامعین کے اعلیٰ ترین احساسات برائیگختہ ہوں۔ اور نظام فطرت کے مطالعہ سے مسائل حیات کے متعلق جو نتائج وہ خود اخذ کرتا ہے۔ اور دوسروں کے دلوں میں بھی پیدا کر دے۔ اس کی نظم ہر قسم کے رکیک خیالات اور ادنیٰ جذبات سے پاک ہو۔ چنانچہ انہوں نے نثر میں شاعر کے اس نصب العین کو نہایت وضاحت اور سلاست سے پیش کیا ہے۔ اور نظم میں پوری بے باکی اور یک سوئی سے اسے پیش نظر رکھا ہے۔ اس لیے انہوں نے تمام قوتوں کو ملک اور قوم کی اصلاح میں صرف کر دیا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ غیر فانی اور عدیم المثال کتاب موجزِ اسلام المعروف مسدسِ حالی جس کی نسبت سر سید علیہ الرحمۃ نے بالکل بجا طور پر فرمایا کہ کہ قیامت میں اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ کیا لایا تو میں مسدس حالی پیش کر دوں گا۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ وہ خاص طور پر مسلمانوں کو ان کی موجودہ زبؤں حالی پر غیرت دلانے کے لیے اور ان میں ملکی اور قومی حمیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ یہ یقینی بات ہے کہ اردو شاعری میں یہی وہ ایک ایسی نئی چیز تھی جس کی کوئی مثال اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ کیونکہ جیسا کہ مرحوم نے خود اس کے پہلے دیباچہ میں لکھا ہے:

.....اس میں نہ کہیں نازک خیالی ہے۔ نہ نگین بیانی ہے نہ
مبانے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی ہے مگر ہے کیا؟ خلوص ہے

صداقت ہے سلاست ہے روانی ہے صاف گوئی ہے سادہ بیانی
ہے۔

ایک آئینہ خانہ ہے جس میں قوم اپنے صحیح خط و خال دیکھ سکتی ہے اور سمجھ سکتی ہے کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے؟ اس نظم کی ہر دل عزیزی اور قبولیت عامہ نے اور اس کے کیا مقدمہ شعرو شاعری نے شعرا کے سامنے ایک نیا اور وسیع میدان کھول دیا ہے اور اس سے جو عظیم انقلاب ہندوستانی شاعری میں پیدا ہو گیا ہے اس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ اور جس کی مثال میں دور حاضرہ کے سب سے بڑے فلسفی شاعر اقبال کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مرحوم نے اس بات کو بھی فراموش نہیں کیا کہ اہل مشرق کا نہ بے سے کتنا گہرا اعلق ہے۔ اور ہوان کی زندگی کے ہر شعبہ میں کتنا موثر اور دخیل ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ مسلمانوں کی تمام شیرازہ بندی مذہب ہی سے ہے۔ اور ان کی ساری قومی ترقی کا راز اسی میں مضمیر ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ مذہب کا اصلی مفہوم فرقہ وارانہ تعصّب اور تنگ نظری سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اور اس کی صحیح اور سچی تعلیم عالمگیر اخوت اور رواداری کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے احکام کی تکمیل جہاں ہر شخص کو بہترین اخلاق سکھاتی ہیں وہیں وہ اسے کسی دوسرے شخص کو تھارات اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے دل میں عام انسانی محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے حالی کی تمام تصنیفیں شاہد ہیں کہ وہ اس

سچی تعلیم کے کیسے سچے عامل تھے ان کے دل میں سچا اسلامی درد تھا۔ ان کو اپنی قوم کے تنزل کا شدید احساس تھا۔ ان کی تمام سعی و کوشش یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے بیدار کریں اس لیے کہ وہ کو سخت سست کہتے تھے۔ ان کو لعن طعن کرتے تھے۔ مگر وہ کسی دوسری قوم کو کبھی بھی برائی نہیں کہتے تھے۔ کسی دوسرے مذہب کی بھول کر بھی برائی نہیں کرتے تھے۔ ان کے پند و نصائح سے تمام اہل وطن یکساں فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ یہی ان کی خصوصیت ہے جو ان کی ماہہ الامتیاز ہے اور جس کی تقلید آج کل ہر شخص کو کرنی چاہیے۔ چنانچہ یاد گار غالب میں ایک جگہ انہوں نے نہایت پر لطف طریقے سے اس روشن کے برخلاف اپنے سابقہ طرز عمل پر خود ہی اعتراض کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

..... ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہو گئی کہ جس کے تصور سے ہمیشہ مجھ کو شرمندگی ہوتی ہے۔ وہ زمانہ تھا کہ جب مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے صرف اہل سنت کو اور اہل سنت میں سے صرف حنفیہ کو اور ان میں میں سے بھی صرف ان کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام الٰہی کے نہایت تقيید کے ساتھ پابند ہیں نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرہ رحمت الٰہی کو لوئن و کٹویہ کی وسعت سلطنت سے بھی جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمی ہیں بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں اور زیادہ تنگ اور محدود خیال

کرتے تھے۔

میرے نزدیک یہ سب سے بڑا سبق ہے جو ہم کو مر جوم کی زندگی سے لینا چاہیے کیونکہ اگر اس وقت ہم بھی اسی نقطہ خیال سے اپنے مذہبی عقائد کو جانچیں اور مر جوم کی وسعت نظری اور فراخ دلی سے کام لے کر آپس میں رواداری کا برتاؤ کرنے لگیں تو یقیناً ہمارے سارے جھگڑے نہ مٹ جائیں گے اور ہماری ساری دقتیں حاصل کر لیں گی۔ آخر ہمارے بزرگوں نے اس ملک میں ایک ہزار سال تک باہم شیرو شکر رہ کر زندگی بسر کی ہے۔ کیا وہ اپنے مذہب کے سچے پرستار نہ تھے۔ یا ان میں ہماری نسبت مذہبی شغف کم تھا؟ کم سے کم میں تو یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں اور میں اس خلاف مذہب تعصب کو صحیح اسچی مذہبی تعلیم سے بیگانگی اور اصول مذہب سے نا آشنائی کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے مذہبوں کے اصل اصول ایک ہیں۔ ہر مذہب نگوکاری کی تلقین کرتا ہے۔ ہر مذہب ہمدردی اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ تو پھر کیا ہم ان اصولوں اصلیہ کے اشتراک کے باوجود بھی

لکھ دینکم ولی دین

کے زریں اصولوں پر کار بند نہیں رہ سکتے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ دوستی اور اتحاد کا برتاؤ نہیں کر سکتے۔ میں نہایت اصرار اور تاکید سے اپنے تمام ابناۓ وطن اور بالخصوص ہر ایک مسلمان سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلے پر غور کریں کہ کیا

وہ اس طرح اپنے ملک اور اپنی قوم کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں یا اپنے معبود حقیقی کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کر سکتے ہیں جو بلاشبہ ان کی اس تمام تگ و دو کامن شا ہے۔

میری رائے میں ہمارے ملک کی موجودہ تعلیم بھی ایک بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔ تعلیم کا ایک صحیح مقصد یہ ہے کہ ہم کو ماہیت اشیاء کا علم ہو۔ تاکہ ہم قوانین قدرت کو سمجھ سکیں۔ ہم میں تحقیق و تدقیق کی قابلیت ہوتا کہ ہم بھلائی اور برائی میں تمیز کر سکیں اور جو معاملات ہمارے سامنے آئیں ان کے متعلق ہم کوئی درست رائے قائم کر کے بھی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ غرض یہ کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اور دنیا کی مشکلات کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ قابلیت پیدا کرنے کی بجائے ہم مدرسون کی مروجہ تعلیم سے فقط چند لٹوٹے ہوئے الفاظ سیکھ لیتے ہیں۔ چند غلط سلط اصطلاحیں از بر کر لیتے ہیں۔ چند الٹے سیدھے جملے بول لیتے ہیں لیکن اس کے سات ہی ہم اپنے قدیم تمدن کو بھول جاتے ہیں۔ اپنی آبائی معاشرت کو فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے مذہب کے اصول سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا غائب تریں المال کوئی سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہے اور ہماری معراج ترقی کسی محکمے کی محرومی کی جگہ لے لینا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملازمتوں کی تعداد محدود ہے اور یقیناً وہ اس قدر جلد خالی اور زیر انتظام نہیں ہوتی۔ جتنی کثرت سے ان کے خواست گار پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تعلیم کی عمومیت کی خواہش اور دوسری طرف تعلیم کے بعد

ملازمتوں کے لیے جدوجہد ایسی مخالفت اور متضاد باتیں ہیں جن کو کسی طرح جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کشمکش کا نتیجہ یہ ہیں تعلیمی اسناد کی کس پرستی اور کساد بازاری اور مختلف قوموں کی باہمی کوشش و کاوش ملازمتوں کے حصول میں بڑی حد تک فرقہ وارانہ جنگ و جدل کی ذمہ دار ہے۔

یہ درس گاہ کی بنیاد حاملی کے مقدس ہاتھوں نے لکھی ہے اور جو مرحوم کی یادگار ہے اس کے طلبہ سے خاص طور پر میں یہ کہوں گا کہ وہ اپنی تعلیم کی غرض سے حاصل کریں اسے صرف ایک پیشے کی طرح نہ سیکھیں مجھے یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ جہاں کے طلبہ کی دینی اور دینیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قوم کے بچوں کے دلوں میں ہاتھ سے کام کرنے کا عار نکالنے اور ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ڈالنے کی غرض سے بطور ایک ضروری ترتیبیت کے اس مدرسے کے مقدور کے مطابق کسی نہ کسی قسم کی دستکاری سکھانے کا بھی انتظام کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ یہ امر قابل افسوس ہے کہ مالی مشکلات کی وجہ سے اب تک اس کا کوئی مستقبل اور اطمینان قابل انتظام نہیں ہوا سکا۔ مالی مشکلات آج کل ہر جگہ ہیں اور کوئی بھی ان سے مستثنی نہیں ہے۔ لیکن ایسی ضروری اور مفید تحریک میں یقیناً یہ مشکلات مانع نہ ہونی چاہیں۔ اور میں یہ مشورہ دوں گا کہ اگر اور کوئی صورت ممکن نہ ہو تو دیگر ضروریات کو ملتوی یا کسی قدر کم کر کے اس کا مستقبل اور قابل اطمینان انتظام کیا جائے کیونکہ حقیقت میں یہ ہماری سب سے بڑی

ضروریات اور ہماری بہت سی شکایتیں کا واحد علاج ہے۔

اس ضمن میں یہ کہنا بھی بے جانہ ہو گا کہ تعلیم پانے کے بعد پیشوں کو ذلیل سمجھنا کسی حال میں بھی درست نہیں ہو سکتا۔ اور خاص کراپنے آبائی پیشے کو حقیر سمجھنا تو نہایت ہی نازیبا بات ہے چونکہ میں الکاسب حبیب اللہ کے ماننے والوں میں سے ہوں اور میرے نزدیک ہر پیش ور جو اپنی قوت بازو سے حلال روزی پیدا کرتا ہے اور اپنی آمدنی کی مقدار کے لحاظ سے بغیر کیساں قابل عزت ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم ضروری تعلیم پانے کے بعد سرکاری نوکریاں تلاش کرنے کے بجائے اپنے ان ہی پیشوں کو اپنا ذریعہ معاش بنائیں اور اپنی علمی لیاقت کو ان کے ترقی دینے اور ان میں اصلاح کرنے میں صرف کریں تو یقیناً ہم خود اپنے اور اپنے ملک کے لیے بہت زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔

صاحبان..... مجھے یہ سن کرو بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے ہاں تعلیم نسوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ بچوں کی درست تربیت ماوں کی صحیح تعلیم پر منحصر ہے۔ ارآج کل کی کشاکش ہستی میں کوئی قوم اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اس کا ہر فرد تنازع للبقاء کے لیے آمادہ اور مستعد نہ ہو۔ اگر اس دوڑ دھوپ میں ہماری قوم کی نصف جماعت سست رو رہی تو میدان مقابلہ میں ہمارا آگے بڑھنا ممکن ہو گا۔ قوم کی ترقی کی بنیاد مال کی گود ہے ہمدردی جرات دلاوری استقلال قناعت فیاض سیر چشمی

اتحاد ایثار محبت اور ملک اور قوم کی عزت کے زیور سے ہر شخص اپنی ماں کی آغوش شفقت میں آ راستہ ہوتا ہے۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی خواتین کو اس زیور سے سب سے پہلے آ راستہ کریں۔ اس مدرسہ کا میری والدہ محترمہ فردوس آشیاں کے اسم گرامی سے منسوب ہونا اس کے لیے ایک مبارک شگون ارمیرے واسطے اس میں مزید دلچسپی کا باعث ہے۔ بلاشبہ اس بارے میں خواجہ لطیف حسن صاحب کی جو اس ہمتی قابل تعریف ہے مگر مجھے امید ہے کہ حالی مسلم ہائی سکول کی جماعت انتظامیہ اس کو بھی جلد اپنی نگرانی میں لے کر اسے حالی مرحوم کے نام سے منسوب کر دے گی۔ تاکہ یہ دونوں مدرسے اسی بزرگ کی یاد گار بن جائیں۔ جس کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہیں مجھے یقین ہے کیکہ مسلمانوں کی ادنیٰ توجہ سے آپ کی مالی مشکلات رفع ہو جائیں گی اور آپ نے جن ضروریات کا اظہار کیا ہے وہ پوری ہو سکیں گی۔ میں حتیٰ المقدور اس میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوں مگر میں اس امر واقعی کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ مالی مشکلات سے کوئی بھی بچا ہو انہیں ہے۔ ریاستوں کو خود اپنے اندونی کاموں کے لیے روپے کی خخت ضرورت ہے اور وہاں کے باشندوں کی یہ خواہش کچھ بے جا نہیں ہے کہ سب سے پہلے خود ان کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔ اس سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم سب کی جدا جاذبہ داریاں ہیں اور صحیح طرز عمل یہی ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کا بار دوسرے پر ڈالنے کی بجائے اسے خود پورا کرنے کی کوشش کرے۔

برطانوی ہند میں ریاستوں کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں جنکی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے صحیح حالات سے بے خبر ہیں اور ان میں وہ ارتباط باہمی نہیں ہے جو اس کمی کا کماحتہ تدارک کر سکے ہمارے اس دعوے سے غالباً کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ مشرقی تمہذیب و تمدن کے نمونے اب بھی پیشتر ریاستوں میں دیکھے جاسکتے ہیں جہاں وہ ابھی تک ایک حد تک تمہذیب مغرب کی بے جادست برد سے بچے ہوئے ہیں۔ بہر حال ہم اپنے مقدور بھر ہر اہم ملکی تحریک میں شرکت کرنے کے لیے تیار نہیں اریہی امید ہم آپ صاحبان سے بھی رکھتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو آپ بھی اسی طرح ہماری معاونت کریں گے۔

میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ اپنی ان اہم ذمہ داریوں کی جانب حکومت ہند کو بھی توجہ دلائیں کیونکہ مجھے قوی امید ہے کہ وہ ان میں آپ کی دشمنی کرگی اور آپ کی مسامی جیلہ انشاء اللہ ضرور مشکور ہوں گی۔

صاحبان..... زمانہ جلد جلد بدل رہا ہے اصلاحات کا نیاد ور شروع ہونے والا ہے۔ ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کے حقوق دیے جا رہے ہیں ہم سب کو اس کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ میں اس وقت سیاست کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ بلکہ آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ اگر ہم نے وقت کی قدر نہ کی اور اس کے میلان کو پیش نظر نہ رکھا تو ہم ترقی کی شاہراہ پر نہ صرف خود پیچھے رہ جائیں گے بلکہ

اپنے ساتھ ملک کی رفتار کو بھی دھیما کر دیں گے جس کے لیے آئندہ
سلیں ہم کو ذمہ دار بھرا کیں گے۔ اس لیے میں اپنی اس تقریر کو اسی
دعا پر ختم کرتا ہوں جو اقبال نے بڑی خوبصورتی اور جامعیت کے
ساتھ مانگی ہے۔

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو گرما دے جو قلب کو تڑپا دے ۱
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشه فردا دے
اسی روز شام کو میونپل کمیٹی کے جواب میں نواب صاحب نے
یہ تقریر فرمائی ۲۔

تقریر ہنزہ ہائی نس اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال

بجواب

ایڈر لیس من جانب میونپل کمیٹی پانی پت ب موقع حالی سینیٹیزی پانی

پت

مورخہ ۱۴۳۵ کتوبر ۱۹۶۲ء

صاحبان..... آپ نے جس خلوص اور محبت سے میرا خیر مقدم
کیا ہے اور اس پر میں آپ سب صاحبان کا تہ دل سے شکر گزار
ہوں۔ یوں توجب سے تاریخ میں پانی پت کی تین فیصلہ کن اڑائیوں

کا ذکر پڑھا تھا۔ تب ہی سے میں اس قدیم شہر کی تاریخی اہمیت دل پر نقش تھی۔ لیکن آج جن الفاظ میں آپ نے گزشتہ عظمت کو یاد دلا یا ہے ان سے چشمِ تصویر میں بہت سی باتوں کا نقشہ پھر گیا۔

۱۔ تھج مصروع یوں ہے جو قلب کو گرمادے جو روح کو تریا دے

۲۔ یہ تقریبھی نایاب تھی۔ چونکہ جشن پانی پت سے اس کا تعلق ہے اس میں شامل کتاب کی گئی۔

اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ بھی وہ سرزین ہے جہاں بار بار ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا اور صرف ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کا نقشہ بدلا لیکن صاحبان۔ اب ان کی بھولی بسری باتوں کو یاد کرنا بیکار ہے زمانہ ایسے بہت سے رنگ بدل چکا ہے اور آئندہ بھی بدلتا رہے گا۔ ہمارا تعلق سب سے زیادہ حال سے ہے اور آپ نے درست کہا کہ اس وقت ظاہری امن و امان کے باوجود بھی ہر شخص کا رگراہ ہستی میں مصروف پیکار ہے۔ اور تنازعِ لبقانے ہرگز کو پانی پت کا میدان بنارکھا ہے۔ علم و جہل کی جنگ جاری ہے۔ اور روشنی اور تاریکی میں لڑائی ہو رہی ہے۔ مجھے یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ صاحبان علم کی اشاعت اور روشنی کے اضافے میں حتیٰ المقدور پوری کوشش کر رہے ہیں اور میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ امر بلاشبہ قبل مسرت ہے کہ آپ نے اس چھوٹے سے شہر میں بر قی روشنی کا انتظام کر دیا جس سے شہر کی ظاہری رونق اور خوش نمائی میں اضافہ ہونے کے علاوہ یہاں کے باشندوں کو بھی بہت

آرام ہو گیا ہو گا۔ پانی کے صاف کرنے کی تجویز میں بھی نہایت مناسب اور مفید ہے کیونکہ بسا اوقات اہل شہر کی صحبت کا مدارز یادہ تر اسی پر ہوتا ہے اور پانی کی خرابی بہت سی بیماریوں کا باعث ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ اصلاحیں ایسی ہیں جو میوسپاٹی کے اولین فرائض میں داخل ہیں اور یقیناً پانی پت کے باشندوں کو اپنی میوسپاٹی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

انظر میڈیٹ کا لج قائم کرنے کا خیال بھی آپ کی عالی ہمتی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ یہاں مفید ثابت ہو لیکن اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ پانی پت کے قرب و جوار میں ایسے کئی شہر ہیں جہاں بہترین کالج موجود ہیں۔ اوری ہاں کے طلبہ میڈرک کے بعد آسانی سے وہاں جاسکتے ہیں میرے نزدیک کالجوں کی تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ کو قابل ترین استاذوں کی صحبت میں رہنے کا زیادہ موقع ملتا ہے مختلف حصے ہائے ملک سے آئے ہوئے دیگر طلبہ کے ساتھ ان کی نشست و برخاست ہوتی ہے۔ ابناۓ وطن کے متفرق طبقات سے ان کا میل جوں ہوتا ہے اور یوں باہمی تبادلہ خیالات سے ان کی نظر میں وسعت اور دماغ میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ محض ایک انظر میڈیٹ کا لج بنادینے سے یہ باتیں ایک چھوٹے سے شہر میں حاصل نہیں ہو سکتیں اور یوں طلبہ ان فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک انظر میڈیٹ کا لج میں اعلیٰ ترین قابلیت کے استاد فراہم نہیں ہو سکتے نہ طلبہ کے جسمانی اور دماغی قوی

کی تربیت اس پیانے پر ہو سکتی ہے جو ایک اول درجے کے بڑے مرکزی کالج میں ممکن ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کی پوری احتیاط اور توجہ سے غور کر لینا چاہیے۔ ذاتی طور پر تو میں ایک زنانہ ہائی سکول کو لڑکوں انٹرمیڈیٹ کالج پر مقدم رکھنے کا مشورہ دوں گا۔ کیونکہ لڑکیاں بالعموم تعلیم کے لیے باہر نہیں بھیجی جاتیں اور ان کی ساری تعلیم و تربیت ان کے مقامی مدرسے کے حدود میں محدود ہوتی ہیں۔ بہر حال یہ ایک سرسری رائے ہے کیونکہ قطعی اور مختتم فیصلہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کے متعلق تمام جزوی اور تفصیلی حالات پیش نظر ہوں۔ جو ہر مقام کے لیے مخصوص اور مختلف ہو سکتے ہیں اور جن سے پوری واقفیت مقامی اصحاب ہی کو ہوتی ہے۔

یہ سن کر مجھے دلی مسرت ہوئی کہ آپ کے ہاں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات ہمیشہ نہایت خوش گوارہ ہے ہیں اور گز شستہ چند سالوں میں بعض اوقات جو بے لطفی پیدا ہوئی ہے اس کا سبب درحقیقت یرومنی اثرات تھے۔ میرے خیال میں کوئی عقل مند اور سمجھ دار آدمی ایسا نہیں ہوگا۔ جو اپنے پشت ہاپشت کے ہم وطنوں سے لڑنا جھگڑنا پسند کرتا ہوں۔ اور حقیقت میں یہ ہمارے ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ یہاں محض خود غرض اور ناعاقبت اندر لیش لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو طرح طرح کے حیلوں سے اس فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میری آپ سے اور تمام ابناء ملک سے مخلصانہ استدعا ہے کہ آپ نہایت حزم و احتیاط سے

اپنا دامن اس آلو دگی سے بچائے رکھیں اور کبھی بھول کر بھی کوئی ایسی
بات نہ کریں جس سے شفاقت اور خوش گوار تعلقات ہی ٹھیک لگے آپ
کے شہر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر مجھے کامل یقین ہے کہ وہ کبھی
اپنی اس اکثریت سے کوئی بے جانہ ہو گایا مناسب فائدہ نہ اٹھائیں
گے مگر مجھے کامل یقین ہے کہ وہ کبھی کبھی اس اکثریت سے کوئی بے جا
یانا مناسب فائدہ نہ اٹھائیں گے اور سچی اسلامی ہمدردی کو منظر رکھ
کر ہر معاملے میں پوری پوری رواداری اور ایثار سے کام لیں گے اور
اقلیب کے فائدے کے لیے اپنے فائدے کی کسی بات ک وچھوڑ
دیں تبھی ان کا کوئی نقصان نہ ہو گا اور یقیناً تعلقات کی عمدگی اس
کی تلافی کر دے گی کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایسے ایثار کا اثر نہ ہو اور کوئی
شریف قوم اس احسان کو فراموش کر دے۔ میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ
اگر ہر بات میں پورے عدل و انصاف سے کام لیا جائے تو کسی کو
کیونکر کوئی شکایت یا غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور کسی پیر و فی در انداز کو
کس طرح فتنہ پر دازی کا موقع مل سکتا ہے۔ غلط فہمیاں تب ہی پیدا
ہوتی ہیں کہ جب دل صاف نہ ہوں اور سینوں میں کدورتیں بھری
ہوں ہم اگر دامن و امان کے ساتھ اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں تو
ہم کو خوب یاد رکھنا ہو گا کہ ہمارا فائدہ باہمی مصالحت اور اتحاد ہی میں
ہے اختلاف اور انتشار میں نہیں ہے۔ اس کے متعلق میں اپنے
خیالات کا اظہار مختصرًا بھی اپنی سابقہ تقریر میں کر چکا ہوں۔ اس لیے
اب اس بارے میں مجھے اور کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت معلوم نہیں

ہوتی۔

صاحبان.....اس سلسلے میں صرف اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ ایک شہری کے لیے فقط یہی کافی نہیں ہے کہ وہ اپنا اور اپنے گھروں کا پہبیٹ پال لے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے تاکہ وہ ابناۓ وطن کو بھی کچھ فائدہ پہنچا سکے میونسپلٹی کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔ وہی محصول جو آپ صاحبان اسے ادا کرتے ہیں اور رفاه عام کے تمام کام وہ کسی طرح پورے کر لیتی ہے۔ اسی روپے سے جو وہ آپ سے وصول کرتی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہی میونسپلٹی زیادہ مفید خدمات انجام دے سکتی ہے جہاں کے باشندے زیادہ دولت مند ہوں اور اس امداد بائیمی میں زیادہ حصہ لسکیں۔ اپنی ذات کے لیے روپیہ کمانے اور فائدہ اٹھانے کی کوشش توہر شخص خود ہی کرت اے۔ مگر دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ایسی کوششیں میری رائے میں ایک عبادت بن جاتی ہیں اور اسی لحاظ سے میں اسے ایک شہری کا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہوں۔

صاحبان.....اس ضمن میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں بسا اوقات ہماری میونسپلٹیوں میں ذاتی اختلافات کی وجہ سے طرح طرح کی بدنظمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ مورد طعن و اعتراض ہوتی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم جب عوام کی کوئی خدمت قبول کریں تو اس کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سوچ لیں اور ہر قسم کی ذاتی غرض سے بالاتر ہو کر اسے انجام دیں۔ اختلاف رائے میں

یقیناً ہرج نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ نفسانیت سے پاک ہو اور اس کی تھہ میں کوئی اور مقصد پہنچ نہ ہو کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو رائے کے اختلاف کو دلی کدورت کا سبب بنادیتی ہے۔ اور جس سے ہر طرح کا فتنہ و فساد پیدا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ صاحبان اپنے تمام کاموں میں اس بات کو منظر رکھیں گے اور خلوص اور صداقت کا وہ نمونہ پیش کریں گے جو اوروں کے لیے قابل تقیید ہو گا اور جس میں اکثریت اور اقلیت کے پیچیدہ مسائل کا اصلاح اور عملی حل ہو گا۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر آپ صاحبان کے سپاس نامہ کا دلی شکر یہ ادا کرتا ہوں۔“

ان خطبات سے جہاں نواب بھوپال کے تدبیر نگار بلند نظری مسائل حاضرہ پر ان کے ترقی پسندانہ خیالات اور مسلمانوں کے حالات کی بہتری کے لیے ان کے قیمتی مشوروں اور عملی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہیں علم و ادب سے ان کے گھرے شغف حالی سے دلی عقیدت اقبال ایسے فلسفی شاعر سے محبت اور تعلق خاطر کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اور جسے ہم بلا خوف تردید تارت خ ادب کے ایک زریں و یادگار باب سے تعییر کر سکتے ہیں۔

جشن حالی کے پہلے اجلاس میں ابوالاثر مولانا حفیظ جalandھری نے جو نظم پڑھی تھی۔ اسے میں نے کافی تلاش کیا لیکن دستیاب نہ ہو سکی۔ جمیل نقوی نے اتنا ضرور بتایا کہ یہ یادگار نظم غالباً حالی مسلم ہائی سکول۔ پانی پت کے رسالے حیات نو میں شائع ہوئی تھی۔ افسوس کہ یہ رسالہ بھی نہ مل سکا۔ حفیظ جalandھری کے تمام مجموعے دیکھڈا لے لیکن یہ نظم ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں رہی تھی۔ نہ حفیظ صاحب کے پاس اس کی نقل ہی محفوظ تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ یہ کتاب تیاری کی منزلوں سے گزر رہی تھی کہ آل پاکستان

ایبیوپیشسل کانفرنس کا جریدہ العلم جولائی تا ستمبر ۱۹۷۲ء مجھے موصول ہوا۔ دوران مطالعہ حسین احمد خاں جمشید پانی پتی کا ایک مضمون مولانا حالی اور ساتھ ہی حفیظ جالندھری کی ان دو نظموں کا تذکرہ بھی تھا جو انہوں نے حالی مسلم ہائی سکول پانی پت میں ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء اور ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو بعنوانات یاد حالی اور خواجہ حالی پانی پتی علی الترتیب پڑھی تھیں۔ یاد حالی رہاس مسعود کی صدارت میں منعقدہ ایک جلسے میں اور خواجہ حالی پانی پتی جشن حالی کے موقع پر نواب بھوپال کی صدارت میں پڑھی گئی تھی۔ جمشید پانی پتی نے اپنے مضمون کے آخر میں ان نایاب نظموں کو شان نزول کی دلچسپ تفصیلات کے ساتھ شامل کر دیا ہے چنانچہ ان گم شدہ اوراق کی اچانک دستیابی کو میں نے غبی مدد جانا اور یہ ضروری سمجھا کہ باب کے آخر میں انہیں شامل کر کے محفوظ کر لوں۔ کیونکہ یہ دونوں نظمیں حالی پانی پت نواب حمید اللہ خاں اقبال اور راس مسعود کی شخصیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ دوسری نظم خواجہ حالی پانی پتی تو حالی کے جشن صدر سالہ میں پڑھی گئی تھی جس میں اقبال بھی موجود تھے۔

حسین احمد خاں جمشید پانی پتی نے ان تاریخی اور یادگار نظموں کا جو پس منظر بیان کیا ہے وہ انہیں کی زبانی سینے:

”..... پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے تھیوسوفیکل ہال کراچی
میں طلبہ کے ایک جلسے میں حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کے
چند شے پارے اور اپنی مشہور نظم ابھی تو میں جوان ہوں پڑھ کر
حاضرین کو محظوظ فرمایا ارو جب جلسے کے باہر تشریف لائے تو میں یہ
دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حضرت حفیظ تو بالکل بوڑھے ہو گئے ہیں ہجوم
عاشقان میں میں بھی شامل تھا اور میں آڑا ترچھا ہو کر ان کی کارتک
پنچ ہی گیا مصالحہ کیا اور عرض کیا کہ آج میں تینتیس بیس سال کے

بعد آپ کو دیکھ رہا ہوں حفیظ صاحب نے پوچھا کہ کہاں دیکھا تھا۔ عرض کیا 1932ء اور 1935ء میں پانی پت میں جب کہ آپ نے حالی مسلم ہائی سکول میں دو مشہور نظمیں پڑھی تھیں۔ یہ سن کر حفیظ صاحب ذرا بے چین ہو گئے اور فرمانے لگے۔ ارے بھئی اگر وہ دونوں نظمیں کسی کے پاس محفوظ ہوں تو جمیل الدین عالی صاحب کے ذریعہ میرے پاس بھیج دیں۔ تقسیم ہند کے وقت وہ افراتفری میں جالندھری میں رہ گئیں شاید وہ اسی زمانے میں حالی سکول امیگریشن میں یا ممکن ہے پاکستان کے کسی رسالے بھی شائع ہوئی ہوں۔ لیکن میرے وہ ناپید ہیں۔ میں نے وعدہ کر لیا لیکن گھر آ کر تلاش کیا تو غزلوں اور نظموں کی میری پرانی کاپی عارضی طور پر اللہ کو پیاری ہو چکی تھی اور مجھے وعدہ فراموش ثابت کرنے کے لیے روپوش تھی۔

1971ء کے آغاز میں وہ کاپی مل گئی۔ لیکن میں یہ نظمیں حضرت حفیظ کی خدمت میں نہ بھیج سکا۔ کیوں نہ پیش کر سکا اور ایک عظیم المرتبہ شاعر اور فردوسی اسلام کے حکم کی تعمیل میں اس قدر تسامیں کیوں ہوا؟ جس شاعر کی ان دونوں نظموں کے علاوہ میں اس کے پورے کلام کا عاشق ہوں۔ شاہنامہ اسلام کی چاروں جلدیوں کو سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔ ہر سال ماہ ربیع الاول میں جن شاہناموں کی تاریخی نظموں سے پورے ہندوستان کی فضا میں گونختی رہیں۔ آج اتنا بھی نہ کرسکا۔ کہ اس کی امانت ان کے سپرد کردوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ پوری انسانی خصوصیات ہی دھندا چکی ہیں اور بغیر کسی لائق اور خود

غرضی کے تعمیل حکم اور اداگی فرض میں بھی تو آنا کافی ہوتی ہے۔ یقیناً
اس بدجھتی کے بوجھ تک میں دبا ہوں ہوں۔

سید مصطفیٰ علی صاحب بریلوی نے حالی مسلم ہائی سکول۔ پانی
پت سرید حاملی اور خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم اور حفیظ جالندھری
کہ یہ واقعات سن کر ادیانہ انداز سے پہلو بد لے اور اس را گیر کو
محبت بھری نظر وہ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس گفتگو
سے بڑے متاثر ہوئے ہیں۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ پانی پت حاملی
مسلم ہائی سکول۔ پانی پت مولانا حاملی کے صاحبزادے سجاد حسین
صاحب کی خدمات اور آج سے چالیس سال پہلے کے حالات پر اگر
ایک مضمون لکھ دیں اور وہ دونوں نظمیں بھی منسلک کر دیں تو یہ ایک
یادگار مضمون ہو گا اور وہ قابل قدر تاریخی نظمیں اعلم میں محفوظ
ہو جائیں.....

یہ دونوں نظمیں پیش کرنے سے پہلے مختصر طور پر ان کی وجہ نزول
بھی پیش کر دوں مولانا حاملی کے صاحبزادے اور حاملی مسلم ہائی سکول
پانی پت کے سیکرٹری خواجہ سجاد حسین صاحب سر راس مسعود وائے
چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جسٹس محمود کے صاحبزادے اور سر سید کے
پوتے۔ کو اپنے سکول میں مدعو بر ماتے ہیں گویا حاملی کے ہاتھ سر سید
اڑا ہے ہیں۔ بہادر سید چمن زار حاملی کی طرف بڑھ رہی ہے علی گڑھ
سے کالی کالی بد لیاں اٹھی ہیں اور گلستان پانی پت پر بر سے والی
ہیں۔ علی گڑھ سے پرو فیسر لیکچرر اور لٹریکیٹ ٹرینوں میں بھر بھر کر آ

رہے ہیں۔ سر راس مسعود کو سکول کی مسجد کا افتتاح فرمانے کے لیے
زحمت دی گئی تھی۔ سر راس مسعود تشریف لائے شاہزادہ استقبال ہوا
ایک بجھے ہوئے دربار کی کرسی صدارت پر مسعود تشریف فرمادی۔
کرنال اور کنج پورہ س نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے خاندان
کے نواب یونپی اور پنجاب کے روسا اور جا گیر دار عالیٰ حکام عوام اور
روئے شہر حالی مسلم ہائی سکول کے اور مسلم یونیورسٹی سے آئے
ہوئے طلبہ اپنی ترکی ٹوپیوں سیاہ شیر و آنبوں اور علی گڑھ کٹ سفید
پاجاموں سے ایک عجیب شان یکتاں پیدا کر رہے تھے مہمانوں کے
استقبال کے لیے چست و چالاک لڑکے تعینات تھے اور ہدایت یہ تھی
کہ مسلمانوں کو درجہ بندی کے لحاظ سے مناسب جگہوں پر پہنچا دیا
جائے۔

حالی مسلم ہائی سکول کی طرف سے مہمان ذی شان کی خدمت
میں سپاس نامے پیش کیے جا رہے تھے۔ شاہید شیخ محمد اسماعیل پانی پتیا
کے بعد خواجہ غلام الحسین صاحب پانی پتی فارسی میں آخری سپاس نامہ
پیش فرمادی تھے۔ کہ اسکول کے گیٹ پر ایک تانگہ رکا اور اس میں
سے بظاہر ایک سید ہے سادھے صاحب برآمد ہوئے۔ شیر و آنی ترکی
ٹوپی، پاجامہ قد آور چھپریا بدن بریف کیس بغل میں وہ تیزی سے
گیٹ کی طرف بڑھے اور دو ایک لڑکے اور دو ایک لڑکے این کی
متوسط شخصیت کی مناسبت سے کسی مناسب نشست پر پہنچانے کے
لیے ان کے پیچھے لپکے لیکن کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان سے یہ

عرض کیا جائے کہ حضور اتنی سادگی لیے آگے ہی کیوں بڑھتے جا رہے ہیں؟

۱۔ افسوس کے ۲۷۱۹ء کے دوران شیخ محمد سمعیل اپنی سی کا بھی انتقال ہو گیا۔

گولباس سادہ تھا لیکن ان کے چہرے پر ایک سمجھیدہ رعب چال میں ایک خاص فاتحانہ تیکھا پین اور انداز ذرا نکیلے واقع ہوئے تھے۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے ایسے بھاگ رہے تھے جیسے گھونسلے کے انڈوں بچوں کو چھوٹے والے شخص کے چاروں طرف چڑیاں چوں چوں کرتی ہیں۔ لیکن رہتی ذرا دور ہی ہیں سر راس مسعود انہیں دیکتے ہی کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے۔ حفیظ بھائی آگئے مہمان خصوصی کے اس احترام میں سب شریک ہو گئے اور ایک کھلبلی سی مج گئی اور یہ حضرات راس مسعود صاحب کے برابر براجماں ہو گئے سر راس مسعود نے اہل پانی پت کے سپاس ناموں کے بعد مختصر انداز میں شکریہ ادا کیا اور فرمانے لگے کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کس شہر کی سر زمین میں قدم رکھ رہا ہوں..... دربار حالی میں کیا عرض کر سکوں گا اسی لے کہ میں نے حفیظ بھائی کو جاندہیر تارے دیا تھا۔ اروک دیا تھا کہ بھائی حالی سکول اور پانی پت کو میری جانب سے خراج عقیدت آپ پیش کریں گے۔ لہذا میں حضرت حفیظ جاندہری سے درخواست کرتا ہوں وہی کچھ فرمائیں۔ جوان حفیظ جن کی ہلکی سی شخصی ڈاڑھی بھی نظر آئی۔ کھڑے ہوئے اور ہمارے سامنے فردوسی اسلام الحاج حفیظ جاندہری جن کے شاہنامہ اسلام کے متعلق اخبارات میں دھوم تھی۔

میدان جنگ اور حالی کی چہار دیواری میں حالی اور سر سید کی خدمت میں خراج عقیدت پیش رہے ہیں۔ حفیظ شاہ نامہ اسلام پڑھنے کے خاص لہجہ میں نغمہ سرائی فرماتے ہیں۔ میں دوڑا بورڈنگ ہاؤس سے کاپی لایا اور یہ جواب بریز سے محفوظ کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ایک قیامت سی پاپا تھی شورج رہا تھا۔ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ کسی نظم نے ایک تڑپ پیدا کی تھی اور لوگوں کو سرد ہٹنے دیکھا تھا۔ آئیے آپ بھی اس دربار حالی میں شرکت فرمائیں۔

یادِ حالی

نظام حضرت حفیظ جالندھری نے مسلم ہائی سکول پانی پت کے ایک خاص جلسے میں زیر صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء کو پیش فرمائی۔

(۱)

نشانِ زندگی پاتا ہوں پانی پت کی راہوں میں
یہ منزل منزل مقصود ہے میری نگاہوں میں
یہاں نقشِ قدم موجود ہیں ان کاروانوں کے
زمیں پر جن کے آگے سر جھکے تھے آسمانوں کے
یہاں لہرا چکے ہیں پرچمِ اسلامی نشانوں کے
یہاں ٹکرا چکے ہیں جوشِ مغلوں اور پٹھانوں کے
اذانوں کی صدائیں بس چکی ہیں ان فضاوں میں

فضائیں محو ہیں اب انہی دل کش صداؤں میں
فلک نے اس زمیں پر شعلہ ہائے جنگ دیکھے ہیں
زمیں نے اس فک پر انقلابی رنگ دیکھے ہیں
یہیں امدا تھا دریا مرہٹوں کی تند نوجوں کا
تلاطم تھا یہیں اس جوش انسانی کی موجودوں کا
بشر کی ہمت عالی کا منظر اس نے دیکھا ہے
کہ احمد شاہ ابدالی کا لشکر اس نے دیکھا ہے
اسی وادی میں گونجی تھیں وہ باطل سوز تکبیریں
اسی میدان میں چمکی تھیں وہ شمشیروں پر شمشیریں
یہیں چپ ہو گئے تھے وہ سماعت پاش بے کارے
یہیں سے کھا کے بھوگے تھے شکست فاش پنڈارے
ہم کثرت کے آگے شان قلت اس نے دیکھی ہے
جہاں حق ہو وہاں باط کی ذلت اس نے دیکھی ہے
یہاں آتے ہی مردان مجاهد یاد آتے ہیں
جو تلواریں اٹھاتے تھے وہ زاہد یاد آتے ہیں
اسی باعظ ملا اس سرزین کو رتبہ عالی
کہ اس بستی کی خاک پاک سے پیدا ہوا حالی
وہ حالی جس نے ابدالی سے بڑھ کر معركہ مارا
تلعم سے مسخر کیا ہندوستان سارا
وہ شاعر جس نے اصناف سخن میں جان لے پیدا کی

بنائے خود ہی پیکر اور خود ہی جان پیدا کی
وہ بُلِل جس نے گھاٹے سخن کو زندگی بخشی
خزاں کے دور دورے میں چمن کو زندگی بخشی
وہ حالی جو علم بردار تھا دین پیغمبر کا
وہ حالی جو سپہ سالار تھا سید کے لشکر کا
وہ حالی جس نے دل کو درد سے آگاہ فرمایا
کیا مردوں کو زندہ قم باذن اللہ فرمایا
جگا کر خاکیوں کو گنبد افلاک کے نیچے¹
وہ حالی سو گیا اپنے وطن کی خاک کے نیچے
وہ حالی ہاں وہی سرسید مرحوم کا بازو
وہ امر کی سپر وہ ملت مظلوم کا بازو

۱۔ یہاں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے غالباً شان ہوگا

دولوں کو تیر حب قوم سے برمایا جس نے
مسلمانوں کے خون سرد کو گرمایا دیا جس نے
وطن میں جس نے اسلامی اخوت کی بنیاد ڈالی
پڑا ہے آج اپنے ہی وطن میں بے وطن حالی
نہ بھول اے شاہ اقلیم سخن کے مولد و مدن
اسی تربت سے ہے اب روپہ رضوان ترا گلشن
نہ بابر تیرے دامن میں نہ اکبر ہے نہ ابدالی
تری بزم کہن کی زیب و زینت ہے فقط حالی

تری شہرت کا باعث یہ چراغ زیر دامن ہے
اسی کی یاد تیرے شرف کی شمع سے روشن ہے
بقائے نام ہے تیری بقاۓ نام حالی سے
خون کی سر خوشی قائم ہے اب تک جام حالی سے
نبرد زیست میں محفوظ رکھ پاس دیانت کو
امانت کی طرح محفوظ رکھ اپنی امانت کو
دوامی زندگی بخشے گا تجھ کو نام حالی کا
سنا سارے زمانے کو سنا پیغام حالی کا
دعا یہ ہے کہ جب ترک شوکت اسلام باقی ہے
خدا کا اور محمد مصطفیٰ کا نام باقی ہے
مسجد سے اذانوں کی صدا اٹھتی رہے جب تک
مدینے کی طرف بانگ درا اٹھتی رہے جب تک
جهان دل نہ ہو جب تک سپاس و شکر سے عاری
الہی چشمہ الاطاف حالی بھی رہے جاری
اس نظم سے متعلق ابوالاثر حفیظ جالندھری اور سید راس مسعود کے دو اہم خط نظر ثانی کے
دورانِ دستیاب ہوئے ہیں جن کی تلاش کا سہرا جلیل قدوالی کے سر ہے۔

حفیظ جالندھری کے خط مورخ ۲۹ فروری ۱۹۳۲ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ نظم
راس مسعود کے ایما پر ارسال کی تھی جس کے جواب میں راس مسعود نے لکھا کہ وہ اس کی
طبعات کا خاص اہتمام کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے مخلص دوستِ نظم کے بعض
اشعار پر نظر ثانی کا بھی مشورہ دیا جس سے نہ صرف ان کی تنقیدی بصیرتِ ادبی دیانت اور

صاف گوئی کا بے آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے بلکہ قریبی ربط و تعلق کا بھی۔
 راس مسعود کے خط پر تاریخ کا اندرانج نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حلیل قدوائی سے
 دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ راس مسعود کے اکثر خطوط پر تاریخ کا اندازہ رہ گیا ہے یہ خط
 بھی انہیں میں شامل ہے البتہ متعلقہ خط سے تاریخ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔
 یہ دونوں خط دوسرے ایڈیشن میں قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں:

”دفتر شاہنامہ اسلام“

ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

۲۹ فروری ۱۹۳۲ء

میرے محسن و محترم حضرت سید صاحب اسلام علیکم
 پانی پت والی نظم ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ تا حال رسید نہیں
 ملی۔ پانی پت کی وہ صحبت اور سفر دہلی کا وہ وقت جب میں آپ کے
 حضور تھا میری زندگی کے لیے بہترین لمحوں پر مشتمل تھا۔ دعا ہے کہ
 پور دگار عالم ایسے محسن، ایسے خلیق اور ایسے قدر شناس کو دین و دنیا ہر
 جگہ فائز المرام کرے:

تم سلامت رہو قیامت تک
 اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو
 جو ناب کے رفیق ڈاکٹر صاحب کی محبت کا بھی ایسا نقش دل پر
 ہے کہ ان کی صورت آنکھوں میں بُسی ہے۔ خدا ان کو شاد آبادر کرے۔
 نظم کے متعلق جلد مطلع فرمائیے کہ بلاک کب بنیں گے اور کس
 ڈیزائن میں چھپے گی۔

ہاں یہ درخواست میرے بھتے کی ہے جس کے متعلق میں نے
ذکر کیا تھا حساب انگریزی اور سائنس میں ماہر ہے مگر میں نے آپ
سے سینڈ ڈویژن میں پاس ہوا کہ وہ تھرڈ ڈویژن میں پاس
ہوا تھا۔ اگرچہ نمبر سینڈ سے تھوڑے ہی کم ہیں۔ بہر حال اگر یہ لیا جا
سکے تو حالی اسکول کے لیے جس تنجواہ پر بھی آپ پسند کریں حاضر ہو
جائے گا۔ میں پانچ سال اس کی پڑھائی کا بوجھ اٹھا چکا ہوں اب
مشکل ہے:

ہیں عمل اپھے مگر دروازہ جنت ہے بند
ہو چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں
خاکسار نیاز مند
حفیظ ۲۔

جواب سید راس مسعود

”پیارے حفیظ۔ تمہاری نظم پر لیں میں ہے۔ اس کی طباعت کا
خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دیکھ کر بہت خوش ہو گے۔
چونکہ تم نے یہ نظم بہت عجلت میں لکھا یاں لیے بعض اشعار پر نظر ثانی کی
 ضرورت ہے۔ میرے خیال میں وہ اشعار حسب ذیل ہیں:
 یہ دھرتی سہہ چکی ہے بوجھ مرہٹوں کی فوجوں کا
 مرہٹوں کیٹ پر تشدید
 تلاطم تھا یہیں اس جوش انسانی کی موجودوں کا

۱۔ حالی کی صد سالہ برسی منعقدہ حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کے موقع پر کہی گئی اور پڑھی گئی۔ (جلیل قدوامی)۔

۲۔ ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی۔ مارچ ۱۹۷۶ء صفحہ ۲۲

وہ حالی بیجو علم بردار تھا محراب و منبر کا
وہ حالی جو سپہ سالار تھا سید کے لشکر کا
محراب و منبر کی علم برداری قابل غور ہے
دولوں کو تیر حبِ قوم سے برمًا دیا جس نے
مسلمانوں کے خون سرد کو گرمًا دیا جس نے
تیر سے برمانا کیا اس موقع پر مناسب ہے؟
کاپیاں تیار ہیں کاغذِ مطبع میں جا چکا ہے۔ صرف اس خط کے
جواب کا انتظار ہے امید ہے کہ جواب جلد چھیجو گے۔
تمہارا سچا خیر خواہ،“

افسوں کے راسِ مسعود کے اس خط کا جواب ان کے مسودات میں سے نہ مل سکا البتہ
مندرجہ بالائین اشعار میں سے پہلے داشعار کے پہلے مصرعِ حفیظ نے تبدیل کیے ہیں جیسا
کہ مشمولہ نظم سے ثابت ہے۔

یہ دھرتی سہہ چکی ہے بوجھِ مرہٹوں کی فوجوں کا
تبدیل شدہ مصرع:

یہیں امدا تھا دریا مرہٹوں کی تند فوجوں کا
وہ حالی جو علم بردار تھا محراب و منبر کا

تبديل شده مصرع

وہ حالی جو علم بردار تھا دین پیغمبر کا
تیرے شعر کا پہلا مصرع جوں کا توں رہا
دلوں کو تیر حب سے برمدا دیا تو نے

خواجہ حالی پانی پتی

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کی صد سالہ جوبلی پر جو کہ
۱۹۳۵ء کو حالی مسلم ہائی سکول میں پانی پت میں زیر
صدرت ہر ہائی نس نواب حمید اللہ خاں فرمائیں روانے بھوپال منانی
گئی۔ خود حضرت حفیظ نے اپنے خاص ترجم میں پڑھ کر سنائی۔

مسلمانوں کی شوکت بھی مرے اللہ کیا شے تھی!
فلک بھی اس کے درپے تھا زمین بھی اس کے درپے تھی
کتاب زندگی کے سو ورق الٹا رہا ہوں میں
گزشتہ صدی کی داستان سہرا رہا ہوں میں
زوال سلطنت کا آہ وہ اندوہ گیں منظر
الم انگیز حسرت خیز عبرت آفرین منظر

۱۔ ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی مارچ ۱۹۷۶ء صفحہ ۲۲-۲۳

نبیں تھا بزم دہلی میں وہ ذوق شعلہ آشامی
کہ خمیازہ کشوں میں چل رہا تھا دور ناکامی
صدائے عندلیب افردہ پژمردہ گل و لالہ

خزان آلود تھا رنگ بہار ہفت صد سالہ
نشاط زندگی سے روح خالی مے سے خم خالی
نہ فکر بے پروبالی نہ ذکر ہمت عالی
حریفان طرب آمادہ اظہار خصوصت پر
ہوا کی یورش اک آخری شمع حکومت پر
ظفرے نام سے اک آفتاب بام باقی تھا
شراب مشک بو تو اڑ چکی تھی جام باقی تھا
شفق کے گیسوؤں نے اس رخ روشن کو گھیرا تھا
دھوئیں میں آخری شعلہ یہی تھا پھر اندریا تھا
زمین ہند پر یہ مسلم کا انجام تھا گویا
فروغ روز روشن پر یہ وقت شام تھا گویا
یہ شام غم اندری رات کا پیغام لائی تھی
فضاؤں پر اداسی اور تاریکی سی چھائی تھی
جود و بے حسی کو ساتھ لے کر انقلاب آیا
ہماری قسمت بیدار کو پیغام خواب آیا
سہارا بال و پر کا جب نہ زیر آسمان پایا
قفس میں طائر بے بال و پرنے آشیاں پایا
حوادث نے کیا مغلوں کا پرچم سرگوں آخر
ہوا یہ مہر عالم تاب غرق موج خون آخر
ہوا شیرازہ ملت پریشاں اس ہزیت سے

کہ مسلم بے خبر تھے اپنی اصلی قدر و قیمت سے
یہ تاج و تخت میں اسلام کو محدود سمجھتے تھے
غبار رہ گزر کو منزل مقصود سمجھتے تھے
زوال جاہ و ملک و مال کو سمجھے زوال اپنا
یہ خود بھی ایک دولت ہیں نہیں آیا خیال اتنا
ججازی قافلہ ہندوستان میں راہ بھولا تھا
ہوائے سرد کے جھونکے تھے اور غفلت کا جھولا تھا
وہ جس کا ہر قدم تھا پیش خیمه خوش نصیبی کا
اسے اب مرحلہ درپیش تھا شام غربی کا
کلام مصطفیٰ بھولا پیام مصطفیٰ بھولا
رموز بے خودی بھولا خودی بھولا خدا بھولا
جرس کی ہر صدا اب رائگاں معلوم ہوتی تھی
تبہی کارروائی درکارروائی معلوم ہوتی تھی۔
پرagned جماعت فرد اس پر خود فراموشی
مسلم ایک سنٹا مسلسل ایک خاموشی
پڑے تھے راہ گزار سیل میں سب نیند کے ماتے
بس اتنی دیر تھی طوفان آتا اور بہہ جاتے
سنا ہے میں نے یہ قصہ بزرگوں کی زبانوں سے
کہ اس ظلمات میں اک چاند اتراء آسمانوں سے
شرافت لے کر آیا تھا یہ آغوش اصالت سے

کیا تھا اس نے کسب نور خورشید رسالت سے
نظر والے اسے اک درد مند انسان کہتے تھے
زبان والے فقط سر سید احمد خاں کہتے تھے
یہ آیا ہند میں علم و عمل کی روشنی لے کر
مسلمان کے لیے اس کی پرانی زندگی لے کر
اسے زعم کرامت تھا نہ چھ اعجاز کے دعوے
محمدؐ کی غلامی پر تھے فخر و ناز کے دعوے
مسیحائی نہیں مردے جلانا کام تھا اس کا
عروج زندگی پر لے جانے کام تھا اس کا
نہ گھاتیں پیش گوئی کی نہ چھچھ الہام کی باتیں
وہ کرنی جانتا تھا خدمت اسلام کی باتیں
مقابل میں جہالت تھی کٹھن تھار استہ اس کا
ضرورت تھی کہ ساتھی ہو کوئی مرد خدا اس کا
بروئے کار آئی جستجوئے کامیاب اس کی
ملی حالی کی صورت میں اسے تعبیر خواب اس کی
ادھر درد آڑنا سید ادھر گرم نوا حالی
زبان و دل نے گویا ربط باہم کی بنا ڈالی
عجب انداز سے شاعر نے تار ساز کو چھیڑا
جگا یا روح خوابیدہ کو خلیل اللہ اب ناز کو چھیڑا
عجب نغمہ تھا خون سرد کو گرمادیا جس نے

عجب ناک تھا ہر پھر کا دل برمایا جس نے
جگایا کاروان کفتہ کو آواز حالی نے
کیا پھر گرم رو مسلم کو اس شعلہ مالی نے
خن کی اک نئی دنیائے عالی شان پیدا کی
بنائے خود ہی پیکر اور خود ہی جان پیدا کی
قیامت بن گئی قلب جس میں اس کی گویائی
ہوا پیدا سروں میں پھر جون جادہ پیائی
جگا کر خاکیوں کو گنبد افلاک کے نیچے^۱
وہ حالی سو گیا اپنے وطن کی خاک کے نیچے^۲
بجا ہے ناز حالی کے وطن کو اس کی تربت پر
کہ ہے ہفت آسمان کو رشک اس مٹی کی رفتہ پر
عیاں ہو سید شاہ خن کا رتبہ عالی
کہ آیا اس کے شوق دید میں بھوپال کا والی
مبارک اے حمید اللہ خاں تیر ایہاں آنا
ترے آنے سے زندہ ہو گیا پھر ایک افسانا
نہیں ہے آج قدر گو ہر دل کج کلاہوں میں
یہ جوہر اب نظر آتا ہے تیری ہی نگاہوں میں
دعا یہ ہے کہ جب تک شوکت اسلام باقی ہے
خدا کا اور محمد مصطفیٰ کا نام باقی ہے
مسجد سے اذانوں کی صدا اٹھتی ہے جب تک

مدینے کی طرف بانگ درا اٹھتی رہے جب تک
زبان و دل نہ ہو جب تک سپاس و شکر سے عاری
اللہی چشمہ الاطاف حالی بھی رہے جاری ہے

۳۲۳۶ تا ۳۷ صفحہ ۱۹۷۲ء تا ستمبر ۱۹۷۴ء جولائی گواہی کراچی "العلم"



اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر سید عبدالباسط کے نام

بھوپال کے قیام اور نقرس کے علاج کے سلسلے میں اقبال کے خصوصی معانج کی حیثیت سے ڈاکٹر سید عبدالباسط کا نام سرفہرست ہے گزشتہ صفحات میں جا بجا اقبال نے ڈاکٹر عبدالباسط کا تذکرہ کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباسط سے اقبال کی قربت وابستگی اور خصوصی ربط و تعلق کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ آپ نہ صرف بھوپال کے بلکہ ہندوستان کے نامی گرامی ڈاکٹروں میں شمار ہوتے تھے۔ اور بچلی کے علاج کے سلسلے میں آپ کا تجربہ و قابلیت آپ کی فرمائی اروفی حیثیت بے مثال تھا۔ پھر آپ صاحب علم بھی تھے اور شعرو ادب کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ اور اقبال کے مذاہوں قدردانوں اور نیازمندوں میں شامل تھے۔ تیرے یہ کہ کوششیں چیزیں میں جہاں اقبال نے دوبار قیام کیا اسی کے مقام قدیمہ محل تھا جہاں ڈاکٹر عبدالباسط بھی رہائش پذیر رکھتے تھے۔ اس لیے مریض و معانج کے ہمہ وقت قرب نے ایک دوسرے سے گہری وابستگی پیدا کر دی تھی۔ جاوید جو پہلی بار بھوپال گئے تھے اپنا پیشتر وقت ڈاکٹر سید عبدالباسط کے صاحبزادے سید عبدالحی اور دیگر عزیزوں کے بچوں کے ساتھ کھلیل کو دیکھ لیتے تھے۔ اکثر ڈاکٹر صاحب شیش محل میں رات کا کھانا اقبال کے ساتھ کھاتے تھے۔ اور ان کی محفلوں میں ذوق شوق سے حصہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کر اقبال ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور جیسا کہ عبدالحی صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالباسط اور علامہ اقبال سے دلی تعلق کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ وہ راس مسعود

کے عزیزوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے دادا سید عبدالغفر و صاحب کی شادی سر سید کی ہمیشہ بیگم صفیہ کی صاحبزادی ڈاکٹر بیگم سے ہوئی تھی۔ اس نسبت سے راس مسعود ہمیشہ ڈاکٹر عبدالباسط کو اپنی قریبی عزیز بتاتے تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالباسط دہلی کے رہنے والے تھے۔ ابتداءً ہرہ دون کی ایکسرے انسٹیٹیوٹ میں بطور ریڈیالوجسٹ ملازم ہوئے ہندوستان میں پہلی بار دہرہ دون میں ایکسرے انسٹیٹیوٹ قائم ہوا تھا جہاں ڈاکٹروں کو ایکسرے اور بھلی سے علاج کی تربیت دی جاتی تھی۔ آپ کا شمار ماہرین فن میں ہوتا تھا۔ اور سارے ہندوستان میں آپ کی شہرت تھی۔

۱۹۲۶ء میں آپ دہرہ دون سے ریٹائر ہو کر دہلی آگئے اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔ وہیں آپ کی ملاقات ڈاکٹر انصاری سے ہوئی جو اپنی گوناگوں سیاسی سماجی اور علمی خدمات کی بنا پر ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ آپ نواب حمید اللہ خاں کے ذاتی معانج تھے اور ان کے قریبی دوست بھی۔ ڈاکٹر سید عبدالباسط سے انہوں نے کہا کہ نواب حمید اللہ خاں بھوپال میں ایکسرے ڈیپارٹمنٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ لہذا آپ وہاں چلے گئیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباسط ریاست بھوپال کی چندر خوبیوں سے واقف تھے۔ بھوپال جانے پر فوراً آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں ہی آپ بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں بطور ریڈیالوجسٹ آپ کا تقرر ہو گیا۔ اور آپ نے پرنس آف ولیز ہسپتال میں جو بعد میں حمید یہ ہسپتال کہلایا ایکسرے ڈیپارٹمنٹ قائم کر کے بھلی کے علاج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے بھوپال کے کئی ڈاکٹروں کو اس شعبہ میں علاج کی تربیت بھی دی۔

۱۹۳۵ء میں اقبال جب پہلی بار علاج کے سلسلے میں بھوپال تشریف لائے تو دیگر معذین کے علاوہ خصوصی معانج کا شرف ڈاکٹر سید عبدالباسط کو حاصل ہوا۔ اور جبھی سے

اقبال اور ڈاکٹر صاحب کے روابط میں قرب و استحکام پیدا ہو گیا۔

ڈاکٹر سید عبدالباسط کے صاحبزادے عبدالجی صاحب کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب والد صاحب سے بڑی محبت اور شفقت فرماتے تھے۔ والد صاحب بھی نہایت توجہ سے ان کا علاج کر رہے تھے۔ اور بچلی کے علاج سے انہیں کافی فائدہ ہوا تھا۔ پہلے اور دوسرے قیام کے بعد علامہ اقبال لاہور میں تشریف لے گئے تو وہاں سے بھی خطوط بھیجنے رہے اور والد صاحب سے مشورے لیتے رہے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ والد صاحب جلد انہیں بھوپال آنے کے لیے لکھتے تھے تاکہ علاج کا کورس مکمل ہو سکے اور علامہ کو گلے کی تکلیف رفع ہو سکے۔ لیکن اس کا جلد جلد آن ممکن نہ ہوا۔ البتہ اس عرصہ میں انہیں کسی نے ویانا جانے کا مشورہ دیا تو انہوں نے پھر والد صاحب سے مشورہ طلب کیا کہ علامہ کے خطوط والد صاحب کے نام آئے تھے جن میں سے صرف پانچ خطوط اور ضرب کلیم کا وہ نسخہ جسے علامہ اقبال نے اپنے دستخط کے ساتھ بھیجا تھا محفوظ رہ گیا۔

اقبال کے پانچ غیر مطبوعہ خطوط جیسا کہ مطالعہ سے ظاہر ہو گا کہ اگرچہ تمام یماری کی تفصیلات ویانا کے سلسلے میں مشورے ایکسرے رپورٹ وغیرہ سے متعلق ہیں لیکن ان میں بھی اقبال کا منفرد لب و لہجہ اور طرز تحریر کی سادگی و پرکاری ملتی ہے اور یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ڈاکٹر باسط سے انہیں کتنا قلبی ربط و تعلق تھا۔

پہلا خط ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء کا ہے جس کا عکس پیش خدمت ہے۔ اسی تاریخ کو انہوں نے راس مسعود کو بھی خط لکھا تھا جو گزشتہ صفحات میں شامل ہے۔ اس خط میں انہوں نے ویانا جانے کے سلسلے میں راس مسعود سے مشورہ طلب کیا تھا ڈاکٹر عبدالباسط کے نام خط بھیجنے کا تذکرہ بھی۔

۱۔ یہ پانچ غیر مطبوعہ خطوط اور ضرب کلیم کا دستخطی نسخہ کا عکس پیش کیا جا رہا ہے۔ رقم

الحروف کی خصوصی درخواست پر سید عبدالجی نے اقبال اکیڈمی میں محفوظ کرایے ہیں۔
(۱۲) حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی صحت پہلے سے گرچہ بہتر تھی اور گلے کی تکلیف سے مکمل بھی تک نہیں ملی تھی۔ چنانچہ جب ان کے ایک دوست نے یورپ سے لوٹ کر انہیں ویانا جانے کا مشورہ دیا تو سب سے پہلے انہوں نے اپنے عزیز ترین دوست راس مسعود سے مشورہ حاصل کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنے خصوصی معالج ڈاکٹر سید عبدالباسط کو بھی تفصیلات سے مطلع کیا۔

اقبال کا خط ملتے ہی ڈاکٹر سید عبدالباسط نے فوراً جواب لکھا۔ اسی دوران اقبال نے ڈاکٹر انصاری کا مشورہ بھی حاصل کیا اور راس مسعود اور ڈاکٹر انصاری سے مشورے کے بعد پھر ایک تفصیلی خط ڈاکٹر سید عبدالباسط کو تحریر کیا۔ جس میں ویانا جانے کے پروگرام کو آخری شکل دینے سے پہلے ڈاکٹر مصطفیٰ علی ہر کو ضروری تفصیلات سمجھنے کی درخواست کی۔ اقبال کا سینہ کا فوٹو ایکسرے مرض کی تفصیلات، معائنه کا مکمل ریکارڈ وغیرہ بھوپال میں موجود تھا۔ ڈاکٹر خان بہادر ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر سید عبدالباسط نے علیحدہ علیحدہ اقبال کا معائنه کیا تھا اور مرض و علاج کی تشخیص کے بارے میں ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر سید عبدالباسط میں قدرے اختلاف تھا جس کا ذکر ہمیں ذیل کے خط سے ملتا ہے۔

اقبال کی خواہش تھی کہ فوٹوک یا ساتھ ڈاکٹروں کی روپرٹ اور اختلاف کے سلسلے میں ایک نوٹ تیار کر کے ڈاکٹر مظفر کو ویانا سمجھ دیا جائے تاکہ وہاں کے ماہرین پر غور کر کے کوئی فیصلہ کر لیں تب ویانا جانے کا پروگرام بنایا جائے۔

اس خط کی عبارت سے جو حاشیے تک میں تحریر کی گئی ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے اور احتیاط پسندی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ چند روز چند

ملکی ملی اور خانگی ذمہ داریاں دامن گیر تھیں اس لیے اتنا دور دراز کا سفر اختیار کرنے سے پہلے ویانا کے ماہرین کی آخری رائے حاصل کرنا نہایت ضروری تھا۔

۱۔ خان بہادر ڈاکٹر احمد بخش اور ڈاکٹر رحمٰن بھی اقبال کے معجین میں شامل تھے اور ان کی خصوصی قرآنی میں ڈاکٹر سید عبدالباسط بھلی کا علاج کر رہے تھے۔

۲ ”سے“ سہواؤ رہ گیا۔

۳ آپ ڈاکٹر انصاری کے بھانجے تھے اور ان دونوں ویانا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

تھے۔

۱ ”کے“ سہواؤ رہ گیا۔

۲ سید عبدالحُمَّی سے مراد ہے۔

سید عبدالحُمَّی بیان کرتے ہیں کہ اس خط کے ملنے پر والد صاحب ڈاکٹر سید عبدالباسط نے اقبال کے سینے کا فوٹو (ایکسرے) ڈاکٹروں کی روپورٹ کے مطابق اپنا اختلافی اور وضاحتی نوٹ ڈاکٹر مظفر علی کو ویانا بھیج دیا اور حسبہ اقبال کو بھی مطلع کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً چار ماہ تک خاموشی رہی۔ جہاں تک ویانا جانے کا سوال تھا خود والد صاحب نے بھی اقبال کو مشورہ دیا تھا کیونکہ یورپ سائنسی اور فنی ترقی میں اوج کمال پر تھا وہاں نئی دریافتوں کے ساتھ ساتھ علاج و معالجہ کی جدید ترین سہولتیں بھی میسر تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ ویانا میں سینے اور گلے کی تکلیف کا خصوصی علاج کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مظفر علی جن کا خط میں تذکرہ ہے۔ آنکھ ناک اور گلے کی تکالیف کی جدید تحقیقات سے استفادہ کے لیے ہی ویانا گئے تھے۔ اقبال براہ راست ڈاکٹر مظفر علی سے واقف نہیں تھے۔ وہ ڈاکٹر انصاری کے بھانجے تھے چنانچہ ان

کی ہی رہبری وہدایت پر اقبال نے ان سے خط و کتابت اور والد صاحب کو بھی ان کے پڑے سے آگاہ کیا اور تفصیلی رپورٹ انہیں ارسال کرنے کی خواہش کی۔

نومبر کے دوران صرف دونوں خط ”مکتبات اقبال“ میں ملتے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق بھوپال سے ہے۔ اس خط کے اقتباس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ پانی پت کے سفر میں اقبال کو خاصی تکلیف ہوئی۔ جسے انہوں نے راس مسعود اور نواب حمید اللہ خاں کی خاطر برداشت کیا۔ سید نذرینیازی کے نام اس خط میں دیگر امور کے علاوہ پانی پت کے سفر کی صعوبت اور تیسری بار بھوپال جانے کا عزم کا اظہار کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:

”..... مگر یقین جانیے کہ مجھے پانی پت کے سفر میں تکلیف ہوئی

اب جو قوت سفر باقی ہے اسے بھوپال کے سفر کے لیے محفوظ رکھتا ہوں“۔

اب اقبال بھوپال کے تیسرا سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ تاکہ علاج کا تیسرا کورس بھی مکمل ہو سکتا۔ ڈاکٹر سید عبدالباسط اور راس مسعود سے ان کی خط و کتابت جاری تھی۔ یہ دونوں حضرات انہیں جلد بھوپال آنے کے لیے لکھے چکے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے اس قلمی خط میں جو ڈاکٹر سید عبدالباسط کے نام ہے ان پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ مکتبات اقبال۔ صفحہ ۳۰۲

اقبال کو راس مسعود کا ایک خط اور تار ملا جس میں ان کی خیریت دریافت کی گئی تھی۔ ساتھ ہی سب بھوپال کی تشویش کا بھی ڈکر تھا جس کا تعلق اقبال کی عالت سے تھا اقبال جشن حالی کے دوران بھی علیل تھے۔ اور پانی پت سے لا ہو رکھنے کے بعد بھی علیل رہے۔ نواب صاحب کو اس عالت کا کسی طور علم ہو گیا تھا چنانچہ اس خط میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

”لا ہو ر..... ۱۹۳۵ء“

ڈیم سعوڈ تمہارا خطاب بھی ملا۔ کل شام کے قریب تاریخی ملا۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے میں اعلیٰ حضرت کاشمگریہ ادا کرنے سے قادر ہوں۔ معلوم ہوتا ہے ان کو میری آسائش کا بہت خیال ہے۔ خدائے تعالیٰ اجر عظیم ان کو عطا فرمائے۔

ہر ہائی نس آغا خاں کو بھی خط لکھ دوں گا۔ اطمینان فرمائیے۔ اس سے پہلے آپ خط آپ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں۔ امید ہے پہنچ گیا ہو گا۔ اور کتابوں کا پارسل بھی مل گیا ہو گا۔ ان دور سے شید صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ ان کو بھی جواب لکھ دیا ہے۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں عرض ہے کہ میں نے حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں ان کی علاالت کا تذکرہ کر دیا تھا وہ نومبر میں تمہارے ساتھ دبلي آئیں تو ضرور ان کو بخش دکھائیں۔

لاہور میں گرمی کی بے انتہا شدت ہے۔ بارش کا نام و نشان نہیں ہے۔ سرحد پر جنگ با قاعدہ شروع ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد شہید گنج کا اثر وہاں بھی جا پہنچا ہے۔ اور راولپنڈی میں کیا تمام پنجاب میں مسجد کی بازیابی کے لیے جوش و خروش بڑھ رہا ہے۔ خدائے تعالیٰ مسلمانوں پر اپنا فضل کرے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ جاوید آپ کی اور لیڈی مسعود کی خدمت میں آداب لکھواتا ہے علی بخش بھی سلام عرض کرتا ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال..... لاہور ۱۹۴۷ء

اس خط میں نواب حمید اللہ خاں کے بارے میں ان کا یہ لکھنا کہ:

”..... میں اعلیٰ حضرت کا شکر یہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

معلوم ہوتا ہے ان کو میری آسائش کا بہت خیال ہے۔ خدا یے تعالیٰ

اجر عظیم ان کو عطا فرمائے“

۱۔ یہ خط دسمبر کا ہے۔ ظاہر ہے نومبریات و سہو کتابت ہے یا اقبال غلطی سے لکھ گئے ہیں۔

۲۔ اقبال نامہ۔ (جلد اول) صفحہ ۳۷۲-۳۷۳

چچ پوچھیے تو اس گہری وابستگی دلی قرب اور خصوصی تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو نواب صاحب کو اقبال سے اور اقبال کو نواب صاحب سے تھا۔ ورنہ غور کرنے کی بات ہے کہ ایک والی ریاست کو اقبال ایسے مرد قلندر کی علالت و بیماری کے سلسلے میں پریشان ہونے اور فکر مند ہونے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب نہ صرف اقبال سے گہری محبت کرتے تھے بلکہ اس امر کے خواہش مند بھی تھے کہ وہ جلد رو بصحت ہو جائیں تاکہ ملک و قوم ان سے بیش از بیش استفادہ کر سکے۔ وہ اکے وجود کو ملت کی فلاح و تعمیر کے لیے مقدم سمجھتے تھے اور ایک سچے اور مخلص نیاز مند کی حیثیت سے ان کی صحبت و عافیت کے خواہاں تھے۔ چنانچہ راس مسعود کے خط اور تارکا سلسلہ بھی اسی کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے اور اقبال کا جذبہ سپاس گزاری بھی اسی تعلق کی خاطر ایک بنیاد جس سے دونوں کے باہمی اور مخلصانہ روابط کی نشان دہی ہوتی ہے۔

اس خط میں ہر ہائی نس آغا خاں کا ذکر بھی ہے لیڈی مسعود کی علالت کا بھی..... رشید صاحب لیڈی مسعود کے والد جوان درمیں تھے کے خط کا تذکرہ بھی ہے اور مسجد شہید گنج کے سلسلے میں سرحد پر جنگ کا حال بھی پنجاب میں اس واقعہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر بھی یہ خط کچھ روشنی ڈالتا ہے۔

”راولپنڈی میں کیا تمام پنجاب میں مسجد کی بازیابی کے لیے
جو شاخوں بڑھ رہا ہے۔“

ان جستہ جستہ واقعات میں خصوصیت کے ساتھ آغا خاں کو خط لکھنے کا تذکرہ دراصل اس وظیفہ سے تعلق رکھتا ہے جو نواب صاحب بھوپال کے وظیفہ کے بعد اس مسعودی سعی و کوشش سے سر آغا خاں نے اقبال کو دنیا منظر و کر لیا تھا۔ اقبال کی فقرو مسٹی سادہ روی قناعت پسندی احسان شناسی اور دوست نوازی کے سلسلے میں ان کا یہ خط جو ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے کتنے ہی گوشے بے نقاب کرتا ہے اور ہمارے دل میں اقبال کی عظمت و چند ہو جاتی ہے۔ اس خط میں جس صاف دلی بے باکی اور اعلیٰ طرفی کا اظہار کیا گیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور مل سکے گی۔ لکھتے ہیں:

”لا ہور..... ۱۹۳۵ء ستمبر“

ڈیم مسعود۔ کل خط لکھ چکا ہوں۔ آج اس تمام معاملے پر کامل غور و فکر کرنے کے بعد پھر لکھتا ہوں۔ آپ اس خط کو کافی نیشنل تصور فرمائیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے آپ سے بھوپال میں آپ کے بیڈروم میں گفتگو کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرا خیال معلوم کر لینے کے بعد آپ نے شاید اس تجویز کو ڈر اپ کر دیا ہوگا۔ اس کے بعد جس مسٹری کا آپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ بہر حال آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہوتا میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے ضرورت

سے زیادہ کی ہوں کرنا روپیہ کا لائق ہے جو کسی طریقی مسلمان کے شایان شان نہیں۔ آکو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تجھ نہ ہوگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوه ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے ان حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس رقم کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے اور میں بے حد تذبذب کی حالت میں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی ہر ہائی نس آغا خاں سے کیا خط و کتابت ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میری اس تحریر کو ناشکری پر معمول نہ کیا جائے۔ بہر حال میں نے ہر ہائی نس آغا خاں کو شکریہ کا خط لکھ دیا ہے۔ گواں میں مندرجہ بالا خیالات کا اظہار نہیں کیا گیا اور اخلاقاً مجھے ایسا کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی چاہیے تھی۔ آپ جب اس معاملے پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے بہت پہلو ہیں اور میں نے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر آپ کو یہ خط لکھا ہے۔ آپ مہربانی کر کے مجھ کو جلد اس امر سے اطلاع دیں کہ آیا آپ کو میرے ان خیالات سے اتفاق ہے یا نہیں۔ اگر اتفاق نہیں ہے تو اس تجویز کا ڈرپ کرنا قرین مصلحت نہیں ہے تو پھر میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں کہ وہ ہر ہائی نس آغا خاں یہ پیش جاوید کو عطا کر دیں۔ اس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو جائے یا جس وقت تک ہر ہائی نس مناسب تصور کریں بعض پرائیویٹ وجوہات کی بنابر جن کا کچھ نہ کچھ حال آپ کو بھی معلوم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی تعلیم کی طرف سے بغلی

اطمینان ہو جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہر ہائی نس آغا خاں میری اس تجویز کی نسبت کیا خیال کریں گے۔ میں نے اپنی مشکلات کا حال آپ کو لکھ دیا ہے۔ اب آپ جو تجویز چاہیں کریں اور مجھ کو اپنے خیالات سے مطلع کریں جہاں تک جلد ممکن ہے۔ آخری فصلے تک اس بات کا پریس میں جانا مناسب نہیں ہے۔ امید ہے مزاج بغیر ہو گا۔

والسلام

محمد اقبال..... لا ہورا،

اس خط کے یہ جملے غور طلب ہیں:

”.....اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مختص فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوں کرنا روپیہ کا لائق ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہو گا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوه ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ راس مسعود کو اقبال کی مالی دشواریوں ان کی گرفتی ہوئی صحت اور چند در چند پریشانیوں کا ذاتی طور پر علم تھا۔ نواب صاحب بھوپال کے وظائف کے اجر کے بعد انہوں نے ذاتی طور پر بھی نواب صاحب بھوپال کے ویلے سے آغا خاں سے مراسلت کی

اور یہ کوشش کی کہ وہ بھی اقبال کا پانچ سورو پے وظیفہ مقرر کر دیں تاکہ وہ آسانش واطمینان سے زندگی بس رکھ سکیں اور بچوں کی تعلیٰ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ حیدر عباسی صاحبؒ کا بیان ہے کہ سر راس مسعود کی تجویز جب انہیں موصول ہوئی تو انہوں نے نواب بھوپال کے ایما سے اسے خصوصی سفارش کے ساتھ آغا خاں کو بھیج دیا جس کی جلد ہی منظوری آگئی۔ لیکن اقبال ان واقعات سے قطعی لاعلم اور بے خبر تھے۔ انہیں تو راس مسعود کے خط ہی سے سر آغا خاں کے وظیفہ کی منظوری کا علم ہوا اور جب انہیں علم ہوا تو وہ عجب الحصن میں پڑ گئے۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۳۷ تا ۶۲

۲۔ سابق مشیر المہماں صیخ سیاہ سیریاست بھوپال جو کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

جیسا کہ مندرجہ بالا خط کی عبارت سے ظاہر ہے کہ اس الحصن سے قطع نظر ان کے جذبہ احسان مندی کا بھی اندازہ لگائیے کہ وہ اپنے عزیز ترین دوست کو کس بے باکی سے یہ لکھتے ہیں کہ جو رقم نواب صاحب بھوپال نے مقرر کر دی ہے وہ ان کے لیے کافی ہے اور کافی نہ بھی ہو تو تب بھی وہ امیرانہ زندگی کے عادی نہیں۔ یہ ہے وہ طرز فکر اصول زندگی اور انسانیت کی اعلیٰ قدر جو مفکر مشرق کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی تھی اور جسے اپنا کر انہوں نے ایک سچے مسلمان کی ان تمام خصوصیات کو اجاگر کیا جس سے رسول کریمؐ کی ساری زندگی عبارت ہے۔

راس مسعود کی خواہش پر انہوں نے سر آغا خاں کو شکر یہ کا خط تو لکھوادیا لیکن وہ خود ان کی پیش کش قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ مندرجہ بالا خط میں انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ پیش کی رقم جاوید کو عطا کر دی جائے تاکہ اس کی تعلیم مکمل ہو سکے۔ چنانچہ راس مسعود نے اقبال کے جذبات و خیالات کو نہ صرف سراہا بلکہ دلی اعتراض بھی کیا کہ اور پھر یہ کوشش بھی کی کہ سر آغا خاں کی پیش کی دونوں بچوں جاوید اور منیرہ کے نام منتقل ہو جائے اور

ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں صرف کی جائے تاکہ دونوں بچوں کی تعلیم میں کسی قسم کی پریشانی پیدا نہ ہو۔ لیکن افسوس کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ابھی ان کی مساعی جمیلہ کا سلسلہ جاری تھا کہ راس مسعود کا بلا و آگیا اور وہ معبد حقیقی سے جاملے اور ان خوابوں کا شیرازہ ہی بکھر گیا جو وہ سوتے جا گئے اپنے پیارے دوست اقبال کی سودو بہبود کے لیے دیکھتے تھے۔

ان واقعات کی تصدیق فقیر سید وحید الدین مصنف روزگار فقیر کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو شان استغنا کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں نواب حمید اللہ خاں اور سر آغا خاں کے وظائف کے سلسلے میں راس مسعود کی پر خلوص سعی وجہد کا علم ہوتا ہے وہیں اقبال اور راس مسعود کے قریبی روابط پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راس مسعود اقبال سے کتنی گہری اور شدید محبت کرتے تھے اور ان کی آساںش و آسودگی کے لیے وہ کسی خلوص اور لگن سے آخری سانس تک جدوجہد کرتے رہے۔

”.....ڈاکٹر صاحب کے یوں تو بہت سے احباب تھے مگر راس

مسعود کی محبت اور لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہر وقت سوچتے رہتے۔ فکر اس بات کی کہ ڈاکٹر صاحب کی علالت طویل سے طویل تر ہوتی چلی جا رہی ہے ان کے مالی حالات بھی اچھے نہیں ہیں آخر کار ڈاکٹر صاحب کے حالات پر بہت کچھ غور کرنے کے بعد نواب سر حمید اللہ خاں فرمائیں کہ اور بڑے عزت و وفات کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے معاٹے کو پیش کیا۔ سر راس مسعود خود اپنی جگہ ممتاز شخصیت رکھتے تھے۔ پھر جو شخصیت موضوع فکر و گفتگو تھی وہ سب کے نزدیک محترم اور قبل عزت و تکریم تھی۔ چنانچہ انہوں نے

نواب صاحب بھوپال اور سر آغا خاں کو پانچ پانچ روپے ماہوار کے وظائف کے لیے آمادہ کر لیا۔ جب یہ معاملہ طے پا گیا تو سر راس مسعود نے جو اس وقت بھوپال کے وزیر تعلیم بھی تھے ڈاکٹر صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے انتخاب کی کہ میں نے آپ کے ایماء کے بغیر یہ کوشش کی ہے آپ اس پیش کش کو قبول فرمائیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی قانونی پریلیٹس عرصہ سے موقوف تھی۔ بیماری کے تسلسل نے ان کے مالی حالات کو برباد طرح متاثر کیا تھا۔ ان کی ضروریات وسیع بھی تھیں اور ناگزیر بھی۔ ایسے اعالم میں ایک ہزار روپے ماہوار کی آمدنی سبیل کتنی بڑی چیز تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب قلندر صفت اور درویش مزاج واقع ہوئے تھے۔ وہ بڑے عالی ظرف اور طبیعت کے مستغتی تھے انہوں نے سر راس مسعود کا یہ مشورہ تو قبول کر لیا اور ان کی بات مان لی مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میری مدد جو ده ضروریات کے لحاظ سے پانچ سور و پیہ ماہوار میرے لیے کافی ہیں۔ اس سے زیادہ خرچ کی مجھے عادت نہیں اس لیے نواب صاحب بھوپال کے وظیفہ پر اکتفا کی جائے اور سر آغا خاں سے وظیفہ نہ لیا جائے۔

سر راس مسعود نے ڈاکٹر اقبال کے اس جواب میں اور ان کی قناعت پسند روشن کو بہت سراہا لیکن ساتھ ہی اس امر کے لیے کوشش ہوئے کہ سر آغا خاں والے وظیفہ کی رقم ماہ بہ ماہ کسی بینک میں جمع ہوتی

رہے اور ڈاکٹر صاحب کے دونوں بچوں جاوید اور منیرہ کی تعلیم و تربیت میں دشواری پیش آنے پر ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں اسے صرف کیا جائے۔ یہ اقدام بڑی دوراندیشی پر منی تھا لیکن قدرت کا فیصلہ کون بدل سکتا تھا۔ چنانچہ اس سے قبل کہ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ٹرسٹ قائم کیا جاتا یا سر آغا خاں وظیفہ کی ادائیگی شروع کرتے سر اس مسعود ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ہی رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے اور یہ بساط ہی الٹ گئی۔

سر آغا خاں کے وظیفہ کے سلسلے میں سر اس مسعود کو خط لکھنے کے فوراً بعد انہیں دیانا سے ڈاکٹر مظفر علی کا خط بھی موصول ہو گیا اور جب اس خط سے انہیں یہ علم ہوا کہ ان کے کاغذات ابھی تک دیانا نہیں پہنچے ہیں تو انہوں نے دوسرے ہی روز ۱۹۳۵ء کو پھر ڈاکٹر سید عبدالباسط کو تفصیلی خط لکھا اور کاغذات کے بارے میں معلومات فرمائی اور پھر درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر حسن اروڈاکٹر خان بہادر سے کہہ کر ہستیری شیٹ دوبارہ تیار کر دیں تاکہ جنوری ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں وہ بھوپال آنے کے بعد اسے نئے فوٹو کے ساتھ دیا جیج دیں۔

۱۔ یہ حادثہ جانکاہ اگرچہ اقبال کے تیسرا قیام بھوپال کے بعد رونما ہوا لیکن چونکہ اس کا تعلق اقبال کے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط سے تھا اس لیے تاریخی اور واقعی تسلسل قائم رکھنے کے لیے اسے ان صفحات میں شامل کیا گیا۔

۲۔ روزگار فقیر۔ صفحہ ۱۶۳ تا ۱۶۴

کاغذات اور فوٹو کا دینا نہ پہنچنا تجھ بخیز تھا حالانکہ راس مسعود بھی انہیں کاغذات بھیجنے کے بارے میں لکھ چکے تھے۔ اور ڈاکٹر عبدالباسط بھی۔ بہر طوراً بتو اقبال کے بھوپال پہنچنے کے بعد ہی ان کی دوبارہ تسلیم ممکن تھی۔ وہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں بھوپال جانے کا ارادہ

رکھتے تھے لیکن اسی عرصہ میں مجلس احرار اور جماعت احمدیہ کے مذہبی اور سیاسی جھگڑے نے نازک صورت اختیار کر لی جس سے پنجاب کی فضائی مکدر ہو گئی اقبال نے ختم نبوت پر جو بیان دیا تھا وہ ہر اعتبار سے مکمل اور جامع تھا لیکن پنڈت نزو نے اس بیان پر دیدہ و دانستہ ایک ایسا بیان دیا تھا جس سے نہ صرف اقبال کے نظریات پر ضرب پڑتی تھی بلکہ جو اسلامی تعلیمات سے نہ اتفاقیت کو بھی ظاہر کرتا تھا۔ چنانچہ اقبال نے اس کی وضاحت کو ضروری سمجھا اور جوابی بیان لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران ایک ایرانی لنسٹ سیدزادے جن کا نام معلوم نہیں ہوا سکا انہوں نے علاج شروع کر دیا جس سے انہیں خاصا فائدہ ہوا۔ چنانچہ بھوپال جانے کا پروگرام انہوں نے فی الوقت ملتوقی کر دیا جیسا کہ نذرینیازی کے نام ۳ جنوری ۱۹۳۶ء کے اس خط سے ظاہر ہے:

”ڈرینیازی صاحب“

میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ ایک ایرانی الصل سید زادے کی دو انبیاء کیا عجب کہ آواز پھر عود کر آئے اس کا دعویٰ تو یہی ہے۔ اسی واسطے میں نے چند روز کے لیے بھوپال جانے کا ارادہ ملتوقی کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ سردی بھی بہت ہے۔ غالباً جنوری کے آخر میں جاؤں گا۔ مضمونِ ختم ہو گیا ہے پمفت کی صورت میں شائع ہو گا۔ غالباً تین چالیس صفحے ہوں گے۔ آپ ٹائپ ہو گا۔ ٹائپ ہونے کے بعد میں پھر نظر ثانی کر کے پر لیں میں دوں گا۔

والسلام

محمد اقبال ۳ جنوری ۱۹۳۶ء۔ ۲“

اقبال اس تمام عرصہ میں اپنے مضمون پر نظر ثانی کرتے رہے اور ایرانی انسل سید زادے کا علاج بھی جاری رہا۔ چند در چند مصروفیتوں کے سبب ابھی تک وہ بھوپال جانے کے پروگرام کو آخری شکل نہیں دے سکتے تھے۔ جیسا کہ ذیل کے خط سے بھی ظاہر ہے۔

”ڈینیازی صاحب!

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے آپ کو ایک پوسٹ کارڈ بخوباب آپ کے ایک پہلے خط کے لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کارڈ آپ تک نہیں پہنچا۔

بہر حال خدا کا شکر ہے کہ صحت اچھی ہے۔ آواز کا بھی علاج ہو رہا ہے مضمون کا آخری پروف میں نے آج بھیجا ہے۔ امید ہے کہ آج شام یا کل شام تک چھپ جائے گا انشاء اللہ میں آپ کو کل پرسوں تک اس کی کاپی ارسال کر سکوں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

میں جنوری کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتہ میں بھوپال جانے کا قصد رکھتا ہوں۔

والسلام

محمد اقبال۔ لاہور۔ ۱۹۳۶ء۔ ا جنوری

راجہ صاحب سے سلام کہہ دیجیے گا، ۲۔

انگریزی مضمون حسب توقع شائع ہو گیا اور نیازی صاحب نے اس کا اردو ترجمہ شروع کر دیا۔ اسی سلسلے میں ایک اصطلاح زیر بحث آگئی اور نیازی صاحب نے اس سے دریافت کیا کہ جس کے جواب میں انہوں نے وضاحت فرمادی اور بھوپال جانے کے

پروگرام سے بھی انہیں مطلع کر دیا۔

”ڈینیازی صاحب“

آپکا خط ابھی ملا ہے اور الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں میرا
حال بھی خدا کے فضل سے بہتر ہے۔ انشاء اللہ وسط فروری میں
بھوپال جانے کا قصد ہے۔ Major Occultation
مطلوب ہے غیبت کبریٰ۔

محمد اقبال۔ ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء۔ لاہور،“

۱۔ یہ مضمون بعد میں ”اسلام اور احمدیت“ کے عنوان سے شائع ہوا۔

۲۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۱۵۔

۳۔ مراد راجہ حسن اختر جوان دنوں دہلی میں میرے ہاں مقیم تھے۔ (نیازی)

۴۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۱۶۔

لاہور کی گوناگوں مصروفیات کے ساتھ ساتھ بھوپال سے اکا قلمی تعلق بدستور قائم تھا اور
وہ وقفہ وقفہ سے اپنے عزیز دوست راس مسعود اور خصوصی معاملج ڈاکٹر سید عبدالباسط کو خط
برا برا لکھتے رہے۔ ذیل کا عکسی خط جوانہوں نے ۶ فروری ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر سید عبدالباسط کو
ارسال کیا ہے۔ راس مسعود کی علالت ان کے سفر کلکتہ اور فروری کے آخری ہفتہ میں بھوپال
آنے کے قصد پر روشنی ڈالتا ہے۔

۱۔ کلکتہ کا سفر۔ دراصل تعلیمی کانفرنس میں شرکت سے متعلق تھا جہاں راس مسعود نے
فُروری ۱۹۳۶ء کو (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر)

نزلہ کی موسیٰ شکایات کے علاوہ اقبال کی عام صحت رو بہ ترقی تھی اور وہ فروری کے
آخری ہفتہ میں بھوپال جانے اور بھلی کا مزید علاج کرانے کا پروگرام بنانے تھے جیسا کہ

مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہے۔

۱۲ اور ۱۵ فروری ۱۹۳۶ء کے خطوط میں انہوں نے نذر ی نیازی کو بھی بھوپال کے

پروگرام سے مطلع کر دیا:

”میں فروری کے آخری ہفتہ میں بھوپال کا قصدر کھتا ہوں“۔ ۱

بالآخر بھوپال جانے کا پروگرام طے ہو گیا۔ تو انہوں نے نیازی صاحب کو اطلاع دی۔

”ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم“

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے اور میں بھی
خدا کے فضل سے کسی قدر بہتر ہوں۔ ۲۸ فروری یا یکم مارچ کو بھوپال سے
کا قصدر کھتا ہوں۔ جاتی دفعہ دہلی نہ ٹھہر ہوں گا۔ انشاء اللہ بھوپال سے
واپسی پر تصل خانے میں ایک آدھ روز قیام رہے گا۔ کہ سردار
صلاح الدین اصرار کرتے ہیں۔ روانگی سے پہلے آپ کو پھر خط
لکھوں گا۔ ارادہ یہ ہے کہ تمام دن دہلی شیشناں پر ہی رہوں گا۔ وہاں
سے پانچ بجے شام کی گاڑی میں بھوپال روائے ہو جاؤں گا۔ آپ پہلے
سے اس گاڑی کا وقت معلوم کر چھوڑیں۔ و السلام
محمد اقبال..... لا ہور ۹ فروری ۱۹۳۶ء“۔ ۲

نیازی صاحب لکھتے ہیں:

”..... میں نے سردار صاحب کی خدمت میں اطلاع دی کہ

انہیں بڑی شکایت تھی کہ حضرت علامہ برادر راست ریاست بھوپال جا
رہے ہیں قفضل خانے میں قیام نہیں فرمائیں گے۔ ۲۶ کو اطلاع
موصول ہوئی۔

”لا ہور ۲۵ فروری ۱۹۳۶ء“

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

میں یہاں ۲۹ فروری کی شب فرنٹیئر میں سے ۳ چلوں گا یادوسری
ٹرین میں جو اس کے قریب ہی لا ہور سے چلتی ہے۔ بہر حال یکم
مارچ کی صبح کو دہلی پہنچ کر دن بھر وہیں قیام کروں گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سینٹ ہاؤس میں تقریر فرمائی تھی جس کی یہ عبارت آج بھی

انگریزی زدہ ذہنوں کے لیے تازیانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

”ہندوستانی طلباء اپنے ملک کی تاریخ میں ایک ایسی زبان سیکھ رہے ہیں جو ان کی زبان
ہے نہ استاد کی کیا کوئی اس سے بھی زیادہ مہم بات ہو سکتی ہے کہ جو تعلیم اس قسم کے مصنوعی
اور غلاف فطرت ماحول میں حاصل کی جائے اور وہ ہر گز قوم کے لیے ایک حیات بخش قوت
نہیں بن سکتی۔“

۱ مرقع مسعود صفحہ ۱۸

۱ اقتباس مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۲۱ و ۳۲۲

۲ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۲۵

۳ ”سے“ سہوارہ گیا۔

۴۔۵ بچے بعد دو پھر جو ٹرین دہلی سے بھوپال کی طرف جاتی
ہے۔ اس میں سوار ہو کر ۲ مارچ کو بھوپال پہنچوں گا۔ اطلاع گزارش
ہے۔

والسلام
محمد اقبال ا۔

نیازی صاحب کو بھوپال کی روانگی کے پروگرام سے مطلع کرنے کے علاوہ انہوں نے بیگم راس مسعود کو بھی اطلاع دے دی کہ وہ ۲۹ فروری کا لاہور سے روانہ ہو رہے ہیں جیسا کہ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خط میں راس مسعود کو کئی خط لکھنے اور ان کے جواب نہ دینے کا شکوہ بھی کیا گیا ہے۔ نیز ڈاکٹر عبدالباسط کو خط بھیجنے کا تذکرہ بھی ہے اور شعیب صاحب کو آمد کے پروگرام سے مطلع کرنے کا اظہار بھی۔ اس خط میں بیگم راس مسعود کی چند فرمائشوں کا ذکر بھی ملتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم راس مسعود بھی اقبال کو خط لکھتی رہتی تھی۔ افسوس کہ سمعی و تلاش کے باوجود بیگم راس مسعود اور اقبال کے خطوط دستیاب نہ ہو سکے۔ اسی خط سے مجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس باروہ ایک ماہ سے زیادہ بھوپال میں قیام کا ارادہ نہیں رکھتے تھے کیونکہ ایسٹر کی تعطیلوں میں انہیں حمیات اسلام کا لاہور میں سالانہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا جس میں ان کی شرکت اور موجودگی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ بھی بعض خاص حالات کی بنابر وہ جلد لاہور لوٹنا چاہتے تھے لیڈی مسعود کے نام اقبال کے خط کا متن یہ ہے۔

”لاہور.....۲۵ فروری ۱۹۳۶ء“

ڈیگم صاحبہ

آپ کا والا نام مل گیا ہے نان خطا کے لیے تو میں نے کئی دن سے کہہ رکھا ہے۔ انشاء اللہ ۲۷ تک امر ترس سے تیار ہو کر آجائے گی۔ قصور کی میتھی بھی امید (ہے) کل تک یا پرسوں تک مل جائے گی۔ ہمراہ لاوں گا۔ میں انشاء اللہ اعزیز ۲۹ فروری کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲ مارچ کی دوپہر آپ کی خدمت میں پہنچوں گا۔ مہربانی کر کے شعیب صاحب کو مطلع کر دیجیے گا۔ مسعود صاحب سے بھی سلام

کہیے۔ انہوں نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا آج ڈاکٹر صاحب عبدالباسط کو بھی خط لکھا دیا ہے۔ اب ایک ماہ سے زیادہ نہ ٹھہر سکوں گا۔ کیونکہ ایسٹر کی تعطیلوں میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہے اور بعض خاص حالات کی وجہ سے ان دونوں میرا یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ محمد اقبال^۲۔

چنانچہ نیازی صاحب کے علاوہ لیڈی مسعود ڈاکٹر عبدالباسط اور چند دیگر احباب اور نیازمندوں کو خطوط لکھنے کے بعد وہ حسب پروگرام کیم مارچ ۱۹۳۶ء کو دہلی پہنچے۔ دن کا کچھ حصہ شیش پر اور کچھ وقت سردار صلاح الدین کی معیت میں قونصل خانے میں گزارا اور شام کی ٹرین سے بھوپال کے لیے روانہ ہوئے۔ اور ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو تیری بار بسلسلہ علاج و قیام بھوپال پہنچے۔ ریلوے شیش پر راس مسعود، ممنون حسن خاں ڈاکٹر سید عبدالباسط اور دیگر نیازمندوں نے ان کا استقبال کیا اور انہیں سرکاری قیام گاہ شیش محل لے گئے جسے دوسری بار شاعر مشرق کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا!

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۲۵-۳۲۶

۲۔ ” ہے“ سہوارہ گیا۔

۳۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۹۰-۳۹۱



بھوپال کا تیسرا قیام

۱۹۳۶ء مارچ تا ۱۸ اپریل

شیش محل کی ویران فضا ایک بار پھر اقبال اور ان کے نیازمندوں سے آباد ہو گئی۔ بھوپال میں یہ ان کا تیسرا اور آخری قیام تھا۔ اگرچہ بعض خطوط میں انہوں نے پھر بھوپال جانے کا تذکرہ کیا ہے لیکن افسوس کہ چند وجہات کی بنابر یہ ممکن نہ ہو سکا۔

اس قیام کے دوران سب سے پہلے تو انہوں نے اپنے علاج پر توجہ مبذول کی۔ ڈاکٹر رحمن ڈاکٹر باسط وغیرہ نے ان کا تفصیلی معائنہ کیا اور بھلی کے علاج کا تیسرا کورس شروع کیا۔ اس بار ان کی عام صحت نسبتاً بہتر تھی۔

راس مسعود اور دیگر نیازمندان بھوپال کو اقبال کے اس قیام سے پھر ایک بار قرب و استفادہ کا موقع مل گیا عبدالحی کا کہنا ہے کہ صبح کا بیشتر وقت حمید یہ سپتال کی نذر ہو جاتا تھا۔ جہاں بڑی بڑی توجہ سے ان کے علاج کا تیسرا کورس شروع ہو گیا تھا۔ دو پھر میں آپ آرام و مطالعہ فرماتے۔ آپ کا دیرینہ ملازم علی بخش آپ کے اس سفر میں بھی ہمراہ تھا۔ اس کے علاوہ سرکاری طور پر بھی کئی ملازمین اقبال کی خدمت خبر گیری اور دیکھ بھال پر متعین تھے۔ ریاست کی طرف سے سواری موڑو غیرہ کا بھی انتظام تھا اور علاج معالجہ کا بھی سہ پھر کو آپ اکثر ہوا خوری کرنے کے لیے کبھی شملہ پہاڑی ایں کبھی کملہ پتی پارک یا دگارشاہ بھانی سے تشریف لے جاتے۔ والد صاحب اکثر آپ کے ہمراہ جاتے۔ کبھی کبھی میں بھی ساتھ ہو لیتا شام کو راس مسعود خود اقبال کی قیام گاہ پر یا اقبال راس مسعود کے دولت کدہ ریاض منزل پر تشریف

لے جاتے۔ رات نو دس بجے تک راس مسعود بیگم راس مسعود کی معیت میں دلچسپ موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ کبھی کبھی دیگر عوام دین شہر بھی وہاں آ جائتے تو محفل گرم ہو جاتی۔ اکثر و بیشتر جو موضوع زیر بحث رہتا وہ اسلام کی عظمت سلاطین اسلام کے کارناموں ہندوستان کے مسلمانوں کی ابتری انگریزی تسلط کے خاتمه کی تدایر اور ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی پر مبنی ہوتا تھا۔ اقبال کو ان دونوں سب سے زیادہ جس مسئلے سے دلچسپی تھی۔ وہ ملت اسلامیہ اور قسمیں ملک کے مسئلے تھے اور سچ پوچھیے تو یہی مسئلے آگے چل کر تحریک پاکستان کی اساس قرار پائے۔ اور نواب حمید اللہ خاں جو اقبال کے الفاظ میں:

حَمِيدُ اللَّهِ الْخَانُ أَئِ مَلْكٌ وَ مَلْتَ رَا فِرْوَغٌ اَزْ تُو
زَ الْأَطَافُ تُو مَوْجُ لَالِهِ خِيزْدُ اَزْ خِيَا بَاغُ

۱۔ ۲۔ ۳۔ بھوپال کی مشہور اور دل آویز تفریق گاہیں۔

کی مجسم تفسیر تھے۔ تقسیم ہند کے سخت و عظیم مرحلے کے دوران قائد اعظم کے دست راست ثابت ہوئے اور بالآخر اس دستاویز پر انہوں نے گاندھی جی کے دستخط کرا لیے جس کی رو سے مسلم لیگ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا گیا۔ اور اس طرح پاکستان کا قیام عمل میں آسکا۔

مجھے اس دستاویز کی مدت سے تلاش تھی جس پر قائد اعظم نے مسلم لیگ کی جانب سے اور گاندھی جی نے کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔ نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کی صاحبزادی اور ولیعہدہ ریاست شہزادی عابدہ سلطان اگرچہ کراچی میں ہی سکونت پذیر ہیں لیکن تقریباً دو سال تک سعی و کوشش کے باوجود ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بالآخر ۱۹۶۸ء کو بہ معیت جناب حسن عزیز جاوید مجھے شرف بازیابی مل گیا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اس تاریخی دستاویز کا کھون لگایا بلکہ نواب صاحب

اور اقبال سے متعلق بھی بعض ایسے واقعات دریافت کر لیے جن کا علم اس سے پہلے کسی کو نہ تھا۔ اس اثر و یوکی تفصیلات آئندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی۔

بات کچھ دور جا پڑی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے باہمی روابط کے ابھی کتنے ہی گوشے تاریکی میں ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب اس موضوع سے محققین کی دانستہ پانا دانستہ بے تعلقی یا عدم دلچسپی رہی۔ پھر چالیس سال سے زیادہ عرصہ بیت جانے کے باعث کتنی ہی متعلقہ اور اہم شخصیتیں ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اس طرح علم و آگیہ اور تحقیق و تلاش کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں۔ اور دنیا اقبال، نواب حمید اللہ خاں، بھوپال اور سر راس مسعود کے قریبی اور خصوصی تعلقات اور کتنے ہی متنبہ واقعات سے آج تک لاعلم ہے۔

بھوپال آتے ہی اقبال نے خیرتی سے پہنچنے کی اطاعت سب سے پہلے نیازی صاحب کو دی۔ انہیں نیازی صاحب کے رسالہ ”طلوع اسلام“ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ یہ رسالہ رندرہ کر اور مالی اعتبار سے مستحک ہو کر ملک و قوم کی بیش از بیش خدمت کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے راس مسعود سے اس کا تذکرہ کیا اور سرکاری امداد ک لیے بھی ان سے گفتگو کی خود بھی نواب صاحب سے اس رسالہ کا تذکرہ کرنے کا اظہار کیا۔ لکھتے ہیں:

”بھوپال.....شیش محل ۳ مارچ ۱۹۷۱“

ڈیر نیازی صاحب

میں کل مع الخیر بھوپال پہنچ گیا۔ سید راس مسعود کے پاس کوئی

نمبر طلوع اسلام کا آج تک نہیں پہنچا۔ ان کے نام تمام نمبر فوراً بھجا

دیجیے مزید کوشش بھی کی جائے گی۔ سید صاحب کا نام بھا اپنے

خریداروں میں لکھ لیجیے۔ میں نے ان سے آپ کی مدد و عده لے لیا

ہے اور اعلیٰ حضرت سے خود بھی کہوں گا۔ افغانستان والے معاملے کو
بھی Pursue کرنا چاہیے۔

باقی ہر معاملے میں خدا پر بھروسہ رکھنا مسلمان کا کام ہے۔

محمد اقبال،

۱۔ ”۱۹۳۶ء“ سہوارہ گیا۔

۲۔ ملتویات اقبال صفحہ ۳۲۶

اس خط سے اقبال کی در دمندی کا اظہار ہی نہیں ہوتا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوی
کارکنوں اور ملت کے خدمت گزاروں کی کتنی حوصلہ افزائی اور عملی ہمدردی کا جذبہ اپنے دل
میں رکھتے تھے۔

اس خط کے بعد ۸ مارچ کو انہوں نے پھر نیازی صاحب کو قدرے تفصیلی خط ارسال کیا
جس میں عرض داشت کے مضمون وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس خط میں نواب صاحب بھوپال
کے بارے میں ان کی یہ گراں قدر رائے تھی:

”اس وقت سارے ہندوستان میں علمی اداروں اور رسالوں کی

حوصلہ افزائی کرنے والی سوائے اعلیٰ حضرت کی ذات والا صفات

کے اور کون ہے؟“

اس سے واضح ہوتا طور پر نواب صاحب کے ساتھ ان کے دلی تعلقات اور جذبات
محبت و عقیدت کی نشان دہی ہوتی ہے۔ انہوں نے جس محبت سے نواب صاحب کے نام
عرض داشت کے لیے یہ جملہ نیازی صاحب کو لکھ کر بھیجا ہے اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو
جاتی ہے کہ اس وقت بلا خوف تر دید نواب حمید اللہ خاں کے سوا پورے ہندوستان میں واقعی
کوئی ایسی در دمند صاحب دل اور صاحب نظر شخصیت موجود نہیں تھی۔ طلوع اسلام کا مقصد

جیسا کہ نیازی صاحب نے بھی لکھا ہے۔ ملت اسلامیہ کی ذہنی اور فکری تعمیر تھا۔ اور اقبال کو اس مقصد سے گہری وابستگی تھی چنانچہ وہ نیازی صاحب کی ممکنہ امداد بھی ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

”بھوپال.....۸ مارچ ۱۹۳۶ء“

ڈیر نیازی صاحب.....السلام علیکم

امید ہے یہ خط آپ کو دہلی میں مل جائے گا۔ آپ ایک عرض داشت اعلیٰ حضرت کے نام رسالہ طلوع اسلام کی مدد کے لیے لکھیے۔ اور تینوں رسائل بھی ان کے نام ارسال کر دیجیے۔ عرض داشت میں رسالہ کے اغراض و مقاصد اور اس کا نصب اعین عمده الفاظ میں بیان کیجیے۔ نیز یہ بھی لکھیے کہ اس وقت سارے ہندوستان میں علمی اداروں اور رسالوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی سوائے اعلیٰ حضرت کی ذات والاصفات کے اور کون ہے؟ یہ عرض داشت میرے نام ارسال کیجیے تاکہ میں اس پر اپنی سفارش لکھ کر سید راس مسعود کے پاس بیٹھ جوں۔

والسلام

محمد اقبال،

اس خط کے سلسلے میں نیازی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:

”.....میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اعلیٰ حضرت سے کس بنابر طلوع اسلام کی امداد کے لیے درخواست کروں۔ عرض داشت کا مضمون بھی ذہن میں نہیں آتا تھا۔ احباب سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ

درباری کے معاملات ہیں۔ تم ان سے عہدہ برانہیں ہو سکو گے۔
ویسے حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے۔

بہر حال جوں توں کر کے ایک عرض داشت مرتب کی لیکن
گھر یا رچونکہ لاہور میں منتقل ہو رہا تھا لہذا اس کی ترسیل میں غیر
معمولی تاخیر ہو گئی۔ آخر مارچ میں لاہور منتقل ہو گیا۔ حضرت
علامہ نے مجھے خاموش پایا تو میرے مرحوم دوست سید سلامت اللہ کو
خط لکھا حضرت علامہ کو طلوع اسلام اور میرے مستقبل کا کس قدر

خیال تھا ارشاد ہوا،“

لے مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۲۷

”بھوپال..... ۲۸ مارچ ۱۹۳۶ء“

ڈیسلامت اللہ شاہ صاحب

معلوم نہیں نیازی صاحب لاہور پہنچ یا نہ پہنچے۔ میں نے جو خط
ان کو لکھا تھا اس کا کوئی جواب انہوں نے نہیں دیا۔ میں نے ان کو لکھ
دیا تھا کہ طلوع اسلام کی مدد کے لیے ایک عرض داشت اعلیٰ حضرت
نواب صاحب بھوپال کے نام لکھ کر میرے نام فوراً ارسال کر دیں
عرض داشت کا مضمون بھی میں نے اس خط میں لکھ کر دیا تھا۔ وہ اب
تک خاموش ہیں۔ اگر انہوں نے تسلیم کیا تو معاملہ دوسرے سال پر
پڑ جائے گا۔ اس وقت بجٹ تیار ہو رہا ہے۔ اگر وہ فوراً عرض داشت
بھیج دیں تو کام اسی سال ہو جائے گا۔ اجہاں کہیں بھی ہوں ان کو
تاکید کر دیں عرض داشت میں اعلیٰ حضرت کو ایڈر لیں کیا جائے اور

میرے پاس بھیجا جائے تاکہ میں اپنی سفارش پر لکھ سکوں۔

والسلام

محمد اقبال،

اقبال کو اپنے معاصرین اہل علم خدمت گزاران ملت اور اپنے نیاز مندوں کی سود و بہبود اور اعانت اور فلاح و صلاح کا کتنا خیال رہتا تھا ان خطوط سے اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

بھوپال کے قیام کے دوران..... اپنے نیاز مندوں دوستوں اور فیقوں کو خطوط کے جوابات پابندی سے لکھنا بھی ان کا ایک محبوب مشغل تھا۔ کہاں کہاں کے ضرورت مندانہیں لا ہو رحتی کہ مختصر قیام کے دوران بھوپال تک خطوط بھیجنے جن کے وہ فوراً جوابات ارسال کرتے۔ ایسے ہی ایک صاحب علم سید احمد عباس تھے جن کا شمار شرفائے عرب میں ہوتا تھا اور روضہ رسول رسالت آب کے محافظ تھے۔ وہ اقبال کی مدد کے طالب ہوئے اور انہیں اپنے حالات سے مطلع کرنے کے نواب صاحب تک پہنچے اور ریاست کی سرپرستی حاصل کرنے کی خواہش کی تو شیش محل میں سے ہی انہوں نے ایک خط راس مسعود کو بطور تعارف تحریر کیا۔ اس خط میں جن امور کا تذکرہ ہے وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ ہاں اقبال کی عظمت اور ان کی درمندی کے ضرور شاہد ہیں:

”.....ڈیر مسعود۔ ملفوظہ خط سید احمد عباس کا ہے۔ جو مدینہ

منورہ میں روضہ رسول حضور رسالت آب کے محافظ ہیں۔ میں نے پہلے بھی تم سے ان کا ذکر کیا تھا۔ نہایت عمدہ سفر نامہ ہندوستان کا لکھ رہے ہیں۔ عربی زبان کے ادیب ہیں شرفائے عرب میں ان کا خاندان بلند مرتبہ ہے۔ یہ خط ہر ہائی نس کی خدمت میں بھجوا

دیجیے۔ چونکہ ان کو یہاں کے دستور کا علم نہیں اس واسطے انہوں نے اپنا خط میرے خط میں ملغوف کر دیا ہے۔ اگر اعلیٰ حضرت نے ان کو اجازت دی تو یہاں آئیں گے۔

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۲۷-۳۲۸

۲۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۲۸-۳۲۹

پیالہ نے ان کی بڑی قدر افزائی اور بڑی خاطرومدارات کی۔
اگر وہ آئیں تو تم بھی ان کو دعوت دینا اور کرنل رابنس سے بھی تو مجھے ملا دیجیے۔ تم کہتے تھے کہ وہ اب یہاں سے چلے جانے والے ہیں۔

والسلام

محمد اقبال شیش محل۔ ۱۹۳۶ء۔

(یہ خط بھوپال ہی میں لکھا گیا)

اہل علم و کمال کی عزت و تکریم اور ان کی بجا قدر دنیکا جذبہ اقبال کا فطرت کا ایک حصہ تھا۔ وہ سعی و سفارش بغیر کسی لامگ لپیٹ کے کرتے تھے۔ بھوپال سے ان کی گھری والبنتی نواب صاحب سے قربت اور راس مسعود ایسے سچے شیدائی کے ہوتے ہوئے انہیں اہل ضرورت کو متعارف کرنے میں ذرا بھی تکلیف نہ تھا۔ جیسا کہ اس خط کی عبارت سے مترشح ہے۔

(یہ) عربی زبان کے ادیب ہیں اور شرفائے عرب میں ان کا خاندان بلند مرتبہ ہے۔ اگر وہ آئیں تو تم بھی ان کو دعوت دینا.....
غرض وہ کسی بھی مستحق اور ضرورت مند کو پریشان حال نہیں دیکھ سکتے تھے کہ کسی عنوان اس کے کام آجائیں۔ نیازی صاحب نے لاہور پہنچ کر جب نواب صاحب بھوپال کے نام

عرض داشت ارسال کردی تو انہوں نے فوراً جواب دیا۔

”بھوپال.....۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء“

ڈیرینیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کی عرض داشت پہنچ گئی ہے۔ میں انشاء اللہ ۱۹ اپریل کی
شام کو ساڑھے سات بجے لاہور پہنچ جاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل سے
خیریت ہے۔ والسلام
محمد اقبال۔ بھوپال،“

پروگرام کے مطابق ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء کو اقبال بھوپال سے روانہ ہو کر ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو
لاہور واپس پہنچ گئے۔ نیازی صاحب خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں پہلے سے کافی صحت
مند پایا۔ فرماتے ہیں۔

”.....۱۹ اپریل کو حضرت علامہ واپس لاہور تشریف لائے۔“

معلوم ہوتا تھا کہ ان کی صحت کے لیے بہت اچھا رہا آواز کی حالت
بھی بہتر ہو گئی اور چہرے پر بھی تندرستی کے آثار نمایاں تھے۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۷۷۔ ۲۷۸

۲۔ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۹۳

۳۔ اقبال ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچ چیسا
کہ نیازی صاحب کے اس بیان اور اقبال کے ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء کے خط سے ثابت ہے۔
لیکن ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی کتاب اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ کے صفحہ ۲۶۴ پر لکھا
ہے ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء تک شیش محل میں ٹھہرے۔ اس غلطی کا اعادہ عبد القوی دسنوی نے
اپنے کتاب پرچھ علامہ اقبال بھوپال میں بھی کیا ہے۔ صفحہ ۲۷ پر درج ہے۔ تیسرا مرتبہ قیام ۲

ماچ ۱۹۳۶ء سے ۱۹ میل ۱۹۳۶ تک حالانکہ وہ ۱۹ میل کو لا ہو رہنے چکے تھے۔

۳۲۹ مکتوبات اقبال صفحہ

نیازی صاحب کے اس بیان کے پس پرده ایک عجیب و غریب داستان کا انکشاف خود اقبال کے اس خط سے ہوتا ہے جو لا ہو رہنے کے دو ماہ بعد انہوں نے پروفیسر صلاح الدین محمد الیاس برنس کے نام ۱۳ جون ۱۹۳۶ء کو لا ہور سے ارسال کیا تھا۔ نیازی صاحب نے اقبال کو بھوپال سے لوٹ کر کافی صحت مند پایا۔ آواز میں بھی بہتری کے آثار تھے اور چہرے پر بھی تند رسمی نمایا تھی۔ اور یہ سب کچھ بھوپال کے دوران قیام شیش محل کی ایسی تاریخ سز عمارت میں ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کی رات کو موقع پذیر ہوا۔ یہ وہ خواب تھا جو انہوں نے بھوپال میں دیکھا اور پھر ان کی مشہور مثنوی پر چہ باید کردا۔ اقوام شرق معرض وجود میں آئی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ خط ملاحظہ ہو:

”لا ہور ۱۳ جون ۱۹۳۶ء“

مخدومی پروفیسر صاحب السلام علیکم
نو ازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے نہایت شکر گزار ہوں۔
مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو طلب میں بھی دخل ہے۔ اگر معلوم ہوتا
تو ضرور آپ کی خدمت میں لکھتا۔

دو سال سے اوپر ہو گئے جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا۔ سویاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ بہدانہ پینے پر زکام بند ہوا تو گلا بیٹھ گیا۔ یہ کیفیت دو سال سے جاری ہے بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے مجھے بالآخر بیرسٹری کا کام چھوڑنا پڑا۔ انگریزی اور یونانی اطباء دونوں کا علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ

نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ مجھے کسی قدر دمہ کی شکایت ہو گئی۔ حکیم ناپینا صاحب نے فرمایا تھا کہ تمہاری بیماری ایک ہلاک سادمہ ہے۔ کھانسی اس شدت سے آتی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتا تھا۔ اب یہ کیفیت نہیں ہے صحیح بلغم لکھتی ہے۔ علی ہذا القياس کھانا کھانے کے بعد بھی سفید بلغم لکھتی ہے جس کے نکلنے سے آواز ہمہر ہو جاتی ہے۔ انگریز اطباء کی تشخیص یہ ہے کہ ایک رگ جسے Aorta کہتے ہیں اور جو قلب کے قریب ہے ایک مقام سے پھیل گئی ہے اور اس کا دباؤ ووکل کا رو پر پڑتا ہے جس کے سبب بولنے میں دقت ہوتی ہے۔ علی ہذا القياس ان کی تشخیص یہ بھی ہے کہ طویل بیماری سے قلب کی ریگیں کمزور ہو گئی ہیں اس واسطے عام کمزوری ہو گئی ہے اور مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے کہ جس میں Excitement پیدا ہو۔ ذرا سی محنت کرنے سے دم پھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غسل خانے کرنے میں اپنے ہاتھوں سے اپنابدن بھی اگر ملوں تو دم پھول جاتا ہے۔ عام کمزوری بھی ہے۔ یہ مختصر سی کیفیت میری بیماری کی ہے۔ اگر آپ کوئی دوا تجویز کریں گے تو ضرور مفید ہو گی۔ آپ عاشقان رسول میں سے ہیں۔ اس واسطے ایک بات اور آپ کے گوش گزار کرنے کے لائق ہے۔

۳ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سر سید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو؟ میں نے عرض کیا دوسال سے اوپر مدت گزر گئی

ہے۔ فرمایا حضور رسالت ماب کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ
اسی وقت کھل گئی اور اس عرض داشت کے چند شعر جواب طویل ہو گئی
ہے۔ میری زبان سے جاری ہو گئی۔ انشاء اللہ ایک مشنوی فارسی پس
چہ باید کر دے اقوام شرق نام کے ساتھ یہ عرض داشت شائع ہو گی۔
۳ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے
کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ Ring عود کر رہا
ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔ گواں ترقی کی رفتار بہت سست ہے
جسم میں بھی عام کمزوری ہے زیادہ کیا عرض کروں۔ امید ہے کہ آپ
کا مزاج بتیر ہو گا۔

خلص محمد اقبال،

سر سید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھنے کا تذکرہ انہوں نے سر راس مسعود کے نام ایک خط
میں بھی کیا ہے جو کتاب کی تکمیل کے دورانِ انجمن ترقی اردو کراچی کے ترجمان ماہنامہ قومی
زبان میں اشاعت پذیر ہوا۔ خط کے آغاز میں انہوں نے ”ضرب کلیم“ کا تذکرہ بھی کیا ہے
جس کی تفصیلات آئندہ باب میں پیش کی گئی ہیں۔ خط کا متن یہ ہے:

” لا ہور جولائی ۱۹۳۶ء ”

ڈیر مسعود تمہارا خطاب بھی ملا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اب خدا کے
فضل و کرم سے بالکل اچھے ہو کیونکہ خط میں تم اپنی صحت کے متعلق
ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

ضرب کلیم یا اعلان جنگ زمانہ حاضر کے خلاف افسوس کہ اب
تک تیار نہیں ہوئی۔ یہ میرا قصور نہیں پر لیں والوں کا قصور ہے۔ اب

چار جولائی کو کتاب کی طباعت ختم ہو گئی تو..... Advance کا پی ارسال کر دوں گا۔ ۱۳ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا میں نے تمہارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علاالت کے متعلق حضور سالت آب گی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے اور لا ہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مشنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمد للہ کہ یہ مشنوی بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ مجھ کو اس مشنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہر حال اس کا نام ہو گا پس چہ باید کردے اقوام شرق ضرب کلیم کی طباعت کے بعد اس کی کتابت شروع ہو گی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے تم اپنی خیریت کی اطلاع دو۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ علی بخش تم دونوں کو آداب عرض کرتا ہے۔

محمد اقبال ۲۔

ان خطوط کے دو بہت نمایاں پہلو ہیں پہلا ان کی علاالت کی ابتداء اور اس کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ دوسرا اس خواب سے متعلق ہے جس کے زیر اثر پس چہ باید کردے اقوام شرق ایسی معرکہ آرامشناوی کی تخلیق کا بھوپال میں آغاز ہوا۔ اقبال کی کون سی تخلیق..... کب کہاں اور کن حالات میں معرض وجود میں آئی۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۳ تا ۳۲۴

۲۔ ماہنامہ ”قومی زبان“، کراچی ستمبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۳۱۳ تا ۳۲۲

اس کے بارے میں تو اقبالیات کے ماہرین ہی بجا طور پر تحقیق کر کے ہر تحقیق کے پس منظر کو جاگر کریں گے۔ جہاں تک اس مثنوی کا تعلق ہے۔ خود اقبال کی تحریر سے ہمیں اس کی شہادت مل گئی اور یہ علم ہوا کہ خواب سے آنکھ کھلتے ہی ان پر ایک الہامی کیفیت طاری ہو گئی اور حضور رسالت مآب کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے اشعار ان کی زبان پر جاری ہو گئے۔ اس عالم میں انہوں نے کتنے شعر لکھے اس کا اندازہ اس خط سے نہیں ہوتا۔ اس عبارت سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ مثنوی طویل ہو گئی تھی۔

اسی مثنوی سے متعلق جس کا ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کی شب کو شیش محل بھوپال کے قیام کے دوران آغاز ہو چکا تھا ایک اور عجیب و غریب واقعہ کا انکشاف فقیر و حید الدین نے اپنی کتاب روزگار فقیر میں کیا ہے۔ ان دونوں واقعات کو ایک دوسرے سے کسی طور علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ کچھ یوں لگتا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی سلسلے کی دو کریاں ہیں:

پانچ سو آدمی

”ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم جس زمانہ میں انارکلی کے دو منزلہ مکان
میں رہتے تھے انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے صرف واقعہ سمجھ کر
سن لینا اور پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ خود مرحوم کے اس شعر کے پس
منظر میں کہ:

مری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محروم راز درون مے خانہ
اس پر جتنا غور کیا جائے ذہن و فکر کوئی لذت اور بالیدگی حاصل
ہوتی ہے اور شعور و احساس کی دنیا و جدان و واردات قلبی کی آئینہ دار

بن جاتی ہے۔ یہ واقعہ شاعر مشرق کی شعرگروئی کے سب سے نمایاں پہلو کو پیش کرتا ہے۔ یہ سرسری طور پر گزر جانے کا نہیں ہے ٹھہرنے غور کرنے اور لطف لینے کا مقام ہے۔

ہوایوں کہ ایک بار رات گئے سوتے سوتے علامہ مرحوم کی آنکھ
کھل گئی۔ دیکھا بلکہ محسوس کیا کہ قلب پر شعرگروئی کی وہ خاص کیفیت
طاری ہے جس کا ذکر انہی صفات میں اجمالاً آچکا ہے۔ یہ وہ عالم
ہے جسے شاعری کی زبان میں آمد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مکان کی دوسری منزل پر استراحت فرماتھے پاس
نکاغذ تھانہ پسل چپ چاپ اٹھے لائیں ہاتھ میں اٹھائی اور سیڑھیوں
سے قدری تیزی کے ساتھ اتر کر نچلی منزل میں پہنچ۔ لائیں ایک
طرف رکھ دی۔ کاغذ اور قلم سنبھالا اور جس قدر اشعار اس وقت
موزوں ہوتے گئے انہیں قلم بند کرتے گئے۔ یہاں تک کہ نزول شعر
کی یہ کیفیت اختتام کو پہنچی۔ انہوں نے بالائی منزل پر جانے کا ارادہ
ہی کیا تھا کہ ایک سفید ریش طویل قامت درویش صفت بزرگ نظر
آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسرت واستجواب کے انداز میں دریافت
کیا آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ درویش نے دونوں ہاتھ
اٹھاتے ہوئے جلدی سے کہا:

”پانچ سو آدمی پیدا کر..... پانچ سو آدمی پیدا کر۔“

یہ کہتے ہوئے وہ بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف
بڑھنے لگے۔ حالانکہ اس طرف کوئی راستہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے

لالثین اٹھائی اور زینہ کی طرف اشارا کرتے ہوئے جہاں گھپ اندر ہمرا تھا کہا حلیے میں آپ کو راستہ دکھادوں اور نیچتک لے چلوں لیکن ان مرد بزرگ کے ڈاکٹر صاحب کی پیش کش کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنا ہی فقرہ اسی جوش اور تاکید کے ساتھ دھراتے ہوئے نظر سے او جھل ہو گئے ڈاکٹر صاحب زینہ کی طرف سے سیر ہیاں طے کر کے بازار میں آئے اور دور تک دیکھا مگر بزرگ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ جیسے وہ ڈاکٹر سے اپنا یہ جملہ ہی کہنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ اور وہ جملہ کہہ کر غائب ہو گئے۔ اس اثناء میں ڈاکٹر کورات میں گشت کرنے والا کانٹیبل نظر آیا۔ اس سے دریافت کیا کہ تم نے اس وضع قطع چال ڈھال اور حلیہ کا کوئی آدمی تو نہیں دیکھا۔ کانٹیبل نے نفی میں جواب دیا ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹ آئے اور پھر بستر پر سو گئے۔ صبح کو جب بیدار ہوئے تو رات کا واقعہ ذہن میں بالکل تازہ تھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ شاید انہوں نے خواب دیکھا ہے لیکن جب پھلی منزل میں آ کر رات کے لکھے ہوئے اشعار موجود پائے اور قریب ہی لالثین رکھنے کا نشان بھی ابھرا ہوا تھا تو ذہن اس کی طرف منتقل ہوا کہ وہ خواب تھا یا بیداری تھی بہر حال جو حالت بھی تھی اس کا ایک حصہ حقیقت بن چکا ہے۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر چند دن کے بعد ڈاکٹر صاحب موسم گرامی تعطیلات میں جب سیالکوٹ تشریف لائے تو اپنے والد بزرگوار سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ شیخ اعجاز احمد اس وقت وہاں موجود تھے۔

ان کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے واقعہ سنانے کے بعد اپنے والد ماجد سے دریافت کیا۔ کہ پانچ سو آدمی تیار کرنے سے اس درویش کی کیا مراد ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ پانچ سو آدمی پیدا کرنے کی۔ کی فرماں شپھر اس تاکید اس کا حقیقی مفہوم تو میں نہیں تاکسلنا مگر تم پانچ سو آدمی تیار نہیں کر سکتے تو پانچ سو آدمی تیار کرنے والی پانچ سو اشعار کی کتاب ہی لکھ دو۔

اس واقعہ کو ذہن میں رکھ کر قارئین کرام ڈاکٹر صاحب مرحوم کی مشہور منشوی..... پس چہ باید کردے اقوام شرق کا تصور کریں بلکہ اسے ایک بار پڑھیں۔ اس کے شعروں کی تعداد ۵۳ ہے۔ یعنی پانچ سو اشعار سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ خاص طور پر ذکر کر کے قبل بات ہے یہ ہے کہ اس مجموعہ کلام کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے۔

سپاه تازه برگزیم از ولایت عشق
که در حرم خطرے از بغاوت خرد است
آگے چل کر فرماتے ہیں:

زمانہ پیچ نداند حقیقت اورا
جنوں قbast که موزول به قامت خرد است
بآ مقام رسیدم چو در برش کردم
طوف بام و درمن سعادت خرد است

عجیب اتفاق ہے کہ ابھی یہ کتاب زیر ترتیب ہی تھی کہ ماہنامہ ”افکار“ کراچی کے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء میں مدیر افکار جناب صہبہ لکھنؤی کے بزرگ محترم پروفیسر سید نواب علی مرحوم

کا ایک نہایت قیمتی مقالہ بعنوان پس چہ باید کر داے اقوام شرق نظر آیا۔ راقم الحروف نے اس مقالہ کو بار بار پڑھا اور پھر اس کا منظر معلوم کرنے کے لیے مدیر افکار سے رابطہ قائم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقالہ پروفیسر نواب علی نے سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں شائع کرایا تھا۔ اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ اور افکار نے کسی پرانے حوالے سے، ہی اسے ۱۹۶۲ء میں نذر قارئین کیا ہے۔ پروفیسر نواب علی درجنوں کتابوں کے مصنف اور ڈاکٹر صاحب کے حلقہ احباب میں سے تھے۔ قیام بھوپال کے دوران ڈاکٹر صاحب سے ان کی طویل ملاقاتیں رہیں۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔ مثنوی پس چہ باید کردے متعلق ان کا یہ مقالہ ظاہر ہے کہ ان کے اور ڈاکٹر صاحب کے ماہین دوستانہ تبادلہ خیال کا نتیجہ ہے اور ممکن ہے کہ پانچ سو اشعار کے موضوع پر انہیں انارکلی والے واقعہ کا پس منظر معلوم ہو لیکن بدقتی سے پروفیسر صاحب نواب علی گزشتہ سال ۳۰ جون ۱۹۶۱ء کو کراچی میں انتقال کر چکے ہیں۔ اور اب ان کے زیر نظر مقالہ کے علاوہ پانچ سو اشعار والی کتاب کے لیے مزید شہادت موجود نہیں۔

مرحوم نے اپنے اس خیال افروز مقالہ کی تمهید کے طور پر جو سطور قلم بند فرمائی ہیں ان کا مطالعہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں:

”.....ڈاکٹر محمد اقبال نے وفات سے دو سال پیشتر مولانا روم گی شہرہ آفاق مثنوی کی پیروی میں پانچ سو اشعار کی ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی پس چہ باید کر داے اقوام شرق لکھی جوان کے افکار عالیہ کا ایک صاف و شفاف آئینہ ہے۔ مولوی معنوی کی مثنوی کی طرح اس میں بھی وہی جوش وہی سوز اور وہی تخیل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زبان پہلوی کے قرآن کا سورہ اخلاص ہے“۔

”پانچ سو آدمی پیدا کر“، کے بیان کردہ اس واقعہ کے پس منظر میں اب آپ پھر اقبال کے ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کے خط کے اقتباس کو پڑھیں:

اے سہوکتابت ہے۔ یہ مقالہ پہلی بار انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رسالہ جو ہر کے اقبال نمبر میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد صرف ”افکار“ میں شائع ہوا۔

۳ روزگار فقیر صفحہ ۱۱۵ تا ۱۱۶

”۱۳ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سر سید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں کہ تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا کہ دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضور رسالت مآبؑ کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرض داشت کے چند شعر جواب طویل ہو گئی ہے میری زبان پر جاری ہو گئی۔ انشاء اللہ ایک مشنوی فارسی پس چہ باید کرداے اقوام شرق نام کے ساتھ یہ عرض داشت شائع ہو گی۔“

تو بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ انارکلی والے مکان میں بزرگ کا آنا اور شیش محل میں سر سید کا خواب میں نظر آنا اور حضورؐ کی خدمت میں عرض داشت پیش کرنے کی ہدایت کرنا۔ پھر مشنوی کے اشعار کا زبان پر از خود جاری ہو جانا۔ حقیقتاً ایک ہی الہامی فکر کے دو مر بو طسلے معلوم ہوتے ہیں جن کے تحت پس چہ باید کردا یہی معمر کہ آراء مشنوی عالم وجود میں آئی اور اس طرح بھوپال کو اس کی تخلیق و آفرینش کا فخر بھی حاصل ہو گیا۔ مشنوی کے اس پس منظر پر اس سے قبل شاید ہی کسی نے غور و فکر کی ضرورت محسوس کی ہو۔ کیونکہ یہ واقعہ ایک ایسی دور افتادہ ریاست میں وقوع پذیر ہوا جس کے درود یو اسکی دور میں اسلامی شکوہ کے امین سمجھے جاتے تھے اور جو آج بھی اپنی عظمت رفتہ پر نوحہ کنائ ہیں۔

اقبال اور پروفیسر سید نواب علی کے باہمی روابط کا آغاز کب ہوا اس کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں البتہ جن حقائق کا رقم الحروف کو علم ہے ان سے دونوں کے قریبی تعلقات کا اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہوں۔ ریاست بھوپال کے تقریباً بھی حکمرانوں کو علم و ادب سے خاص شغف تھا اور ہندوستان بھر کی بلند پایہ شخصیتیں ریاست بھوپال کے حکمرانوں کی علم پروری اور ادبی شغف کے سبب کھنچ کر یہاں آگئی تھیں اور ممتاز عہدوں پر فائز تھیں۔ دوسرے معنوں میں بھوپال ان کا طلن ثانی بن گیا تھا میرے والد سید محمد علی وکیل مرحوم بھی نواب شاہ جہاں بیگم خلد آشیاں کے دور حکومت میں غالباً ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۷ء میں لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر بھوپال آگئے تھے۔ اور پھر یہیں رہ پڑے۔ اور کچھ عرصہ بعد ان کا شمار ممتاز ترین اور سر برآورده وکلا میں ہونے لگا۔ پروفیسر سید نواب علی میرے والد کے حقیقت چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم بھی لکھنؤ میں حاصل کی۔ کینگ کالج سے ایم اے بی ٹی کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ کے مدرسے العلوم سے وابستہ ہو گئے۔ اور دوسال تک وہاں خدمات انجام دیں لیکن ۱۹۰۳ء میں بڑودہ کے علم دوست مہاراجہ گیکواڑ کے ایما پر آپ وہاں چلے گئے اور بڑودہ کالج کے پروفیسر مقرر ہو گئے جہاں مسلسل ۲۶ سال تک آپ کا قیام رہا۔ کچھ ہی عرصہ بعد مولانا محمد علی جوہر بھی بڑودہ کے کم سن ولی عہد کے اتالیق مقرر ہو کر وہاں تشریف لے آئے اور سات سال تک آپ کا اور ان کا ساتھ رہا اور دونوں ایک دوسرے کے ہدم و رفیق رہے۔ پروفیسر سید نواب علی کی ساری عمر درس و تدریس علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف میں گزری۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں آپ نے بلند مرتبت معاصرین کے دو شہنشاہ اپنے مخصوص و پسندیدہ موضوع اسلامی تاریخ پر جو پیش بہا اور نادر روزگار کرتا ہیں لکھیں۔ وہ آج بھی اسلامیات میں

حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن معاصرین سے آپ کے ذاتی اور قریبی روابط ہیں جن اکابر سے ملاقاوں کا شرف حاصل ہوا جن حضرات سے تبادلہ خیال کے موقع میسر آئے ان کی فہرست طویل ہے۔ پھر بھی جن مشاہیر کا آپ ہمیشہ خصوصیت سے ذکر فرماتے ہیں ان میں مولانا حامی علامہ شبی مولانا محمد علی مولانا عبد الحليم شریعت علامہ سلیمان ندوی۔ عطیہ فیضی۔ علامہ اقبال۔ اکبرالہ آبادی۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اقبال ذکر ہیں۔

پروفیسر نواب علی اور اقبال ایک ہی سال یعنی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر دونوں میں فکری اور علمی مذاق تقریباً یکساں تھا۔ قرآن مجید اور سیرت رسول دونوں ہے کے محبوب اور پسندیدہ موضوعات تھے مولانا محمد علی کی فرمائش پر جامعہ ملیہ دہلی کے لیے آپ کی مختصر سی کتاب ہمارے نبی نہایت آسان زبان میں لکھی جس کے پچاس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ تذکرہ المصطفیٰ سیرت پر آپ کی پہلی کتاب ہے جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ معارج الدین المعروف بہ اسلام اور سائنس ۱۹۱۳ء میں چھپی۔ جسے آپ نے علامہ کی خدمت میں ارسال کیا تو انہوں نے اس کی بے حد تعریف کی۔ اور اس نوع پر مزید تحقیقی کتابیں لکھنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے اکبرالہ آبادی کے نام ایک خط میں بھی اس کتاب کا بطور خاص توصیفی انداز میں تذکرہ کیا۔ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ہمدرد اور معلانا عبد الحليم شریعت نے رسالہ دل گداز میں اس پر سیر حاصل تبصرے شائع کیے۔ اس کے فوراً ہی بعد ۱۹۱۹ء میں آپ نے تاریخ صحف ساوسی ایسی مستند اور بلند پایہ کتاب تحریر کی جو آج بھی پاکستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے اور نئی نسل اس سے اکتساب فیض کر رہی ہے۔ سیرت پاک پر جب منتشر قین کے پے بے پے ناروا حملوں کا سلسلہ دراز ہوا تو آپ ن دوبارہ سیرت پر قلم اٹھایا اور ۱۹۳۱ء میں سیرت رسول اللہؐ ایسی محققانہ اور بلند پایہ کتاب شائع کی جس کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی اور اضافہ کے بعد مکتبہ افکار کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

آپ بیک وقت انگریزی عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ اور کسی حد تک عبرانی سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ آپ نے سیرت رسول اللہ کا علامہ شبیلی کی سیرت النبی سے مختلف انداز میں احاطہ کیا۔ دونوں بزرگ و محترم شخصیتوں نے باہمی مشاورت سے کتاب کے جدا گانہ موضوعات منتخب کر لیے تھے۔ چنانچہ آج بھی سیرت کی یہ دونوں کتابیں تحقیق و بصیرت اور سعی و کاوش کا بے بہا خزینہ ہیں جن سے سیرت پر کام کرنے والے مستفید ہو رہے ہیں۔

بھوپال سے پروفیسر سید نواب علی کی والبنتگی کا سب سے بڑا سبب تو ان کے بڑے بھائی سید محمد علی وکیل کا بھوپال میں قیام تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے والد صاحب کی تحریک و خواہش پر انہوں نے اپنی بڑی صاحبزادی یوسف النساء بیگم کی شادی مولوی شکر اللہ سہیل کے صاحبزادے سید وجیہ الدین سے کر دی تھی مولوی شکر اللہ سہیل یوپی کے رہنے والے اور ریاست میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ شعر و ادب سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ میرے والد صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اس رشتہ کے بعد دوستی کچھ اور مستحکم ہو گئی تھی۔

پروفیسر سید نواب علی ہر سال موسم گرم کی تعطیلات میں بھوپال ضرور آتے تھے اور ایک ایک دو دو ماہ یہاں ان کا قیام رہتا تھا۔ پروفیسر صاحب کے حلقة احباب میں بھوپال کے عوامند شہر ہی نہیں۔ ممتاز علمی و ادبی شخصیتیں بھی تھیں جن میں سے بیشتر ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر متمكن تھیں۔ ان میں سب سے پہلے تو خود ان کے سہمی مولوی شکر اللہ سہیل تھے ان کے علاوہ شعیب قریشی۔ راجہ اودھ نرائن بسیریا۔ سر لیاقت علی خان۔ حیدر عباسی محمد حیات۔ ماسٹروی محمد۔ منتشر منصب علی۔ عبد الرحمن بجنوری وغیرہ تھے جو آپ کی آمد کے منتظر رہا کرتے تھے۔ خود والی ریاست نواب سلطان بیگم پروفیسر سید نواب علی کے تاجر علیمی کی بڑی معترف تھیں اور ان کی کتابیں شائع ہونے پر ریاست کے مدارس اور لائبریریوں کے لیے

خرید فرما کر ہمیشہ سرپرستی کرتی تھیں سلطان جہاں بیگم کے بعد نواب حمید اللہ خاں نے بھی پروفیسر سید نواب علی کی تصانیف کی قدردانی فرمائی۔

۱۔ جدید ترین تحقیق و دستاویزی ثبوت کی روشنی میں علامہ اقبال کا سن پیدائش ۹ نومبر

۲۳۲ صفحہ ۷۷۸ءے۔ ملاحظہ ہو روزگار فقیر صفحہ

میرے والد صاحب نے دو ایک بار اس امر کی کوشش بھی کی کہ پروفیسر صاحب نواب بھوپال مستقلًا آجائیں لیکن انہوں نے مہاراجہ بڑودہ کے اسلامی علوم سے غیر معمولی شغف کی بنا پر بھوپال آنا منظور نہ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انہیں مہاراجہ نے بڑودہ کالج کی لائبریری کے اسلامی موضوعات پر ہر قسم کی بلند پایہ اور نادرست تابیں دنیا کے ہر ملک سے منگوانے کی ہر ممکن سہولت دے رکھی تھی۔ چنانچہ آپ نے مصر یورپ امریکہ اور دوسرے ملکوں سے اسلامی علوم پر کتابیں شائع شدہ بڑودہ کالج کی لائبریری کے لیے جمع کر دی تھیں۔ اس قیمتی سرمایہ سے آپ نے تو خیر استفادہ کیا ہی تھا۔ آئندہ نسلوں کے لیے بھی شعیں فروزان کر دیں تاکہ وہ علم و تحقیق کی روایت کو برقرار رکھیں کسی ہندو ریاست کے راجہ کا اسلامی علوم سے اتنا ہی گہرا شغف آج تودیوانے کا خواب نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال اور پروفیسر نواب علی کے روابط کا آغاز جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے بڑودہ کے دوران قیام ہوا۔ جو قلمی رابطہ اور ذاتی ملاقاتوں کے بعد گہری دوستی اور قلبی تعلق میں تبدیل ہو گیا۔ آپ نے بیشتر کتابیں بڑودہ کے قیام کے دوران ہی تحریر کیں۔ کتاب کی نظر ثانی کے دوران خوش قسمتی سے رحیم بخش شاہین کی کتاب اور اق گمشتہ میں اقبال کا ایسا خط بھی مل گیا جس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ پروفیسر سید نواب علی کے علمی کارناموں سے ۱۹۱۳ء میں واقع ہو چکے تھے اور یہ وہی زمانہ تھا جب آپ بڑودہ کالج کے پروفیسر تھے۔ اس ضمن میں حسب ذیل امور بطور خاص قبل ذکر ہیں:

خواجہ حسن نظامی میرٹھ سے ایک ہفت روزہ نکالنے تھے جس کا نام توحید تھا۔ اس پر علامہ اقبال کا مشہور شعر لکھا ہوتا تھا:

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
ممکن نہیں مٹانا نام و نشان ہمارا

اسی ہفت روزہ توحید نے ۸ جون ۱۹۱۳ء کو خواجہ نمبر شائع کیا۔ خواجہ حسن نظامی نے اعلان کیا تھا کہ بہترین مقالہ غزل یا نظم پر اول دوم اور سوم انعامات تمغوں کی صورت میں دیے جائیں گے۔ منصوفین میں علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی۔ اور عبدالحیم شر کے نام شامل تھے۔ ”توحید“ کے شمارہ بابت ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء میں علامہ اقبال کی رائے کے سلسلے میں یہ خط درج کیا تھا۔ جس میں علامہ نواب علی کے مضمون کو سب سے زیادہ پسند کیا اور اسے معنی خیز قرار دیا۔ اس طرح گویا پہلی بار ایک ایسا خط دستیاب ہوا جس سے اقبال اور سید نواب علی کے رابطہ تعلق کی نشاندہی ممکن ہو سکی:

ڈیر خواجہ صاحب!

السلام علیکم

”خواجہ نمبر“ میں نواب علی صاحب پروفیسر بڑودہ کا لج کا مضمون مجھے سب سے زیادہ پسند آیا کہ معنی خیز ہے اس سے دوسرے نمبر پر زلف خواجہ کا اسیروں شہنشاہوں کی پیشانیاں اجمیری چوکھٹ پر موڑالذ کرمضموں کچھ نتیجہ خیز نہیں ہے۔

نظموں میں رامی صاحب کی غزل سب سے اعلیٰ اس کے بعد شفق صاحب کا ترانہ یا یوں کہیے کہ فارسی نظموں میں گرامی صاحب کی غزل اول نمبر اور اردو نظموں میں شفق کا ترانہ۔

محمد اقبال

۲۶ سال تک بڑودہ میں خدمات انجام دینے کے بعد آپ ۱۹۲۹ء میں ریاست جونا گڑھ سے وابستہ ہو گئے۔ ابتدأ بطور پرنسپل بہاء الدین کا لج خدمات انجام دیں اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد آپ وزیر تعلیمات و اوقاف مقرر ہو گئے اور بالآخر ۱۹۳۸ء میں ریاست جونا گڑھ میں سے پیش نے کر مولوی شکر اللہ سہیل اور دیگر دوستوں کی خواہش پر جولائی ۱۹۳۸ء میں بھوپال آ کر قیام پذیر ہوئے۔ یہاں چار ماہ کے قیام میں حیدر عباسی راجہ اودھ نرائن بسیر اس مسعود شعیب قریشی سر محمد لیاقت علی خاں مولوی منصب علی ڈاکٹر حمزہ محمد حیات اور کئی عمائد ریاست سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ خود اس مسعود سے بھوپال میں پہلی ملاقات ۱۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو ہوئی جس کا ذکر انہوں نے قلمی روزنامچہ میں جس کے مسودات رقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں میں ملتا ہے:

”.....رجب المرجب ۵۳ مطابق ۱۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء.....سر

راس مسعود سے مہمان خانہ سرکاری میں ملاقات میرے حالات پر جو ناگڑھ دریافت کیے۔ کہا کہ علی گڑھ چلے آؤ۔ کانفرنس کے دفتر میں کام کرنا۔ انہوں نے اپنے حالات بیان کیے۔ کس طرح مخالفت ہوئی اور اب کیا قصد ہے۔“

اس روز نامچہ سے شعیب قریشی کے مشیر المہماں اور سر اس مسعود کے ممبر تعلیمات مقرر ہونے کی صحیح تاریخ کا بھی علم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

”.....مسٹر شعیب سے ملام مشیر المہماں ہو گئے سر اس مسعود ممبر تعلیمات مقرر ہوئے شب کو مسٹر شعیب کے یہاں دعوت کھائی مع مولوی شکر اللہ.....(سہیل)،“

جولائی ۱۹۳۷ء سے ۳ نومبر ۱۹۳۸ء تک پروفیسر نواب علی کا بھوپال میں قیام رہا۔ انہیں راس مسعود کے آنے سے قبل حیدر عباسی اور شعیب قریشی نے ملازمت کی پیش کش کی تھی۔ پھر جب راس مسعود بھوپال مستقل آگئے تو انہوں نے بھی پروفیسر سید نواب علی کی خدمات بھوپال کے لیے حاصل کرنے کی سعی کو شوش کی لیکن کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا تو آپ دسمبر ۱۹۳۸ء میں اپنے وطن لکھنوات گئے لیکن بھوپال آنے جانے کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

اہفت روزہ تو حیدر میرٹھ بابت ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء

۲ مولانا غلام قادر گرامی

۳ مولانا شفقت عمار پوری

۴ اوراق گمشدہ صفحہ ۱۳۲

میرے والد کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہو گیا تو پروفیسر سید نواب علی نے مجھے اپنی سرپرستی اور کفالت میں لے لیا۔ مئی ۱۹۳۵ء میں جب میری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا تو جولائی ۱۹۳۵ء میں مجھے انہوں نے اپنے پاس لکھنوا لیا اور اپنے بچوں سے زیادہ شفقت کے ساتھ میری تعلیم و تربیت پر توجہ فرمائی۔

پس چہ باید کرد والا مضمون جس کا حوالہ فقیر و حیدر الدین نے دیا ہے علامہ اقبال کی وفات کے فوراً بعد شائع ہونے والا پہلا اقبال نمبر ہے جسے انجمان اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رسالہ جوہر نے ۱۹۳۸ء میں مرتب کیا۔ رسالہ جوہر کے اقبال نمبر میں جن گرانماہی خصیتوں کے پیغامات ہیں ان میں گاندھی جی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیکور مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر ذاکر حسین جو انجمان اتحاد کے صدر تھے۔ ڈاکٹر سراج کبر حیدری۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ سرتیج بھادر سپرد۔ اور مولانا عبدالماجد دریابادی شامل ہیں اقبال نمبر میں تاریخ اشاعت اگرچہ درج نہیں لیکن دو پیغامات بقید تاریخ دستخط شائع ہوئے ہیں جن سے اس نمبر کی تاریخ اشاعت کا

تعقین ہو جاتا ہے۔

(۱) پیغام مہاتما گاندھی۔ مورخہ ۹ جون ۱۹۳۸ء گاندھی جی نے یہ پیغام اردو میں لکھا تھا جو ان کے قلمی عکس کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

(۲) پیغام ابوالکلام گلکتہ ۱۹۳۸ء نومبر اعرسالہ جو ہر کے اسی اقبال نمبر میں پروفیسر سید نواب علی کا مضمون پس چہ باید کرد صفحات ۱۵۸ تا ۱۶۲ پر شائع ہوا ہے۔ اسی نمبر میں ان کی ایک فارسی نظم بھی علامہ اقبال کے متعلق شامل ہے جس کا عنوان ہے یادِ اقبال (صفحہ ۸۰)

پروفیسر سید نواب علی کا انتقال ۳۰ جون ۱۹۶۱ء کو کراچی میں ہوا جب ان کے قلمی مسودات اور قیمتی کتابوں کو میں نے محفوظ کرنے کے لیے یک جا کیا تو رسالہ جو ہر پر میری نظر پڑی اور اس مضمون پر بھی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۶۲ء کے افکار میں میں لے ان کی پہلی برسی پر اس مضمون کو بطور تبرک دوبارہ شائع کیا۔ اشاعت کے کچھ عرصہ بعد جب فقیر و حید الدین نے پس چہ باید کر دوالے مضمون کے سلسلے میں پروفیسر نواب علی سے معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھ سے رابطہ قائم کیا تو میں نے انہیں بایا کہ ان کے انتقال کو تو ایک سال بیت گیا ہے۔ وہ کراچی ۱۹۶۸ء میں آگئے تھے رسالہ جو ہر کا اقبال نمبر بھی ان کے پاس محفوظ تھا۔ لیکن شاید فقیر و حید الدین کی نظر سے یہ رسالہ نہیں گزرا تھا۔ ورنہ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۲ء کے دوران وہ پروفیسر صحابی یار قم سے رابطہ قائم کر کے پانچ سو آدمی پیدا کر کی تشریی و تشریع معلوم کر سکتے تھے۔ عجیب اتفاقات ہیں ان واقعات کی تلاش و جستجو کا بھلا کے علم تھا ورنہ علم و نور کے سوتوں سے اسی وقت استفادہ کر لیا جاتا جب وہ جلوہ گلن تھے۔

پروفیسر سید نواب علی..... میرے چچا ہونے کے علاوہ ۱۹۵۸ء میں میرے خسر بھی ہو گئے میں ۱۹۵۰ء میں پاکستان آیا اور انہیں کے ساتھ آخر دم تک رہا۔ وہ اکثر رات کے ہانے کے بعد مولا ناصر محمد علی علامہ اقبال علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر مشاہیر کے واقعات مجھے سنایا

کرتے تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طور وہ ایادداشت توں کو قلم بند کر دیں۔ یا مجھے لکھوا دیں لیکن افکار زمانہ کے اس کی نوبت نہ آسکی۔ ۱۹۲۸ء میں پاکستان آنے کے فوراً ان کی جو نگر گڑھ کی پیشی تقریباً ساڑھے تین سو روپے ماہوار تھی بند ہو گئی پھر نیوتنی تصبہ لکھنؤ میں ان کی کئی لاکھ کی جائیداد جو انہیں دادا سے ورشہ میں ملی تھی ختم ہو گئی۔ کراچی کے قیام کے دوران چند در چند مصائب اور وسیع کنبہ کی ذمہ دار یوں نے ان کی یادداشت کو بے حد متاثر کیا۔ ۱۹۵۸ء تک وہ اگرچہ برابر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے لیکن آخر آخر میں ان کی یادداشت قطعی جواب دے گئی..... ہر یا کے پرانے مریض تھے۔ بالآخر جون ۱۹۶۱ء میں یہ منارہ نور بھگھیا اور ہم اکتساب فیض سے محروم ہو گئے وہ اگر زندہ ہوتے تو بھوپال اور اقبال سے متعلق کچھ اور واقعات جن کا جستہ جستہ ذکر ان کے روز نامچوں میں ملتا ہے روشنی میں آ جاتے لیکن افسوس

آں قدح بشکست و آں ساقی نمامد



اقبال، راس مسعود اور ضرب کلیم

بھوپال سے لاہور واپس پہنچ کر اقبال پھر اپنے معمولات و مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ ان مصروفیات میں سب سے مقدم ضرب کلیم کی اشاعت تھی جو تمکیل کے آخری مرحلہ میں تھی اس سے باوجود راس مسعود سے قلمی ربط تعلق بددستور قائم رہا۔ نیازی صاحب دہلی میں سے لاہور منتقل ہو چکے تھے۔ اس لیے اب بھوپال سے متعلق ان کے نام خط بھیجنے کا سوال ہی پد یا نہیں ہوتا تھا۔ اقبال نامہ میں ۱۹۳۶ء کے دوران میں وقف و قفر سے چار خطوط راس مسعود کے نام متے ہیں اور ایک خط سلیمان ندوی کے نام جن سے اس دور کی صرف چند جھلکیاں ہمارے سامنے آتی ہیں اور بس ۱۹۳۶ء پر میل ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچنے کے بعد یقیناً اقبال اور راس مسعود کے درمیان خطوط کا تبادلہ ہوا ہو گا۔ لیکن افسوس کہ یہ خطوط دستیاب نہیں ہو سکے صرف دو خطوط اقبال نامہ میں ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں دونوں کے درمیان قلمی ربط تعلق قائم تھا۔

”لاہور.....مسی ۲۱۹۳۶ء“

ڈیر مسعود

کئی دن سے تمہارا خط نہیں ملا میں منتظر ہوں۔ خیر خیریت تو لکھ دیا کیجیے۔ اگر تم مصروف ہو تو ممنوں صاحب سے کہہ دیجیے کہ دو حرف لکھ دیا کریں۔ میری صحت خدا کے فضل سے بحال ہو گئی ہے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس بیماری سے پہلے جو حالت تھی وہ عود کر آئی ہے

البنت آواز میں ابھی ترقی نہیں ہوئی جتنی کہ امید تھی۔ گو پہلے سے بہتر ہے۔ نیازی اور انجمن حمایت اسلام کی عرض یا داداشت کا کیا ہوا؟ کیا تم نے سر آغا خاں والے معاملے کا اعلیٰ حضرت سے ذکر کیا تھا؟ یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ اعلیٰ حضرت کیا خیال کریں۔

زیادہ کیا لکھوں پنڈت جواہر لال نہروں کا خط آیا تھا۔ آج کل مسٹر محمد علی جناح لاہور آئے ہوئے ہیں اور یہاں کی مختلف پویشکل پارٹیوں میں اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ تم اور نیگم صاحبہ اچھے ہوں گے۔

محمد اقبال،

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۸-۳۷۹

اس خط کا ابتدائی ٹکڑا..... کئی دن سے تمہارا خط نہیں ملا اس بات کا غماز ہے کہ ۱۹ اپریل اور ۲۴ مئی کے دوران خطوط کا تبادلہ ضرور ہوا لیکن راس مسعود کی طرف سے انہیں جواب نہیں ملا۔ چنانچہ ابتدائی سطروں میں اس کا اظہار کیا ہے۔ اگر تم مصروف ہو تو ممنون صاحب سے کہہ دیجیے کہ دوہر ف لکھ دیا کریں،

ان کی صحت خدا کے فضل سے بحال ہو گئی تھی جس کا ذکر اس خط میں ملتا ہے۔ انہیں نیازی صاحب اور انجمن حمایت اسلام سے جو قربت اور وابستگی اس کا سبھی کو علم ہے۔ ان دونوں کے گلے انہوں نے نواب صاحب کی خدمت میں سفارش کے ساتھ عرض داشتیں بھی راس مسعود کے توسط سے پیش کرائی تھیں۔ چنانچہ ان کے نتیجے کی انہیں فکر تھی جیسا کہ اس خط کے نضمون سے ظاہر ہے۔

سر آغا خاں کا معاملہ وہی وظیفہ کا ہے جس کا گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے۔ معلوم نہیں اعلیٰ حضرت کیا خیال کریں۔ کاظمیا اقبال کے قلندرانہ مزاج کا واضح نقش ہے جو ایک محسن کے ہوتے ہوئے کسی اور کا احسان مند ہونا گوار نہیں کرتا۔ ویسے یہ معاملہ اسی وقت ختم ہو چکا تھا۔

اسی خط میں پنڈت نہر و اور قائد اعظم محمد علی جناح کے تذکرے اس بات کے غماز ہیں کہ لا ہور پھر سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ کاغذ اور مسلم لیگ کے سربراہ صوبہ پنجاب سے حمایت حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

اس خط کے بعد بظاہر آخر جولائی تک خاموشی اڑھی لیکن واقعتاً وہ اس عرصے میں اپنے نئے مجموعہ کلام ضرب کلیم کی اشاعت میں مصروف رہے جس کا تذکرہ ہمیں عبدالحمید سالک کی کتاب ذکر اقبال میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

”..... چونکہ بر قی علاج کے لیے بھوپال جانا ضروری تھا۔ اس

لیے مارچ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں دہلی ہوتے ہوئے بھوپال پہنچ گئے۔ ۱۹ اپریل کو بھوپال سے واپس آگئے اور ضرب کلیم شائع فرمائی اور چند ماہ بعد ستمبر میں پس چہ باید کرداے اقوام شرق کو مکمل کر کے شائع کر دیا۔“ -

خود اقبال کے ایک خط بناًم خواجہ غلام السیدین مورخہ ۱۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء سے ہمیں ضرب کلیم کے سلسلے میں ان کی مصروفیت کا علم ہوتا ہے اقتباس ملاحظہ ہو۔

”ضرب کلیم کے پروف دیکھ رہا ہوں۔ امید ہے مجی کے آخر

تک کتاب چھپ جائے گی۔“ -

لیکن کتاب مئی کے بجائے جولائی کے آخر تک مکمل ہو سکی جیسا کہ کیم اگست کے اس خط

سے ظاہر ہوتا ہے۔

” لاہور کیم اگست ۶ ۱۹۳۶ء ”

ڈیر مسعود..... آج میرے مشی طاہر دین آپ کی خدمت میں
ضرب کلیم کی چھ مجلد کا پیاں ارسال کر رہے ہیں ان میں سے ایک
کاپی آپ کی ہے اور باقی خاندان شاہی کے لیے اعلیٰ حضرت کے
لیے ایک ہر ہائی نس کے لیے۔ ایک شہزادی ولیعہد کے لیے اور دو اعلیٰ
حضرت کے دونوں بھتیجوں کے لیے۔

۱۔ صرف ایک غیر مطبوعہ خط ۲۹ جون ۱۹۳۶ء کامل سکا جو گز شنیہ صفحات میں شامل ہے۔

۲۔ ذکرِ اقبال۔ صفحہ ۲۰۲

۳۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۱۷

اعلیٰ حضرت کے لیے جو کاپی ہے اس پر یہ نام کتاب کے صفحہ پر
ڈیڈی کیشن کے اشعار کے نیچے لکھا ہے اگر کوئی اور کاپی مطلوب ہو تو
اطلاع دیجیے۔

ڈاکٹر عبدالباسط صاحب اور شعیب صاحب کے لیے علیحدہ
پارسل میں کاپیاں ان کے نام ارسال کی گئی ہیں۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ بیگم مسعود سلام قبول کریں۔
جاوید سلام عرض کرتا ہے۔ علی بخش بھی آداب کہتا ہے.....

والسلام

محمد اقبال

میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں شاید سردیوں میں بھوپال

آؤں۔“

”ضرب کلیم“ شائع ہو گئی اور اس کی خصوصی آٹھ کا پیاس تیار ہو کر بھوپال پہنچ گئیں۔ راس مسعود کے علاوہ پانچ کا پیاس شاہی خاندان کے لیے انہوں نے ارسال کی تھیں۔ نواب صاحب بھوپال بیکم صاحبہ بھوپال شہزادی عابدہ سلطان۔ (ولی عہدہ ریاست) اور اعلیٰ حضرت کے دونوں بھتیجوں۔ سعید الظفر خاں اور رشید الظفر خاں کو ضرب کلیم کے نئے پہنچا دیے گئے۔ دو کا پیاس ڈاکٹر عبدالباسط اور شعیب قریشی کے نام اقبال نے علیحدہ پارسل میں روانہ کر دیں۔ ڈاکٹر عبدالباسط کے نام جو نئے اقبال نے اپنے دستخطوں سے بھیجا تھا۔ وہ ان کے صاحبزادے عبدالحی صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ جس کا عکس کتاب میں شامل ہے اصل کتاب میں نے اقبال اکیڈمی میں محفوظ کرادی ہے ضرب کلیم اور پس چہ باید کردا ہے اقوام شرق کے دستخطی نئے شہزادہ عابدہ سلطان جو میر کراچی میں سکونت پذیر ہیں کے پاس محفوظ تھے جن کی فوٹو کا پیاس شامل کتاب ہیں۔ ضرب کلیم کی اشاعت کے بعد انہوں نے اپنی توجہ اس کتاب پر مبذول کر دی جس کا وعدہ انہوں نے نواب صاحب بھوپال سے کیا تھا۔

شاید سردیوں میں بھوپال آؤں کیم ۱۹۳۶ء کے خط کا یہ ٹکڑا۔ اس بات کا غماز ہے کہ وہ جلد ہی پھر بھوپال جانے کا عزم رکھتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ذیل کا یہ خط اس امر کی مزید تصدیق کرتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے کے لیے کتنے مضطرب تھے لکھتے ہیں:

” لاہور ۷ اگست ۱۹۳۶ء ”

مندوی..... السلام علیکم..... ولانا مہما بھی ملا ہے آ کی صحت کی خبر
پڑھ کر بہت خوشی ہوئی خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ وسلامت
رکھے۔ میری صحت کی حالت بہتر سبقت میں گواہ میں

کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب کو لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس میں آ کے مشورہ کی ضرورت ہے۔ بدروالی بازغہ بھی اسی مطلب کے لیے متنوائی ہے۔ اس کا ب میں زیادہ تر قوانین اسلام پر بحث ہو گی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے متعلق جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں براہ مہربانی کر کے ان کے ناموں سے مجھے آگاہ کر دیجیے۔ اور یہ بھی فرمائیے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۸-۳۷۹

الحمد للہ کہ اب قادریانی فتنہ پنجاب سے رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔
مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی تک بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ اگر آپ کی صحت اجازت دے تو ایک جامع و نافع بیان شائع فرمائیے۔ میں بھی تیسرا بیان انشاء اللہ جلد لکھوں گا اس کا موضوع ہو گا بروز لفظ بروز ا کے متعلق اگر کوئی نقطہ آپ کے ذہن میں ہو تو یا کہیں صوفیا کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتہ دیجیے۔ نہایت شکر گزار ہوں گا۔

موسیٰ جاراللہ صاحب کی کتاب نہایت عمدہ ہے ملنے کا پتہ کتاب پر لکھا ہے۔

مکتبہ الخانجی شارع عبدالعزیز مصر

امید کہ مزانج والا بخیر و عافیت ہو گا۔ والسلام

مخلص محمد اقبال سے۔

ان دنوں اقبال کی توجہ دو خاص امور پر مرکوز تھی۔ اول مسئلہ قادیانی جس کے متعلق ان کے دو بیانات چھپ چکے تھے تیسرا وہ لکھ رہے تھے۔ ان کی خواہش بھی یہی تھی کہ ندوی صاحب بھی اس سلسلے میں بیان شائع فرمائیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اب قرآن مجید کے حواشی کے لیے ضروری مواد بھی جمع کر رہے تھے۔ یہ کتاب وہ انگریزی میں لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی صاحب سے ممکنہ اعانت کے طالب تھے جیسا کہ مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہے کہ انہیں اپنے وعدے اپنی ذمہ داری اور اپنے وقت کے صحیح مصرف کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس خط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

پنجاب میں تینہ قادیانی کا زور اگر چڑھ گیا تھا۔ لیکن اپنے نیازمندوں کی خواہش پر اقبال اپنے تیسرے بیان کی تیار میں مصروف تھے اور اس سلسلے میں سید صاحب کی رہبری اور اعانت کے طالب تھے۔ راس مسعود کے نام ۲۱۹۳۶ء کے خط میں پنڈت نہرو کا تذکرہ غالباً اقبال کے اس بیان سے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ جوانہوں نے مسئلہ قادیانی کے بارے میں دیا تھا جس کے جواب میں پنڈت نہرو کا تذکرہ غالباً اقبال کے اس بیان سے متعلق معلوم ہوتا ہے جوانہوں نے مسئلہ قادیانی کے بارے میں دیا تھا۔ جس کے جواب میں پنڈت نہرو نے بھی ایک بیان شائع کر دیا جس میں کانگرس کے مفادات اور اپنے مخصوص خیالات و تصورات کے پیش نظر اقبال پر اعتراضات کیے تھے۔ مجلس احرار اور جماعت احمدیہ کے درمیان مسئلہ ختم نبوت کی نزاعی مشکل سے پنڈت جی نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی کانگرس کا مفاد اسی میں تھا کہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی نہ ہو سکے اور مذہبی فرقے آپس میں دست و گرد بیاں رہیں پنڈت نہرو کی اسلامی شعائر اقدار و تعلیمات سے ناواقفیت کا اندازہ ان کے بیان سے ظاہر تھا چنانچہ اقبال نے اپنے تیسرے بیان میں ان

امور کی وضاحت ضروری تھی۔ یہ بیان جب شائع ہوا تو کتنے ہی گوشے واضح ہو کر سامنے آ گئے اس سلسلے میں نیازی صاحب فرماتے ہیں:

”..... دراصل پنڈت جی نے بلاوجہ ایک ایسی بحث میں دخل اندازی کی تھی جس کے وہ اہل نہیں تھی۔ ان کی روشن بھی طالب علمانہ نہیں تھی بلکہ معتزلانہ یوں بھی ان کا خطاب ایک طرح سے حضرت علامہ ہی سے تھا اور اس لیے حضرت علامہ کے لیے بجز اس کے کہ ان سب حقائق کی تشریع فرمادیں جن کی طرف پنڈت جی نے اشارہ کیا تھا کوئی چارہ کا رنبیں تھا۔

۱ لفظ بروز کے معنی ناظہور کے ہیں مگر اس کے اصطلاحی معنی ملاحدہ عجم کی پیداوار ہیں۔

۲ موسیٰ جاراللہ مشہور روئی عالم مفکر یہ ہندوستان کی بار آپکے ہیں مجھ سے مکہ معظّمہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی یہ ترکی میں بہت سی اسلامی کتابوں کے مصنف ہیں۔ (سید سلیمان ندوی)

سم اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۹۸ تا ۲۰۰

پنڈت جی کے بیان کو بے جواب چھوڑ دینا ایک طرح سے اعتراض شکست تھا جس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچتا تھا۔ ہندا کچھ دنوں کی روکد کے بعد حضرت علامہ نے فیصلہ کیا کہ ایک طویل بیان شائع کریں۔ حالانکہ انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ اور حکیم صاحب بھی فرم اچکے تھے۔ کہ ڈاکٹر صاحب کو دماغی حت سے احتراز کرنا چاہیے۔ بایس ہمہ حضرت علامہ نے یہ طویل بیان جس نے آگے پل کر ایک مضمون کی شکل اختیار کی رقم فرمایا۔ چنانچہ

یہی بیان ہے جو بعد میں اسلام اور احمدیت کے عنوان سے شائع ہوا
ہے۔

راس مسعود اور بھوپال سے خط و کتابت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ضرب کلیم پہنچنے کے بعد جب راس مسعود کا خط انہیں ملا تو انہوں نے فوراً جواب دیا۔

۷ اگست کا یہ خط ملاحظہ ہو:

” لاہور ۷ اگست ۱۹۳۶ء ”

ڈیر مسعود..... تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ خیریت ہے
میرا بھی یہی فیصلہ ہے جو تم نے کیا ہے۔ یہ واقعی اٹل ہے کہ میں نے تو
پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے بھی استغفار دے دیا ہے بورڈ کی
میٹنگ کل ہو گی آج کے سوچ اینڈ ملٹری گزٹ میں جونوٹ اس
استغفار پر نکلا ہے ممکن ہے تمہارے ملاحظہ سے گزر ہو۔ بورڈ کے ممبر
اصرار کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لیے اسے ملتی کر دوں۔ بہر حال
اس ماہ کے اختتام تک میں اس کی صدارت سے دستبردار ہو جاؤں
گا۔ جس روز کتب تمہارے نام ارسال کی گئیں اس روز صرف آٹھ
کتابیں جلد ہو کر آئی تھیں۔ آٹھ کی آٹھ بھوپال ارسال کردی گئیں۔
بعد میں جو جلدیں ہوئیں وہ Inferior قسم کی جلدیں تھیں۔
اس واسطے لیدی مسعود کے نام ارسال نہ کی گئی۔ امید ہے کہ کل تک
اور عمدہ جلدیں بن کر آئیں گی تو انہیں ارسال کروں گا۔ مطمئن رہیے
مجھے یاد ہے بھولانہیں ہوں۔ اعلیٰ حضرت کا خط بھی نہایت تلفظ
آمیز تھا جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ باقی رہی کتاب سو یہ

ایک Topical چیز ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عرض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک اعلان جنگ ہے زمانہ حاضر کے نام اور ناظرین سے میں نے خود کہا ہے کہ میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ۔

نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں ہے۔ اس کتاب کا نام ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی تلافی سے کی گئی ہے۔ Realistic Epigrammatic Style

والسلام

محمد اقبال

۱۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۲۷

۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۹۳۷

اس خط سے پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے استغفار کا حال ہی نہیں اس کا پس منظر بھی واضح ہو جاتا ہے۔ پنجاب کی سیاسی فضا اقبال ایسے صاحب فکر و عمل کے لیے بالآخر ناساز گار ثابت ہوئی اور وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

لیڈی مسعود کو اقبال نے ضرب کلیم نہیں بھیجی تھی۔ چنانچہ راس مسعود نے بیگم کا شکوہ ان تک پہنچایا وہ راس مسعود ہی نہیں بیگم راس مسعود کے بھی بے حد ماح قدر دا ان اور ان کے اعلیٰ ادبی ذوق کے معرف تھے۔ ان کی شکایت پر بھلا کیوں نہ توجہ دیتے۔ وضاحتاً لکھا کہ صرف آٹھ جلدیں اعلیٰ قسم کی ابتدأ تیار ہو کر آئی تھیں۔ باقی جلدیں معمولی قسم کی تھیں اس واسطے لیڈی مسعود کو نہیں بھیجی گئی۔ لیکن جلد ہی عمدہ جلد کی کتاب بھیجنے کا وعدہ کیا۔

اس خط کا آخری حصہ خصوصیت سے قابل غور ہے۔ ضرب کلیم اگرچہ بقول اقبال
ٹاپیکل یا موضوعاتی مجموعہ کلام ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی قدر و اہمیت کم نہیں ہوتی۔ بلکہ
کمھ بڑھتی جاتی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے انقلابی اور خلفشاہی دور کا اندازہ کیجیے اور پھر اس مجموعہ
کی تخلیقات پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان موضوعات پر صرف اقبال ہی قلم
اٹھا سکتے ہیں۔ اور سوئی ہوئی مسلم قوم کو بیدار کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ واقعی یہ مجموعہ
زمانہ حاضر کے نام اعلان جنگ تھا اور ناظرین سے ان کا تناخاطب یوں تھا:

میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
وہ نوائے چنگ کو غیر موزوں قرار دیتے تھے۔ البتہ کتاب کے ریکٹک حقیقت پسندانہ
ہونے کو ضروری سمجھتے ہیں اور نوائے چنگ کی تلافی کے لیے انہوں نے جوان داڑھ اختیار کیا ہے
اسے اپنے یہی بیک اشائل تلمیحاتی اسلوب کا نام دیا ہے۔ ویسے بھی یہ مجموعہ ان کے عام
مجموعوں سے کئی اعتبار سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔ جیسا کہ ایک اور جگہ ضرب کلیم کی
اشاعت کے دوران خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط مورخ ۲۱ جون ۱۹۳۶ء میں جو
انہوں نے لاہور سے بھیجا تھا اس مجموعہ کے بارے میں خود اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جو کئی
لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

”..... ضرب کلیم امید ہے جون کے آخر تک شائع ہو جائے گی
اور میں آپ کو ایک نسخہ پیش گی بھیج سکوں گا۔ اس مجموعہ میں سے ایک
 حصہ تعلیم و تربیت کے لیے وقف ہے ممکن ہے کہ آپ کو اس میں کوئی
 نئی بات نظر نہ آئے تاہم اگر کتاب آپ کو بروقت مل جائے تو محولہ بالا
 حصہ ضرور مطالعہ فرمائیے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ Leibnitz's Monadism کے

تعلیمی نتائج سے واقف ہیں۔ اس قیاس کے مطابق انسانی مونیڈ خارج سے کوئی اثر قبول کرنے سے عاری ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ انسانی مونیڈ زیادہ تاثر پذیری قوت کا حامل ہے۔ زمانہ ایک بڑی سی برکت و نعمت ہے (الاتسیو الدھران الدھر حوالہ اللہ) اگر ایک طرف موت اور تباہی لاتا ہے تو دوسری طرف وقت کی ہی آبادی و شادابی کا منع ہے۔ یہی اشیاء کے پوشیدہ امکان کو ہر دن کار لاتا ہے حالات حاضرہ میں تغیر کا امکان ہی انسان کی سب سے بڑی دولت اور سماں کو ہے۔“

لے اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۱۵-۳۱۶

نامناسب نہ ہو گا اگر ضرب کلیم کے پہلے اور انتساب کے صفحات پر ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ یہی وہ تاریخی مجموعہ ہے جو اقبال اور ناب صاحب کے ذاتی مراسم اور تعلقات کی دائمی یادگار ہے۔ کتاب کھولتے ہی ضرب کلیم کا پہلا صفحہ ہمیں چونکا دیتا ہے:

ضرب کلیم

یعنی

اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثال نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے

خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر
(اقبال)

”ضرب کلیم“ کو انہوں نے نواب حمید اللہ خاں کے نام معنوں کرتے ہوئے جس انداز میں انہیں خراج تحسین ادا کیا ہے اس سے ان کی تصرف نگاہی کا قائل ہونا پڑتا ہے:
اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خاں فرمائ روائے بھوپال کی خدمت میں:

زمانہ با امم ایشیا چہ کرد و ند
کسے نہ بود کہ ایں داستان فرو خواند
تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است
دل تو بیند و اندیشه تو می داند
گبیر ایں ہمہ سرمایہ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

اس انتساب کے دو مصروع خصوصیت کے ساتھ نواب حمید اللہ خاں سے اقبال کی گہری عقیدت اور وابستگی کے آئینہ دار ہیں:

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است
دل تو بیند و اندیشه تو می داند

نواب حمید اللہ خاں کو جب یہ عظیم تھفا اپنے دوست کی جانب سے موصول ہوا ودیر یہ نہ
تعلق کی بنا پر انہوں نے اقبال کا رسی نہیں بلکہ قلبی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ والیان
ریاست میں ایسے صاحبان علم و نظر کتنے ہوں گے جو شاعران بالکمالی اس طرح قدر دانی
اور پذیرائی کے قائل ہوں گے۔ یا اسے ضروری سمجھتے ہوں۔ نواب صاحب نے جس محبت
سے انہیں خط لکھا۔ ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کا اظہار خط کے اس ٹکڑے سے ظاہر ہے۔

”..... اعلیٰ حضرت کا خط بھی نہایت تلطف آمیز تھا جو

انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا.....“

نواب صاحب کا یہ قلمی خط یقیناً کہیں نہ کہیں ضرور محفوظ ہو گا۔ میں نے جاوید اقبال کو اس سلسلے میں دو تین بار توجہ دلائی لیکن افسوس کہ وہ اس خط کے بارے میں رہبری کرنے سے قاصر ہے۔ کاش یہ خط مل جاتا تو دونوں کے ذاتی روابط اور مراسم کے کچھ اور پہلو سامنے آ جاتے۔ اس کتاب ضرب کلیم اور انتساب کا ایک اور پہلو وہ فکری ہم آہنگی بھی ہے جو اقبال اور نواب حمید اللہ خاں صاحب میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا اس مجموعہ کی نظموں میں موضوعاتی اعتبار سے جا بجا اظہار ملتا ہے۔ بعض کم نظر وہ اور کوتاه بینوں نے اس انتساب پر اعتراضات بھی کیے۔ لیکن حقیقت شناس نگاہوں نے ضرب کلیم کو نواب حمید اللہ خاں کے نام معنون کرنے میں کسی مصلحت یاد نیاداری کی کوئی جھلک نہیں دیکھی۔
نواب صاحب اقبال کے گرویدہ و شیدا تھے۔ وہ ان کی عظمت فن اور ان کے فکر و فلسفہ کا بارہا اعتراف کر چکے تھے اس لیے ان حلقائیں کا تجزیہ کیجیے تو انسانی سطح پر یہ انتساب حقیقت پسندی جذبہ نیاز مندی اور سپاس گزاری کے مساوا کسی اور جذبہ کا غمار نظر نہیں آئے گا۔ دونوں کے اس جذبہ مودت کا خوشامد تملق یا مدح سرائی سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ ایک شخص دوست کا دوسرے مخلص دوست کو خراج تحسین ہے اور بس۔

ضرب کلیم کے انتساب پر اقبال کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد بھی کتنی قیاس آرائیاں کی گئیں ان گنت اعتراضات ہوئے حتیٰ کہ ان کے بعض شرپسند پرستاروں جوانہیں انسان سے زیادہ پیغمبر اور مافق البشر ہستی سمجھنے لگے تھے۔ اسے ان کی سبکی قرار دیا اور طرح طرح سے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی کہ چنانچہ اقبال کے ایک دیرینہ نیاز مند پروفیسر یوسف سلیم چشتی جن کے کئی مستند واقعات روزگار فقیر میں بھی شامل ہیں اس تقید و

اعتراض پر خاموش نہ رہ سکے اور انہوں نے حقیقت حال کا اظہار کر دیا لکھتے ہیں:

”میں نے اس انتساب کی علت پر بار بار غور کیا۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مرحوم بہت احسان شناس واقع ہوئے تھے اور میں ذاتی تجربہ کی بنابر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص ان کے ساتھ جب کوئی سلوک کرتا تو وہ اس کا تذکرہ ہمیشہ شکر گزاری اور ممنونیت کے رنگ میں کیا کرتے تھا۔“

مولانا الیاس برلنی کی دانست می اس کا جواز یہ تھا فرماتے ہیں:

”فرماں روائے بھوپال نے علامہ مرحوم و مغفور کی آخری زمانے میں جو قدرشناسی کی تھی تو علم پروری کی بڑی خصوصیت حاصل ہو گئی تھی۔ بھوپال گویا اقبال کا میزبان بن گیا۔ یہ مہمان داری قابل یادگار ہو گئی۔“

اور اس کا اعتراف تو ایک سے زائد بار اقبال نے راس مسعود کے خطوط میں کیا ہے مثلاً ۱۹۳۵ء کے خط بنا مرام راس مسعود کا یہ اقتباس:

”اعلیٰ حضرت کے مراحم خروانہ کا کس زبان سے شکر ادا کروں کہ بھوپال میں میری آصائش کا ان کا اس قدر خیال ہے۔“

۱۔ شرح ضرب کلیم صفحہ ۲۱-۲۲

۲۔ گورنمنٹ جمیڈ یہ کانج میگزین بھوپال ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۹

۳۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۰

اقبال کی وفات کے پورے چوبیس سال بعد یعنی ۱۹۶۲ء گورنمنٹ جمیڈ یہ کانج بھوپال کے ایک طالب علم شبیر اقبال ایم اے (علیگ اردو) (ایم اے سال اول انگریزی) کا ایک

مختصر مضمون کا جمیگرین میں ”اقبال اور بھوپال“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون کے بعد اقتباسات سے ضرب کلیم اس کے انتساب اور اقبال اور نواب صاحب کے باہمی روابط پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے ملاحظہ ہو:

”..... جہاں کسی شاعر کے پیغام کو سمجھنے اور اس کی روح فن کی

گھرا بیوں تک پہنچنے کی لیے اس کے کلام کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

وہاں اس کے گرد و پیش کے حالات اس کے زمانے کے سیاسی تہذیبی

تمدنی شور اور سب سے بڑھ کر خود اس کی دلی کیفیات کو سمجھنا ضروری

ہے۔ اقبال ہماری زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔

ان کے پورے کلام میں ضرب کلیم کو جو حیثیت حاصل ہے اسے

کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس میں اقبال اپنے فن کے انتہائی عروج

عروج پر ہیں۔ فلسفہ تصوف اسلامیات اور میں الاقوامی اثرات غرض

ضرب کلیم میں وہ سب کچھ ہے جو اقبال کی اہم خصوصیات ہیں یہی

نہیں بلکہ اقبال نے ضرب کلیم میں ان مسائل پر بھی شعر کہے ہیں جن

کا تعلق نہ تو ان کے وطن عزیز ہند سے ہے اور نہ ان کی قوم سے۔ اس

کی سب سے اچھی مثال مسوی نی اور جمعیت اقوام مشرق ہیں۔ ضرب

کلیم ان فلسفیانہ نظموں سے پر ہے۔ انہوں نے تعلیم معاشرت

سیاست عورت تعلیم نسوان وغیرہ مختلف عنوانات پر اپنے مخصوص اور

منفرد انداز میں بے شمار نکتے بیان کیے ہیں اور بعض نظمیں اس مجموعہ

میں اس قدر بلند پائے کی ہیں کہ بقول پروفیسر سلیم چشتی ان کی سرحد

الہام سے ملی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔“

ابھی تک ضرب کیم کو سمجھنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں ان میں
 بہت کم کامیابی نصیب ہوئی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فی
 الحال ہمارے سامنے اقبال کی نجی زندگی کے مختلف پہلو بے نقاب
 نہیں ہیں۔ اقبال کی شاعری کیونکہ اقبال نے کبھی اپنی باطنی نفسی
 تحریک کے بغیر کوئی شعر نہیں کہا اور ان کا تمام کلام آمد کا نتیجہ ہے۔
 آور دکواں میں کوئی دخل نہیں چنانچہ اپنے متعلق خود فرماتے ہیں:
 کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی
 دراصل ضرب کلیم کو سمجھنے کیلئے علامہ اقبال کو بھوپال سے جو تعلق
 رہا ہے اسے سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ضرب کلیم کی تمام
 اچھی نظمیں ان کے قیام بھوپال کے زمانے کی یادگار ہیں اور یہ ہماری
 بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ ان سب میں علامہ موصوف نے خود
 بھوپال کا حوالہ دینا ضروری سمجھا ہے۔ اقبال کو بھوپال اور خصوصاً
 نواب حمید اللہ خاں مرحوم سے جو تعلق تھا وہ بعد میں اس قدر رنگ لایا
 کہ اس نے ان سے ضرب کلیم کو نواب صاحب کے نام معنوں کرا
 کے چھوڑا۔“

اسی مضمون میں آگے چل کر اس انتساب کے اسباب و عمل پر روشنی بھی ڈالی ہے لکھتے

ہیں:

۱۔ گورنمنٹ حمید یہ کالج میگزین بھوپال ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۸

اس انتساب کی اہم وجہ ڈاکٹر اقبال کا ممنون احسان ہونا تھا بلکہ
 اقبال ان سے یعنی نواب حمید اللہ خاں سے ذاتی طور پر متأثر تھے۔

اور اپنے سیاسی فلسفہ کی عملی جدو جہد کا ضامن نواب صاحب کو سمجھتے تھے۔ اسی لیے اپنے ایک خطبہ میں جو دوسری گول میز کا نفلس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم نواب صاحب بھوپال پر کلی اطمینان ظاہر کرتے ہیں اور ان کی رائے کا ہمیشہ احترام کریں گے۔ اور ان کے فیصلوں کے پابند رہیں گے۔

درactual نواب صاحب سے ان کے تعلقات کی ابتداء اس وقت ہوئی جب دونوں دوسری گول میز کا نفلس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔ وہاں آپس کی ملاقاتیں رنگ لائیں اور دونوں ایک دوسرے سے بہت متاثر ہوئے۔

لندن سے واپسی کے بعد جب کشمیری عوام کی تحریک نے مہاراجہ کشمیر کے خلاف زور پکڑا اس وقت ڈاکٹر اقبال کے ایما اور مشورہ سے مہاراجہ نے نواب صاحب کو کے ثالث بننے پر زور دیا۔ اس سلسلے میں نواب صاحب کی منظوری لینے اور ضروری صلاح و مشورہ کے لیے ڈاکٹر اقبال دوبارہ بھوپال تریف لائے اور یہاں لمبے عرصہ تک قیام کیا۔ اس وقت اقبال کے دوست اور دست راست سر راس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم تھے جس سے گویا ان کے تعلقات کی تجدید ہو گئی اسی زمانے کی یادگاریں اقبال کی مشہور نظمیں ”صحح“، ”تصوف“، ”وحی“، ”مومن“، ”مقصود“، ”حکومت“، اور ”نگاہ“، وغیرہ میں سلطانی جیسے پروفسر سلیم چشتی نے بلندی افکار اور عمق معانی کے لحاظ سے ضرب کلیم کی بہترین نظم قرار دیا ہے وہ بھی

اسی زمانہ قیام کی یادگار ہے۔

اس کے بعد ان تعلقات نے اور بھی وسعت اختیار کی۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک نے زور پڑا۔ اور ڈاکٹر اقبال نواب صاحب مرحوم کے مشورہ سے تحریک میں عملی طور سے شریک ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ مستی کردار کے لحاظ سے اقبال کو حلاج سے کوئی نسبت نہیں۔ داروں سن تو بڑی چیز ہے وہ سیاسی دنیا میں محمد علی جو ہر داں، اجمل، نہرو نہ بن سکے۔ پھر بھی ہر سیاسی تحریک کے وہ دماغ سمجھے جاتے تھے اور ہر فیصلہ نواب صاحب کے صلاح و مشورہ کے بعد ہوتا تھا۔

ان تعلقات کی انتہا اس وقت ہوئی جس سر آغا خاں کی تحریک اور سر راس مسعود کی تائید و حمایت پر ڈاکٹر اقبال کو نواب صاحب نے منسٹری اپیش کی اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی خودداری قناعت اور آزادی کے پاؤں میں بیڑی ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔

۱۔ بھوپال میں وزارت کی پیش کش کا اس اقتباس کے علاوہ کوئی اور ثبوت نہیں مل سکا۔

اور اس طرح انکار کر دیا کہ پھر سر راس مسعود کو اصرار کی ہمت نہ ہوئی۔

اس مضمون کا آخری اقتباس خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتا ہے جس میں نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں اقبال اور نواب صاحب کے گھرے روابط کا تجزیہ کیا گیا ہے:

”.....رام پور حیدر آباد اور بھوپال کی تاریخ ایسے صد ہاوا اقuated سے بھری ہوئی ہے کہ جب کسی ادیب یا شاعر کو یہش بھا عطیات اور

گرائقد رانعامت وجایگیرات عطا کر کے اسیکر لیا گیا ہو۔ رام پور سے غالب حیدر آباد اور دار غ اور امیر میانی کو جو نسبت رہی ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں قابل ذکر ہے۔ مگر ڈاکٹر اقبال اور بھوپال کی نسبت اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے بالکل جدا گانہ اور انوکھی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تعلقات ایک نواب اور ایک درباری شاعر کے تعلقات نہ تھے جس کا کام کلام پر اصلاح کرنا یا تہذیت اور تقاریب کے موقع پر تصدیق لکھنا ہو بلکہ ایک رازدار دوست اور سچے ساتھی کے تعلقات تھے جنہوں نے ایک دوسرے کو گرویدہ بنالیا تھا اور جس نے اقبال کے کلام پر اور خصوصاً ضرب کلیم کی نظموں پر وہ اثرات ہیں جنہیں ہم بغیر ان دونوں کے تعلقات کو سمجھے ہوئے خیالات کی گہرائی اور روح تک نہیں پہنچ سکتے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اقبال کے وہ تمام خوط منظر عام پر نہ آ جائیں جو انہوں نے وقتاً فوقاً نواب صاحب مرحوم سر اس مسعود اور روز تعلیم بھوپال اور ممنون حسن خاں کو لکھے ہیں ۲۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اقبال اور بھوپال کے سلسلے میں جتنا کچھ مواد مجھے کئی سال کی سعی و تلاش اور مسلسل جدوجہد کے بعد دستیاب ہو سکا وہ اس کتاب میں پیش کر دیا گیا ہے لیکن ابھی کتنا ہی دستاویزی ثبوت ایسا ہو گا جو ریاست بھوپال میں انضمام کے بعد شائع ہو گیا یا منتشر ہو گیا۔ نواب صاحب کے خطوط اقبال کے نام اور اقبال کے خطوط نواب صاحب کے نام ہر ممکن کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ کبھی اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ان کی تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری رکھیں اور ان حقائق کو بے نقاب کر

سکیں جو اقبال اور نواب صاحب اور بھوپال کے گھرے روابط کی اساس تھے۔ پھر بھی جتنے واقعات اب تک علم میں آسکے ہیں ان میں سے یہ حقیقت یقیناً بے نقاب ہو گئی ہے کہ اقبال اور نواب بھوپال کے تعلقاً اگرچہ قطعی بنیادوں پر تھے لیکن بالواسطہ اس دور کی سیاست سے بھی ان کا کچھ حصہ پکھ ضرور تعلق تھا۔

ضرب کلیم بھوپال کے تیرے قیام ۲ مارچ تا ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء کے بعد جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اور کیم اگست ۱۹۳۶ء کو انہوں نے پہلی آٹھ مطلا جلدیں بھوپال ارسال کیں۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے۔ دو ماہ کے بعد ستمبر ۱۹۳۶ء میں ان کی مشہور مثنوی پس چہ باید کرداے اقوام شرق جس کا آغاز انہوں نے شیش محل بھوپال میں کیا تھا۔

۱۔ گورنمنٹ حمید کانج میگزین بھوپال ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۰۔

۲۔ گورنمنٹ حمید یہ کانج میگزین بھوپال ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۰۔

کمل ہو کر اشاعت پذیر ہوئی۔ اقبال نواب صاحب سے گھری واہنگی کے سبب صرف ضرب کلیم کے انتساب پر ہی مطمئن نہ تھے بلکہ کچھ اور تخفہ بھی ان کی نذر کرنا چاہتے تھے جیسا کہ ذیل کے خط سے ظاہر ہے فرماتے ہیں:

” لاہور ۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء ”

ڈیر مسعود۔ ابھی تمہارا خط ملا۔ کیا خوب میں گزشتہ رات علی بخش سے کہہ رہا تھا کہ مسعود کا خط کئی دن سے نہیں آیا فکر و تردید ہے۔ آج دو پھر کو تمہارا خط مل گیا۔ الحمد للہ میری صحبت دن بہ دن ترقی کر رہی ہے ارآواز میں بھی فرق آ رہا ہے۔ انشاء اللہ دربار رسالت میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے قبول ہو گا۔ امسال دربار حضور میں حاضری

کا تصد تھا مگر بعض موقع پیش آگئے۔ انشاء اللہ امید ہے کہ آئندہ سال اچھی بھی کروں گا۔ اور دربار رسالت میں بھی حاضری دوں گا۔ اور وہاں سے ایک ایسا تھنہ لاوں گا کہ مسلمانان ہندیا دکریں گے۔ یہ تھنہ بھی اعلیٰ حضرت کی نذر کیا جائے گا۔ خدا تعالیٰ انہیں عمر دراز عطا فرمائے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے لاہور میں ایکشن کی گرم بازاری ہے پنجاب میں ایکشن کے سلسلے میں اب تک دو قتل کی واردا تیس ہو چکی ہیں۔ سرحد پر پھر جنگ اور قصہ وہی مسجد شہید گنج کا۔ امید ہے لیڈی مسعود بخیریت ہوں گی۔ ان کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہے۔ جاوید بھی جو ابھی سکول سے آیا ہے سلام عرض کرتا ہے فروری یا مارچ میں دہلی جانے کا قصد ہے ممکن ہوا تو چند روز کے لیے بھوپال بھی آؤں گا۔

تمہارا مخلص محمد اقبال ہے۔

اس خط کا یہ حصہ..... ”ابھی تمہارا خط ملا ہے۔ کیا خوب میں گزشتہ رات علی بخش سے کہہ رہا تھا کہ مسعود کا خط کئی دن سے نہیں آیا لکر وتر ددھے۔ آج دوپہر کو تمہارا خط مل گیا“..... اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ دونوں میں برابر خطوط کا سلسلہ جاری تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خطوط کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے دل کی گہرائیوں سے زیادہ قریب تھے۔ یہ دونوں کی سچی دوستی قلبی تعلق اور خلوص و محبت کی انہاتھی پھر اسی خط سے دربار رسالت میں حاضری کی خواہش اور وہاں سے غیر معمولی تھنہ لانے کی آرزو کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اور اس عظیم و یادگار تھے کونو اب صاحب بھوپال کی نذر کرنے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

کس خلوص و محبت سے لکھتے ہیں:

”.....انشاء اللہ..... امید ہے سال آئندہ حج بھی کروں گا اور

دربار رسالت میں بھی حاضری دوں گا۔ اور وہاں سے ایک ایسا تھے
لاؤں گا کہ مسلمان ان ہندیا دکریں گے۔ یہ تھے بھی اعلیٰ حضرت کی نذر
کیا جائے گا۔ خدا تعالیٰ انہیں عمر دراز عطا فرمائے“

۱۔ سہوا رہ گیا۔

۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۸۲-۳۸۱

ضرب کلیم کے بعد ایک اور تھنہ نظر کرنا اور درازی عمر کی دعا کرنا۔ محض رسمی یارواہی جملے
نہیں بلکہ اس گہری عقیدت اور والہانہ وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں جو انہیں نواب صاحب سے
تھی اور نواب صاحب کو ان سے۔

لاہور میں ایکشن کی گرم بازاری سرحد پر جنگ اور قصہ وہی مسجد شہید گنج کا۔ اس خط
کے وہ اہم ٹکڑے ہیں جن سے اس دور کی سیاسی فضا کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
خط کے آخر میں دہلی جانے کا اظہار بھی ہے اور بھوپال جانے کا تذکرہ بھی۔
ممکن ہوا تو چند روز کے لیے بھوپال بھی آؤں گا.....

اس عبارت سے تعلق خاطر ہی نہیں۔ بھوپال سے ان کی خصوصی دلچسپی کا بھی اندازہ
ہوتا ہے۔ اب ان کی صحت پہلے سے کافی بہتر تھی جیسا کہ خط کے شروع میں کہا ہے۔ الحمد للہ
میری صحت دن بدن ترقی کر رہی ہے آواز میں بھی فرق آ رہا ہے.....

وہ چوتھی بار بھوپال جانے کا عزم رکھتے تھے لیکن حالات کی ستم طریقی نے اس کا موقع
نہ دیا۔ وہ اپریل میں دہلی ضرور گئے لیکن حکیم ناپینا صاحب کو دکھا کر دوسرا ہی روز لوٹ
آئے۔ اس سفر کا تذکرہ ان کے ۱۹۴۷ء کے خط میں ملتا ہے جو آئندہ صفحات میں

شامل ہے۔

نواب بھوپال اور ارمغان حجاز

نواب صاحب بھوپال کے نام ایک اور تخفہ نذر کرنے کا تذکرہ دراصل ارمغان حجاز کے بارے میں ہے۔ یہ مجموعہ اس قت شائع ہوا جب راس مسعود بھی دنیا میں نہ رہے اور اقبال بھی شیخ عطا اللہ مرتب اقبال نامہ لکھتے ہیں:

”اقبال کی احسان مندی کا حال یہ تھا کہ انہوں نے اپنی کتاب ارمغان حجاز بھی نواب صاحبی کی نظر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس کی اطلاع انہوں نے سر سید راس مسعود کو دی تھی۔ سر راس مسعود اقبال سے پہلے فوت ہو گئے اور ارمغان حجاز اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس طرح اقبال کی اس خواہش و وعدہ کا جواب ایک گونہ وصیت کا حکم رکھتا ہے۔ کسی کو علم نہ ہوا،“

نادرہ مسعود کی پیدائش پر تاریخی قطعہ

مارچ ۱۹۳۷ء میں راس مسعود کو اللہ نے چاند سی پنجی عطا کی جس کا نام اقبال نے نادرہ رکھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی پیدائش پر تاریخی قطعہ بھی لکھا جو خوش نصیبی سے فقیر و حید الدین کو مل گیا۔ اور انہوں نے محفوظ کر دیا۔ اس کے بارے میں تفصیلات انہیں کی زبانی سنئے:

”ڈاکٹر صاحب نے نادرہ مسعود کی پیدائش پر تاریخی قطعہ قلمبند کرایا۔ یہ کیم مارچ ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے۔ یہ اشعار جواب تینس سال قبل کہے گئے تھے کسی کتاب یا رسائل میں آج تک شائع نہیں ہوئے۔ پہلی بار اس کتاب کی زینت بنے ہیں۔“

ان اشعار کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ سر سید احمد خاں کے پورے خاندان کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے گھرانوں میں لڑکی پیدا ہونے پر جس سردمہری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اس کا ازالہ ڈاکٹر صاحب نے ان اشعار میں بڑے ہی حکیمانہ انداز میں فرمایا ہے:

راس مسعود جلیل القدر کو
جو کہ اصل و نسل میں محدود ہے
یادگار گھر سید والا
نور چشم سید محمود ہے
راحت جان و جگر دختر ملی
شکر خالق منت معبد ہے
خاندان میں ایک لڑکی کا وجود ہے
باعث برکات لا محدود ہے
کس قدر برجستہ ہے تاریخ ائمہ
با سعادت دختر مسعود ہے

کیم مارچ ۱۹۳۷ء بھوپال (محمد اقبال) ۲۔

یہ قطعہ بھوپال بھیجنے کے بعد جب کئی دنک راس مسعود کا جواب نہیں آیا تو انہوں نے ۱۹ اپریل کو خط لکھا ان کی لیڈی مسعودی اور نومولود بچی کی خیریت دریافت فرمائی اور اس افواہ کا تذکرہ بھی کیا جاں کے متعلق تھی اور بعد میں غلط ثابت ہوئی لکھتے ہیں:

”لا ہو ر.....۱۹۳۷ء پریل ۱۹۳۶ء“

ڈیر مسعود کئی دنوں سے تمہاری خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ لیڈی مسعود اور بچی خدا کے فض و کرم سے مع الخیر ہوں گی۔ ان کی خیریت سے مطلع کیجیے۔ میں ایک روز کے لیے دہلی گیا تھا۔ حکیم نایبنا کی دوائی سے صحت بہت ترقی کر رہی ہے۔ تم اپنی خیریت سے مطلع کرو۔ گرمی کا آغاز لا ہو ر میں ہو گیا ہے۔ گورات کو ذرا سردی ہو جاتی ہے۔ رات میں نے ایک کشمیری بزرگ سے سنا کہ تم کشمیر کے ہوم منستر بننے والے ہو۔ کیا اس افواہ میں کوئی صداقت ہے؟..... امید نہیں کہ اعلیٰ حضرت نواب بھوپال صاحب تم کو بھوپال چھوڑ نے کی اجازت دیں گے۔

والسلام تمہارا مخلص

محمد اقبال۔

میں نے یہ خط ایک دوست سے لکھوایا ہے۔ معاف رکھنا۔ آنکھ کا معاشرہ کرایا ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دوسرے معاشرہ تک لکھنا پڑھنا بند کر دو۔ جاوید تم کو اور لیڈی مسعود کو سلام کہتا ہے اور علی بخش بھی سلام عرض کرتا ہے۔

راس مسعود کے بھوپال چھوڑ کر کشمیر جانے کی افواہ حسب موقع غلط ثابت ہوئی:

۱۔ یکم مارچ ۱۹۳۷ء کو اقبال لا ہو ر میں تھے۔ لفظ بھوپال شاید اس مسودہ میں لکھا ہو گا جو

فقیر و حیدر الدین کی نظر سے گزرا ہو گا اس لیے سہواً کتاب میں بھی درج ہو گیا۔

مسلسل لکھنے پڑھنے اور دیگر علمی مشاغل میں اگاتار مصروفیت ان کی بینائی کو منتاثر کیا تھا۔ چانچپچے یہ خط وہ خود نہیں لکھ سکے بلکہ کسی دوست سے لکھوا یا اور اس کی معذرت بھی کر لی۔ موسم گرم میں نواب صاحب عموماً شمیر یا نینی تال جاتے تھے جب سے راس مسعود بھوپال آگئے تھے۔ وہ بھی اکثر ان کے ہمراہ جانے لگے تھے۔ اس خط میں یہ دریافت کرنا کیا آپ اس دفعہ شمیر جانے کا قصد کر رہے ہیں؟ اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن راس مسعود کشمیر نہیں جا سکے۔ کیونکہ آئندہ چند ماہ میں جو انقلابات رونما ہوئے ان کی اس سے تصدیق ہوتی ہے۔ ۸ جون کا خط ملاحظہ ہو:

”لاہور..... ۸ جون ۱۹۳۷ء“

ڈیر مسعود..... تمہارا خط آج مل گیا۔ جسے پڑھ کر اطمینان ہوا۔
دعا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہاری بچی کو جلد صحت یا ب کرے۔ تاکہ تم
دونوں کو اطمینان قلب حاصل ہو۔

جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے لیے اور گھر کے عام انتظام کے لیے جو ایک مدت سے بگڑا ہوا ہے۔ میں نے فی الحال عارضی طور پر علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون کو جا اسلامی معاشرت سے واقف ہے اور اردو بول سکتی ہے۔ بلوایا ہے۔ پروفیسر شید احمد صدیقی اور دیگر احباب نے اس کی شرافت کی بہت تعریف کی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کامیاب ہو گئی تو مجھے بے فکری ہو جائے گی۔
جاوید کی عمر اس وقت تقریباً تیرہ سال ہے اور منیرہ کی تقریباً سات سال۔ ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں

اسی واسطے میں نے مذکورہ بالا انتظام کیا۔ یہ جرمن لیڈی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن ہے جو ایک مدت سے علی گڑھ میں مقیم رہی ہے۔ شاید تم انہیں جانتے ہو گے۔ باقی تمہارے خط سے مجھے بے انہا تسلی ہوتی ہے۔ اور تمہارا وعدہ بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ زیادہ کیا لکھوں؟ گرمی شدید ہے۔ علی بخش سلام کہتا ہے اور جاوید سلام عرض کرتا ہے۔

ہاں تم کوں کر تجب ہو گا کہ سرا کبر حیدری کا خط مجھ کو ندن سے آیا ہے اور بہت دل خوش کرن ہے۔

والسلام

محمد اقبالؑ۔

راس مسعود کی بچی علیل ہو گئی تھی۔ وہ اس کی علاالت کے سبب پریشان تھے۔ راس مسعود کا خط ملا تو انہوں نے بچی کی صحت یابی کی دعا فرمائی۔ اور اپنے دونوں بچوں جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے سلسلے میں جرمن خاتون کی خدمات حاصل کرنے کی تفصیلات بھی بیان کر دیں۔

اس خط کا یہ یکٹرا..... ”باقی تمہارے خط سے مجھے بے انہا تسلی ہوتی ہے“، رفاقت اور دوستی کے ان گہرے رشتؤں کی نشان دہی کرتا ہے جو دونوں میں قائم و مستحکم تھے۔ اس خط میں سرا کبر حیدری کے خط کا بھی ذکر ہے جو انہیں اندن سے ملا تھا۔ اور دل خوش کرن تھا۔ اس کا تعلق حیدر آباد کن کی کسی نئی نسل پیش کش ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ بھوپال کے ساتھ وابستگی سے قبل حیدر آباد کن سے جو انہیں تعلق خاطر رہا ہے۔

اس کی تفصیلات نظر حیدر آبادی مرحوم کی کتاب ”اقبال اور حیدر آباد“ میں پیش کی گئی ہیں۔ اقبال ایسے مرقدندر کے لیے اب حیدر آباد کی کسی نئی پیش کش میں صرف اتنی سی کشش رہ گئی تھی کہ وہ اپنے عزیزوں دوستوں کو دل خوش کرنا ایسے الفاظ ہی لکھ سکے۔

جوں کے فوراً ہی بعد ۱۰ جون کو انہوں نے پھر راس مسعود کو خط لکھا۔ راس مسعود کے نام یہ ان کا آخری خط ہے جس کا جواب بھی خوش قسمتی سے محفوظ رہ گیا اور اقبال نامہ میں شامل ہو گیا۔

”لاہور..... ۱۰ جون ۱۹۳۷ء“

ڈیر مسعود۔ پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardians مقرر کیے تھے۔ یہ ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے۔ جو سب رجسٹر ار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں (۱) شیخ طاہر الدین یہ میرے کارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

(۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنڈنٹ پرلیس برائچ سول سکرٹیریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

(۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب نج دبلی اے۔

(۴) عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں اس کی جگہ خال صاحب میاں امیر الدین سب

رجسٹر الا ہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۱۳ اعجاز شیخ احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صاحب آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لا ہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو.....
Guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ اس پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لا ہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہو تو لا ہور میں رہنے والے Guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لا ہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا۔ کہتے ہیں خدا اس کے لیے بہت منفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام۔ محمد اقبال سے،

راس مسعود نے اس خط کا فوراً جواب دیا۔ ان کا یادگار اور تاریخی خط ملاحظہ ہو:

۱۔ پرادرزادہ علامہ اقبال

۲۔ چاویدا اور منیرہ کے حقیقی ماموں

۳۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۸۶ تا ۳۸۸

”بھوپال ۱۹۳۷ء۔ ۱۲ جون“

نہایت پیارے اقبال..... تمہارا خط مورخہ ۱۰ جون ابھی ۳ بجے

میں نے بغور پڑھا ہے۔ چوتھے گارڈین کی بابت میری رائے یہ ہے

کہ میں چونکہ نہ لا ہو رہا میں رہتا ہوں اور نہ کوئی امید لا ہو رکے قریب
رہنے کی ہے تو مجھے مقرر نہ کرو بلکہ کسی ایسے دوست کو جو کم سے کم
پنجاب میں ہی مقیم ہو۔ البتہ اپنی وصیت میں یہ ضرور لکھوا کہ اگر
گارڈین کو کسی معاملہ میں جہاں تک کہ منیرہ سلمہا اور جاوید سلمیہ کی
تعلیم کا تعلق ہے کہ کوئی مابی وقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا
جاوں کیونکہ جب تک ان دونوں کی عمر بائیس برس نہ ہو جائے میں
ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ میں زندہ رہا۔ یہ خود
ایک بری ذمہ داری ہے۔ میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے
رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے۔ یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلے
میں جو الفاظ اپنی وصیت نامہ میں درج کرو جو کہ رجسٹر کے پاس
محفوظ کر رہے ہیو ان کی ایک نقل میرے پاس بھیج دینا۔ اگر
خدا نخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو تھا رے ان دونوں بچوں
کے لیے ان کے تعلیم کے مسئلے میں میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے
لیے یہ ضرور صلاح دیتا ہوں کہ جہاں تک جاندار وغیرہ کا تعلق ہے ا
س کا انتظام اپنے سامنے ہی ایسا کر دو کہ کسی قسم کا ابهام باقی نہ رہے۔
شکر ہے خدا کا نادرہ اب ذرا بہتر ہے۔

میں ہوں تمہارا چاہنے والا.....

راس مسعوداً،

دو سچے دوستوں اور عاشقان باصفا کے یہ خطوط ہماری ادبی تاریخ کا ناقابل فراموش
 حصہ ہیں۔ اقبال کا اپنے بچوں کی سرپرستی کے لیے راس مسعوداً یہے عزیز ترین دوست کو

منتخب کرنا اور پھر راس مسعود کا محض سر پرست ہی نہیں بلکہ کفالت کا تمام تربارا پنے سر لینے کا جذبہ محض سرسری طور پر پڑھنے والے واقعات اور حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک عہد اور ایک زمانے کی وہ صداقتیں ہیں جن سے ہر دور کا انسان درس تپش حاصل کر سکتا ہے۔

ان کا یہ لکھنا وصیت میں یہ ضرور لکھوادو کہ اگر گارڈین کسی معاملہ میں جہاں تک منیرہ سلمہ اور جاوید سلمیہ کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی معالی دقت پیش آئے تو سب سے پہلے مجھے مطلع کیا جائے۔ کیونکہ جب تک ان دونوں بچوں کی انشاء اللہ بائیس برس کی عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔ یہ خود ایک بڑی ذمہ داری اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے۔ اور آخر میں میں ہوں تمہارا چاہنے والا راس مسعود، اس ایسا کے یہ فقرے بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔ اور اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے اور یا میں ہوں تمہارا چاہنے والا نہایت معنی خیز ہیں اور راس مسعود کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پھر اسی خط میں ان کا یہ کہنا کہ اگر خدا نخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ میں تمہارے ان دونوں بچوں کے لیے تعلیم کے مسئلے میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے اس حقیقت کے آئندہ دار ہیں کہ انہیں اقبال سے ہی عشق نہیں تھا۔

اے اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۸۸-۳۸۹

ان کے بچوں سے بھی اپنی اولاد کی مانند محبت تھی۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بچے کسی طور مصائب کا شکار ہوں۔ اسی لیے انہوں نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اپنے سامنے ہی اقبال جائداد کا انتظام کر دیں تاکہ کسی طرح کا ابهام باقی نہ رہے۔ اقبال نامہ کے صرف یہی دو خط ایسے ہیں جن سے اہمی ربط و تعلق کی گہرا ائمیں منکشف ہو سکی ہیں۔ اس نوع کے وہ سارے خطوط جو اقبال نے سر راس مسعود کو اور راس

مسعود نے اقبال کو تحریر کیے ہیں کسی طور پر دستیاب ہو جاتے تو ان دونوں کی زندگی اور شخصیت کے کتنے ہی اور روشن پہلو ہمارے سامنے آ جاتے افسوس کہ تمام تر کوششوں کے باوجود یہ قیمتی خطوط فراہم نہ ہو سکے۔

جو لائی میں راس مسعود سخت بیمار ہوئے۔ چنانچہ ان کی جانب سے ممنون حسن خاں نے جواب ارسال کیا تو اقبال نے پریشانی کے عالم میں انہیں خلط لکھا:

”لا ہور..... جولائی ۱۹۳۷ء“

ڈیر ممنون صاحب..... آپ کا خط مل گیا ہے میں بہت متعدد ہوں۔ بارہ دن کا ملیر یا اور اس پر مسلسل سر درد۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مسعود بہت کمزور ہو گئے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ ان کو جلد صحبت کامل عطا فرمائے اور میرا یہ خط وصول کرتے ہی آپ ان کی خیریت سے آگاہ کریں تاکہ تردد رفع ہو۔ امید ہے لیڈی مسعود اور بچی دونوں تندروں سے ہوں گی۔ میری طرف سے دعا کہیے۔

اب کے لاہور میں بھی بخار کا زور رہا۔ اور اب بھی ہے گونستاً کم ہے لیکن اب برسات شروع ہو گئی ہے۔ اور موسم بدل گیا ہے۔ باقی خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ سید مسعود کی خیریت سے بہت جلد آگاہ کریں تاکید مزید ہے۔

بھوپال میں تو آج کل خوب بارش ہوتی ہو گی۔ جاوید میاں اچھے ہیں۔ آج کل ان کو آم کھانے سے کام ہے۔ صبح و شام یہی مشغله ان کا ہے امتحان میں عربی میں فیل اور انگریزی میں فرست۔ علی بخش کی طرف سے سید صاحب کو لیڈی مسعود صاحبہ کو آداب

کہیے۔ جاوید بھی سلام عرض کرتا ہے۔ والسلام۔ محمد اقبال اے۔

راس مسعود کی رحلت

راس مسعود کی اچانک اور شدید دعالت پر اقبال کی پریشانی اور تردی حق بجانب تھا بظاہر وہ بارہ دن تک مسلسل ملیر یا اور در درسر میں بیتلار ہے جو بالآخر ان کی جان لے کر گیا۔ مشیت کے اسرار و رموز کو کس نے آج تک سمجھا ہے؟ ابھی ۱۶ جولائی کے خط کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ کہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو راس مسعود کا روزِ احیات کے کتنے ہی منصوبے اپنے ذہن و دماغ میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور معبدِ حقیقی سے جا ملے۔ گویا وفات سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی زندگی پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا اور اقبال کے نام ۱۷ جون ۱۹۳۷ء کے خط میں انکے قلم سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا تھا۔ بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔ زندگی اور موت کا فلسفہ آج تک عقدہ لا خیل ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبروں سے لے کر عام انسان تک بے بُس اور ناچار ہے۔ اور بت قول اقبال:

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۶

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں جس پر سخن
اقبال پر راس مسعود کی المناک اور اچانک موت کا کتنا گہرا اور شدید اثر ہوا اس کا
اندازہ ممنون حسن خاں کے نام اس خط سے لگایا جاسکتا ہے:

”لا ہور..... ۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء“

ڈیممنون..... سید مسعود مر حوم کے انتقال کی ناگہانی خبر صحیح اٹھتے

ہی اخبار زمیندار سے معلوم ہوئی۔ میں نے اس خبر کو مشتبہ سمجھ کر آپ

کے نام خط لکھا کہ اتنے میں..... سوں ملڑی گزٹ سے مرحوم کے انتقال کی سرکاری اطلاع معلوم ہوئی۔ سخت پریشان ہوں مفصل حالات سے مجھے آگاہ کیجیے۔ میرے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہے۔ مرحوم کے ساتھ جو قلبی تعلقات میرے تھے وہ آپ کو معلوم ہیں۔ ابھی ان کی والدہ اور لیڈی مسعود کے نام تاردینے ہیں۔ آپ کے خط کا مجھے بے چینی سے انتظار ہے۔
والسلام۔ محمد اقبال۔

اس خط کے ہر لفظ سے ان کی پریشانی بے چینی اور دلی کرب ظاہر ہے۔ چنانچہ اسی روز وہ دوسرے خط بھی تحریر کرتے ہیں۔

”لاہور..... ۳۱ جولائی ۱۹۳۴ء

ڈرممنوں.....

صحیح میں آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ آج صحیح سے دو پہر تک مر حوم
کے جانے اور ان کے غائبانہ معترف تعزیت کے لیے آتے رہے۔
راس مسعود کارخانہ عالم گیر ہے۔ یہ تاریخ جو اس خط کے ساتھ صحیح رہا ہوں
سردار صلاح الدین سلجوقی قول نص جزل افغانستان مقیم شملہ کا ہے۔
ان کی خواہش ہے کہ مر حوم کے اعز اتک پہنچا دیا جائے۔ مہربانی کر
کے آپ یہ تاریثی مسعود اور مر حوم کی والدہ کو دکھادیں۔ والسلام
محمد اقبال،

واقعی راس مسعود کی موت۔ ایک فرد کی موت نہیں ایک ادارہ کی موت تھی۔ وہ جو اپنی ذات سے ایک انجمان تھے اور ان ہو چکی تھی۔ اقبال سے ان کے قلبی تعلقات کسی سے

پوشیدہ نہ تھے۔ لہذا ان کی موت پر اقبال کی خدمت میں تعزیت کرنے والوں کا تاتا بندھ گیا
یہ غم اقبال کا ذاتی غم تھا۔ اور وہ بجا طور پر تعزیت کے مستحق تھے۔ زندگی کے آخری لمحوں تک
راس مسعود نے اقبال کی جتنی سچی رفاقت و اعانت کی اور جس طرح حق دوستی ادا کیا اس
کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے چنانچہ جس پر سوزانداز میں انہوں نے بیگم مسعود کو تعزیتی
خط لکھا ہے اس سے ان کے گھرے جذبات غم کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۷

۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۸-۳۲۷

”لاہور..... کیم اگسٹ ۱۹۳۷ء“

ماں ڈیریلیڈی مسعود۔ میں آپ کو صبر و شکر کی تلقین کیونکر کروں
جب کہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود بفریز ہے۔ مرحوم سے جو
میرے قلبی تعلقات تھے ان کا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے اس
بانا پر میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کے دکھ
درد میں شریک ہوں۔ غالباً مرحوم کے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا
نہ ہو گا جس کے دل پر مرحوم نے اپنی دل نوازی بلند نظری اور سیر چشمی
کا گہرائش نہ چھوڑا ہو۔

مسعود اپنے باپ دادا کے تمام اوصاف کا جامع تھا۔ اس نے
قدرت سے دادا کا دل اور باپ کا دماغ پایا تھا۔ اور جب تک جیا اس
دل دماغ سے ملک و قوم کی خدمت کرتا رہا۔ خدا تعالیٰ اسے غریق
رحمت کرے۔ کل شام کے اخباروں میں معلوم ہوا کہ مرحوم کی میت
علی غرہ لائی گئی ہے۔ اس وجہ سے میں نے کل آپ کو ہوپاں کے پتہ

پر تار دیا تھا اور والدہ ماجدہ مرحوم کو علی گڑھ کے پتہ پر۔ اس کے بعد
 ہر ایکسی لپیسی سردار صلاح الدین خاں سبلوقی و نصل جزل
 افغانستان مقیم شملہ کا تعزیتی خط بھی میرے نام آیا جس میں
 انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کا پیغام ہمدردی مرحوم اعزہ تک
 پہنچا دیا جائے۔ یہ تاریخی میں نے بھوپال ہی پہنچ دیا تھا۔ امید ہے کہ
 آپ تک پہنچ جائے گا۔ والدہ ماجدہ تک بھی سردار صاحب کا پیغام
 ہمدردی پہنچا دیجیے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ ہم سب پریشان ہیں اور خدا
 تعالیٰ سے آپ کے اطمینان قلب کی دعا مانتے ہیں۔
 والسلام محمد اقبال۔

علیٰ بخش آداب کہتا ہے اور بے حد رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

اقبال اور راس مسعود کے گھرے تعلقات کا بیگم مسعود سے زیادہ بھلا اور کے علم ہو سکتا
 ہے۔ کئی سال کی مسلسل قربت اور وابستگی اور اقبال اور راس مسعود کی ایک دوسرے سے بے
 پناہ محبت اور دوستی ایک ہی خاندان کے رشتے میں بدل چکی تھی۔ اس لیے وہ بیگم صاحبہ کو صبر و
 شکر کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اور کس طرح کرتے جبکہ خود انہیں اپنے رفیق و جان ثار دوست
 کی جدائی پر قدرت سے شکایت تھی۔ راس مسعود جس طرح اقبال کے ذاتی مسائل میں
 دلچسپی لیتے تے اور ان کے دکھ سکھ کے ساتھی بن گئے تھے۔ اقبال بھی اسی طرح راس مسعود اور
 ان کے افراد خاندان کے دکھ سکھ میں برابرے شریک تھے۔ ان کا یہ لکھنا جب تک زندہ ہوں
 آپ کے دکھ سکھ میں شریک ہوں..... ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ حقیقتاً راس
 مسعود کی دل نوازی بلند نظری اور سیر چشمی سے سمجھی ممتنع ہوئے۔ اور مرتبے مرتبے وہ اتنے
 گھرے نقش چھوڑ گئے کہ جو صدیوں تک ان کی عظمت ان کی اعلیٰ صلاحیت کا ران کے جذبہ

خدمت گزاری اور ایثار پسندی اور ان کی اعلیٰ خاندانی روایات کے امین رہیں گے۔ جن کا اعتراض خود اقبال نے بھی اسی خط میں کیا ہے۔ دوسرے ہی روز انہوں نے پھر ممنون حسن خاں کو خط لکھ کر حالات دریافت فرمائے۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۹۱-۳۹۲

”لاہور..... ۱۲ اگست ۱۹۳۵ء“

ڈیممنوں

میں آپ کے خط کا کئی دن سے انتظار کر رہوں مہربانی کر کے مفصل خط لکھیے۔ علی گڑھ کے خطوط سے معلوم ہوا ہے کہ راس مسعود کے صاحبزادے انور ہندوستان میں ہیں۔ مجھے یہ بات پہلے سے معلوم نہ تھی۔ آج میں نے انہیں بھی ایک خط لکھا ہے اطلاع دیجیے کہ آیا انور اپنے مرحوم باپ سے مل سکا یا نہیں نیز یہ کہ لیڈی مسعود صاحبہ کیسی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ خدا نخواستہ وہ علیل نہ ہوں۔ ان کی صحت و عافیت سے جلد اطلاع دیں۔ میں ذرا سفر کے قابل ہو تو سید مسعود کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے علی گڑھ جانے کا قصد رکھتا ہوں۔ وہاں سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک دو روز کے لیے بھوپال بھی آ سکوں۔ زیادہ کیا لکھوں۔ سوائے اس کے کہ بہت پریشان ہوں۔

خط کا جواب بہت جلد دو۔ والسلام۔

محمد اقبال

ان کی پریشانی مسلم تھی۔ راس مسعود کی میت علی گڑھ دفنانے کے لیے لے جائی گئی تھی۔ اس لیے وہ فاتحہ خوانی کے لیے علی گڑھ جانے کا قصد کر رہے تھے۔ ادھر بیکم مسعود بھوپال میں

تھیں۔ ان کی جانب سے بھی وہ فکر مند تھے اور بھوپال جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ خود ان کی صحت ان دنوں تسلی بخش نہ تھی۔ مسعود کی اچانک موت کا ان پر شدید اثر پڑا تھا۔ چند ہی دنوں بعد انہوں نے پھر بھوپال خط لکھا۔

”۱۹۳۷ء کے اگست“

ڈیر ممنون صاحب

مسعود مر حوم کے کتبہ مزار کے لیے میں نے مندرجہ ذیل رباعی
انتخاب کی ہے۔

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
زبند این و آں آزادہ فتم
چو باد صح گردیم وے چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ فتم
یہ رباعی میں نے اپنے کتبہ مزار کے لیے لکھی تھی۔ لیکن تقدیر
اللہ یہ تھی کہ مسعود مر حوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے
حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ اس کے
علاوہ رباعی کا خصمون مجھ سے زیادہ ان کی زندگی اور موت پر صادق
آتا ہے۔

۱۔ سہو کتابت ہے یہ خط ۱۹۳۷ء کے اگست کا ہوگا کیونکہ اس سے پہلے ۳ جولائی ۱۹۳۷ء کا
خط درج ہے اور ۲ اگست کے بعد ۱۹۳۷ء کا۔ اس خط میں راس مسعود کی رحلت کا
ذکر ہے۔

لیکن اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگ مزار پر لکھنا ہو تو
مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں بہتر ہو گا:

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں
باقی خیریت ہے مسعود کاغم باقی رہے گا۔ جب تک میں باقی
ہوں۔ میرے پہلے خط کا مفصل جواب دیجیے۔ والسلام۔
محمد اقبال اے۔

راس مسعود سے اقبال کی عقیدت و محبت کی یہ انہا تھی کہ جور بائی انہوں نے اپنے کتبہ
مزار کے لیے لکھ رکھی تھی اسے راس مسعود کی نذر کر دیا تھا کیونکہ جن صبر آزم حالات میں
انہیں راس مسعود کی جدائی کاغم سہنا پڑا تھا وہ ان کی ذات سے زیادہ راس مسعود کی زندگی اور
موت پر صادق آگئے تھے۔

..... ان کے خط کا یہ جملہ مسعود کاغم باقی رہے گا جب تک میں باقی ہوں
ان کے شدید غم اور قلبی تاثر کی سچی تصویر کشی کرتا ہے۔ کتبہ مزار کے لیے صرف ایک شعر
میں جو کچھ انہوں نے کہہ دیا ہے بڑے بڑے دیوان بھی اس کی ترجمانی سے قاصر ہیں:

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں
اسی کے ساتھ ان کا یہ کہنا قدرِ الٰہی یہ تھی کہ مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے
رخصت ہو جائے۔ حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ اس گھرے
رنج و غم اور نفسیاتی رُعل کا اظہار ہے جو زندگی کے ایک عزیز ترین ساتھی کے پچھڑ جانے کے
سبب رونما ہوتا ہے۔

راس مسعود کی وفات کے بعد بھوپال میں لے دے کر صرف ان کے سیکرٹری ممنون حسن خاں ہی ایک ایسے نیاز مند اور معتمد رہ گئے تھے جن سے وہ بیگم مسعود ان کی بچی نادرہ ان کے دونوں بچوں انور اور اکبر اور بھوپال کے بارے میں ضرورت معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس خط میں وہ لکھتے ہیں:

”لاہور ۱۲۳ آگسٹ ۱۹۳۷ء“

ڈیر ممنون

مسعود مرحوم کی وفات پر جوا شعارات میں نے نہ لکھتے تھے وہ آج میں نے رسالہ اردو میں چھپنے کیلئے حیدر آباد کن ٹھیک دیے ہیں۔ مدیر رسالہ مولوی صاحب عبدالحق مسعود نمبر نکالنے والے ہیں۔ امید ہے کہ یہ رسالہ آپ کو بھوپال میں مل جائے گا۔ خود بھی پڑھیے اور لیڈی مسعود کو بھی سنائیے۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خیریت سے آگاہ کیجیے۔ اکبر ولایت سے آیا یا نہیں اور انور کیا اس وقت بھوپال میں ہے؟ رشید صاحب بھوپال میں ہیں یا ان دور چلے گئے؟ تمام حالات و کوائف سے مفصل آگاہ کیجیے۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب اس وقت بھوپال میں ہیں یا شملہ میں؟ آپ بھوپال میں رہیں گے یا اعلیٰ حاضر کے اسٹاف میں لے جائیں گے۔ موخر الذکر جگہ آپ کے لیے بہتر ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے سب خیریت ہے۔ والسلام آپ کا..... محمد اقبال“۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۹-۳۳۰

۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۰-۳۳۱

اس خط میں جتنے سوالات کیے گئے ہیں ان کا تمام تر تعلق بھوپال ہی سے ہے۔ رشید صاحب راس مسعود کے خست تھے۔ اور اکبر ان کی پہلی بیوی سے دو بچے تھے۔ اکبر ولایت میں زیر تعلیم تھے۔ انور بھوپال آپکے تھے۔ منون حسن خاں کے مستقبل کے بارے میں انہیں یہی فکر تھی۔ ان کا مشورہ یہی تھا کہ وہ نواب صاحب کے شاف ہی میں شامل رہیں۔ انہوں نے نواب صاحب کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا۔ اور اس طرح سے بھوپال سے ان کا ربط و تعلق قائم تھا۔ اسی خط میں انہوں نے راس مسعود مرحوم کی وفات پر جن اشعار کا ذکر کیا ہے وہ پہلی بار بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مرتبہ رسالہ اردو کے مسعود نمبر بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئے۔ یہی اشعار بعد میں ارمغان جاز میں مسعود مرحوم کے عنوان سے شامل ہوئے اور بقول مرتب اقبال نامہ ان اشعار میں اقبال نے موت و حیات کی کشوود میں انسانی بے بی کا ماتم کرتے ہوئے براہ راست سر سید راس مسعود مرحوم کی وفات پر اپنے رنج و قلق کا اظہار کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگار کمالات احمد و محمود
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاع گرائ بہا مسعود
مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بے دردی
نفغان مرغ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پہاں ہے چارہ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معماۓ موت کی ہے کشوود
دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است

ز عشق تا به صبوری ہزار فرسنگ است اے سعدی

جب تک شعروادب کی تابندگی باقی ہے اقبال کا یہ مرثیہ دونوں کی امت اور لازوال
محبت کی یادتازہ کرتا رہے گا۔ ممنون حسن خاں کا جواب ملتے ہی انہوں نے پھر ممنون حسن
خاں سے دریافت حال فرمایا:

” لاہور ۲ ستمبر ۱۹۳۷ء ”

ڈیر ممنون
.....

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس کے لیے بہت شکریہ۔ میں لیدی مسعود صاحبہ کی طرف سے بہت متنفس رہتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ
ان کی صحت پر مرحوم کی موت کا بہت خراب اثر پڑے گا۔ پچھی کی صحت
اور پروش کے لیے ان کا تندرست ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس
کے علاوہ اس خیال نے کہ راس مسعود کوئی وصیت نہ کر سکے، میرے
افکار میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ آپ مجھ کو باقاعدہ خط لکھتے رہیے۔
انور یاض منزل میں ہی ہیں یا کسی اور جگہ میری طرف سے انہیں دعا
کہیں۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۹۲-۳۹۳

لیدی مسعود صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر میری جانب سے
بہت بہت سلام کہیے اور جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے عرض کر
دیجیے جاوید سلمہ تندرست ہے اور آداب کہتا ہے لاہور میں کیم اگسٹ
سے لے کر اس وقت تک کہ ۲ ستمبر ہے مطلق بارش نہیں ہوئی۔ ہاں

شیعیب صاحب کی خدمت میں سلام کہیے۔ والسلام محمد اقبال، -

بیگم مسعود کی صحت بچی کی پرورش و پرداخت اور راس مسعود کے وصیت نہ چھوڑنے سے وہ جس ڈینی کرب میں مبتلا تھے۔ یہ خط بخوبی اس پر روشی ڈالتا ہے۔ ممنون حسن خاں صاحب کو باقاعدہ خط لکھنے کی تاکید بھی اسی لیے کی تھی کہ وہ مسعود مر جم کے متعلقین کی خیرخبر اور حالات سے آگاہ رہیں۔ ان دنوں حقیقتاً وہ بے حد فکر من داور پریشان ہیں۔ اور اس پریشانی یا کواحد سبب راس مسعود کی ناوقت موت تھی۔ راس مسعود کی والدہ علی گڑھ میں تھیں اور ان کی خیر خبر اپنے عزیز دوست خواجہ غلام السیدین کی معرفت معلوم کر رہے تھے۔ ۲۵ ستمبر کا یہ خط اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں اس رباعی کا بھی ذکر ہے جو انہوں نے مسعود مر جم کے کتبہ مزار کے لیے ممنون حسن خاں کو بھوپال ارسال کی تھی۔

” لاہور ستمبر ۱۹۳۷ء ”

ڈیر سیدین صاحب

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس کے لیے شکر یہ قول کیجیے۔ میں نے مسعود مر جم کے کتبہ مزار کے لیے ایک رباعی رباعیات میں سے انتخاب کر کے مر جم کے سیکرٹری ممنون حسن خاں کو بھوپال بھیجی تھی۔ معلوم نہیں کہ انہوں نے اب تک علی گڑھ کیوں نہیں بھیجی۔ یہ رباعی حقیقت میں میں نے اپنے کتبہ مزار کے لیے لکھی تھی۔ میں ابھی ممنون حسن خاں صاحب کو ایک خط لکھ کر دریافت کرتا ہوں۔ چند اشعار مر جم کی وفات پر بھی لکھتے تھے جو رسالہ اردو کے مسعود نمبر میں شائع ہوں گے۔ اگر وہ رباعی جو میں نے بھوپال بھیجی تھی پسند آگئی تو

بہتر ورنہ اور فکر کروں گا۔ میری طرف سے مسعود مر حوم کی والدہ ماجدہ کی خدمت میں بہت بہت آداب عرض کیجیے۔ ذرا موسم اچھا ہو جائے تو میں خود بھی تعزیت کے لیے مر حوم کی قبر پر فاتح خوانی کے لیے علی گڑھ حاضر ہونے کا قصر رکھتا ہوں۔

پنجاب یونیورسٹی سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ واس چانسلر

M.L.A. Darling. Financial
مستر Commissioner ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ گوگز شہزادین سال سے بوجہ علالت ان سے نہیں مل سکا۔ آپ ان سے اس ارے میں خط و کتابت کریں۔ اس کے علاوہ آپ مسٹر عبدالمحییٰ وزیر تعلیم کو لکھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو اور انتظام بھی ہو سکتا ہے باقی خیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

محمد اقبال سے۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۲-۳۳۳

۲۔ اقبال کے فلسفہ تعلیم کے متعلق تو سیعی خطبات دیے جانے کی تجویز بعض احباب نے پیش کی تھی۔

۳۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۳

اس خط سے اور ممنون حسن خاں کے نام مشمولہ دیگر خطوط سے بھی یہ حقیقت عیاں ہے کہ راس مسعود کی وفات کے بعد انہیں مر حوم کے متعلقین کی کتنی فکر اور پریشانی لاحق تھی۔ والدہ مسعود علی گڑھ میں تھیں اور بیگم مسعود اور بچے بھوپال میں۔ اس زمانے کے وہ تمام خطوط جو خواجہ غلام السید یعنی کوانہبوں نے علی گڑھ ارسال کیے اور جو خطوط ممنون حسن خاں کو

بھوپال بھیجے ان میں سے بیشتر میں راس مسعود کے متعلقین ہی کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ تعزیت کے لیے علی گڑھ اور بھوپال جانے کا قصد رکھتے تھے۔ لیکن موئی حالات اور خود ان کی صحت اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ کتبہ مزار کی رباعی ابھی تک علی گڑھ نہیں پہنچی تھی اور اسی لیے اسی روز جس روز انہوں نے مندرجہ بالا خط تحریر کیا ممنون حسن خاں کو بھی خط بھیجا۔

لاہور..... ۲۵ ستمبر ۱۹۳۷ء

ڈیممنوں

میں نے ॥ اپکو جو رباعی مسعود مرحوم کے کتبہ مزار کے لیے لکھ کر بھیجی تھی اس کی ایک نقل مجھے بھیج دیں۔ شاید آپ نے وہ رباعی ابھی تک علی گڑھ نہیں بھیجی۔ میاں انور ملیں تو ان سے کہیے کہ میں نے جو کچھ ان کو لکھا تھا اس کے جواب کا منتظر ہوں۔ امید ہے کہ لیڈی کپیلے۔

مخلص..... محمد اقبال،

رباعی کی نقل طلب کرنے کے علاوہ انہوں نے راس مسود کے صاحبزادے انور مسعود کا ذکر بھی اس خط میں کیا ہے جنہیں انہوں نے خط لکھا تھا۔ افسوس کہ یہ خط بھی سعی و کوشش کے باوجود نہیں مل سکا۔ لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس خط میں انہوں نے ایک شفیق و رفیق سرپرست کی حیثیت سے انہیں مفید مشورے دے ہوں گے۔ واقعاً ایک فرد کی موت سے ایک خاندان کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا۔

..... راس مسعود جن کی ساری عمر دوسروں کی خدمت اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی میں گزری تھی۔ آج ان کے افراد خاندان بے سروسامان تھے۔ اقبال کے لیے اس

سے زیادہ سوہان روح اور کیا حقیقت ہو سکتی تھی؟
ممنون حسن خاں نے فوراً ہی جواب دیا تو اقبال نے خط کی رسید بھجتے ہوئے صورت
حال سے مطلع کیا:

لاہور.....۱۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء

ڈیم منون صاحب.....

آپ کا خط مل گیا۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میری حالت بھی خدا
کے فضل سے بہتر ہے۔ لیکن ابھی طویل سفر کے لاٹنیں۔ انور کا خط
بھی آج آیا ہے۔ ابھی اس کا جواب لکھا ہے ربائی اور شعر جو آپ
نے خط میں لکھے ہیں والدہ ماجدہ مسعود مرحوم کی خدمت میں بتوسط
خواجہ غلام السید ین بھج دئے تھے ہیں۔ کیونکہ سید ین صاحب کا خط
اس بارہ میں مجھے چند روز ہوئے آیا تھا۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۳

شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ریاست بھوپال میں اسلامی فیملی لا
کے متعلق علماء کے مشورہ کے بعد ایک Enactment ضابط وضع
کیا گیا تھا۔ ارآپ کو معلوم نہیں تو شعیب صاحب سے معلوم کر لیجیے
اور اس کی ایک کاپی مجھے بھیج دیجیے۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے
کہ مسعود نہیں بھولتا۔ ڈاکٹر عبدالباسط کہیں مل جائیں تو ان سے میرا
سلام کہہ دیجیے۔ علی ہذا القیاس خاں بہادر ڈاکٹر احمد بخش اور ڈاکٹر
رحمٰن صاحب کو بھی۔

والسلام۔ محمد اقبال اے۔

وہ جلد سے جلد بھوپال جانا چاہتے تھے۔ لیکن جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے کہ ابھی طویل سفر کے قابل نہ تھے۔ انور کو جو خط انہوں نے لکھا تھا اس کا جواب انہیں مل گیا تھا۔ چنانچہ اس کا جواب بھی اسی خط کے ساتھ انہوں نے لکھ دیا تھا۔ رباعی اور شعر جو ممنون حسن خاں نے نقل کر کے بھیجے تھے۔ وہ علی گڑھ غلام السید یین کو ارسال کر چکے تھے۔

اسلامی فیملی لاکے سلسلے میں علماء کے مشورے سے بھاپال میں جو ضابط وضع کیا گیا تھا وہ اسے دیکھنا چاہتے تھے جو غالباً اسی کتاب کے سلسلے میں ہو گا۔ جس کا وعدہ انہوں نے نواب صاحب بھوپال سے کیا تھا۔

اس خط کا یہ فقرہ..... مسعود نہیں بھولتا ان کے دلی درد و کرب کا آئینہ دار ہے۔ وہ بھوپال کے ان قابل قدر اور مشتق معین کو بھی نہیں بھولے تھے جنہوں نے ان کا بھوپال میں علان کیا تھا۔

.....ڈاکٹر عبدالباسط، خان بہادر احمد بخش، اور ڈاکٹر حمّن کو بھی اس خط میں انہوں نے یاد کیا ہے اور ممنون حسن خاں کے توسط سے سلام بھیجا ہے۔ بھوپال اور بھوپال کی ممتاز شخصیتوں سے ابھی تک ان کا ذہنی اور روحانی تعلق برقرار تھا۔ کچھ عرصے خاموشی رہی آخر اکتوبر میں انہوں نے بیگم مسعود کو خط لکھا۔

” لاہور ۱۹۳۷ء کتوبر ”

ڈیر لیڈی مسعود صاحبہ..... میں نے انور کے خط کا جواب لکھ دیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ظفر الحسن پروفیسر علی گڑھ سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ وارڈون کالج کو خود لکھ سکتے ہیں۔ مسعود مرحوم نے نیو کالج میں ہی تعلیم پائی تھی اور کالج کے موجودہ وارڈون کو غالباً جانتے تھے اس بنا پر جو تجویز آخری میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ

ڈاکٹر ظفر الحسن مذکورہ بالا کانج کے وارڈن کو یہ لکھیں کہ وہ انور کے
 لیے سرہیری ہیگ گورنر یوپی ک لکھیں کہ وائرسے ہند انور کے
 خاندان کی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اس نوجوان کو جو اپنے
 قد و قامت اور تعلیم کے لحاظ سے ہر طرح موزوں ہے امپریل پولیس
 سروس میں جانے کی سفارش کریں۔ اور چونکہ اس وقت انور نواب
 صاحب بھوپال کی سروس میں ہے اس لیے وائرسے اعلیٰ حضرت
 نواب صاحب بھوپال سے مشورت فرمائیں۔ یہ مختصر مضمون وارڈن
 اس خط کا ہونا چاہیے جو نیو کانج کا وارڈن سرہیری ہیگ کو لکھے۔
 اگر انور کی درخواست پر اعلیٰ حضرت وائرسے کی خدمت میں
 سفارش کرنے کو خود تیار ہو جائیں تو یہ بات سب سے اچھی ہے۔

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۲-۳۳۳

اس صورت میں وارڈن نیو کانج صرف سرہیری ہیگ کی
 خدمت میں یہ لکھیں کہ انور کی بابت وائرسے سے خود سفارش
 کریں۔ اگر اس تجویز سے آپ کو اتفاق ہو تو آپ ڈاکٹر ظفر الحسن
 صاحب کو علی گڑھ اور خط لکھ دیں کہ وہ نیو کانج خط لکھ کر سرہیری ہیگ
 کے نام سفارشی خط جلد منگوائیں۔
 محمد اقبال اے۔

جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے انور مسعود صاحب بھوپال کی ملازمت اختیار کر چکے تھے
 لیکن ان کے مستقبل کی بہتری کے لیے لیے انہوں نے نہایت قیمتی مشورے دیے تھے۔
 انور امپریل پولیس سروس میں جانے کے خواہش مند تھے۔ جس کی دو ہی صورتیں

تھیں۔ اول یہ کہ نواب صاحب بھوپال والسرائے ہند سے سفارش کریں۔ دوسرا یہ کہ ڈاکٹر ظفر الحسن نیوکارج کے وارڈن کے ذریعہ سرہیری ہیگ گورنر یوپی سے درخواست کریں کہ وہ والسرائے ہند کو سفارش لکھ پھیجن تاکہ انور مسعود کے خاندان کی گروں قدر مایہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں امپریل پلیس سروس میں لے لیا جائے۔

یوں تو بر صغیر کی تاریخ کا کوئی دور بھی سعی و سفارش سے خالی نہیں رہا لیکن قدرت کی ستم ظرفی یہ تھی کہ راس مسعود جن سے ہر شخص نے بلا امتیاز فیض اٹھایا تھا۔ آج ان کی اولاد ملازمت کے سلسلے میں دست گیری اعانت اور سفارش کی محتاج تھی۔

اے اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۹۲-۳۹۵



دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا سوگ

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کا دن حیدر آباد کن کی ادبی تاریخ کا وہ یادگار دن ہے جب اہل حیدر آباد نے باغِ عامہ کے ٹاؤن ہال میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں یوم اقبال منا کر زندہ دوستی کی عظیم روایت کا آغاز کیا۔ اس پر شکوہ تقریب کی صدارت ولی عہد شہزادہ برار نے کی اور ملک کی جنگ را مایہ شخصیتوں نے یوم اقبال کے لیے خصوصی پیغامات سے نواز ایں میں نواب حمید اللہ خاں ڈاکٹر رباندرنا تھے ٹیکور ہر ہائی نس آغا خاں مسزسر وجہ نایبڑو اور پنڈت جواہر لال نہرو قابل ذکر ہیں۔ نواب حمید اللہ خاں کے پیغام میں ان کی اقبال شناسی اور دلی والی بستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ پیغام میں لکھتے ہیں:

”..... مجھے سرت ہوئی کہ یوم اقبال ہر ہائینس پرنس آف برار ولی عہد خانوادہ آصفی کی صدارت میں منایا جا رہا ہے۔ اقبال کے نعموں میں ہندوستانی قومیت کے راز مضمرا ہیں۔ اس فلسفی شاعر نے اہل ہند کو خواب غفلت سے چونکا کران میں احساس بیداری پیدا کر دیا ہے۔“

واقعہ یہ ہے کہ بھوپال کے علاوہ اگر ہندوستان کی کسی اور ریاست نے اقبال سے اپنی گہری والی بستگی اور اقبال شناسی کی کوئی بناڑا تو وہ صرف ریاست حیدر آباد کن تھی۔ جہاں اقبال پر سب سے زیادہ کام ہوا۔ ان کی زندگی میں یوم اقبال منایا گیا۔ ان کے افکار و خیالات سے حیدر آباد کے سرمائے میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور ان کی خدمات حاصل

کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ لیکن حالات اور قسمت نے یا ورنہ نہ کی ورنہ اقبال حیدر آباد ہی کے ہو رہے تھے اور نواب حمید اللہ خاں کو وہ فخر و امتیاز نصیب نہ ہوتا جو راس مسعود کے توسط سے اقبال کو اپنا کرانہ ہوں نے حاصل کیا۔

ابھی یوم اقبال کو بمشکل چار ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ اقبال کی صحت نے جواب دے دیا۔ وہ گز شتمہ ماہ سے شدید بیمار تھے۔ اراس مسعود کی موت نے انہیں گھرے صدمے سے دوچار کر دیا تھا جس کا اندازہ ان کے آخری دور کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔

لے حیدر آباد کا مشہور باغ

۲۵ اقبال اور حیدر آباد صفحہ

عجیب اتفاق ہے کہ اقبال نے اپنی وفات سے صرف دو روز پہلے کا ایک خط بھی بھوپال ہی روائے کیا۔ جس کے متن سے ان کی علاالت آنکھوں کے آپریشن اور دمے کی زیادتی کا علم ہوتا ہے۔ اس خط میں بشرط زندگی کا ٹکڑا انہایت معنی خیز ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے اب زندگی پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”جاوید منزل۔ لا ہور

۱۹۳۸ء پر میل

ڈیر ممنون

آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا۔ افسوس کہ شدید علاالت کی وجہ سے جواب نہ لکھوا سکا۔ دمے کے متواتر دوروں نے مجھے زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا ہے۔ مگر اب خدا کے فضل سے کچھ افاقت ہے۔ مگر کلی طور پر صحت نہیں ہوئی۔ آنکھوں کا آپریشن مارچ میں ہونے والا ہے مگر دمے کی وجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا۔ اب بشرط زندگی انشاء

اللہ تمبر میں ہوگا۔ حیات اصحاب سے میرا بہت بہت سلام کہیے گا۔
اب آپ کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ کیا آپ اعلیٰ حضرت کی پیشی میں
ہیں میں زیادہ کیا لکھوں۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔
مخلص محمد اقبال،

کے معلوم تھا کہ مفکر اسلام شاعر مشرق اور دنائے راز کا یہ آخر خط بھی اسی بھوپال کا
مقدرت تھا جسے دار الاقبال بننے کا شرف نصیب ہوا۔ جس کے والی ریاست کو اقبال کی ذاتی
شفقت و محبت میسر آئی۔ اور جس کی ریاست کے درود یو اقبال کی نغمہ سرائی سے گونجتے
رہے۔

یہ ہی بھوپال تھا جس سے اقبال کی وابستگی کا آغاز ۱۹۱۰ءی میں ہوا تھا۔ اور اب یہ ہی
بھوپال ہے جس کے ایک فرزند ممنون حسن خاں کے نام وہ آخری خط ۱۹۳۸ء پر میں ۱۹۳۸ء کو تحریر
کرتے ہیں اور تیسرا روز اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ۱۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء
کی صبح یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی کہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ مدراس
دفاتر بازار بند ہو گئے۔ اور پورے شہر نے ماتھی لباس پہن لیا۔ ایک بھوپال ہی پر کیا منحصر
تھا۔ ان کی موت نے تو پورے ہندوستان کو اور بیرونی دنیا کو سوگ کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
اتنے عظیم شاعر اتنے بلند پایہ مفکراتنے بڑے انسان دوست اور مصلح قوم کی موت ایک ایسا
المیہ تھا جس نے ہر قلب کو متاثر کیا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی سچ پوچھیے تو اقبال کی موت ایک عہد
کی موت تھی اور رونے والوں کے آنسو تک خشک کر گئی تھی۔

بلاشبہ اقبال ان خوش نصیبوں میں شامل تھے جن کی زندگی میں ہی ان کے قدر داں
پیدا ہوئے تھے حکیم یوسف حسن مدیر ماہنامہ نیرنگ خیال نے اس زمانے میں جب وہ گول
میز کا نفرنس میں شرکت کے لیے اندن تشریف لے گئے تھے اقبال نمبر شائع کیا تھا اور اس

طرح اردو سائل کی تاریخ میں زندہ دوستی اور اعتراف عظمت کی روایت کا آغاز ہو گیا تھا۔ نواب حمید اللہ خاں نے ان کی گراں مایہ خدمات کے اعتراف میں ان کی ہر ممکن مالی اعانت کی تھی وفات سے چند ماہ قبل حیدر آباد کن کے اقبال شناسوں نے یوم اقبال منا کر شاعر مشرق کو شایان شان خراج تحسین پیش کیا تھا۔ لیکن آپ پورے برصغیر میں ان کا سوگ منایا جا رہا تھا۔

۱۔ حسن محمد حیات۔ سیکرٹری چسلیو کونسل بھوپال

۲۔ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۵

چیز ہے موت برحق ہے اور اس پر کوئی فتح حاصل نہیں کر سکتا۔ اقبال بھی اپنی مسلسل گرفتی ہوئی صحبت اور کمزرو ناتوان قوی کے ہاتھوں موت پر فتح نہ پاسکے لیکن پوری قوم کو بیدار کر کے جیئے کا سلیقہ اور درس عمل دے گئے۔ ان کی موت پر جگہ جگہ تعزیتی جلسے اور قراردادیں منظور کی گئیں۔ وفات کے تیسرا دن ایک بڑا اور یادگار تعزیتی جلسہ بھوپال میونسپلٹی کے وسیع میدان میں منعقد ہوا جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اس جلسہ کی صدارت اقبال کے ایک دیرینہ نیازمند سلام الدین خاں سابق مشیر الہمہام صیغہ قانون و انصاف نے فرمائی جلسہ کی رواداد ملاحظہ ہو:

”..... جلسہ کا افتتاح قرآن حکیم کے پارہ سیقوں کے دوسرا

رکوع سے کیا گیا۔ بعد ازاں صاحب صدر کی اجازت سے جناب چودھری محمد اطہر ڈسٹرکٹ میسٹریٹ بلڈہ بھوپال نے ریزو لیوشن پیش کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ یقیناً درد میں ڈوبی ہوئی تھی آپ نے علامہ سر محمد اقبال تاج دار سخن کی زندگی پر مختصر مگر بلیغ اور جامع الفاظ میں تبصرہ کرتے ہوئے حاضرین جلسہ کو انعقاد جلسہ کی غرض

سے آگاہ فرمایا۔ اس کے بعد آفاق حسین صاحب ہیڈ ماسٹر جہانگیریہ سکول نے علامہ اقبال کی ذاتی خصوصیات اور شاعری سے بہت وضاحت کے ساتھ حاضرین کو متاثر فرمایا۔ تیسرا نمبر بھوپال کے ایک سنکریت عالم پنڈت پچمن جی کا آیا۔ آپ کی تقریر کا موضوع اقبال کی مشرق سے محبت تھا آپ نے ان شعروں سے تقریر کا آغاز فرمایا:

دلا نادانی پروا نہ تا کے
نگیری شیوه مردانہ تا کے
یکے خود را از سوز خویشن سوخت
طوف آتش بیگانہ تا کے

ازال بعد جناب مولوی عبدالرزاق مولف البرامہ اور جناب سعید رزمی نے ریزو لیوشن کی تائید میں جو تقریریں فرمائیں ان میں اقبال کی شاعری اور ان کے نظریہ کی خصوصیات کی وضاحت میں خاص خاص چیزوں کو پرسوز الفاظ میں دوسرے نامور شعراء سے مقابلہ کرتے ہوئے حالی مرحوم کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر فرمایا۔ لیکن اقبال مرحوم کی اس خصوصیت کو خاص طور پر نمایاں کیا کہ مرحوم نے فنی اور زہنی حیثیت سے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ نظام قدرت نے جو فضا پیدا کر رکھی ہے اس سے وہ متاثر تھے۔

دوسرा تعزیتی جلسہ بھوپال کے تمام خادمان علم و ادب کا زیر صدارت مولانا سید حامد رضوی وکیل دفتر ندیم ۱۹۳۸ء پریل بوقت ۶ بجے شام منعقد ہوا۔ ذیل کے حضرات نے جلسہ میں شرکت

فرمائی:

۱۔ مولانا سید حامد رضوی صاحب وکیل سابق محبر پھسلیٹ کو نسل بھوپال۔ ۲۔ مولانا ارشد تھانوی صاحب وکیل۔ ۳۔ مولانا عبدالجلیل صاحب مائل نقوی۔ ۴۔ مولوی محمد احمد سبزواری بی اے غوثانیہ ۵۔ محمود الحسن صدیقی بی۔ اے علیگ میر ندیم۔ ۶۔ مولوی عبدالرزاق صاحب مہتمم ذخیرے۔ ضیاء الملک ملار موزی ۸۔ ماسٹر ناصر علی صاحب ناصر اثاوی۔ ۹۔ ماسٹر سلیمان محمد خاں صاحب آرزو۔ ۱۰۔ جناب سید حسن بی اے علیگ۔ ۱۱۔ جناب مرزا مظفر سیفی۔ میر معاون ندیم۔ ۱۲۔ مشی سید لطف علی صاحب استٹنٹ روینبو سکرٹری دیورڈی عید گاہ کوٹھی۔ ۱۳۔ مولوی عبدالقيوم صاحب۔ ۱۴۔ مشی ظہور الحسن صاحب۔ ۱۵۔ مشی محمد اسمعیل صاحب ہائف۔ ۱۶۔ مشی مطلوب عالم صاحب فاروقی۔ ۱۷۔ مشی رحم حسین صاحب۔ ۱۸۔ مولانا احسان رسول صاحب۔ ۱۹۔ جناب نقیس احمد فاروقی۔ ۲۰۔ جناب مصباح الدین احمد۔ ۲۱۔ مشی نواب حسن صاحب۔ ۲۲۔ مشی شیر حسن صاحب۔ ۲۳۔ مشی قریش مسح وغیرہ جلسہ کا افتتاح تلاوت قرآن پاک سے ہوا مولانا احسان رسول صاحب نے سورہ یاسین کے تیسرے روکع کی القراءات فرمائی۔ اس کے بعد ذیل کے تین ریزولیوشن جلسہ میں پیش ہو کر بااتفاق رائے منظور ہوئے۔

۱۔ بھوپال میں شیفعتگان اور خادمان علم و ادب کا یہ غیر معمولی جلسہ مشرق کے شاعر اعظم ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بار

ایٹ لاکے بے وقت اور پرائم سانحہ وفات پر اپنے انہائی حزن و ملال کا اظہار کرتا ہے اور اس کو ملت اسلامیہ کے لیے خصوصاً ایسے وقت میں جبکہ عالم اسلامی کو آپ کی حکیمانہ رہبری کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔

۲۔ یہ جلسہ ہندوستان کے بلند پایہ شاعر مفکر اور فائدہ کی ان تمام علمی ادبی اور ملی خدمات کا دلی جذبات و عقیدت مندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے اور ان کو ملت اسلامیہ کے لیے خصوصاً اور تمام مشرق اقوام کے لیے عموماً باعث احیاء و ہیداری قرار دیتا ہے۔

۳۔ یہ جلسہ علامہ خلد آشیاں کے تمام اعزاء اور پس مانگان کے ساتھ اس ماتم خیر سانحہ پر دلی رنج و الم کے ساتھ پر خلوص ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ صاحب صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ کہ مجھ پر ایسے جلسہ تعزیت کی صدارت کا بار رکھا گیا ہے جس سے ہمارا دل در دغم سے نٹھال ہے اس لیے کہ ہم سے آج وہ چیز چھین لی گئی ہے جس کی ابھی ہماری قومی و ملی بلکہ ملکی اور سیاسی زندگی کے لیے سخت ضرورت باقی تھی۔ اور جس کا بدل اس وقت مستقبل قریب میں ہم کو نظر نہیں آتا تھا۔ ان کی شاعری جو اپنے رنگ کی نزاکتی نہ صرف مسلمانوں کے درد سے مملو تھی بلکہ سارے ہندوستان اور ایشیا کا اس میں درد بھرا ہوا تھا.....!

اس کے بعد جناب محمود الحسن صدیقی ایڈیٹر ندیم نے علامہ اقبال کی ایک ایسی خصوصیت پر روشنی ڈالی جو صحیح طور پر قابل تحسین و

تشکر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مشرقی اقوام کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً زندگی کا نظریہ یہ ہے کہ حالات و واقعات نے انسان پیدا کیے یا انسان حالات و واقعات پیدا کرتا ہے اقبال کے مشن نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان حالات کو بدلتا ہے۔ اس بلند پایہ مفکر باند مرتبہ شاعر و ادیب نے مسلمانوں میں ایک روح پھوٹی۔ اس کے اندر زندگی اور جوش ملی پیدا کیا۔ اس سلسلے میں حالي کا نام بھی لیا جائے تو نامناسب نہ ہو گا۔ لیکن اقبال کی شاعری میں بلندی و عظمت اور انقلاب پیدا کرنے والی قوت مضر ہے۔ گوہم اقبال کی خدمت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم اس کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔

جناب سبزداری نے فرمایا کہ اقبال کی وفات سے ملک و قوم اور ادب کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ آپ نے اقبال کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا اقبال نے اردو ادب میں ایک جدید دور کا آغاز کیا۔

جناب ارشد تھانوی نے کہا کہ اقبال نے اس دور میں جنم لیا جب کہ شعرو شاعری میں داغ کے رنگ کو پسند کیا جاتا تھا اور ہر شاعر داغ کا تتبع کرتا تھا۔ اس وقت چند لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اس نئے پرانے رنگ کو چھوڑ کر ایک نئی روشن اختیار کی اس میں علامہ اقبال مولانا حالی اور پروفیسر آزاد کا خاص حصہ ہے۔ اقبال ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

جناب مرزا ظفر سیفی نے کہا کہ اقبال بحیثیت شاعر نہ صرف اردو

شاعری کے لیے باعث افتخار تھے بلکہ ان کی شخصیت ہندوستان کے لیے ایشیاء کے لیے اور عالم اسلام کے لیے بھی ماہی ناز تھی اقبال نے جس نظریہ کے تحت مسلم اقوام کے احیاء کا مسئلہ پیش کیا وہ دوسرے الفاظ میں خود اقبال پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے۔ یعنی قوم میں سے بعض جلیل القدر افراد آگے چل کر اپنی قوموں کو بنایا کرتے ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں نے اقبال کی بین الاقوامی شخصیت کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا جرمی نے کہا اقبال کی شاعری گوئٹے کی مر ہون منت ہے۔ اطالیہ نے کہا کہ اقبال نے ہم سے سب کچھ سیکھا ہے۔ فرانس نے کہا کہ اقبال ہمارا ہے حالانکہ اقبال وہی کہہ رہا ہے جو آج سے سارے تیرہ سو برس پیشتر کہا جا چکا ہے۔ غرض وہ بین الملی اتحاد کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔

پہلی مئی ۱۹۳۸ء کے اخبار ندیم میں ایک طویل اداریہ لکھا گیا۔ جس میں علامہ اقبال کے انتقال پر اظہار غم کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی گئی۔ اداریہ میں کہا گیا اقبال مر حوم ان انقلاب انگلیز شعراء میں سے ہیں جن کی تخلیق ہنگامی خلیق نہیں ہوتی۔ وہ فطرت کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں ایک عظیم الشان مشن لیے ہوئے۔ اپنی زندگی میں وہ اس مشن کو پھیلاتے ہیں۔ اس سبق کو خفته بخت قوم کو یاد دلاتے ہیں جو وہ بھول چکی ہوتی ہے۔ اس کے اجزاء قومیت میں ہم آہنگی پیدا کر کے اس کے پریشان اور منتشر شیرازہ کو یکجا کرتے ہیں۔ اس کی اساس ملت کو

استوار اور مستحکم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ملہم غیبی آواز ہوتی ہے
ان کا ہر لفظ اثر میں ڈوبتا ہوتا ہے۔ اکے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔
سوز و گداز ہوتا ہے اور وہ برق آشنا تڑپ ہوتی ہے جس سے ایک
مضحمل اور پس ماندہ قوم کے قومی میں حیات کے شرارے پیدا
ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقتاً قوم کے مستقبل کے بانی ہوتے ہیں۔ وہی
ملت کے محسن حقیقی را ہبر اور صحیح معنوں میں مجد و اعظم کھلانے کے مستحق
ہوتے ہیں۔ اقبال بھی ہندوستان بلکہ عالم مشرق کے زندہ جاوید
شعراء میں سے ہیں۔“

اقبال کی وفات کے بعد مقامی جریدوں میں ان کی اعلیٰ شاعری اور ان کے بلند نصب
اعین پر کئی مضامین شائع ہوئے جو افسوس ہے کہ تلاش و کوشش کے باوجود نہ مل سکے۔ البتہ
ہفت روزہ ندیم کے چند مضامین کا اشارہ آئندہ صفحات میں شامل ہے۔

اقبال کے سانحہ ارتحال پر بھوپال کے جن مقدار شعراء نے مرثیے لکھ کر اظہار عقیدت
پیش کیا ان میں علامہ محسوی لکھنؤی جناب حامد سعید خاں حامد جناب مائل نقوی جناب
حبيب الحسن صاحب قادری جناب اختر سعید خاں کے اسماء گرامی ہمیں عبدالقوی دسنؤی
کے کتابچے علامہ اقبال بھوپال میں ملتے ہیں۔ ان تمام شعرائے گرامی کے مرثیے ان کی نظر
سے گزرے تھے۔ لیکن انہوں نے صرف ایک مرثیہ مائل نقوی کا شامل کتابچہ کر لیا۔ چنانچہ
میں نے انہیں لکھا کہ دیگر حضرات کے مرثیے نقل کرا کر برآ کرم مجھے بھجوادیں تاکہ میں اپنی
کتاب میں محفوظ کر دوں۔ انہوں نے وعدہ کیا۔ لیکن افسوس کہ اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ جب
میں خطوط لکھ کر مایوس ہو گیا تو میں نے اپنے وسائل سے کام لیا اور میری خوش نصیبی کے مجھے
ایک غیر مطبوعہ مرثیہ بھوپال کی ماہینہ شاعرہ مہ جمین خمار کا ان کے بھتیجے تصحیح صدیقی کے توسط

سے دستیاب ہو گیا اور دوسرا مرثیہ بھوپال کے بزرگ و مختتم شاعر حامد سعید خاں حامد کا ان کے صاحبزادے اظہر سعید خاں کے ذریعہ عمل گیا تھا۔ تلاش کے بعد یہ بھی پہ چلا کہ باسط بھوپالی^۲ اور احسن علی خاں^۳ نے بھی اقبال پر معرب کہ آنظمیں لکھی تھیں جو ہر ممکن کوشش کے باوجود مجھے نہ مل سکیں ہفت روزہ ندیم کی فائلیں جن کی فراہمی کے لیے میں نے کوئی ارسال سعی و جہد کی کسی جگہ دستیاب ہو جاتیں تو وہ تمام سرمایہ یک جا ہو جاتا۔ کم از کم ان مضامین کی ایک مکمل فہرست ہی تیار ہو جاتی جو اقبال پر نظم و نثر کی صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اقبال پر بھوپال کے رسائل و ج رائمد میں ان گنت قیمتی مضامین نظم و نثر شائع ہوئے تھے جواب دس بدر زمانہ کے ہاتھوں اور اق گم گشتہ بن چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھوپال کا کوئی ہونہا محقق اس تمام ادبی سرمایہ کو تلاش و یک کجا کر شائع کر دے جو رسائل و ج رائمد میں بکھرا پڑا ہے۔ اس طرح آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں گی۔

بھوپال علم و ادب کا ایک بڑا مرکز ہونے کے باوجود اخبارات و رسائل کی مسلسل اشاعت کے سلسلے میں بہت بدنصیب واقع ہوا ہے یوں تو وہاں ظل السلطان نگار ”افکار“ ”جادہ“ ”کردار“ اور کتنے ہی رسائل شائع ہوئے لیکن کچھ مدت کے بعد بند ہو گئے۔ یا بھوپال سے کہیں اور منتقل ہو گئے۔ بہر حال یا ایک الگ داستان ہے۔

۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں صفحہ ۷۵ تا ۷۷

۲۔ ۳۔ ان شعراء کی نظمیں اس باب کے آخر میں ملاحظہ ہوں۔

گزارش کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آج جب گزشتہ نصف صدی کے ادبی ذخیرے کی تلاش جاری ہے تو رسالوں اور جریدوں کی فائلیں نایاب ہو گئی ہیں جس میں کتنے ہی قیمتی

ادب پارے اور لتنی ہی عظیم و پرمایہ شخصیتیں جو بجا طور پر بھوپال کے شعروادب اور علم و فن کی آبرو کہی جا سکتی تھیں ورنہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ مہبہ جبین خمار کا غیر مطبوعہ مرثیہ وفات کے فوراً بعد انہوں نے لکھا تھا جس کے شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ مہبہ جبین خمار مختصر حالات زندگی آئندہ صفحات میں شامل ہیں۔ ان کے مرثیہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ اقبال سے کتنی گہری عقیدت رکھتی تھیں۔ مرثیہ کا ہر شعران کے دلی جذبات غم کا آئینہ دار ہے۔ یہ مرثیہ اقبال کی وفات کے تقریباً ۲۵ سال بعد پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

فغان غم در یاد اقبال

قرطاس کو تخلی تحریر غم نہیں
اظہار و اضطراب مجال قلم نہیں
اقبال سر بلند کی رحلت کا سانحہ
کرب و بلائے یوم تعابن سے کم نہیں
طوفان نوح شدت گریہ سے آشکار
اشکوں پہ اختیار ذرا چشم نم نہیں
ہنگامہ نشور بپا شور آہ سے
صد حیف نالہ در خور ضبط الہم نہیں
آئی ندا لحاظ مشیت ضرور ہے
ترک حدود صبر بساط قدم نہیں
حکم قضا ہے زندگی نو کا راز دار
حیرت ہے آگھی رموز حکم نہیں
عازم ہے روح منزل تکمیل کی طرف
اس مرحلہ پہ بحث وجود و عدم نہیں
ہستی کہ در ازل اثر ارتقاء گرفت
در مرگ و زیست سعی جہاد والبقا گرفت

اقبال کو ملی تھی سرافراز زندگی
جس پر ہمیشہ کرتی رہی ناز زندگی
پاکیزہ خو بلند خصائص نکو شعار
ان خوبیوں سے پائی تھی ممتاز زندگی
اسرار کائنات میں الہام و شعر میں
شاعر کا دل صحیفہ صدر از زندگی
کب موت کے جمود میں تبدیل ہو سکا
وہ نغمہ تھا جو وقف تگ و تاز زندگی
انجام زیست نذر سکوت فنا نہیں
ہستی نو کا کرتی ہے آغاز زندگی
کرتی ہے انکشاف عروج حیات کا
دامن بہ اوج مائل پرواز زندگی
فردوس کی فضائے درختان میں تابناک
دنیائے ارتقاء کی عمل ساز زندگی
چوں نعمت بہشت بہ جہد رواں رسید
روح جری بہ زندگی جاوداں رسید
اقبال چوں بہ روپہ جنت درآمدہ
اکنوں بہار گلشن رحمت درآمدہ
گفتند حوریاں کہ زہے اوج قسمتم
درآمدہ حدائقہ عزت نوبادہ

چندیں عروج شوکت طوبی بہم نہ یافت
 آں سرو باقادر رفت درآمدہ
 باں ساعت کو مھفل فردوس نظم جست
 آں شمع دل نشین به جلالت درآمدہ
 بابوئے جاں نواز عزیز زمانہ بود
 اکنوں به خلد آں گل عظمت درآمدہ
 از باغ دهر قصد نعیم جنان گرفت
 باصد ہزار شان و شہامت درآمدہ
 در ظل ایزدی شرف ذوالمقام یافت
 قدرش به بین نمار فروع دوام یافت

(مه جبین خمار)

اس مرثیہ سے اگر ایک طرف مہ جبین خمار کے ذاتی غم اور ان کی دلی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ مرثیہ بھوپال کے ادیبوں اور شاعروں کے دلی رنخ و غم کی ترجیhanی کرتا ہے۔

وہ اگرچہ اس وقت بھوپال ہی میں تھیں لیکن ایک پرده نشین خاتون تھیں اس لیے انہیں اقبال سے نیازمندی کا شرف تو حاصل نہ ہو سکا لیکن اقبال نے ان کا کلام ان کے بھائی معظم رسول صدیقی کی زبان سے سننا اور پسند کیا اور ان کا مجموعہ کی اشاعت کے سلسلے میں انہیں مشورہ بھی دیا۔ آئندہ باب میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

حامد سعید خاں حامد بھوپال کے ایک جا گیر دار خاندان کے ذی علم اور صاحب طرز شاعر تھے اور ان کا شاعر بھوپال کے صفوں کے شعرا میں کیا جاتا تھا۔ نظم و نثر پر کیساں

قدرت حاصل تھی۔ ۱۹۲۳ء میں آپ نے بھوپال سے ایک رسالہ محسن الملک بھی جاری کیا تھا جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا شہید ٹونکی سے آپ کو شرف تلمذ حاصل تھا اور وسط ہند کے غزل گو شعراء میں بلاشبہ آپ کی حیثیت منفرد تھی۔ آپ کے بارے میں علامہ نیاز فتح پوری کی رائے ہے..... حامد بھوپالی کی شاعری صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے کلاسیکل قسم کی چیز ہے اس میں وہ سب کچھ ہے جسے قدما و متاخرین کے تغزل کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ ٹھہراو کے ساتھ ممتازت ان کی خاص خوبی ہے۔

۱۹۲۴ء میں جب نواب حمید اللہ خاں نے بھوپال میں سالانہ مشاعروں کی طرح ڈالی تو اقصائے ہند کے بلند پایہ شعراً مثلاً جوش فانی جگر سیما ب حفیظ فراق وغیرہ ہر سال بھوپال آنے لگے۔ یہ مشاعرہ شہر کی حسین عمارت صدر منزل میں عرصہ تک منعقد ہوتا رہا۔

ان مشاعروں کے خصوصی کار پردازوں میں حامد سعید خاں کی ذات گرامی بھی شامل رہتی تھی۔ اور بیشتر شعراً مشاعرہ کے بعد حامد صاحب کی ذاتی دعوتوں اور ادبی محفلوں میں شریک کرتے تھے۔ اس طرح حامد صاحب کی ذات بھوپال کے لیے ایک ادبی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ افسوس کہ بھوپال کا یہ ما یہ ناز فرزند فروری ۱۹۶۰ء میں ہم سے جدا ہو گیا ورنہ اقبال سے ذاتی ملاقاتوں کا کچھ اور متنند حال احوال ہم تک پہنچ جاتا جس سے وہ اقبال کے قیام بھوپال کے دوران متمع ہوئے تھے۔ ذیل کامریہ جوانہوں نے اقبال کی وفات پر لکھا تھا ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں فنی پختگی ہی نہیں۔ اقبال کی شاعرانہ عقلمت کا پرشکوہ اعتراف بھی ہے۔ یہ غیر مطبوعہ مریشیہ بھی پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

اقبال

پیکر اقبال جب تخلیق فرمایا گیا!
یعنی بزم آب و گل میں جب اسے لایا گیا
نطق جبریل امین معتبر بخشنا اسے
خود بنایا اور پھر خود غور سے دیکھا اسے
کوثر و تسیم کی موجود سے نہلایا اسے
خلعت پیغمبری شعر پہنایا اسے
روح سوز عشق اس کے جسم میں پھونکی گئی
پیر رومی کی امانت سب اسے بخشی گئی
شاعری کا تاج اس کے فرق پر رکھا گیا
علم و حکمت کا خزانہ سب اسے بخشنا گیا
قوم کے جذبات دل کی ترجمانی دی گئی
ترجمانی دی گئی جاد و بیانی دی گئی
فرش پا انداز اس کا آسمانوں سے بلند
آدمی لیکن فرشتوں کی صفوں میں ارجمند
طائر سدرہ نشیں کو دام میں لائے ہوئے
اور اس کے بعد بھی آغوش پھیلائے ہوئے

بلبل شیراز کے نغموں کو دھراتا ہوا
زندگی کے راستوں میں پھول برساتا ہوا
جنت الفردوس کی ساری بہاروں کو لیے
شعر و نغہ کے ہزاروں آبشاروں کو لیے
زندگی بھی ساتھ میں تابندگی بھی ساتھ میں
بے خودی بھی ساتھ اسرار خودی بھی ساتھ میں
آہ وہ شمع ضیا افروز اب ہم میں نہیں
ہم تو ہیں لیکن وہ ساز و سوز ہم میں نہیں
جم ہے لیکن حقیقی روح رخصت ہو گئی
قوم پر قبل از قیامت اک قیامت ہو گئی
عبدالجلیل مائل نقوی۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی..... (حامد سعید خاں حامد)

”.....بھوپال کے کہنہ مشق اور رذی علم شراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سر راس مسعود کے خاص آدمی تھے سر راس مسعود کی ہی تحریک اور امداد سے انہوں نے سحر بھوپالی کا کلام جمع کر کے بیاض سحر کے نام سے شائع کیا۔ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے۔ غزل کے علاوہ قصیدہ کہنے میں بھی مہارت کامل رکھتے ہیں ابھی بقید حیات ہیں اور پاکستان منتقل ہو گئے ہیں۔ ابتداء میں شعری بھوپالی نے انہیں سے اصلاح لی تھی۔ بعد میں ذکی وارثی سے اصلاح لینے لگئے۔“

۱۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ صفحہ ۲۸۲

ماں نقوی بیک وقت نظم و نثر پر قادر ہیں۔ نظامی بدایوں کا ایک مضمون بعنوان سر راس

مسعود اور اردو ادب مرقع مسعود میں شامل ہے۔ جس کا ایک اقتباس مائل نقوی کی ادبی حیثیت اور ان کے راس مسعود سے قریبی تعلقات اور راس مسعود کے ان کارناموں پر خاصی روشنی ڈالتا ہے جو انہوں نے بھوپال کی ملازمت کے مختصر سے عرصہ میں علم و ادب کے فروغ کے لیے انجام دیں لکھتے ہیں:

”یہ مضمون ختم نہ کرنے پایا تھا کہ انجمن ارتقی اردو بھوپال کے معتمد حضرت مائل نقوی کا ایک مضمون ”زمانہ“ میں نظر سے گزرا جس میں انہوں نے سر راس مسعود کی ان دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے جو بھوپال کی ادبی فضایاں ان سے ظہور میں آئیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مرحوم نے اپنے ذاتی صرف سے وہاں دارالتصنیف کی بنیاد ڈالی تھی اور اس ادارہ کو وہ بڑے پیمانہ پر عملی صورت میں اس طرح دینا چاہتے تھے کہ کسی پروفیسیو پہاڑی مقام پر ایک درجن کوٹھیاں تعمیر کرائی جائیں اور ہر کوٹھی کو علم و ادب کے کسی شعبہ سے منسوب کر کے اسے جملہ اواز مات سے مکمل کر دیا جائے۔ پھر ہر فن کے ماہر کی خدمت کم از کم ڈھائی سور و پیہ ماہانہ پر حاصل کی جائے اور ان سے یہ معاملہ کر لیا جائے کہ ہر سال چھ ماہ تمام علایق سے منقطع ہو کر کوٹھی میں قیام کریں اور تین سال کے بعد اپنے فن پر ایک رسالہ تیار کر دیا کریں۔ انہوں نے اس سکیم کو عملی صورت دینے کے لیے پندرہ لاکھ روپے کا تخمینہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ وہ اس رقم کو آسانی سے جمع کر لیں گے۔ جگہ کا بھی انتخاب کر لیا تھا جس کا اظہار نہیں کیا تھا یہ بھی کہا تھا کہ میری زندگی کا یہ آخری زمانہ ہو گا۔ لیکن مشیت کو یہ منظور نہ تھا۔

مائل صاحب کے اس مضمون کو پڑھ کر مجھے مرحوم کے اس خط کا
خیال آگیا جو ۱۹۳۶ء میں انہوں نے مجھے بھوپال بلانے کے لیے
بھیجا تھا کہ ہونہ ہواں سکیم کے متعلق مشورہ کے لیے میری طلبی ہوئی ہو
گی۔

اقبال کی وفات کے فوراً بعد مکتبہ جامعہ دہلی نے جو ہر کاشمار خصوصی بیان اقبال شائع کیا
تھا۔ اس جامع اور متعدد خصوصی شمارے میں جن اکابر اور مشہور شخصیتوں کے مضامین نظم و نثر
شامل ہیں ان میں علامہ سید سلیمان ندوی ابوالاثر حفیظ جاندھری ڈاکٹر عبدالحسین، پروفیسر
رشید احمد صدیقی، پروفیسر محمد مجیب پروفیسر سید نواب علی، پروفیسر غلام السیدین، ڈاکٹر سعید احمد
بریلوی، مولانا محمد اسلم چیراچپوری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی بطور
خاص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ میں تقسیم سے قبل کے علمی و ادبی اداروں کی جو
فہرست دی گئی ہے اس میں مائل نقوی کے نام کے ساتھ انجمان اردو تحریر کیا گیا ہے صفحہ ۲۵۹
۲۔ یہ مشہور رسالہ دیانی زبان نگم کی ادارت میں کانپور میں سے شائع ہوتا تھا۔

۳۔ یہ وہی زمانہ ہے جب اقبال علاج اور قیام کے سلسلے میں بھوپال تشریف لے گئے
تھے ہو سکتا ہے کہ راس مسعود نے اپنی اس سکیم کے سلسلے میں اقبال سے بھی مشورہ کیا ہو۔

۴۔ مرقع مسعود۔ صفحہ ۶۲-۶۵

پروفیسر نواب علی اسلامی تاریخ پرسند کا درجہ دکھنے کے علاوہ اردو اور فارسی میں شعر گوئی
کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ خصوصی شمارہ جو ہر کے اقبال نمبر میں ان کا معمر کہ ال آر ا مضمون
متنوںی پس چہ بایک کرداے اقوام رق شامل ہے جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا
ہے۔ اسی نمبر میں آپ کی بلند پایہ فارسی نظم بھی صفحہ ۸۰ پر شریک اشاعت ہے جو پیش خدمت

ہے عنوان ہے:

یاداقبال

بلند پایه سخن ور حکیم هند اقبال
چو باگ اربعه بشعید گشت محو جمال
چه گفت؟ گفت که از مرگ من نمی ترسم
چو مسلم متبسم ردم به بزم وصال
خدا رسیده خودی راست کاشف اسرار
رموز بے خود خویش انظر والی الیماقال
چه جرات است که از حق شکایت اس اورا
جواب شکوه او داد ایزد متعال
شکست ضرب کلیش فرنگ را نیرنگ
پیام مشرق او نزدبان اوچ کمال
فگند غلغله جاوید نامه اش به فلک
چو رفت زمزمه خواه تا سراوق اجلال
سر آمده شب دیبور خفته ملت
زنو نمود چو از بال جبریل ہلال
چو مست بانگ درائے است شد لاریب
کلام او شده تاروز حشر حسن مقاب

حیات او سبق آموز ملک و ملت را
چراغ بیت عقیق است و دیر را تمثیل
دماغ غربی و قلب مشرقی اورا
بشرق و غرب ضیا پاش بود مهر مثال
نمود ساده دار رانگاه حق بینش
وطن پرستی مغرب چو فتنه دجال
درست هفت که حب الوطن من الایمان
مگر پرستش او جان خلق راست و بال
چو پیر روم بیامنخت فلسفه با دین
زخارک سجدہ برافروخت آتش سیال
به بین به دوره باشین چوں حدی خوان است
جنوں نوازی او عقل راکشید عقال
حسن زبصره بلال از جوش صمیب از روم
بیابه بین که چنان بود پور ہند اقبال
نه شاعرے که به ہروادی است سرگردان
نه مشاعرے که ز اقوال او جدا افعال
ترانه اش ہمه عشق و سرود او ہمه درد
زنو گفت کهن داستان ہجر و وصال
فادئے ملت و پیک رجاو خضر طریق
سوار اشہب دوران وحید عصر اقبال

فرشته صید و پیغمبر شکار ویزدال گیر
بہ یاد او دل نواب مست بادہ حال
(پروفیسر سید نواب علی)

جبیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے کہ اقبال کی وفات پر جن مقتندر شعراء نے
مرثیے لکھے تھے ان میں احسن علی خاں، اختر سعید خاں اور باسط بھوپالی بھی شامل تھے۔ پہلے
ایڈیشن کی تکمیل کے دوران ہر ممکن کوشش کے باوجود ان شعراء کی نظمیں نہیں مل سکی تھیں جو
خوش قسمتی سے دوسرے ایڈیشن کی نظر ثانی کے دوران مستیاب ہو گئیں اور پہلی بار شائع ہو
رہی ہیں۔

احسن علی خاں اور اختر سعید خاں اس دور میں بھوپال کی نئی نسل کے نمائندہ
شاعروں میں اقتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ ان دونوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور تعلیم
مکمل کر کے بھوپال آگئے اور علمی ادبی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر
حصہ لیا۔ شروع ہی سے یہ دونوں حضرات جدید خیالات اور انقلابی نظریات کے حامل تھے۔
اور اقبال کی مقصدی اور تعمیری فکر سے متاثر۔ چنانچہ ان کی نظموں میں اقبال کے اثرات
آپ محسوس کریں گے۔

اختر سعید خاں..... آج بھی بھوپال میں ہیں اور شہر کے ممتاز ایڈوکیٹ ہی نہیں.....
باند پا یہ شاعروں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفوں کے سیکرٹری
اور مرکزی حکومت ہند کے تحت قائم کردہ اقبال سینیٹری کمیٹی کے رکن بھی ہیں اور اس امر کے
لیے کوشش ہیں کہ شیش محل..... قیام گاہ اقبال کو مستقلًا یادگار اقبال کی حیثیت عطا کر دی
جائے۔ ان کی نظم بے عنوان بیاد اقبال ان کے سچے جذبات کی ترجیمانی کرتی ہے۔

احسن علی خاں..... عرصہ دراز تک ملٹری کالج کا کول میں استاد کی حیثیت سے فرائض

انجام دیتے رہے۔ ان دونوں وہ اسلام آباد میں ہیں اور وزارت خارجہ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر
فاٹض ہیں ان کی بنیط姆 کا عنوان ہے ”اقبال“۔

باسط بھوپالی کا شمار بھوپال کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ غزل و نظم پر یکساں عبور رکھتے
تھے۔ بھوپال کی نئی نسل کی دینی اور فکری تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ باسط بھوپالی بھی
اقبال کے پرستاروں میں تھے۔ چنانچہ ان کی معرفہ کہ آر انظم کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی فائدہ
ہو گا کہ وہ افکار اقبال سے کس حد تک متاثر تھے۔

باسط بھوپالی بھوپال اور وسط ہند کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے
اور اکثر ویشتران کا کلام حاصل مشاعرہ قرار پاتا تھا..... ان کا یہ شعر تو آج بھی بھوپال میں
زبان زد ہے:

سارا	عام	آئینہ	باسط
جیسی	نگاہیں	ویسے	نظرے

ان کا پہلا نامائی نہ مجموعہ کلام کارروان غزل کے نام سے ۱۹۶۱ء میں بھوپال سے شائع ہوا
تھا۔ اور اسی سال افسوس کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی درد انگیز نظم نوح اقبال کی فراہمی بھی ایک دلچسپ اتفاق کی رہیں منت ہے۔
باسط مرحوم کے ایک عزیز شاگرد حبیب بھوپالی جو خود بھی ایک خوش لکھاری اور خوش آواز شاعر ہیں
نومبر ۱۹۷۶ء میں اپنے عزیزوں سے ملنے کر اچی آئے اور ایک روز اپنے چھوٹے بھائی فہیم
رضاء کے ہمراہ ملاقات کے لیے دفتر افکار بھی آگئے۔ باتوں باتوں میں میں ن باسط مرحوم کی
اقبال کے متعلق نظم کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ نظم آج تک کہیں شائع
نہیں ہوئی نہ باسط صاحب کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔ لیکن انہیں زبانی یاد ہے۔ اقبال
کے تعزیتی اجلاس میں یہ نظم باسط بھوپالی کی جانب سے انہوں نے ہی سنائی تھی۔ وہ اسے لکھ

کر دے دیں گے۔ چنانچہ یہ یادگار نظم حبیب بھوپالی کے دلی شکریہ کے ساتھ شامل کتاب کی
جاری ہے۔

اقبال

کونسا طائر فضا میں ارتعاش انداز ہے
فکر کی پرواز ہے یا روح کی پرواز ہے
اڑنے والا عرش کی جانب کوئی نغمہ نہیں
آہ اے اقبال یہ تو ہے ترا شکوہ نہیں
جی میں کیا آئی کہ یکاکیں آشیاں سے اڑ گیا
تو بھی اے قمری نوا شاپیں جہاں سے اڑ گیا
اب سنائے گا چمن میں نغمہ شیراز کون؟
اب دکھائے گا جہاں کو فکر کی پرواز کون؟



ایک ساعت جس نے دیکھی گردش دور جہاں
وہ شہاب زندگی ہے زیب سقف آسمان
اے شہاب زندگی اے شاعر فکر حسین
بھول کر بھی یاد آتا ہے تجھے خواب زمیں؟
تیرے شایاں جو نہ تھا ایسے جہاں کو بھول جا
میرے شکوؤں پر نہ جا ہندوستان کو بھول جا
حسن کا پیارا ہے تو اور عشق کا پیارا ہے تو

بہر نظارہ بتا دے کون سا تارا ہے تو؟



ساری دنیا طور سے بے طور ہے تیرے بغیر
عالم بزم نگاراں اور ہے تیرے بغیر
تیری موس آج سے بیمار ہجراں ہو گئی
فرط غم سے لیلی شب مو پریشاں ہو گئی
خوبصورت آنسوؤں کا حسن ماتم ہائے ہائے
نازینِ صح کے عارض پہ شبنم ہائے ہائے
ہائے وہ دھنی سروں میں نوحہ گر جوئے رواں
جیسے کوئی لے رہا ہو ہچکیاں پر ہچکیاں
سینہ رنگین گل تیرے الہ میں چاک چاک
شبنمی چہرہ کلی کا فرط غم سے تاباک
گلتاں میں کس لیے اتنی پریشاں ہے شیم
کیا خبر پائی ہے جو گھبرا گئی ہے باد نسیم
تیرے غم میں ہو گئی بزم چمن بزم عزا!
پھر کسی صورت سے اس ویراں چمن میں لوٹ آ
(احسن علی خاں).....

بیادِ اقبال

اے شہپر جریل امیں طائر افلک
جاتے ہوئے فردوس کو اللہ دھر دیکھ
ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہے جہاں میں
تجھ بن یہ زمیں ہو گئی کیا ایک نظر دیکھ
اشکوں کا تلاطم کہیں آہوں کا دھواں ہے
خاکستر دل شعلہ جاں زخم جگر دیکھ
خاموش ہے کیوں اے لب اعجاز مسیح!
بھی اٹھیں گے ہم پھر ہمیں تو بار دگر دیکھ
افلاک پر غل ہے تیری بیباک نظر کا
سمیں ہوئی مجبور غلاموں کی نظر دیکھ
دیکھ آج بھی دھقاں کو میسر نہیں روزی
خرمن ہے وہی سیر گہ برق و شر دیکھ
مرمر کی سلیں آج بھی ہیں سجدہ گہ خلق
مٹی کا حرم آج بھی ہے خاک بہ سر دیکھ
جلنے کو تو جلتا ہے چراغ حرم و دیر
روشن کسی اللہ کے بندے کا ہے گھر دیکھ
تفريق ابھی تک ہے وہی محنت و زر میں
یہ قصر یہ ایواں یہ گھروندے یہ کھنڈر دیکھ

مشرق کی زمین اب بھی ہے بازیچہ اطفال
اب تک ہے وہی سلسلہ شام و سحر دیکھے
(آخر سعید خاں).....

نوحہ اقبال

حیف اے بزم جہاں اے انقلاب کائنات
ہر نفس پر ختم ہو جاتا ہے اک دور حیات
زندگی سی قیمتی شے اور اتنی بے ثبات
آہ اے معمورہ آفات و بزم حادثات
سب شہود و غیب فانی، باطن و ظاہر فنا
منزل اول فنا اور منزل آخر فنا
کیا غم و اندوہ کیا سرمایہ عیش و نشاط
کیا طسم رنج پیغم کیا فریب انبساط
کیا خیال پیش بنی کیا جنون احتیاط
کیا یہ دنیا اور کیا دنیا کانظم ارتباٹ
کیا گدا کی زندگانی اور کیا شہ کا وجود
حاصل افسانہ ہستی نہیں جز رفت و بود
منزلوں کی کچھ خبر ہے اور نہ راہوں کا پتا!
کچھ نہیں ہے سامنے دھنڈ لے نشانوں کے سوا
گرد منزل ہی نہیں ملتی ہے منزل تو کجا!
ہر طرف بس اک سراب اندر سراب اف اے خدا

جا رہے ہیں کس طرح ہم کو خبر کچھ بھی نہیں
زندگی محو سفر ہے اور سفر کچھ بھی نہیں
کاروان مہ دنیم صبح تک رخصت ہوا
پھول گلشن میں کھلا مہکا مگر مر جھا گیا
کیسا نغمہ کس کا بادہ کیا بہار جاں فرا؟
ہر حقیقت میں بجز نام حقیقت کچھ نہ تھا
جائگتے ہی موج آغوش فنا میں سو گئی
شکل طوفان رفتہ رفتہ محو دریا ہو گئی
جھونپڑوں میں موت اور دولت کے کاشانوں میں موت
خلوقوں میں موت جلوتوں میں اور زندانوں میں موت
محفل شادی میں اور غم کے سیہ خانوں میں موت
دشت و در میں موت شہروں اور ویرانوں میں موت
ٹل نہیں سکتی کہ حکم آخر تقدیر ہے
زندگی کے خواب کی بس موت ہی تعبیر ہے
موت بہتر ہے ضعیفوں ناتوانوں کے لیے
بے ثبات و بے ہنر اور بے نشانوں کے لیے
آفتوں میں بتلا بے تاب جانوں کے لیے
خانماں برباد فاقہ کش جوانوں کے لیے
لیکن اک کامل کا اٹھ جانا جہاں سے ہائے ہائے
ہائے اب اقبال کو لاکیں کھاں سے ہائے ہائے

صرف اے اقبال تو ہی شاعر اسلام تھا
تیرا جام فکر لبریز مئے الہام تھا
عاشق فطرت تھو تو قدرت کا اک انعام تھا
قلب مسلم کے لیے تسلیم کا پیغام تھا
تو وہ شاعر تھا کہ روح دہر جس سے شاد تھی
درد کی بستی تری تخلیل سے آباد تھی
فارسی تک ہی نہ تھا محدود تیرا فیض عام
کشت اردو کے لیے آب روائی تیرا کلام
تو امام شاعر ایشان تھا فلسفہ تیرا غلام
آسمان شاعری کا تو ہی تھا ماہ تمام
تجھ پہ اہل ہند کو اک فخر تھا اک ناز تھا
جس پر یورپ رقص کرتا تھا تو ایسا ساز تھا
مست ہے مسلم مگر بدذوق بالکل ہی نہیں
اس کے ہر انداز میں پیدا ہیں سو حسن و یقین!
اس کی رگ رگ میں ہے پنہاں ایک عزم آتشیں
کاش یہ خاموش چنگاڑی بھڑک اٹھے کہیں
کاش تیرا واعظ و تلقین پر اثر بن کر رہے
جو خس و خاشک مسلم میں شر بن کر رہے
تو نے اسرار یہ الہی بتائے قوم کو
تو نے غیرت خیز افسانے سنائے قوم کو

تو نے جینے کے طریقے بھی سکھائے قوم کو
کون اب تیری طرح دیکھیں جگائے قوم کو
اے خطیب بے بدل اے شاعر عالی مقام
تا ابد محفوظ رکھا جائے گا تیرا کلام
(باسط بھوپالی).....



ملفوظات قدسی اور نیازمندان بھوپال

حضرت شاہ اسد الرحمن قدسی مدظلہ کا مختصر احوال اس کتاب کے دوسرے باب میں اقبال کے بھوپال سے روابط کے ذیل میں درج کر چکا ہوں۔ آپ کا اسم گرامی ناصر الدین اسد الرحمن اور تخلص قدسی ہے۔ آپ بمقام بھوپال ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی حبیب الرحمن علیہ الرحمۃ اللہ صاحب رشد و ہدایت اور صوفیائے کرام کے اعلیٰ مسلک سے فضیاب ہو چکے تھے اور حضرت وارث علی شاہ دیوبندی شریف کے خلیفہ تھے۔

قدسی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور سن شعور کو پہنچ تو آئندہ تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیے گئے۔ سات برس بعد بھوپال لوٹے۔ آپ کے والد بزرگوار کا وصال ہو چکا تھا اس لیے آپ خاندانی سلسلہ رشد و ہدایت پر فائز ہوئے۔ چار پانچ برس تک صحراؤں پہاڑوں اور ریاضت شاقدہ میں بسر کیے۔ آخر میں بھوپال کی مشہور تیکری منوا بھانڈ پر چلہ کشی فرمائی۔ یہ سنسان اور ویران پہاڑی شہربھوپال سے تقریباً پانچ میل دور ہے۔ پھر ریت گھاٹ پر قیام فرمایا۔ وہاں سے مشی حسین خاں کی مسجد میں فروکش ہو گئے۔ اس زمانہ میں بڑی رجوعات ہوئیں۔ بھوپال کے تمام صاحبزادگان اور اخوان ریاست کے علاوہ اطراف ہند کی سیکڑوں عورتیں اور مرد خدمت میں حاضری دینے لگے۔ بعدہ شملہ کوٹھی جو بھوپال کی ایک بلند ترین پہاڑی پر واقع تھی اس کے نیچے شہرستان عبید آپ کو پیش کیا گیا اور نواب زادہ سعید الظفر خاں، نواب زادی رشید الظفر خاں نواب حمید اللہ خاں کے سنتھنے اور ان کی والدہ محترمہ مرحومہ حلقة بگوش اور مرید خاص ہو گئے۔ شہرستان میں آستانہ قائم ہوا۔ مسجد اور عمارت

تعمیر کی گئیں۔ تقسیم ہندوپاک تک بھیں قیام فرمائے ہیں میں بھوپال سے بحیرت کی اور کئی لاکھ کا اٹانہ وہیں چھوڑا۔ پاکستان آنے کے بعد کراچی کے بولان ہوٹل میں قیام کیا۔ پھر حیدر آباد کا لونی۔ کراچی میں ڈیڑھ سال تشریف فرمائے ہیں۔ یہاں سے لاہور روانہ ہوئے اور کوئی چار سال وہاں رہے۔ پھر بہاول پور میں قیام ہوا۔ وہاں سے کوٹری تشریف لے آئے معتقدین نے بلا طلب دریائے سندھ کے کنارے ایک نو تعمیر بنگلہ پیش کیا۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر چکوال جہلم سے آٹھ میل دور قصبہ بھون شریف لے گئے۔ جہاں جلد ہی ایک وسیع و عریض احاطہ میں آستانہ تعمیر ہو گیا۔ جب سے وہیں قیام ہے۔ آپ کا شمار بھوپال کے بزرگ و ممتاز دیوبول اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی متعدد نظم و نثر کی تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ تصانیف کی تفصیل گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔

حضرت موصوف کے بارے میں مجھے علم ہوا کہ آپ کے اقبال سے دیرینہ روایات رہے ہیں چنانچہ اپنی کتاب کے بارے میں آپ کو تفصیلات سے مطلع کیا اور گزارش کی کہ اس بارے میں مطلوبہ معلومات سے نواز دیں چنانچہ ۱۹۶۳ء میں حضرت موصوف نے کمال شفقت سے جواب دیا اور عنایت کیا:

”۱۲-۲۳۱۲ عزیزم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

میری صحت بہ تقاضائے عمراب اچھی نہیں رہی۔ ایک ماہ سے سخت نزلہ زکام کھانسی اور بخار ہے اللہ پاک انعام بخیر فرمائیے۔
میں خود اب کچھ لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں۔ یادداشت بھی خراب ہو چکی ہے۔ مکاتیب سب ایک عزیز کے پاس محفوظ ہیں۔
اقبال مرحوم کا خط حاصل کر کے آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

آستانہ بھون جہلم۔
قدسی!“۔

اس کے فوراً بعد آپ کی ہدایت پر صوفی خدا بخش متول آستانہ قدسی نے مجھے اقبال کا
قلمی خط بھیجتے ہوئے تحریر فرمایا:

”مکرمی.....السلام علیکم

آپ کا خط موصول آسانہ ہوا۔ حضرت مرشدنا عرصہ سے علیل
ہیں۔ ایک ماہ سے زیادہ تکلیف ہے اللہ کریم صحت و سلامتی عطا
فرماتے۔

آپ نے علامہ اقبال علیہ الرحمة کے بھوپال سے تعلقاتے
بارے میں معلومات کی درخواست کی ہے حضرت مدظلہ بہ سبب
عالیٰ جواب سے معدود رہیں۔

رقم الحروف کی نظر میں علامہ اقبال کی فقیر دوستی اس سے ظاہر
ہے کہ جب کبھی بھوپال میں شاہی مہمان ہوئے حضرت مرشدنا اسد
الرحمن قدسی مدظلہ العالی کے آستانہ پر ضرور حاضری دی۔ افسوس کہ
علامہ علیہ الرحمة کے ایک مکتوب کے سوا جو حضرت گل حسن شاہ قلندر
علیہ الرحمة کے انتقال کی خبر سے متعلق ہے دیگر علمی و روحانی خطوط جو
مختلف وقوف میں بھیج گئے دستیاب نہ ہو سکے بطور یادگارو ہی ایک خط
۲ ارسال ہے جو بعد نقل واپس بھیج کر منون فرمائیں..... خیر اندیش
صوفی خدا بخش مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۶۳ء

متول آستانہ قدسی!“۔

حضرت قبلہ ک مزاج پر سی کرتے ہوئے میں نے اپنی کتاب کے سلسلے میں چند رچنہ مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے خصوصی اعانت کی درخواست کی بھوپال سے خاندانی تعلق کا حوالہ دیا اور یہ عرض کیا کہ اگر قبلہ موصوف اس اہم کام میں اپنی یادداشتوں سے کچھ عطا فرمایا گے تو اس کتاب کی قدر و اہمیت بڑھ جائے گی میرے تفصیلی عریضہ کے جواب میں حضرت موصوف نے میری کامیابی کی دعا فرمائی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی زیر ترتیب کتاب نقش ماضی سے چند ایسے واقعات بھی بھجوادیے جو اقبال کے بھوپال سے روابط کے سلسلے میں ہمیشہ یادگار ہیں گے۔ ان وقایت کا اس سے پہلے کسی کو علم نہیں تھا گرامی نامہ کا متن ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

۱۔ ذاتی خط بنام رقم الحروف۔ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء

۲۔ اس خط کا تذکرہ اقبال کے بھوپال سے روابط کے سلسلے میں آچکا ہے۔

۳۔ ذاتی خط بنام رقم الحروف۔ مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۶۳ء

۷۸۲

۱۲ جنوری ۱۹۶۴ء

عزیز مکرم..... السلام علیکم و رحمۃ اللہ

محبت نامہ موصول ہوا۔ آپ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے تعلق
ے بارے میں معلومات کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ یہ بڑی اہم
یادگار ہوگی۔ دعا ہے کہ آپ کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل
ہو۔

میری معلومات میں یہ ہے کہ بھوپال سے بطور قدر دانی و عزت
افزاںی چند نامور مشاہیر ملک کے وضائف مقرر تھے۔ اسی سلسلے میں

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو بھی وظیفہ ملتا تھا اور اسی سبب سے موصوف کا
بھوپال آنا جانا ہوا۔

علامہ علیہ الرحمۃ جہاں ایک ممتاز شاعر ادیب فلسفی، مفکر و محقق
اور سیاست داں تھے اسی کے ساتھ فقیر منش اور صوفی بھی تھے۔
مسلم و مشرب قلندرانہ تھا۔ گوشہ نشیں فقراء سے مخلصانہ محبت رکھتے
تھے۔ ملک کے اکثر عزالت گزینوں سے مراسلت کی تھی۔ بعض موقع
پر مجھے بھی خطوط لکھے جو افسوس ہے محفوظ نہیں رہے۔ ایک خط خدا
جانے کس طرح کاغذات میں مخلوط ہو کر نجگیا تھا۔ جو بطور یادگار
نقوشِ ماضی میں شامل کر لیا گیا۔

میں نے صوفی خدا بخش صاحب کو توجہ دلائی ہے کہ جو معلومات
اقبال اور بھوپال کے متعلق یادداشت میں محفوظ ہوں قلم بند کر کے
آپ کو ارسال کر دیں۔

یہ معلوم ہو کہ آپ ہمارے وطن عزیز کے ایک خوش خصال فرزند
ہیں مسرت ہوئی۔ اللہ رب العزت آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ
اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اور عزت و سرفرازی عطا فرمائے۔
میری عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ ضعیف العمری کے
ساتھ عرصہ دراز سے علیل بھی ہوں چراغِ سحری ہوں اللہ تبارک تعالیٰ
انجام بخیر فرمائے۔

خیر طلب دعا گو
آستانہ بھون ضلع جہلم

فقیر قدسی اے۔

اس گرامی نامہ کے فوراً بعد حضرت قبلہ کی ہدایت پر صوفی خدا بخش صاحب نے آپ کی یادداشتوں سے جواب قتباسات ارسال فرمائے ہیں ان کی تفصیلات یہ ہیں۔ اقبالیات کے سلسلے میں یہ اچھوتے واقعات تینی اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۷۸۶

۱۹۶۲ء جنوری

جناب محترم۔ السلام علیکم

عنایت نامہ سے معلوم ہوا کہ آپ کے افکار عالیہ میں ایک
دلچسپ موضوع..... ”اقبال اور بھوپال منتخب ہو کر کتابی صورت میں
منظر عام پر آنے والا ہے.....

۱۔ ذاتی خط بنا نام رقم الحروف مورخہ ۱۹۶۲ء جنوری

علامہ اقبال کی شخصیت اور شخصیت کی مختلف حیثیات پر روشنی
ڈالی گئی ہے اور ملک کی بلند پایہ ہستیوں پر بھوپال کی شاہانہ نواز شاہات
سے متعلق بھی کافی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ عنوان اقبال اور بھوپال
سے مترشح ہوتا ہے کہ اقبال کا تعلق بھوپال سے صرف شاہانہ
نواز شاہات تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ بھوپال کی ماہنہ ہستیوں سے
بھی مربوط ہے۔ امید ہے اس سلسلے میں بھی معلومات مہیا کی گئی
ہوں گی۔ میں آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے بھوپال کی
نہایت ممتاز اور بزرگ ہستی حضرت شاہ اسد الرحمن قدسی اعلیٰ اللہ
مagnaem سے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے ارتباٹ کا تذکرہ پیش

کرتا ہوں۔

بھوپال میں آستانہ عالیہ پر ملک کی اکٹھنمایاں شخصیتوں نے حاضری دی ہے۔ جن میں حضرت خواجہ حسن نظامی مہاراجہ کشن پرشاد۔ علامہ سیماں اکبر آبادی۔ ساغر نظامی جگر مراد آبادی۔ حفیظ جالندھری۔ مضطرب خیر آبادی۔ سلیمان ندوی اور حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

حضرت اقبال ریاست بھوال کے وظیفہ یاب ہونے سے سالہا سال قبل حضرت مرشدنا مدظلہ العالی سے متعارف تھے اور سلسلہ مکاتیب جاری تھا۔ حضرت علامہ وظیفہ یاب ہونے کے بعد جب آخری بار بھوپال میں شاہی مہمان ہوئے تھے اس زمانہ میں حضرت مرشدنا مدظلہ علیہ شہر بھوپال سے چار میل دور فاصلہ پر باغ شمرستان میں رونق افروز تھے۔ حضرت علامہ جب حضرت مرشدنا سے ملنے شمرستان پہنچ تو خوش منظر پہاڑیوں سے گھرے ہوئے مقام کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور نہایت ذوق سے یہ قطعہ پڑھا۔

چشمہ لے فیضِ تشنہ لب کے لیے
مرکز رشد بہر اہل صفا
کوئی سمجھے تو ہے مقام قدس
آستانہ جناب قدسی کا
جب حضرت خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمۃ حاضر آستانہ ہوئے اور
قطعہ سناؤ اس دل کشا اور پرفضا مقام کو وادی ایمن سے موسوم کر کے

اپنے اخبار منادی دہلی میں تذکرہ شائع کیا۔

جگہ مراد آبادی مرحوم نے بارہ آستانہ پر حاضری دی ہے۔

ایک نظم بھی آستانہ کی تعریف میں لکھی گئی تھی جو گم ہو گئی۔ بعض لوگوں کو ایک شعر آج تک یاد ہے:

منزل قدس ایکن وادی آستانہ ہے خیر کا مخزن
ابوالاثر حفیظ جاندھری بھی جب نواب زادہ عمامہ الدولہ ہیں
الملک محمد رشید الظفر خاں بہادر مرحوم کے ساتھ آستانہ پر حاضر
ہوئے تو خوش نما قدرتی مناظر سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے
جدبات چند اشعار میں لکھ کر نواب زادہ موصوف کو پیش کیے جو محفوظ
نہیں رہے۔

۱۔ یہ غیر مطبوعہ قطعہ اقبال کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں اور پہلی بار اس کتاب میں
شائع ہو رہا ہے۔

مشاہیر ملک کی آستانہ پر حاضری مختلف وجوہ کی بنا پر تھی بعض
حضرات تو حضرت مرشدنا مظلہ کے عارفانہ حکیمانہ کلام کے شائق
تھے۔ بعض لوگ حضرت مظلہ کی روحانی تقاریر کے مشتاق تھے بعض
اصحاب حضرت کی باوقار متوكانہ گوشہ نشینی کے گرویدہ تھے۔ حضرت
علامہ علیہ الرحمۃ کے ربط انس کا سبب حضرت مرشدنا مظلہ کا قلندرانہ
مسلسل تھا۔

خط بند کرتے قت شبیہ مبارک والا واقعہ یاد آ گیا۔ علامہ اقبال

بھوپال میں شاہی مہمان تھے۔ نواب زادہ فخر الملک محمد سعید الظفر خان بہادر ملاقات کے لیے مہمان خان پہنچ گئے تو عمایدین ریاست کے علاوہ وہاں شمس العلماء سید احمد صاحب دہلوی بھی تھے۔ فرمایا کل بعد نماز جمعہ میں بھی حضرت اقبال کے ساتھ آپ کے باغ شرستان میں حضرت قدسی صاحب کی زیارت کے لیے گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مشاہدہ ہوا کہ شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ کس طرح قلندرانہ معاشرت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں رہ کر ترک دنیا کا تصور بعید از قیاس تھا حضرت علامہ نے فرمایا جناب مولانا کیا آپ نے عارف روی علیہ الرحمۃ کا مشہور شعر نہیں سنा۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
 نے قماش و نقرہ و فرزند و زن
 آپ کو تو صرف دنیا میں ترک دنیا کا مشاہدہ ہوا مگر میرے دل
 میں آستانہ میں قدم رکھتے ہی انشراح صدر کے ساتھ رجوع الی اللہ کا
 جذبہ ابھر آیا اور منکشف ہوا کہ بے شک فقر الحق پر انوار بانی کا نزول
 ہوتا ہے۔ اور لطائف روشن ہوتے ہیں۔ پھر نواب زادہ فخر الملک کی
 طرف مخاطب ہو کر فرمایا کل سے ابھی تک جناب قدسی کی شبیہ
 مبارک نظر کے سامنے ہے کیا آپ تصویر مہیا فرماسکتے ہیں۔ اپنے
 علمی ذخیرہ میں رکھوں گا۔ نواب زادہ کی تصویر کی فراہمی کا وعدہ کر
 کے واپس ہوئے۔ اور آستانہ پر حاضر ہو کر تصویر کی درخواست کی

ارشاد ہوا:

دل کے آئینہ میں ہو تصویر دوست
کاغذی تصویر ہے مانند پوست
سفرج و ممالک اسلامیہ کے پاسپورٹ پر جو تصویر ہے اس کا
عکس حاصل کر لیا جائے متعدد عکس اتارے گئے۔ ایک عکس خوش نما
فریم میں حضرت علامہ کونوا بزادہ موصوف نے پیش کر دیا اور ابطور
یادگار اقبال متولیین آستانہ میں تھفتہ تقسیم ہو گئے۔ جب سے اب
تک بعض مخلص احباب ہر سال حضرت مرشدنا مظلہ کی سال گردہ کی
تقریب کے موقع پر ابطور یادگار اقبال عکس کشی کی تجدید کرتے ہیں۔

۱۔ یہ شیوه مبارک اسی کتاب میں شامل ہے۔

ایک کاپی ا تھفتہ آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔ جوانی
کی تصویر کلام قدسی میں ہے۔ یہ مجموعہ اب نایاب ہو چکا ہے۔ ایک
جلد پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

ایک واقعہ اور یادآیا:

مسعود علی وارثی استٹنٹ ڈائریکٹر تعلیمات بھوپال نے
رباعیات عمر خیام کا انگریزی میں ترجمہ کر کے طبع کرایا تھا۔ کسی نے
راس مسعود کے توسط سے ایک جلد حضرت علامہ کو پیش کی۔ یہ وہ نسخہ
تھا کہ جو وارثی مرحوم نے جب گاندھی جی بھوپال میں شاہی مہمان
تھے خود پیش کر کے سرورق پران کے دستخط ابطور اعزاز کرا لیے تھے۔
حضرت علامہ نے یہ کہہ کر نسخہ واپس کر دیا کہ یہ واپسے گھر میں ڈی
رکھنے کی چیز ہے۔ تھفتہ پیش کرنے کی نہیں۔ عمر خیام کی رباعیات کا

تذکرہ چل نکلا۔ حاضرین میں سے کسی نے رباعیات سرمد شہید کی تعریف کی حضرت علامہ نے فرمایا اپنے اپنے مذاق کے مطابق رباعیات عمر خیام اور رباعیات سردم شہید بہت بلند پایہ کلام ہیں۔ ہر زمانے میں بہ تقاضائے حالات و ماحول مذاق میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ مثنوی مولانا روم اور میری مثنوی سے ظاہر ہے۔ مجھے تو حالات حاضرہ اور موجودہ ماحول کے مذاق میں جناب قدسی کی رباعیات میں بڑی معنی آفرینی نظر آتی ہے۔ بعض رباعیات بے حد دلکش ہیں۔ ایک رباعی تو اکثر زبان پر آتی ہے۔

ہر ذرہ بہ وسعت بیابانے ہست
 ہر گل بہ لطفتے گلتانے ہست
 در دیدہ مردمان اہل بینش
 ہر قطرہ بہ خوش گریہ طوفانے ہست
 (قدسی)

رباعیات قدسی اور نغمات قدسی بھی اب نایاب ہیں۔ انہیں ترقی اردو کے دہلی والے بکڈ پو میں چند نسخے موجود تھے۔ کتابت و طباعت کی گرانی کے پیش نظر ارادہ ہے کہ اگر حالات سازگار ہوئے تو انتخاب کلام شائع کیا جائے۔

خیر طلب صوفی خدا بخش

آستانہ بھون ضلع جہلم،

ان نئے واقعات کا علم ہونے پر میں نے قدسی صاحب مظلہ کا دلی شکریہ ادا کیا اور

گزارشی کی کہ یادداشتؤں سے اگر کچھ اور تفصیلات مل جائیں تو عطا فرمادیں۔ کچھ ہی دنوں بعد صوفی خدابخش کا گرامی نامہ مجھے نئے معلومات کے ساتھ موصول ہو گیا۔ اس کے مطالعہ سے جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے اقبال کی شخصیت کے کچھ اور نئے رخ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۷۸۲[”]

۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء

جناب محترم السلام علیکم و رحمۃ اللہ

عنایت نامہ اور دو کتابیں اموصول آستانہ ہوئے۔ شکریہ۔

۱۔ یہ دو کتابیں میرے عم محترم پروفیسر نواب علی مرحوم کی تھیں۔ تاریخ صحف سماوی اور معارج الدین جنہیں میں نے آستانہ کے لیے نذر کیا تھا۔

حضرت مرشد نامذکور کی عمر شریف پچھتر برس کے قریب پنجی۔

عرصہ دراز سے علیل ہیں۔ کیم جنوری سے یہاں بارش وزالہ باری اور سرد ہواں کا سلسلہ جاری ہے۔ چند بار برف باری بھی ہوئی ہے موسمنہایت سرد ہو رہا ہے جو حضرت مرشد نامذکور جیسے ضعیف العمر ہے لیے ناقابل برداشت ہے۔ صحت زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ بھوپال سے اپنے حقیقی عزیزوں کو طلب فرمایا ہے اللہ کریم خیر کے مجھے ہدایت فرمائی کہ آپ کے خط کا مفصل جواب لکھوں۔

محض صوفی خدابخش

پہلے خط میں شبیہہ مبارک والے واقعہ میں ایک بات لکھنا بھول گیا تھا۔ علامہ کے ساتھ شمس العلماء سید احمد صاحب دہلوی بھی

حاضر آستانہ ہوئے تھے حضرت مرشدنا مدخلہ نے ان کو نہایت بیش قیمت ایک ایرانی غالیچہ عنایت فرمایا اور کہا کہ جمعہ کے دن جامع مسجد دہلی کے منبر پر بچھا دیا جایا کرے۔ یہ غالیچہ ولی عہد ریاست ٹونک نے منجانب نواب صاحب والی ٹونک آستانہ میں پیش کیا تھا۔ حضرت علامہ نے شمس العلماء سے کہا یہ یادگار قدسی ایک تاریخی چیز رہے گی۔ یہ سب واقعات و حالات مجھے حضرت مرشدنا مدخلہ کے خادم خاص حضرت حافظ عبد المتعال خاں صاحب غوالی سے معلوم ہوئے جو حضرت مدخلہ کے پاکستان میں تشریف آوری سے قبل ضروری سامان کے ساتھ پاکستان آگئے تھے۔ ابھی چند ماہ ہوئے کراچی میں انتقال ہوا۔ با فیض بزرگ تھے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا جو اگرچہ علمی ادبی نہیں مگر معلوماتی ضرور ہے۔ علامہ اقبال کے قیام بھوپال کے زمانے میں نواب خسر و جنگ حیدر آباد سے دہلی جاتے ہوئے ایک دن کے لیے شاہی مہمان ہوئے۔ موصوف کو کشمیر کے قیام کے سبب مرغ مسلم اور کتاب ماہی بہت پسند تھے۔ کشمیر کا مرغ مسلم اور کتاب ماہی بہت مشہور ہیں۔ احباب کو معلوم تھا کہ موصوف کو مرغ مسلم و کتاب ماہی بہت مرغوب ہے اور اس لیے شاہی دعوت میں مرغ مسلم اور کتاب ماہی کا خصوصیت سے اہتمام کیا گیا۔ نواب زادہ فخر الملک سعید الظفر خاں نواب زادہ بیکین الملک رشید الظفر خاں اور کرمل اقبال محمد خاں شریک طعام تھے۔ نواب زادہ فخر الملک نے کہلا لاہور کے بازار مسجد

وزیر خاں کی مجھلی بہت مشہور ہے۔ علامہ علیہ الرحمۃ نے کہا کئی من
مجھلی روزانہ تی جاتی ہے۔ قابل تعریف ہوتی ہے۔ سنا ہے شاہی
مطبخوں میں ایسے رکاب دار ہوتے تھے جو مجھلی کے کانٹے پکانے سے
قبل نکال لیتے تھے نواب زادہ فخر الملک نے کہا کہ حضرت مرشدنا
مدظہ کے آستانہ پر امانت خاں نامی خان اسماء پکانے سے قبل مجھلی کے
کانٹے علیحدہ کر لیتا ہے۔ اکثر باورچی اس کی خوشامد کرتے ہیں کسی کو
نہیں سکھاتا۔ آستانہ کا نام سن کر نواب افتخار الملک حمید اللہ خاں مرحوم
نے فرمایا آستانہ میں کبھی قلندری دیگ بھی پکتی ہے۔ جو عجیب
پرطف چیز ہے۔ حضرت قدسی صاحب ہماری والدہ محترمہ نواب
سلطان جہاں بیگم مرحومہ فرمائے بھوپال کے لیے بھی حصہ بھیجی
ہیں۔ اس کے پکانے کا راز بھی آستانہ تک ہی محدود ہے۔ حضرت
علامہ نے فرمایا جب میں اور ڈاکٹر انصاری میرٹھ میں حضرت گل
حسن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس دن اتفاق
سے خانقاہ میں قلندری دیگ پکی تھی۔ ہم کو شریک طعام فرمایا میں نے
مدت العمر اتنی لذیذ چیز نہیں کھائی۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو
بہت ہی لذیذ کھانا ہے فرمایا قلندری دیگ سے موسوم ہے فقراء کا
خاص کھانا ہے۔ نواب صاحب والی ٹونک بھی ۱۲ ربیع الاول کی
دعوت میں قلندری دیگ پکواتے ہیں۔ مجھے اس کی ترکیب حیدر آباد
دکن میں حضرت شاہ عبدالرحیم قلندر سے حاصل ہوئی تھی۔ جو قدسی
صاحب کے والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب الرحمن قلندر قدس سرہ

کے خلیفہ تھے۔

علامہ اقبال اول عمری سے تصوف و روحانیت کی طرف میلان رکھتے تھے۔ انگلینڈ میں جب زیر تعلیم تھے تو حضرت شاہ سلیمان چپلواری رحمۃ اللہ علیہ سے مسائل تصوف پر مراسلت جاری تھی۔ جب پورپ سے فارغ التحصیل ہو کر واپس ہوئے تو حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ سے عقیدت مندانہ تعلق پیدا ہوا۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ و جانشین تھے۔ اور بڑے عارف کامل بزرگ تھے۔ تذکرہ غوشیہ مشہور و معروف کتاب میں اپنے مرشد حضرت غوث علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات جمع کیے ہیں۔ یہ کتاب بہت مقبول عام و خاص ہو کر متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

حضرت مرشدنا اسد الرحمن قدسی مدظلہ علیہ بھی قلندرانہ مسلک کے پیرو ہیں۔ بواسطہ علامہ اقبال حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ سے تعارف و تعلق قائم ہوا تھا۔ نواب ابراہیم علی خاں والی ریاست ٹونک راجپوتانہ حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ سے ارادت مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے ولی عہد نواب عبدالحفیظ خاں مرحوم بھی معتقد تھے جب علامہ اقبال کے توسط سے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ حضرت مرشدنا قدسی مدظلہ سے متعارف ہوئے تو حضرت شاہ صاحب نے نواب عبدالحفیظ خاں والی عہد ریاست ٹونک کو ہدایت فرمائی کہ حضرت قدسی صاحب سے روحانی تعلق قائم

کریں چنانچہ ولی عہد مرحوم حسب ہدایت حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ مرشدنا اسد الرحمن قدسی مظلہ العالیٰ کے معتقد ہو گئے۔

حضرت مرشدنا مظلہ طویل عرسہ تک متواتر سیر و سیاحت میں رہے۔ جب واپس اپنے منتظر بھوپال آئے تو علامہ اقبال سے شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کا حال دریافت کیا جس کے جواب میں علامہ نے لکھا گل حسن شاہ صاحب قرباً ایک سال ہوا۔ رحلت فرمائے۔

بہت پرانی بات ہے۔ علامہ نے ایک نظم بنام شکوه انجم حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی جو بہت مقبول عام ہوئی اور ظفر علی خاں مرحوم ایڈیٹر اخبار زمیندار نے بڑے اہتمام سے شائع کی۔ مرحوم نے چند نسخے حضرت مرشدنا قدسی مظلہ کو تخفہ بھیجے اور حضرت نے ایک اور نسخہ بطور تخفہ سمش العلماء حافظ سید محمد الحنفی صاحب عظیم آبادی علیہ الرحمۃ کو بھیجا۔ حافظ صاحب نے سخت اعتراض لکھ کر بھیجا۔ حضرت مظلہ نے حافظ صاحب کا اعتراض نامہ علامہ علیہ الرحمۃ کو ارسال کیا جس کو پڑھ کر علامہ علیہ الرحمۃ نے جواب شکوه لکھا جو اسی اہتمام سے شائع ہوا۔ ان دونوں حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ ریاست ٹونک میں قیام فرماتھے۔ وہ زمان ولی عہد ٹونک کی طالب علمی کا تھا۔ کلام اقبال سے بہت دلچسپی تھی۔

شکوه اور جواب شکوه ولی عہد موصوف نے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے حضور میں پیش کیے۔ حضرت شاہ صاحب نے مطالعہ فرمایا کہ علامہ کو خوشنودی و پسندیدگی اور دعاۓ خیر لکھی۔ جس کے جواب

میں علامہ نے چند مذکور شعر بطور ساقی نامہ لکھ کر حضرت شاہ صاحب[ؒ]
کی خدمت میں ارسال کیے اور لکھا کہ جواب شکوہ کے محركِ اجناب
قدسی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے بعد ملاحظہ خط اور ساقی نامہ ولی
عہد کو موصوف کو عنایت فرمادیا۔ جب ولی عہد موصوف حسب ہدایت
حضرت شاہ صاحب بعد فراغت تحقیصیل علم حضرت مرشدنا قدسی مدظلہ
العالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ علیہ الرحمتہ کا ساقی نامہ اور
اپنے والد نوب ابراہیم علی خان صاحب مرحوم کے نعمتیہ کلام کا مجموعہ
پیش کیا جو محفوظ ذخیرہ میں شامل کر دیا گیا۔ یہ محفوظ ذخیرہ اقبال علیہ
الرحمتہ کے خطوط علامہ شبیل علیہ الرحمتہ کے خطوط علامہ ابوالکلام آزاد
علیہ الرحمتہ کے خطوط اور چند مشاہیر ملک کے مرسلہ مضامین کا مجموعہ
تھا۔ جس میں خود حضرت مرشدنا مدظلہ کے اہم علمی مسودات بھی تھے
جو افسوس ہے سب ضائع ہو گئے۔ صورت یہ ہوئی کہ جب حضرت
مرشدنا مدظلہ نے ہندوستان سے پاکستان کی طرف مراجعت کا قصد
فرمایا تو وہ زمانہ حضرت مدظلہ کی سخت عالت کا تحکم دیا کہ آستانہ
میں ضرورت سے زیادہ جس قدر بھی سامان ہے وہ سب عزیزوں
دوستوں اور مریدوں میں تقسیم کر دیا جائے اور کتابیں جن کی تعداد
گیارہ سو تھیں اہل علم لوگوں کو ان کے مذاق کے مطابق تقسیم کر دی
جائیں دو ماہ تک تقسیم کا سلسہ جاری رہا۔ خادموں کی غفلت سے
کتابوں کے ساتھ محفوظ ذخیرہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ جب پاکستان
پہنچ کر ساتھ آنے والے سامان کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ محفوظ

ذخیرہ بھی تقسیم ہو چکا۔ معلوم نہیں کہ یہ نہایت اہم اور بیش بہایادگار کہاں منتقل ہوئی۔ استعمال کپڑوں میں ایک بستہ لپٹا ہوا انکلا جس میں چند مشاہیر ملک کے خطوط اور کچھ یادداشتیں تھیں اور آستانہ اگر یکچھ فارم کے کاغذات میں سے علامہ اقبال کا وہ خط ملا جس میں حضرت گل حسن شاہ صاحب کے انتقال کی خبر بھی تھی۔ اب یہ مجموعہ نقوش ماضی کے نام سے مرتب ہو رہا ہے۔

۱۔ ”جواب شکوہ“ کا یہ پس منظر شاید یہی بار دینا ے ادب کے سامنے آیا ہے ملاحظہ جو

دیا اُنہے ثانی

راقم الحروف نے مکتب اقبال کا عکس اپنی اس کتاب کے لیے محفوظ کر کے واپس کر دیا تو ۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو صوفی خدا بخش صاحب نے اس کی وصولی کی رسید بھیج ہوئے ایک ایسی نظم کا ذکر بھی فرمایا جس کا تعلق بھوپال سے تھا اور جو یقیناً قیام بھوپالہ کی یادگار کی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف نے اپنے طور پر اس نظم کا ہر ممکن سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ صوفی صاحب لکھتے ہیں۔

۷۸۲”

۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء جناب مکرم.....السلام علیکم

عنایت نامہ مکتب اقبال موصول ہوا۔ شکریہ۔ حضرت مدظلہ

عرصہ سے علیل ہیں آپ کے لیے دعائے خیر فرماتے ہیں۔

علامہ اقبال کی ایک نظم سیر بھوپال راس مسعود مرحوم کے پاس تھی جس میں تاج المساجد موتی محل، جامع مسجد تالاب شملہ پہاڑی آستانہ قدسی اور آبشار بحدا بحدا کے عادہ بیرون شہر کے قدرتی

مناظر کا نہایت دلچسپ اور پروقار تذکرہ تھا۔ افسوس کہ باوجود سعی
بلغ وہ تاریخی نظم دستیاب نہ ہو سکی۔ ایسی ہی اور بھی اہم واقعات جو
علامہ مرحوم کے قیام بھوپال سے متعلق ہیں بعض لوگوں میں علم سینہ ہو
کر رہ گئے ہیں جن کا حصول چاند تک رسائی کی کوشش سے کم نہیں۔
بہر حال آپ کی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جتو جاری رہے گی اور
جو حالات بھی معلوم ہو سکے انشاء اللہ ارسل خدمت کیے جائیں
گے۔ بھوپال کے اکثر ادبی مذاق والے وفات پا کر یاد رفتگان کی
فہرست میں شامل ہو چکے ہیں جو لوگ رہ گئے ہیں وہ بھی بحوم افکار
کے سبب سب ادبی علمی اور تاریخی یادگاریں فراموش کر چکے ہیں۔

اک محیت سی طاری اے شاد ہو رہی ہے
بھولے ہوئے فسانے کچھ یاد آ رہے ہیں

(شاد عظیم آبادی)

رقم

صوفی خدا بخش

آستانہ

بھول۔ ضلع جہلم،۔

اس خط کے بعد صوفی خدا بخش صاحب کے چند خطوط اور آئے لیکن ان میں اقبال سے
متعلق کوئی نئی بات تحریر نہیں تھی۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے حضرت مرشدناقدی صاحب
مدظلہ العالیکی خیریت دریافت کرتا رہا اور اپنی اس کتاب کی تکمیل میں مصروف رہا۔ آپ
بفضل خدا بھون میں بقید حیات ہیں عمر ۸۳ سال کے لگ بھگ ہے۔ دعا ہے کہ خداۓ

بزرگ و برتر آپ کو صحبت و سلامتی میں رکھے اور آپ کے طفیل رشد و ہدایت کا چشمہ فیض جاری رہے۔ قدسی صاحب مظلہ کی وساطت سے آپ کے نج عزیز و محترم مریدین سے مجھے اقبال کے سلسلے میں نئے واقعات کا علم ہوا ان میں ایک تو اقبال حسین خاں اندیم خاص فرماں روائے بھوپال اور دوسرے مشہور ادیب و صحافی حسن عزیز جاوید ۲ ہیں جنہوں نے قدسی صاحب کا ایک قلمی خط بھی عطا کر دیا جو ففتر آستانہ مبارک سے ۱۳ اماریج ۱۹۳۱ء کو تحریر کیا گیا تھا۔

۱۔ اقبال حسین خاں بفضل خدا بھوپال میں بقید حیات ہیں۔

۲۔ حسن عزیز جاوید کا افسوس کہ ۱۹۷۰ء کے دوران کراچی میں انتقال ہو گیا۔

اس خط میں کسی پرفیڈ افلاطون کا منصوبہ درج تھا۔ قدسی صاحب اور اقبال کے درمیان اس سلسلے میں مراسلت بھی ہوئی تھی۔ اور اقبال کے مشہور پڑھائی صحرا میں دارالسلام کے تحت دارالعلوم کا قیام تفصیلی پروگرام کا ایک حصہ تھا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ اگر اسلامی و روحانی نوآبادی کسی صحرا میں قائم ہو گئی تو وہ ہر سال چند ماہ وہاں گزار کریں گے قدسی صاحب کے اس منصوبہ سے اقبال کی دلچسپی بلاشبہ اقبالیات پر کام کرنے والوں کے لیے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے اسی منصوبے سے ملتا جلتا ایک منصوبہ راس مسعود نے بھی تیار کیا تھا اور اقبال نے بھی جس کا تذکرہ مولانا عبدالجید سالک کی کتاب ذکر اقبال میں ملتا ہے۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان تینوں حضرات یعنی قدسی صاحب، راس مسعود اور اقبال میں اس سلسلے میں ضرور تبدلہ خیال ہوا ہو گا۔ قدسی صاحب کی تجویز ۱۹۳۱ء کی ہے۔ راس مسعود اور اقبال نے ۱۹۳۷ء میں ان تجویزوں کو رو بہل لانے کا عزم کیا تھا۔ لکھتے ہیں:

”ایک علمی اسلامی ادارہ مدت دراز سے اقبال کے دماغ میں یہ

تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی اور دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کیے جائیں اور ماہرین کو خود و نوش کی فکر سے بالکل آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام تاریخ اسلام تمدن اسلام ثقافت اسلامی اور شرع اسلام پر ایسی کتابیں لکھیں جو دین کے فکر میں انقلاب پیدا کر دیں۔ چنانچہ مرتضیٰ جلال الدین پیر سڑھ سے ذکر آیا تو انہوں نے ریاست بہاول پور میں سرکار بہاول پور کے زیر سرپرستی اس قسم کے ادارے کے قیام کا سرو سامان درست کیا اور لیکن ریاستوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں معاملہ جو تعیق میں پڑا تو پھر اس کا سراغ نہ ملا۔

آخر ۱۹۳۷ء میں ایک دین دار مخلص، صاحب ایثار بزرگ چودھری نیاز علی خاں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ پڑھان کوٹ ضلع گوردا سیپور کے رہنے والے تھے۔ اور پڑھان کوٹ س کوئی ایک دولیل دوران کی اراضی موجود تھی۔ چودھری صاحب نے علامہ کی خدمت میں گزارش کی میں نے ایک بہت بڑا قطعہ اراضی آپ کے مجوزہ ادارے دارالسلام کے لیے وقف کر دیا ہے تاکہ اس پر کتاب خانہ دارالمطالعہ مکانات برائے مصنیفین اور دوسرے ضروری مساکین تعمیر کر دیے جائیں جتنے علماء و مصنفین اس ادارہ میں رہ کر علوم اسلامی کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کریں گے میری جائیداد زرعی کی آمد فی ان سب کی معاش کی کفیل ہوگی۔ وہ ہر طرف

سے بے فکر ہو کر امن و سکون کی فضا میں اپنا کام انجام دے سکیں گے۔ حضرت علامہ چوبدری نیاز علی خاں کی اس روشن خیالی اور دین پروری سے بے حد خوش ہوئے اور انہیں دارالسلام میں اپنے خواب کی تغیر نظر آئی۔

اذکر اقبال۔ صفحہ ۲۱۳۔

شہزادی عابدہ سلطان سے میری ملاقات تقریباً ایک سال کی سعی و کوشش کے بعد حسن عزیز جاوید کی معیت میں ان کی کوٹھی واقع میسر شی کراچی میں ہوئی۔ انہوں نے میرے ہر سوال کا جواب نہایت تسلی بخش عنایت فرمایا۔ اسی کیسا تھا ساتھ انہوں نے جاوید صاحب اور مجھے اقبال کی حسب ذیل چار کتابیں بھی دکھائیں جو اقبال نے بھوپال کے قیام کے دوران بہ نفیس شہزادی صاحب کو پیش کی تھیں۔

(۱) باغ درا (۲) بال جریل (۳) ضرب کلیم (۴) پس چہ باید کردے اقوام شرق ان کتابوں کی خصوصی جلدیں بنوائی گئی تھیں۔ ان درونی صفحہ پر اقبال کا قلمی انتساب تھا۔ چنانچہ ملاقات کے بعد ان کی اجازت سے ضرب کلیم اور مثنوی کے صفحات کا فوٹو لے لیا جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ ان نسخوں کو انہوں نے بڑی حفاظت سے رکھا تھا اور جیسا کہ ان کے دیکھنے سے ظاہر ہوا۔ میں نے گفتگو کا آغاز نواب حمید اللہ خاں اور اقبال کے باہمی روابط سے کیا اور دریافت کیا کہ ان کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی تھی۔ شہزادی عابدہ سلطان نے بتایا کہ ان کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب نواب صاحب علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ وہ اقبال کے پیام و کلام سے پہلے ہی متعارف ہو چکے تھے علی گڑھ کے دوران قیام انہوں نے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور جب وہ تعلیم مکمل کر کے بھوپال آئے اور انصرام حکومت سے اپنی والدہ نواب سلطان جہاں بیگم کا

ہاتھ بٹانے لگے تو اقبال کے علاوہ ان کے رابطے قائد اعظم محمد علی جناح ڈاکٹر انصاری حکیم محمد اجمل خاں گاندھی جی سرتقیبہادر پر وغیرہ سے قائم ہو گئے۔ ان کی تعلیم چونکہ ایک ممتاز عوامی ادارہ میں ہوئی تھی۔ اس لیے ان میں عوامی شعور کے ساتھ ساتھ جمہوریت اروجہوری اقدار کا صحیح احساس پیدا ہو گیا تھا۔ جب زمام حکومت سنگھائی تو بھوپال کے دیگروالیان ریاست کی طرح انہوں نے بھی ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مشہور و ممتاز شخصیتوں کو اپنے اردوگرد جمع کر لیا۔ تھا۔ شعیب قریشی حسن محمد حیات سلام الدین خاں، علی حیدر عباسی، سر راس مسعود، ماسٹروی محمد، ڈاکٹر عبدالرحمن، ڈاکٹر عبدالباسط محمد احمد خان، حکیم سید ضیاء الحسن، محمد خلیل اللہ خاں، مولوی شکر اللہ سہیل، ڈاکٹر سلطان، ڈاکٹر بوس وغیرہ باقاعدہ ریاست کے مختلف ذمہ دار عہدوں پر فائز ہو کر ریاستی امور میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ خلافت تحریک کی بنیاد بھوپال میں پڑی۔ مولینا محمد علی، مولانا شوکت علی، قائد اعظم اور اقبال بھوپال آنے جانے لگے۔ ریاست کی طرف سے ان حضرات کو ہر ممکن اخلاقی اور مالی اعانت پیش کی گئی تھی اور اس طرح ریاست بھوپال نے ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں جلد امتیاز و اعزاز حاصل کر لیا۔ انگریزوں کی پالیسی کے تحت نوابین اور راجہ مہاراجہ عملی سیاست میں حصہ لینے کے مجاز نہیں تھے۔ لیکن نواب صاحب کی تنہا ایسی شخصیت تھی جو بلا خوف و خطر سیاست میں دخیل ہو گئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ ایک بڑے سیاست داں مد بر اسلام کے شیدائی اور مسلمانوں کے سچ بہی خواہ کی حیثیت سے آج بھی عقیدت و احترام سے یاد کیے جاتے ہیں پر سر چمپبرز کے چانسلر کی حیثیت سے انہوں نے ریاستوں کی جو خدمت کی ہے اور مسلمانوں کے تحفظ اور پاکستان کے قیام کے سلسلے میں جو مساعی انجام دی ہیں وہ دنیا جانتی ہے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ جب پاکستان کے قیام کے لیے آخری کوششیں ہو

رہی تھیں۔ کیا اس وقت تہنا نواب صاحب ہی کی ذات تھی جس پر کانگریس اور مسلم لیگ کو
برا برا کا اعتماد حاصل تھا۔ اور کیا آپ بھی ان کے ساتھ دہلی میں موجود تھیں.....؟

شہزادی صاحبہ نے فرمایا کہ میں اس وقت بطور ولی عہدہ خدمات انجام دے رہی تھی اور
نواب صاحب کے ہمراہ دہلی گئی تھی شعیب قریشی اور حسن محمد حیات بھی ہمارے ساتھ تھے۔
قائد اعظم اور گاندھی جی کے درمیان نواب صاحب ہی مصالحت کے فرائض انجام دے
رہے تھے۔ صحیح کی ملاقات کے بعد جب وہ دوپہر کے کھانے کے لیے قیام گاہ پر تشریف
لائے تو میں نے نتیجہ کے بارے میں دریافت کیا جس پر انہوں نے فرمایا:

”..... ان دونوں بڈھوں نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے نہ ایک مانتا ہے نہ دوسرا مانتا

ہے۔“

دوپہر کے کھانے کے بعد پھر ملاقات ہوئی اور نواب صاحب کی سعی بلیغ نے گاندھی
جی نے یہ تسلیم کر لیا کہ مسلم لیگ انڈیا کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس اصول
کے تسلیم ہونے کے بعد ہی پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ اور اس طرح اقبال کے تصور
پاکستان کا خوب شرمندہ تعبیر ہو سکا۔ یہ اتنی بڑی تاریخی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی
انکار نہیں کر سکتا۔ وسط ۱۹۴۷ء کے تمام اخبارت میں نواب صاحب کی خصوصی کدو کاوش
اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں ان کے عملی کارناموں سے بھرے پڑے ہیں ویسے اس
واقعہ کا ذکر چودھری خلیف الزمان نے اپنی کتاب پاتھوںے ٹو پاکستان میں بھی تفصیل سے کیا

ہے۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ کو اس دستاویز کا کچھ علم ہے جس پر قائد اعظم اور گاندھی جی
نے دستخط کیے تھے اور جس میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا گیا تھا۔
انہوں نے فرمایا کہ نواب صاحب کے ساتھ شعیب قریشی بطور پرائیویٹ سیکرٹری اس

گفت وشنید میں شریک ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ وہ تحریر جس پر قائد اعظم اور گاندھی جی نے دستخط کیے تھے شعیب قریشی کے پاس محفوظ تھی۔ افسوس کہ ان کا انتقال ہو گیا لیکن ان کی صاحبزادی خالدہ شعیب سے معلومات کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ قیام پاکستان کا اصول تسلیم کر لینے کے بعد گاندھی جی کی سیاست ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ ریاستوں کے الحاق کے سلسلے میں بھی یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آل جمُوں و کشمیر مسلم کا فرنز نے ۱۹۷۲ء میں پاکستان سے الحاق کا جو اعلان کیا تھا اس میں نواب صاحب بھوپال کی ذاتی مساعی کو بھی دخل تھا کیونکہ کشمیر کی مسلم آبادی تقریباً ۸۰ فیصد تھی۔

میں نے جب اقبال کے بھوپال آ کر قیام کے بارے میں خود ان کی اور نواب صاحب کی ملاقاتوں کا حال اور وظیفہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ نواب صاحب اقبال کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ انہوں نے قیام و طعام علاج و معالج کی تمام سہولتیں فراہم کرنے کے لیے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ ایک دوبار میری موجودگی میں اقبال نواب صاحب سے ملنے کے لیے محل پر تشریف لائے تھے۔ زیادہ تر گفتگو مسلمانوں کے عام حالات اور سیاسی مسائل پر ہوئی نواب صاحب اور اقبال کے سیاسی مسلک میں بڑی ہم آہنگ تھی۔ اور دونوں مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے حامی تھے نواب صاحب نے آرام و آسائش کی جو سہولتیں مہیا کی تھیں اقبال نے ان کا دلی شکریہ ادا بھی کیا ارجو جب وہ رخصت ہونے لگے تو باہر کا راتک انہیں رخصت کرنے آئے۔

۱۹۳۳ء سے میں والد صاحب کے ساتھ ریاستی فرائض انجام دینے لگی تھی۔ میری تعلیم و تربیت بھی اسلامی شعائر کے مطابق کی گئی تھی لہذا میرے دل پر بھی اقبال کے پیام کا گہرا اثر تھا۔ ۱۹۹۳ء میں جب ان کے وظیفہ کے احکام مکملہ صرف خاص اسے جاری ہو گئے تو

پہلا چیک میرے سخنطوں سے ہی شیش محل روانہ کیا گیا تھا جہاں اقبال قیام فرماتھے۔ چیک ملنے کے بعد وہ میرا شکریہ ادا کرنے تشریف لائے تو میں نے ان کی مزاج پرسی کی اور عرض کیا کہ اس سلسل میں زحمت کی کیا ضرورت تھی۔

۱۔ یہ مکملہ نواب صاحب بھوپال کی ذاتی جائیداد و املاک سے متعلق تھا جس کا ریاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔

کچھ دیر ٹھہر کروہ رخصت ہو گئے ان کے چہرے سے کافی تھکن اور اضھال ظاہر ہو رہا ہے۔ پھر ۱۹۳۶ء میں جب وہ بھوپال آئے تو میرے لیے چار کتابیں بطور خاص تیار کر کر ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ یہ کتابیں آپ کے سامنے ہیں۔

جاوید صاحب اور میں نے ان دونوں کتابوں کے قلمی انتسابات کو پڑھنے کی کوشش کی کیونکہ اقبال کی تحریر کے نقوش کافی مددم تھے۔

ضرب کلیم پر تحریر تھا:

”.....تقديم والا جناب عليها حضور نواب گوہرتاج بیگم صاحبہ ولی

عہد

دار الاقبال بھوپال
بندہ اخلاص کیش محمد اقبال لاہور
کلیم اگست ۱۹۳۶ء“

اور مشنوی پس چہ باید کردے اقوام شرق پر یہ عبارت مرقوم تھی:

”تقديم عليا حضور نواب گوہرتاج بیگم صاحبہ

ولی عہد دولت علیہ بھوپال ایدا اللہ نصرہ

بندہ اخلاص کیش محمد اقبال لاہور

شہزادی عابدہ سلطان سے ہم نے آخری سوال کیا ہے کہ آپ نے ریاست بھوپال کی جائشی کو خیر باد کہہ دیا کہ پاکستان کو اپنا وطن کیوں بنایا۔ تو انہوں نے نہایت شفقت سے فرمایا کہ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اپنے والد کی طرح مجھے بھی مسلمانوں کی جداگانہ مملکت پاکستان کے قیام سے دلچسپی تھی میرے والد نے سیاست اور ادب میں قائدِ عظیم اور اقبال کو اپنا رہنمایا تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر میں نے بھی انہیں کے اثرات قبول کیا اور اسلامی فکر و اقدار کے تحفظ کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھا اور بھوپال کی جائشی کو چھوڑ کر پاکستان چلی آئی۔ اب یہی میرا وطن ہے۔

محمد احمد سبزواری بھوپال کے بلند پایہ اہل قلم ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں بمقام بھوپال پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے علم و ادب کا ذوق تھا۔ ۱۹۳۲ء میں الگز مذرعہ جہانگیر یہ ہائی سکول سے پہلے اردو ماہنامے گھوارہ ادب کے پہلے مدیر مقرر ہوئے آپ کی طالب علمانہ زندگی قابلِ رشک رہی ہے۔ تحریر و تقریر کے متعدد مقابلوں میں کوئی میگزین نورس کی ادارت کی۔ معاشریات میں بی گئے۔ وہاں کئی سال تک کالج کی سہ ماہی میگزین نورس کی ادارت کی۔ معاشریات میں بی اے کیا اور جامعہ میں اول آئے۔ ۱۹۳۹ء میں فرست ڈویژن میں ایم اے پاس کیا اور جامعہ عثمانیہ میں اول آئے دوسال کے لیے ریسرچ سکالر شپ ملائیکن ایک سال بعد ہی خانگی حالات کی بنا پر بھوپال آگئے اور ریاست میں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں آگئے اور پھر پشاور میں بطور ریسرچ سپیشلیسٹ آٹھ سال تک اکیڈمی برائے ترقی دیہات میں فرائض انجام دینے کے بعد مرکزی محکمہ اعداد و شمار میں اعلیٰ افسر شماریات کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا۔

۱۔ اقبال کی قلمی تحریروں کے عکس کتاب میں شامل ہیں۔

۲) حمید اللہ خاں کے دور حکومت میں اس کا نام حمید یہ جہانگیر ہائی سکول کر دیا گیا۔ یہ بھوپال کا سب سے قدیم اور بڑا سکول تھا جس سے دنیا کے ادب کی کلtnی، ہی متاز شخصیتیں بطور استاد یا طالب علم وابستہ رہ چکی ہیں۔

دومرتبتہ اعلیٰ تعلیم اور ٹریننگ کے لیے امریکہ گئیں۔ اس کے علاوہ یورپ اور مشرق بعید کے متعدد ملکوں کا بھی آپ نے دورہ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں آبادی کی علمی کانفرنس منعقدہ روم میں آپ نے پاکستان کی نمائندگی کی اور ۱۹۶۳ء میں ایشیائی آبادی کانفرنس میں شرکت فرمائی۔

آپ متعدد اردو انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں۔ عرصہ تک بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ساتھ کام بھی کیا اور ان کے مشہور رسالہ معاشیات کے مدیر ہے۔ اردو ادب میں معاشیات کے موضوع کو مقبول بنانے میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی کتاب ہمارے بnk جوازو زبان میں بنکاری پر پہلی کتاب ہے۔ ۱۹۷۶ء میں انہم ترقی اردو چہلی سے شائع ہوئی۔ اسی طرح اردو ادب میں بھی آپ نے نام پیدا کیا۔ اس کتاب کی تیاری کے دوران پتہ چلا کہ جن دنوں اقبال بھوپال میں مقیم تھا ان دنوں محمد احمد سبزواری نے ان سے نیاز حاصل کیا تھا اور اپنی ملاقاتوں کا احوال پشاور یونیورسٹی کے مجلہ خیاباں کے اقبال نمبر میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ میں خاص نمبر کی تلاش شروع کی گئی۔ کراچی کی تقریباً ہر لاجبری دیکھ لی۔ لیکن خیاباں کا مطلوبہ شمارہ مل نہ سکا۔ کراچی سے مایوس ہونے کے بعد میں نے افکار کے رفیق و شفیق محمد طاہر فاروقی صدر شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کو خط لکھا اور اپنے کام کی نوعیت بتائی اور درخواست کی کہ جس طرح بن پڑے یہ خاص شمارہ مجھے فراہم کر دیں۔

انہوں نے فوراً جواب دیا کہ اور لکھا کہ یہ شمارہ ۱۹۶۲ء میں چھپا تھا اور اب نایاب ہے کوشش کر رہا ہوں دستیاب ہو گیا تو فوراً بھیج دوں گا۔ میری خوش نصیبی کہ کچھ عرصہ بعد مطلوبہ

شمارہ انہوں نے مجھے کہیں سے حاصل کر کے عطا کر دیا۔ خیاباں کا شمارہ ۲ اقبال نمبر تھا جو ۱۹۶۲ء میں چھپا تھا۔ اس میں محمد احمد سبز واری کا مضمون بعنوان نژاد نوشامل تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔

مضمون کے مطالعہ سے پتا چلا کہ سبز واری صاحب اقبال کے نیازمندوں میں شامل تھے۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی ملاقات کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ کئی اعتبار سے نئی اور اچھوتی بھی ہیں یہ مضمون نہ صرف ان کے اعلیٰ ادبی مذاق اور اقبال شناسی کا آئینہ دار ہے بلکہ اقبال کی ان ادبی محفلوں کا ترجمان بھی جن سے بھوپال کے نیازمند ممتع ہوئے لکھتے ہیں:

”..... وسط ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے علامہ اقبال علیل تھے۔ جب

آپ کی علاالت کا علم فرمائ روانے بھوپال کو ہوا تو تبدیل آب و ہوا اور علاج کی غرض سے انہیں بھوپال بلا لیا۔ اس زمانہ میں سر راس مسعود ریاست کے وزیر تعلیم تھے۔ ان کے اور علامہ کے دیرینہ مراسم تھے چنانچہ آپ نے کچھ عرصہ ان ہی کے بنگلہ ریاض منزل میں مقیم ہوئے۔ یہ بنگلہ شہر سے کافی دور تھا۔ پھر نواب صاحب نے ایک شان دار عمارت موسومہ شیش محل کے ایک حصہ میں علامہ اقبال کی رہائش کا بنڈو بست کر دیا۔ شیش محل وسط شہر میں واقع تھا۔ جب مقامی باشندوں کو اس بات کا علم ہوا کہ مفکر مشرق ان کے شہر کے بیچ میں پڑا ہوا ہے تو لوگ وہاں پہنچنے لگے۔ علامہ کی علاالت کے باوجود عام طور پر رات کو آٹھ سو آٹھ بجے شیش محل میں شاعروں ادیبوں سخن فہموں کا اچھا خاص اجتماع ہونے لگا۔ سر راس اور ریاست کے دوسرے اکابر

بھی یہاں آیا کرتے تھے۔ میں اس وقت کانج میں پڑھتا تھا۔ علامہ کا اردو فارسی کلام کورس میں داخل تھا۔ وہیں علامہ کا یہ شعر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔

بیا مجلسِ اقبال ویک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری دادند
بھوپال سے لاہور کا فاصلہ..... ہزار میل سے کم نہ ہوگا۔ لہذا
کبھی مجلسِ اقبال میں شرکت کا تصور ہی نہ آیا لیکن اب منزل کا بعد ختم
ہو چکا تھا پھر یہ دعوت عام تھی اور اس سے استفادہ نہ کرنا بڑی بدستمی
ہوتی۔ نیز مصرعہ ثانی میں قلندریت کا جو مرقع پیش کیا گیا وہ بھی کچھ
عجیب تھا۔ سڑکوں پر مارے مارے پھرنے والے گھاؤں میں بیٹھنے
وابے اور خانقاہوں میں ہوتق کرنے والے قلندروں کو دیکھنے کا
اتفاق ہوا تھا مگر ایک ایسے مرد قلندر کا تصور بھی نہ تھا جو مغربی تعلیم یافتہ
ہو کر پورپ میں کافی وقت گزار چکا ہوا اقتصادیات کا معلم رہ چکا ہو
حکومت کا اعلیٰ ترین اعزاز اپنے چکا ہو چنانچہ یہی شوق کشاں کشاں مجھے
بھی ایک رات اس کوچے میں لے گیا۔ مجھ میں یہ طاقت و جرات نہ
تھی کہ کوئی ساغر اٹھا سکتا مگر پرانے بادہ کشوں کو سرشار ہوئے اور نئے
بادہ کشوں کو جھومنتے دیکھنے کا ناظرہ ہی اس قدر وجد آور تھا کہ میں اکثر
ان محفلوں میں شریک ہونے لگا۔

یہ محفلیں ادبی اور سیاسی رنگ لیے ہوتی تھیں۔ یہاں شعرو
شاعری ہوتی اطائف و ظرائف بیان کیے جاتے قصے کہانیاں اور آپ

بیتیاں سنائی جاتیں۔ سیاست حاضرہ اور ملکی مسائل پر تبصرے ہوتے۔ زیادہ تر گفتگو کا موضوع یورپ اور مشرق وسطیٰ کی سیاست ہوا کرتا تھا کیونکہ یہی وقت کی آواز تھی۔ اس وقت سیاست عالم پر یورپ چھایا ہوا تھا۔ وہاں نئی نئی طاقتیں ابھر رہی تھیں۔ روس میں اشتراکی حکومت ۱۹۲۸ء سے منصوبہ بندی کے ذریعہ اپنی قوت اور معیشت کو مستحکم کرنے میں مصروف تھی۔ جرمنی میں ہٹلر اور اس کی نازی جماعت ۱۹۳۳ء میں بر سر اقتدار آچکی تھی جس نے دو سال بعد معاهدہ ورسائی کے پرے پرے کردیے تھے۔ اطالیہ میں مسویں کا اقتار بڑھ رہا تھا۔ اس کی خونی آنکھیں جب شہر پر لگی ہوئی تھیں۔ برطانیہ اور فرانس دھمکیاں دے رہے تھے کہ وہ اطالیہ کے سی غیر مستحسن اقدام پر خاموش تماشائی نہ بنیں گے۔ ادھر مشرق وسطیٰ میں پہلی جنگ عظیم کے تجربے بڑی طاقتیوں کی چال بازیوں اور پیرس صلح کا نفرنس میں عربوں کے مطالبات کی ناظوری نے اس علاقہ میں ایک نئے قومی احساس کو جگا دیا تھا جس میں علاقائی خود مختاری کا جذبہ کا فرماتھا۔ ترکی میں اس وقت اتنا ترک کمال اور ان کی جماعت بر سر اقتدار تھی۔ جہاں نئی نئی اصلاحات ہو رہی تھیں جن میں خلافت کا خاتمه ۱۹۲۴ء دستور سے اسلامی مملکت کا دفعہ کا حذف عربی کے بجائے لاطینی رسم الخط کا نفاذ شامل تھا۔ ۱۹۳۲ء میں بلقان کی چار حکومتوں میں اتحاد کا معاهدہ ہوا۔ ایران میں رضا شاہ اول نئی اصلاحات میں مصروف تھے۔ ۱۹۳۳ء میں افغانستان میں نادر شاہ

کو قتل کر دیا گیا۔ ادھر ۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں نیا آئین نافذ کیا جس میں صوبوں کو اندرومنی معاملات میں خود مختاری دی گئی۔ غرض کے نفتوگو کا معاوادا تھا کہ اس کے لیے ہر شست محقر نظر آئی تھی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ اس محفل میں شریک ہوا تو یورپی سیاست فروغ بحث تھی اس سلسلے میں علامہ اقبال نے اپنی ایک تازہ نظم مسویں سنائی جس کو پڑھ کر مجھے آج تک یاد ہیں۔ تب کا آپ کو بھی سنائے دیتا ہوں:

کیا زمانے میں نرالا ہے مسویں کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزان
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برالگatta ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجان
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
تم نے لوٹے بے نوا صحراء نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دھقاں تم نے لوٹی تخت و تاج
پردہ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

حاضرین نے اس کلام بлагت نظام پر جو حقائق سے معمور تھا دل کھول کر داد دی۔ ذاتی طور پر مجھے علامہ اقبال کی سیاست دانی کا اس وقت قائل ہونا پڑا جب اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مسوئینی نے جب شہ پر حملہ کر دیا اور مئی ۱۹۳۶ء میں اس کی فوجیں عدیس بابا میں داخل ہو گئیں۔ اس وقت جمیعت اقوام زندہ تھی۔ اطالیہ اور جب شہ دونوں اس کے رکن تھے مگر وہ اطالیہ کے خلاف معاشری پابندیاں لگانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔ یہ پابندیاں بھی صرف کاغذی تھیں۔ نہہر سویز برطانیہ کے قبضہ میں تھی اطالوی فوجوں کے لیے تیل فولاد کو نہ تھی کہ زہر میں گیس تک اسی نہر سے گزرتی رہی۔ داستان اس قدر دل فریب ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کو طول دیے جاؤں مگر عنوان کی پابندی بھی لازمی ہے۔

علامہ اقبال ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ انیسویں صدی کا یہ عشرہ بڑا ہی مردم خیز تھا لینن ۱۸۷۰ء مشہور فلسفی برٹینڈ رسل ۱۸۷۲ء سرونسن چرچل اور مشہور ناول نگار سمرست ماہم ۱۸۷۴ء مغربی جرمنی کا موجودہ چانسلر ریڈی نار ۱۸۷۸ء مولانا محمد علی کمال اتابرک اور قائد اعظم محمد علی جناح ۱۸۷۸ء ٹرائسکو اسلام اور آئن اسلام ۱۸۷۹ء سب اسی عشرے کی پیداوار ہیں۔

۱۔ دی آؤٹ لائنز آف ہسٹری ایج بی ویز گارڈن سٹی بک نیویارک جلد دوم صفحہ ۹۲۳

۲۔ جدید تحقیق کے مطابق علامہ اقبال ۱۸۷۹ نومبر ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوئے تھے۔

۳۔ دی کولمبیا واٹی کنگ ڈیسک انسائیکلو پیڈیا واٹی کنگ پر لیس نیویارک ۱۹۵۳ء جلد اول

گویا قدرت دنیا کے مختلف گوشوں اور شعبوں میں جوانقلاب
لانا چاہتی تھی اس کی داغ بیل اسی عشرے میں ڈال دی۔

علامہ کاظمی گڑھ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا مگر جس
زمانے میں انہوں نے آنکھ کھولی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کہ
ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہن و افکار بثت یا منفی طریقے پر سر سید
کے خیالات و افکار سے متاثر ہو رہے تھے۔ سر سید کی اہمیت مخفی اس
وجہ سے نہیں تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے واسطے علیحدہ کالج کی بنیاد
رکھی بلکہ بقول مولوی عبدالحق مرحوم

”لوگ کہتے ہیں کہ سر سید نے کالج بنایا کالج نہیں اس نے قوم
بنائی قومیت کا تصور پیدا کیا مردہ دلوں میں روح پھونکی زندگی کے ہر
شعبہ کو بنایا اور سنوارا۔ تعلیم علم و ادب زبان سیاست صحافت مذہب
سب کو جدید نظر سے دیکھا۔ وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کی ہر ممکن
کوشش کی۔ اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کا قلع قع کیا اور اپنے ہم
قوموں کی عقلیت اور تحقیق کی طرف رہنمائی کی جسے وہ بے جا تقلید کی
فرمان برداری میں بھول چکے تھے۔“

اس وقت کے مسلمان یا تو سر سید کے حامی تھے یا ان کی تحریک و
خیالات کے مخالف۔ اقبال بھی انہی لوگوں میں سے تھے جنہوں نے
سر سید کی براہ راست اتباع سے گریز کیا۔ مگر شیخ محمد اکرم اپنی کتاب
موج کوثر میں لکھتے ہیں:

”.....وہ علی گڑھ تحریک اور سر سید کا دلی قدر دان تھا۔ سر سید کا جہاں کہیں اس کی تصانیف میں ذکر آیا ہے ساتھ رحمت اللہ علیہ لکھا ہوتا ہے۔ سر سید کی نسبت اقبال کے تحت الشعوری خیالات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ جب ایک دفعہ اقبال سخت بیمار ہوئے اور سب علاج معالجہ بیکار ثابت ہو رہا تھا تو سر سید خواب میں آئے اور کہا تو اپنی مشکل سرور کا نات کے حضور میں عرض کریں۔“

معلوم نہیں کہ شیخ صاحب نے یہ واقعہ کہاں سے لیا ہے لیکن اقبال نے سید کی اوح تربت میں صاف صاف ان کی نیک نیتی کا اعتراف کیا ہے۔ ان کو بندہ مومن کے لقب سے یاد کیا ہے لیکن جس طرح اکبر الہ آبادی مغربی تعلیم کے اثرات کو قومی مفاد کے خلاف سمجھتے تھے اسی طرح اقبال بھی نئی نسل کو مغربی تعلیم کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اور جا بجا اس کا اظہار کرتے ہیں ایک جگہ کہا ہے:

۱ ڈاکٹر مولوی عبدالحق سر سید کا اصل کام برگ گل سر سید نمبر مجلہ اردو کانج کراچی

۱۹۵۳ء صفحہ ۵۵

۲ شیخ محمد اکرم ایم اے مون کوثر مطبوعہ فیروز سنز ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۳ محمد احمد بیزوواری
یہ واقعہ شیش محل بھویال میں پیش آیا تھا جس کا ذکر گز شیش صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ گھر میں پونیر کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما لے کے آئی ہے مگر تیشہ فرباد بھی ساتھ

یا فردوس میں سعدی شیراز کو ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کے

الحادی رجحان سے حالی کی زبان میں یوں واقف کرتے ہیں:

آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی طائر دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جو انسانوں کی زمین گیر و زمین ساز
یہ کہنا تو صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ صرف اسلام پرستی کے قائل تھے۔

لیکن وہ یہ ضرور سمجھتے تھے کہ ہماری موجودہ کمزوریوں اور خرابیوں کا
اصلی سبب یہ ہے کہ ہم نے اس راہ کو قطعاً خیر باد کہہ دیا ہے جو ہمارے
اجداد نے معین کی تھیں جس کی وجہ سے دونوں نسلوں میں بڑی
تفرقی پیدا ہو گئی ہے۔ مولینا حالی نے مدرس میں اسی قسم کے
خیالات کا اظہار کیا ہے۔ علامہ نے ان خیالات کو اپنی نظم خطاب بہ
جو ان ان اسلام میں بڑی عمدگی سے سمویا ہے۔ وہ نوجوانوں کو اپنے
اجداد کے فقر شجاعت غیرت و حمیت کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارہ
دنیا کا ہر شاعر کائنات کے روح پر نظاروں سے متاثر ہوتا ہے
اور گونا گوں ذاتی تاثرات کو نغمات کی صورت میں پیش کرتا ہے۔
انگریزی ادب میں بعض شعراء نے اس طرف اتنی زائد توجہ دی کہ
وہاں دبستان شاعر فطرت پیدا ہو گیا۔ فارسی شاعری بھی گل و بلبل

سر و قمری کلب و دری آہوئے ختن کی داستانوں سے معمور ہے
جہاں ان کی خصوصیات کا طرح طرح سے ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال کی
اس رنگ سے متاثر ہیں۔ لیکن ان میں شاہین ماہی پروانہ و جلنوزارغ و
ذغن اور شہباز و شاہین کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان میں شاہین کا ذکر بار
بار اور کثرت سے آیا ہے۔ اقبال سے پہلے کسی شاعر نے شاہین کا وہ
تخیل پیش نہیں کیا جو ان کے ہاں ملتا ہے پرانے اساتذہ نے اس کی
چند خصوصیات کا ذکر کیا ہے مگر اقبال نے اس کی بڑی تفصیل بیان کی
ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ یہ باور کرتے ہیں کہ اقبال نے قدیم
جرمنی یا نازی جرمنی کے عقابی پر چم سے یہ کنایہ مستعار لیا ہے۔ وہ
اسے فرطائیت کی نشانی سمجھتے ہیں کیونکہ شاہین بڑا جنگجو اور شکاری
پرندہ ہے جو کمزور پرندوں کو مار کھاتا ہے۔ حالانکہ اقبال نے یہ شبیہہ
اس لیے استعمال کی ہے کہ اس پرندہ میں اسلامی فقر کی متعدد
خصوصیات مثلاً خودداری غیرت مندی آشیانے سے بے تکلفی
خلوت پسندی تیز نگاہی اور دوسروں کے بارے میں مارے ہوئے

شکار سے گریزوغیرہ!

۱۔ عزیز احمد اقبال نئی تشكیل۔ ۱۹۳۸ء صفحہ ۳۷۳ (محمد احمد سبز واری)

پائی جاتی ہیں اور کہیں علامہ نے اس کی وضاحت بھی کی ہے مگر
اقبال اور سیاست میں کے مولف نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔
حقیقت یہ ہے کہ اگر کلام اقبال کا تاریخ وار مطالعہ کیا جائے تو
پتہ چلتا ہے کہ یہ شبیہہ ارتقائی صورت رکھتی ہے۔ باگ درا مر جوم کا

سب سے پہلا مطبوعہ ہے۔ اس میں سارے کلام کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے شاہین کا لفظ آخری دور میں جو ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے صرف تین جگہ آیا ہے۔ سب سے پہلے محاصرہ اور نہ میں یادو گکھ طلوع اسلام میں نظم اسیری میں حافظ کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے۔ تضمین میں یہ لفظ ہے مگر خود شاعر نے صرف دو ایک خصوصیات پر اکتفا کی ہے۔

لیکن جیسے جیسے اقبال کے بعض خیالات اور رحمات میں پختگی ہوتی گئی وہ وطن پرستی اور اسلامی شاعری کے دور سے گزر کر انقلابی دور میں داخل ہوئے تو ان کے شاہین کے تصور نے بھی ایک ارتقائی کیفیت حاصل کر لی جس کا اندازہ بعد کے کلام سے ہوتا ہے۔ بال جبریل میں شاہین کے عنوان سے جو قلم ہے اس میں اقبال نے اپنے شاہین کی تمام خصوصیات کو ایک جگہ سمویا ہے:

کیا میں نے اس خاکِ داں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
خیابانوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہس اکی بہت دلبرانہ
ہوائے بیباں سے ہوتی ہے کاری
جو ان مرد کی ضرب غازیانہ

تمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
 کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
 جھپٹنا پلٹنا پلت کر جھپٹنا
 لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
 یہ پورب یہ پچھم چکروں کی دنیا
 میرا نیگلوں آسمان بے کرانہ
 پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
 کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ
 اقبال کی رہبانیت اور دوسرے ادیان یا ملکوں کی رہبانیت میں
 بڑا فرق ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ رہبانیت اسلامی اصولوں کے
 منانی ہے۔ اقبال کے ہاں دین و دنیا دونوں کا امتزاج ہے۔ چنانچہ
 اس نے صاف صاف اعلان کر دیا:

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
 فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
 اس کے فقر میں اگر ایک جانب جرات رندانہ جذب کلیمانہ ہے
 تو دوسری جانب انداز ملوکانہ شکوہ شاہانہ شان سکندری اور دبدبہ قیصری
 بھی نظر آتا ہے اس نے فقر کی دو واضح فتمیں بیان کی ہے:

۱۔ ریس احمد جعفری۔ اقبال اور سیاست میں اقبال اکیڈمی کراچی صفحہ ۱۷ (محمد احمد

سپزواری)

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری

اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دل گیری
اک فقیر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی سرمایہ شبیری
وہ اس فقر کا قائل نہیں جو صیاد کو خچیری سکھائے یا قوموں میں
مسکینی اور دلگیری پیدا کرے بلکہ اس کے نزدیک

فقر کے معجزات اج و سریر و سپاہ!
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
اور اسی فقر کو وہ علم سے بلند و بالا سمجھتا ہے۔ چنانچہ علم و فقر کا
 مقابلہ کرتے ہوئے اس فرق کو بہت اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔

علم کا مقصد ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصد ہے عفت قلب و نگاہ
علم فقیہ و حکیم فقر مسح و کلیم
علم ہے جو یائے راہ فقر ہے دانائے راہ
فقر مقام نظر علم مقام خبر
فقر میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ
لیکن محض اوپھی ہوا میں اڑنے سے وہ خصوصیات پیدا نہیں
ہوتیں جو چاہیں کو دوسراے پرندوں سے ممیز کرتی ہیں۔

پھر افلاطون میں کرگس اگرچہ شاہیں وار

شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا
یا

پرواز ہے دونوں کی اسی اک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور
اقبال کے شاہین میں نہ صرف غیرت اور خودداری ہے بلکہ وہ
قوت طاقت اور جوانبُرداری کا مظہر بھی ہے۔ اقبال کے شاہین کو دنیا
میں رہنا ہے خلوت پسندی اور آشیانے سے بے تعقیٰ کے باوجود وہ
دنیا سے اپنا ناتائجہ نہیں توڑ سکتا ہے اور دنیا میں وہی زندہ رہ سکتا ہے جس
میں ذاتی قوت اور طاقت ہو۔ دوسروں کے سہارے یہاں رہنا
مشکل ہے اس لیے وہ کہتا ہے:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات
لیکن یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ اقبال نے اپنے شاہین کو جبرو
استبداد سے وابستہ کر دیا ہے یا وہ جنگل کا قانون نافذ کرنا چاہتا ہے۔
بلکہ وہ طاقت و قوت کی ذاتی تحفظ کے لیے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ
یقین رکھتا ہے کہ قوت پروازی وقت بڑھتی ہے جب کہ قوت تحفظ
پیدا ہو جائے۔ بغیر ذاتی صلاحیت کے اس جہان رنگ و بو میں امتیاز
حاصل کرنا دشوار ہے۔ پھر قوت و طاقت حرکت کا سبب ہے اور
حرکت زندگی کا نشان کائنات کی ہرشے میں حرکت نظر آتی ہے۔ اور
اس کے بعد ہی وہ مقام آتا ہے جہاں قوت کی جولانی کا مظاہرہ

مقصود بالذات بن جاتا ہے اور وہ حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں رہتا بلکہ:

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

جو کبوتر پر جھپٹنے پر مزا ہے اے پسر

وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں لے

اقبال کے قیام بھوپال کی یادگارِ ادبی محفلوں سے فیضان حاصل کرنے والے بھوپال

کے ماہی ناز فرزند محمد احمد سبزواری کے مندرجہ بالا خیالات ان کی بصیرت افروزی اقبال نہیں

اور تصرف نگاہی پر دلالت کرتے ہیں انہوں نے جس خوبی اور خوبصورتی سے فکر اقبال کا اپنے

اس قیمتی اور نایاب مضمون میں احاطہ کیا ہے وہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے۔

جب سبزواری صاحب کراچی آگئے تو میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور اس مضمون کے

پس منظر کے بارے میں ان سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ شیش محل بھوپال کی وہ محفیلیں

اور صحبتیں جن کا نقش آج تک میرے دل پر قائم ہے یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ ہے۔ میں نے

بچپن ہی سے اقبال کی فکر و حکمت کے گہرے اثرات قبول کیے تھے۔ جب ان سے نیاز کا

شرف بھی حاصل ہو گیا اور ان کے حکیمانہ ارو عالمانہ انداز فکر کا ذاتی طور پر بھی مجھے انداز ہوا

تو عقیدت و احترام کا جذبہ کچھ اور سوا ہو گیا۔ چنانچہ اس مضمون میں وہی کچھ پیش کیا گیا ہے

جو میں نے بزم اقبال کی صحبتیوں سے حاصل کیا ہے وہ بلاشبہ نئی نسل کے لیے اپنے دل میں

گہری درمندی تڑپ رکھتے تھے۔

بھوپال میں بزم اقبال کی کچھ اور تفصیلات کے سلسلے میں میرے ایک سوال پر

انہوں نے کہا کہ جس دور میں اقبال بھوپال آنے جانے لگے تھے یہ وہ دور تھا کہ جب بر صغیر

میں نہ ریڈ یو اس قد رمقبول تھا جیسا کہ آج کل ہے اور نہ چھوٹے شہروں سے روزانہ اخبار نکلا

کرتے تھے۔ اس زمانے میں روزناموں کی تعداد بس گنی چنی تھی۔ اردو کے کچھ روزنامے ملکہ سمبی دہلی لاہور اور لکھنو وغیرہ سے نکلا کرتے تھے مگر انگریزی روزانہ اخباروں کے مقابلے میں ان کا حلقة محدود تھا کیونکہ یہ تیسرے یا چوتھے روز دور راز مقامات پر پہنچا کرتے تھے۔ لہذا اس زمانے میں مقامی خبروں کی فراہمی تبادلہ خیال یا اپنے علمی اور فنی ذوق کو تکمیل دینے کے لیے لوگوں کے گھروں پر نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ غیر رسمی اجتماع یوں تو ہر شخص کے لیے کھلے ہوتے تھے مگر عام طور پر واقف ہم خیال اور ہم ذوق افراد ہی ان میں شریک ہوتے تھے۔

بر صغیر کی علمی اور سماجی زندگی میں ان نشستوں اور محفلوں نے بڑا ہم کردار ادا کیا ہے۔ بھوپال میں ایسی ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ آئندہ جب کبھی بھوپال کی تہذیبی و ثقافتی تحریکات کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ان کے کردار اور اثرات ناقابل فراموش ہوں گے۔ مثال کے طور پر ماسٹر ناصر علی ناصراٹاوی کے مکان پر بلا ناغدر روز ہر رات کو ایک نشست ہوا کرتی تھی۔ جس میں سکولوں کے اساتذہ حکماء تعلیم کے ملازم میں، سرکاری افسران، شاعر، صحافی، وکیل اور طلبہ شریک ہوا کرتے تھے۔ ان نشستوں میں مقامی حالات پر تبصرے سے لے کر ہندوستان کی سیاست، شعرو شاعری، علمی موضوعات اور الطیفہ گوئی تک ہر موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ نشست برسوں ہوتی رہی۔ اور ناصراٹاوی کے انتقال کے بعد ہی اس کا شیرازہ بکھرا۔ اسی طرح بعض نشستیں مقامی شاعروں اور سربرا آورده افسروں کے مکانوں پر ہوتی تھیں۔ خود راس مسعود جمعہ کے روز..... جب کہ ریاست میں تعطیل ہو رہی تھی۔ یہ پابندی صبح سے نماز جمعہ سے قبل تک اور اکثر بعد نماز جمعہ سے شام تک ایسی نشستیں منعقد کرتے تھے۔

اقبال کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

اکثر جگہوں پر دیگر تعطیلات میں بھی شعرو شاعری کی مخلفیں ہوا کرتی تھیں۔ راس مسعود نے بھوپال میں رہ کر یہاں کے ادیبوں شاعروں اور اہل علم کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ وہ ریاست میں بہت مقبول تھے ان کا بغلہ ریاض منزل شہر سے کوئی سواتین میں دور تھا پھر بھی جمعہ کی خاص نشتوں میں جہاں تک یاد پڑتا ہے محمود الحسن صدیقی، عبدالجلیل مائل نقوی، ملا رموزی، سید حامد رضوی مولینا ارشد تھانوی، مولینا محمد یوسف قیصر، مولوی عبد الرزاق، حامد سعید خاں حامد، محمد خلیل اللہ خاں، مشی سید لطف علی، استاذ ذکی وارثی، حکیم علی کوثر چاند پوری، عبدالحیم آرٹسٹ پنڈٹ لکشمی آیا جی رائے زادہ منشی گوبند پرشاد آفتاب سیٹھ بیشتہ وسلم داس مولوی سید احمد سبزواری وغیرہ پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ خود میں بھی قیام بھوپال کے دوران اکثر و بیشتر ریاض منزل جایا کرتا تھا۔ سر راس نے ندیم ہفت روزہ کے لکھنے والوں کا ایک حلقة بنادیا تھا اور تمام لکھنے والوں کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک بار سر راس نے مجھس کہا کہ تم بیکار بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہو۔ ندیم کے دفتر میں جا کر ترجمہ کیا کرو۔ چنانچہ میں دوسرے ہی دن سے اخبار کے دفتر جانے لگا۔ اور قلم کی سب سے پہلی آمدی مجھے اسی ندیم اخبار سے ہوئی۔

سر راس اگرچہ علامہ کو صرف اقبال کہا کرتے تھے مگر وہ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ علامہ سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی بخی مخالفوں میں ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور ان کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات متقد میں اردو اور فارسی کے وہ شعر بھی سنادیتے تھے جن کے مضمایں میں ممتازت ہوتی تھی۔

جبیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ علامہ نے آخری دو بار شیش محل میں قیام فرمایا جہاں اکثر اقبال شناسوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ اگر کسی شب علامہ کی طبیعت ناساز ہوتی تو آنے

جانے والے مزاج پرستی کر کے رخصت ہو جاتے اور نشستوں کا سلسلہ چند دن کے لیے منقطع ہو جاتا۔ پھر جب راس مسعود جوان کی ہمہ وقت خبر گیری کرتے تھے۔ یہ بتا دیتے کہ اب اقبال اپھے ہیں یا کسی وک مخاطب کر کے فرمادیتے کہ آج رات شیش محل میں اس موضوع پر بات ہو گی۔ وہاں آ جاؤ تو نیازمند کا یہ حلقة شیش محل میں جمع ہو جاتا۔ عام طور پر وہی لوگ ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے جن کا ذکر اس سے پہلے کر چکا ہوں۔ مجھے علامہ کی محفلوں میں بھی راس مسعود کے یہاں جمع ہونے والے افراد نظر آئے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالباسط اور ڈاکٹر سلطان کو بھی میں نے وہاں موجود پایا۔ یہ دونوں ان کے معانج تھے۔ اور خصوصی ہدایات کے تحت رات کو علامہ کی خیریت دریافت کرنے آتے تھے۔ ممنون حسن خاں بھی پابندی سے وہاں آتے تھے اور ماestro مولیٰ محمد صاحب بھی جنواب صاحب کے استاد رہ چکے تھے۔ برآمد ہوتے تھے چند مقامی ادیب و شاعر بھی شریک محفل ہوا کرتے ہتھ کبھی خود بھی راس مسعود بھی آ جاتے تھے اور ان کی آمد سے محفل میں جان پڑ جاتی تھی۔ زیریں مسکراہیں بلند قہوہوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ ان کی نشست بلاشبہ بڑی باغ و بہار تھی۔ علامہ اقبال مجھے کم گونظر آئے۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب ان کی علالت اروگلے کی تکلیف ہو۔ پھر بھی وہ اپنے پسندیدہ موضوعات پر ضرور اظہار خیال کرتے تھے۔

عام طور پر میں نے انہیں تمیص شلوار میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے پنگ پر بیٹھ رہتے۔ وہیں ایک چھوٹا سا گاؤں تکیہ رکھا تھا جس کے سہارے وہ بھی نیم دراز ہو جاتے ایک دن آرم کرسی پر بھی دیکھا جس پر دونوں پاؤں اٹھا کر رکھ لیے تھے۔ حقہ البتہ ہر جگہ آپ کے ساتھ ہوتا۔ خادم خاص علی بخش بھی سائیہ کی طرح آپ کے ساتھ رہتا تھا۔

پہلی مرتبہ میں تنہا گیا تھا۔ دوسرا بار اپنے ایک دوست سید حسن کو ساتھ لے گیا۔ یہ مجھ سے کچھ سینتر تھے۔ باقی بہت دلچسپ انداز میں کرت تھے۔ میرے اصرار پر انہوں نے

چند مضمایں تغزل کے رنگ میں لکھے تھے۔ جو لا جواب تھے۔ اس دن ترقی پرسندی پر باتیں ہو رہی تھیں۔ سید حسن کہنے لگے میں ترقی پسندی کا قائل ضرور ہوں مگر شاعری میں ترقی پسندی مجھے بالکل پسند نہیں بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک مصروف تو مولینا سا اور دوسرا مصروف جوش ملچ آبادی۔ (واضح رہے کہ مولینا سہا مجددی نہایت پستہ قد بزرگ تھے) لوگ یہ فقرہ سن کر خوب نہیں۔ علامہ بھی مسکرا دیے۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اس فقرہ سے کافی لطف انداز ہوئے ہیں۔ اب تو ان کی محفلوں کی صرف یادیں..... یادگار بن کر رہ گئی ہیں !!

بھوپال میں اقبال کے خاص معانج ڈاکٹر عبدالباط کا تفصیلی ذکر اور اق میں کیا جا چکا ہے۔ عبدالحی ڈاکٹر عبدالباط کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں بمقام دہڑہ دون پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں وہیں سے میٹرک کر کے بسلسلہ تعلیم دہلی گئے اور ۱۹۲۸ء میں اٹھر میڈیٹ پاس کر کے علی گڑھ بھیج دیے گئے۔ جہاں سے ۱۹۳۰ء میں آپ نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۳۱ء میں ایل بی کا امتحان دے کر فرست ڈویژن حاصل کی۔ اور ۱۹۳۳ء میں میرٹھ جا کر وکالت شروع کر دی لیکن جب آپ کے والد ۱۹۳۵ء میں بھوپال منتقل ہوئے تو آپ بھی بھوپال آگئے اور دو سال تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں آپ جو ڈیشنل افسر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۷ء تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک آپ نے سب نجج اور سب ڈیشنل میڈیٹ بلڈی کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں استعفی دے کر کراچی آگئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ کچھ عرصہ استینٹ کشوڈین رہے اس کے بعد ایڈیشنل سٹی میڈیٹ ایڈیشنل رینٹ کنشروں کی میں آفیسر ڈپٹی سٹیلمنٹ کمشنر اور ڈپٹی کشوڈین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

عبدالحی صاحب سے میری اتفاقیہ ملاقات سٹیلمنٹ کے دفتر میں ہوئی۔ میں اپنے عم
گرامی پروفیسر سید نواب علی کے کلیم کے سلسلے میں ان سے ملنے گیا تھا۔ دوران گفتگو بھوپال کا
ذکر آیا تو آپ نے بتایا کہ میرے پاس علامہ اقبال کے پانچ غیر مطبوع خطوط اور ضرب کلیم کا
ستخطی نسخہ محفوظ ہے۔ چنانچہ بھرا پتہ لے کر دوسرے روز حاضر خدمت ہوا آپ نے از راہ
اقبال شناسی مجھے وہ خطوط اور نسخہ عطا فرمایا دیا میں اپنے کام کی تفصیل انہیں بتا چکا تھا چنانچہ
میری خواہش پر آپ نے اپے والد صاحب اور اقبال کے خصوصی تعلقات کی تفصیلات بھی
مجھے بتائیں جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے اپنے والد صاحب کی طرح عبدالی بھی
اقبال کے گرویدہ و شیدا نکلے۔ چنانچہ انہوں نے اقبال سے اپنی ملاقاتوں کی انتہائی دلچسپ
اور اچھوتی را داد سنائی۔ پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ۱۹۳۵ء میں
اپنے والد صاحب کے ساتھ علامہ اقبال سے ملنے ریاض منزل یا تھا ان کو دیکھ کر یہ اندازہ
لگانا مشکل تھا کہ یہ بہت بڑے شاعر اور فلسفی ہیں نہایت سادہ لباس پہنے تھے۔ سر راس مسعود
بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے والد صاحب کا اور میر اتعارف کرایا اور خاندانی رشتے کا
تذکرہ بھی کیا۔ اقبال نہایت دھیمے لجھے میں گفتگو کر رہے تھے۔ والد صاحب کو انہوں نے
اپنے مرض کی تفصیلات بتائیں اور دریافت کیا کہ بھلی کے علاج سے فائدہ ہو گا۔ والد
صاحب نے انہیں تسلی دی اور یقین دلایا کہ اس علاج سے انشاء اللہ ضرور فائدہ ہو گا۔ میں
خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ کچھ دیر ٹھہر کر ہم لوگ واپس آگئے والد صاحب برابر ریاض منزل
جاتے رہے۔ تقریباً ایک ماہ قیام کر کے علامہ اقبال واپس چلے گئے۔ اس دوران میں والد
صاحب سے ان کی برابر خط و کتابت ہوتی رہی۔

دوسری بار جب ۱۹۳۶ء میں وہ بھوپال آئے تو ان کا قیام شیش محل میں ہوا جو ہمارے
مکان قدسیہ محل کے سامنے تھا۔ اس مرتبہ مجھے تقریباً روزانہ ہی ان سے شرف نیاز حاصل

ہوا۔ اگر کسی روز میں نہ جاتا تو علامہ کسی کو بھیج کر بلوایتے۔ شام کو جب سرکاری موڑ آ جاتی تو وہ والد صاحب کو اور مجھے سیر کے لیے ساتھ لے جاتے۔ یہ تقریباً روزہی کا معمول تھا۔ شہر کی تمام تفریح گاہیں ہم نے اہیں دکھائیں۔ ایک دوبار شہر سے دور اسلام نگر بھی گئے۔ یہ تاریخی اور پر فضائیہ علامہ اقبال کو بہت پسند آئی۔ شملہ کوٹھی یا ٹکلپ بڑا تالاب چھوٹا تالاب اور تمام باغات کی سیر سے علامہ بہت مخلوق ہوئے تھے۔ اتنا قرب ہونے کے باوجود میں نے انہیں بہت کم گو پایا۔ زیادہ تر وہ کسی خیال میں مستغرق رہتے تھے۔ ممکن ہے یہ استغراق فکر شعر کے سلسلے میں ہو۔ کبھی کبھی والد صاحب سے گلے کی تکلیف کے بارے میں پوچھ گچھ کر لیتے تھے۔ کبھی ادبی موضوعات پر بھی مختصر لیکن جامع انداز میں اظہار کر لیتے تھے۔ میرے والد صاحب کو بھی شعروخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر گفتگو کے دوران انہیں کا کلام سنادیتے تھے لیکن خود علامہ اقبال اپنا کلام سنانے سے گریز کرتے تھے۔ البتہ دوسروں کے اچھے شعر سن کر ضرورداد دیتے تھے۔ شیش محل میں شام کوئی لوگ ملنے کے لیے آ جاتے ان میں بڑے افسران اور اقبال کے پرستار بھی ہوتے تھے اور عام لوگ بھی۔ وہ سب سے یکساں محبت سے پیش آتے تھے۔ تقریباً روزانہ کی ملاقات نے مجھے خاصاً بے تکلف کر دیا تھا۔ ایک روز میں نے سوال کر لیا کہ آپ کے کلام کی اتنی شہرت و عظمت ہے پھر کیا سبب ہے جو آپ کو نوبل پرائز نہیں ملا۔

یہ سن کر علامہ نے کچھ دری تو قف کیا پھر فرمایا

میرے یہاں سب کچھ مغرب کے خلاف ہے اس لیے وہ مجھے

نوبل پرائز کیسے دے سکتے ہیں

ان کا جواب سن کر مجھے ان کی حقیقت پسندی کا قائل ہونا پڑا۔ ایک بار میں نے انہیں کا

ایک شعر پڑھا۔

نقش دگر طراز ده عالم پخته تر بیار
طالب خاک ساختن مے نہ سزد خدائے را
اور دریافت کیا کہ اس شعر میں آپ کس حد تک سنجیدہ تھے؟

آپ نے فرمایا:

..... یہ تو آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر شاعر پوری طرح ایک شعر کرتا ہے اس کے مانی اضمیر شعری صداقت اور صحیح مفہوم کو سمجھنا پڑھنے والے کی ذمہ داری ہے۔

ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ آپ شعر کس طرح کہتے ہیں؟

فرمایا:

”..... بعض اوقات مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے
اور میں بے ساختہ شعر کرتا چلا جاتا ہوں۔ لیکن اگر بالا ارادہ کبھی شعر
کھنچنا چاہوں تو نہیں لکھ سکتا۔ عام طور پر جس طرح لوگ مجھ کو شاعر
سمجھتے ہیں اس طرح کا شاعر نہیں ہوں۔ میرے پاس صرف ایک
پیغام ہے جسے میں عوام تک پہنچانا چاہتا ہوں چنانچہ اپنا پیغام منظوم
صورت میں پہنچا رہا ہوں۔ محض شعر کہنے کے لیے شعر کبھی نہیں کہتا
جب تک کہ کوئی خاص تحریک نہ ہو۔“

علامہ اقبال اکثر گفتگو کے دوران اسلامی اقدار کا ذکر کرتے تھے اور رسول مقبول کا
جب تذکرہ فرماتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواؤ ہو جاتے تھے۔ ایک روز مغرب کے
بعد ہم سب شیش محل میں بیٹھے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک نوجوان طالب علم علامہ
سے ملنے آیا اور آتے ہی ان کے قدموں میں گر پڑا۔ آپ نے سہارادے کرائے اٹھایا۔ تو وہ

علامہ کی ایک نظم کا عنوان مجھے یاد نہیں بے اختیار سنانے لگا۔ جسے سن کر آپ آب دیدہ ہو گئے۔ اس سے نہایت شفقت سے دریافت کیا کہ کیسے آنا ہوا؟ اس نے نہایت عقیدت سے کہا کہ صرف آپ کا نیاز حاصل کرنے آیا ہوں اور اسی جذبے سے لا ہو رگیا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ آپ بھوپال علاج کے لیے تشریف لے گئے ہیں چنانچہ لا ہو ر سے چل کر بھوپال آپ سے ملنے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر آپ بہت متاثر ہوئے۔

میرے اس سوال پر کہ شیش محل کی فضائیں اقبال کس طرح اپنا وقت گزارتے ہیں۔ عبدالجہنی نے کہا کہ شیش محل اگرچہ شاہی محل کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب بھی علامہ اقبال وہاں قیام فرماتے تھے۔ ایک عام دربار کی سی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ ہر شخص بلا امتیاز ان سے ملاقات کے لیے آتا تھا رات کو اکثر ادیبوں اور شاعروں اور اقبال کے نیازمندوں کے اجتماع ہوتے تھے۔ دن میں وہ فرصت کے لمحوں میں مطالعہ کرتے تھے۔ میں نے علامہ اقبال کو مطالعہ کو بہت شائق پایا بھوپال کی مشہور حمید یہ لا بھری سے برابر کتابیں منگوائے رہتے تھے۔ اور ایک دو دن میں ان کو پڑھ کر لوٹا دیتے تھے۔ اروٹی کتابیں حاصل کر لیتے تھے۔ جب بھی کسی کتاب کے بارے میں ان سے سوالات کیے۔ وہ نہایت تفصیل سے ان کے بارے میں جواب دیتے تھے۔ مجھے ان کی یادداشت پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی جلد خیتم کتابیں کیسے پڑھ لیتے ہیں اور کس طرح ان کے موضوعات کو بھی یاد کر لیتے ہیں۔ دو کتابیں علی الخصوص ان کے سرہانے میں نے ہمیشہ دیکھیں ایک مشنوی مولینا روم اور دوسری کلام عبدالقدار بیدل دریافت پر علامہ نے فرمایا کہ یہ دونوں کتابیں سفر و حضر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں۔ مجھے بہت پسند تھی۔ جب میں نے وہ نظم سنائی تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ علم و مطالعہ میں اضافہ کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ ان کے رہن سہن میں بڑی سادگی تھی۔ کبھی تہذیب قیص پہنچتے کہہ یشوار قیص جب باہر

کہیں جاتے تو کوٹ پہن لیتے۔ سوٹ میں نیاں کو بہت کم پہنے دیکھا۔ علی بخش ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ وہ علامہ سے بہت محبت کرتا تھا اور حقہ ہمیشہ گرم رکھتا تھا۔

جاوید اقبال ۱۹۳۶ء میں لاہور سے ساتھ آئے تھے۔ اس زمانہ کی ایک دو تصویریں جو اب دھنڈ لائی گئیں اب بھی محفوظ ہیں۔ میری درخواست پر وہ تصویریں انہوں نے مجھے عنایت کر دیں جس کے مکانہ بہتر پرنٹ میں نے بنوای کہ اس کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔ تاکہ بھوپال کی یہ یادگار تصویریں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں جاوید کے بارے میں عبدالجعف نے بتایا کہ وہ زیادہ ت وقت ہم لوگوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ اردو میرے چھوٹے بہن بھائیوں کے بہت منوس ہو گئے تھے۔ اکثر تو دن بھر وہ ہمارے گھر ہی میں کھیل کو دیں مصروف رہتے علامہ اقبال جاوید سے بڑی محبت کرتے تھے ان کی تعلیم و تربیت پر ان کی خاص توجہ تھی۔ بھوپال کے ایک تجربہ کار ماسٹر ان کو پڑھانے کے لیے آتے تھے۔ شام کو وہ روزانہ ہی سیر کے لیے ساتھ جاتے تھے۔ دن کے بیشتر حصے میں وہ بلا تکلف ہمارے گھر آتے جاتے تھے۔

میرے والد صاحب تو علامہ اقبال کے بے حد مداح اور قدراں تھے وہ ان کی خصوصی دیکھ بھال ہی نہیں کرتے تھے فرست کے بیشتر لمبی بھی انہیں کی قربت میں صرف کرتے تھے شام کا کھانا میرے والد صاحب اپنے علامہ اقبال کے ساتھ کھاتے تھے۔ مجھے بھی بارہا شرف طعام نصیب ہوا۔ ہم نے گھر پر کئی بار ان کی دعوت کی۔

اے افسوس کہ ان کا یہ دیرینہ خادم عقیدت مند بھی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

انہیں کباب بے حد مرغوب تھے اور ہم ہر دعوت میں خصوصیت کے ساتھ کباب تیار کراتے تھے۔

آخری بار جب وہ بھوپال تشریف لائے ہیں تو ان کی صحبت بہت گرچکی تھی۔ آواز بھی

صف نہیں نکلتی تھی اور کچھ دمہ کی شکایت بھی بڑھ گئی تھی۔ میرے والد صاحب اور بھوپال کے دیگر معینین بڑی توجہ کے ساتھ اور احتیاط سے ان کا علاج کر رہے تھے اور قس علاج سے بہت کچھ فائدہ بھی ہوا تھا۔ لیکن ان کے ذاتی حالات بھوپال میں زیادہ قیام کی اجازت نہیں دیتے تھے اس لیے آخری قیام بہت مختصر رہا اور وہ جلد بھوپال آنے کا وعدہ کر کے لا ہو رہا۔ واپس تشریف لے گئے۔ اس قیام کے دوران انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت قرآن مجید کے حوالشی پر صرف کیا۔ اس کتاب کے لیے نواب صاحب بھوپال نے ان سے فرمائش کی تھی۔ اور اس سلسلے میں ہر مکمل اعانت بھی کی تھی لیکن قدرت کا عجب تماشا ہے ادھر راس مسعود کا انتقال ہو گیا۔ ادھر علامہ اقبال کی صحبت اور گرگئی اور وہ کوشش کے باوجود پھر بھوپال نہ آسکے۔ اقبال کے ایک اور نیاز مند محمد نعیل اللہ خاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل مہین حمید اللہ خاں والی بھوپال نے راس مسعود سے کہہ رکھا تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ہونہار ارزہیں نوجوانوں کو ملازمت کے لیے بھوپال بھیج دیا کریں۔ چنانچہ راس مسعود کی سفارش پر آپ ۱۹۳۲ء میں بھوپال آگئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہ کر نیک نامی اور شہرت حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں آپ سیکریٹری فوڈ اینڈ ایگری کلچر اور فوڈ کمشنر کے عہدے سے سبک دوشی حاصل کر کے بھوپال سے کراچی منتقل ہو گئے اور یہاں عالیٰ تعلیمی اداروں سے وابستہ رہ کر درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔

۱۹۶۲ء میں اتفاقیہ طور پر میری آپ سے کراچی میں ملاقات ہو گئی۔ ملاقات کے دوران میں لے ان سے اپنے کام کی مشکلات کا ذکر کیا۔ اور عرض کیا کہ کسی روز وقت ہوتو میں حاضر خدمت ہو جاؤں اور آپ مجھے اقبال کے قیام بھوپال اور اپنی ملاقاتوں کی تفصیلات سے بہرہ مند فرمائیں انہوں نے بخوبی آمادگی ظاہر کی۔ وقت مقررہ پر میں ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا تو انہوں نے اپنی یادداشتوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ

۳۶-۱۹۳۵ء میرے لیے واقع خوش قسمت سال تھا۔ جب مجھے شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ وہ ہر ہائی نس نواب محمد حمید اللہ خاں کے الطاف خسروانہ اور ذاتی عقیدت کی بنا پر بسلسلہ علاج بھوپال تشریف لاتے رہے اور نواب صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر بھوپال کے مشہور و ممتاز ڈاکٹروں اور اطباء نے ان کے خصوصی علاج پر ہر ممکن توجہ مبذول کی میرے مکان اور شیش محل کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ اگر میں اپنی ساری ریہائش کو ہمسایگی پر محمول کر دوں تو بے جانہ ہو گا کیونکہ شاعر مشرق اس زمانے میں اپنے دیرینہ ملازم علی بخش کے ساتھ تھا رہتے تھے ظاہر ہے یہاری کی حالت میں تھائی مرض کی شدت کو اور زیادہ بڑھادیتی ہے۔ چنانچہ ان کی بحالی صحبت کے لیے ڈاکٹروں اور اطباء نے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت تھی کہ کچھ صابان ذوق و قما فو قما ان سے ملتے رہیں۔ میں اس زمانے میں ریاست بھوپال میں بعہدہ تختیل دار تین تھا اور سر راس مسعود کی جن کی ذاتی کوششوں سے علامہ اقبال بھوپال آ کر علاج کرانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس وقت وزارت تعلیمات پر مامور تھے۔ چنانچہ جب علامہ اقبال بھوپال تشریف لے آئے تو انہوں نے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی خبر گیری کرنے کے لیے مجھ سے ارشاد فرمایا جس سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔ علامہ اقبال کے احساس تھائی کو کم کرنے کے لیے راس مسعود مرحوم نے میرے علاوہ اپنے سیکرٹری اور میرے دوست منون حسن خاں اور میرے محبوب اور دوست مسح الدین سے بھی جو بھوپال کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ اور نہایت خوش مذاق انسان تھے۔ علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے کہہ دیا..... چنانچہ ہم تینوں کبھی تھا اور کبھی ایک ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔ اور ان سے فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان کے معجبین میں جنہیں نواب صحب نے متعین فرمایا تھا خاص طور پر ڈاکٹر عبدالباسط ڈاکٹر عبدالرحمن چیف میڈیل آفیسر

ڈاکٹر سلطان حکیم ضیاء الحسن افسر الاطباء حکیم سلطان محمود وغیرہ قابل ذکر ہیں بھوپال کے قیام نے علامہ مرحوم کی صحت کی بحالی میں بڑی مدد دی اور بھوپال چھوڑنے سے قبل وہ بڑی حد تک صحت یاد ہو چکے تھے۔ اپنے قیام کے آخری دنوں میں مجھے خود ان کی زبان سے ان کا بصیرت افروز کلام سننے کا موقع بھی ملا۔ وہ لمحے میری زندگی کا سب سے تیقیتی سرمایہ ہیں جو میں نے ان کی قربت میں گزارے۔ ان کا کلام سن کر دل میں جوش و ولہ پیدا ہو جاتا تھا اور عمل کی قوتیں بیدار ہو جاتی تھیں اس دور میں بھوپال کی جن ممتاز شخصیتوں کو اکثر میں نے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر پایا ان میں ملارموزی سید محمد یوسف قیصر، شہزادی ذکر وارثی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جب بھی میں حاضر خدمت ہوتا وہ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے اور جب رخصت ہونے لگتا تو آئندہ جلد آنے کے لیے ضرور ارشاد فرماتے۔ ان الفاظ سے مجھے حقیقی خوشی ہوتی تھی اور میں اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتا تھا کہ اس طرح علامہ مرحوم کا کچھ وقت اچھا نظر جاتا تھا۔ اور وہ اپنی بیماری اور تکلیف کو کچھ عرصے کے لیے بھلا دیتے تھے۔ میں اکثر شام کو حاضر خدمت ہوتا تھا۔ اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی کبھی شاعری کے اعلیٰ مقاصد پر کبھی ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر کبھی مسلم قوم کی زبوب حالی پر اور کبھی ملت اسلامیہ کی ترقی و فلاح پر۔ علامہ مرحوم کے دل میں مسلمانوں کی سود و بہبود کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ تقریباً ہر ملاقات میں وہ قوم کی بدحالی کا ذکر ضرور کرتے اور ملت اسلامیہ کی ترقی کے لیے شیرازہ بندی کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی اور ان کا سارا سرمایہ فکر و حکمت علم و عمل سے عبارت ہے۔ اسلام کی نشأۃ الثانیہ کا جو جزبہ میں نے علامہ اقبال کے دل میں موجود پایا کہیں اور اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

مسح الدین سے بھی میری ۱۹۶۲ء میں ملاقات ہو گئی۔ وہ افکار کے پہلے خریدار میرے

چچا پروفیسر سید نواب علی کے عزیز شاگرد اور ایک ممتاز بینکار تھے۔ محمد خلیل اللدخار کے بیان کردہ واقعات کی انہوں نے بھی تائید و تصدیق کی اور کہا کہ شاعر مشرق کا ریاست بھوپال

اور بھوپال کے عوام نے جس کھلے دل سے استقبال کیا ہے اور ان کی قدر و منزلت کی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ علامہ مرحوم بھوپال کی آب و ہوا تفریح گاہیں اسلامی ریاست کا شکوہ حکمران وقت کی اعلیٰ خدمات۔ سبھی کا دل سے اعترقاف تھا۔

وہ جتنے عرصے بھی بھوپال رہے ہمیشہ خوش اور مطمئن رہے۔ یہاں ان کے نیاز مندوں میں بھی ان کی آمد سے خوشی سے پھولے نہیں سما تھے۔ شیش محل کے قیام میں انہیں ہر ممکن سہولت نواب صاحب کی جانب سے مہیا کی گئی تھی اور وہ اگرچہ ایک شاہی مہمان کی حیثیت سے مقیر رہے لیکن شاعر مشرق کا دربار عام تھا اور ہر شخص بلا تکلف ان سے ملنے اور فیض یاب ہونے کے لیے آ سکتا تھا۔ اکثر جمعہ کی نمازو وہ جامع مسجد یاموتی میں جا کر پڑھتے تھے اور وہاں بھی وہ جانے والے ان کی عزت و تکریم اور عقیدت و محبت سے ملتے۔ خواص سے زیادہ انہیں عوام عزیز تھے اور وہ ہر آنے والے سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔

بھوپال کی ادبی فضا کے سلسلے میں رشید احمد ارشد تھانوی اور سید محمد یوسف قصر کا تذکرہ ابتدائی ابواب میں سبعہ سیارہ کے ذیل میں آچکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں بھوپال کے ادبی افق پر ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔ یہ دونوں بزرگ و محترم یہک وقت نظم و نثر پر حاوی تھے اور بھوپال میں نئے رمحانات کو فروغ دینے اور نظم کی روایت کو برقرار رکھنے میں ان دونوں کا بڑا حصہ ہے۔

مجھے خوش نصیبی سے دونوں شخصیتوں سے نیاز و قرب حاصل تھا۔ قیصر صاحب مرحوم نے تو اس کتاب کے سلسلے میں آئینہ مشاعرہ الیکی دستاویزی تالیف عطا کر کے اقبال کے بھوپال سے روابط کا آغاز کرایا۔ اور یہ کتاب ۱۹۱۰ میں شائع ہوئی تھی۔ ارشد تھانوی صاحب

مرحوم سے بھوپال میں بھی ہمیشہ قریبی تعلق رہا ہے اور کراچی میں بھی جب وہ ریڈ یو پاکستان کے دفتر واقع بندر روڈ پر تشریف لاتے تو مجھ سے ملنے کے لیے دفتر افکار بھی آ جاتے جو ریڈ یو پاکستان سے نزدیک ہی ہے۔

ارشد تھانوی اکثر ویژٹر اقبال سے بھوپال کے قیام کے دوران ملتے رہتے تھے اور ان کے بڑے ماغ و قدر دان تھے لیکن ان کا تعلق نیاز فوجپوری کے ادبی گروہ سے تھا اس لیے وہ کسی اختلاف کی صورت میں اظہار رائے بھی نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ارشد صاحب نے مجھے بتایا کہ اقبال اور میں کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا جو ہفت روزہ ندیم میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے اقبال کے کلام کے بعض فنی نقاصل پر روشنی ڈالی تھی۔ جس زمانے میں یہ مضمون ندیم میں چھپا تھا اقبال بھوپال ہی میں مقیم تھے۔ انہوں نے تو اسے پڑھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن ان کے ایک بھوپالی نیاز مندا اور تاریخ اندرس کے مشہور مصنف قاضی ولی محمد نے اس کا جواب لکھا جو ندیم میں شائع ہوا۔ راس مسعود نے دونوں مضامین دیکھے تو ارشد صاحب کو ملاقات کے لیے بلا یا ساتھ ہی انہوں نے اقبال کو بھی شیش محل سے سواری بھج کر ریاض منزل بلوالیا اور دونوں کی موجودگی میں ارشد صاحب کی غلط فہمی کو بھی دور کیا اور اقبال کی کدورت کو بھی اور اس خوبصورتی سے اعتراض اور جواب اعتراض کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ارشد صاحب نے کہا کہ اس مضمون کے بعد انہوں نے سول قسطوں میں بھوپال کی فضائے شعری کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں اقبال کی شاعری اور ان کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اقبال کو وظیفہ دے کر نواب صاحب نے انہیں مالی اور فتنی پریشانیوں سے ہی نجات نہیں دلائی انہیں زندہ رہنے کا حوصلہ بھی دیا اور آسودگی بھی بخشی تاکہ وہ فکر و تحقیق میں مصروف رہیں۔ ان کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جائے گا۔

سید محمد یوسف قیصر مرحوم ۱۹۶۳ء میں اپنے صاحبزادے سے ملنے کراچی آئے تھے تو میں نے انہیں رات کے کھانے پر مدعو کیا اور ان کی زندگی اور ان کے کاموں کے بارے میں متعدد سوالات کیے۔ اور ان کے تفصیلی حالات افکار میں فن اور فن کار کے عنوان سے شائع کیے۔ دوران گفتگو انہیوں نے بتایا کہ علامہ اقبال سے ذاتی نیازمندی اور عقیدت کے علاوہ جن بلند مرتبہ شخصیتوں سے ان کی خط و کتابت رہی ہے ان میں غالب کے پوتے خواجہ قمر الدین خاں راقم اکبرالہ آبادی، مہدی الافادی، سروجنی نائیڈو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسوس کے خطوط حفظ نہ رہ سکے اور ان کا سارا ادبی سرمایہ چوری ہو گیا۔

اقبال کے نیازمندوں کی تلاش کے دوران پتہ چلا کہ نواب صاحب بھوپال کی کابینہ سے یاک ممتاز رکن علی حیدر عباسی سابق مشیرالمہام صیغہ سیاسیہ کراچی میں قیام پذیر ہیں چنانچہ پہلی فرصت میں میں اے ان سے رابطہ پیدا کیا اور ازراہ شفقت انہوں نے مجھے ملاقات کے لیے وقت دے دیا۔ میں جون ۱۹۶۷ء میں ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور اس دور کے حالات اقبال سے ملاقاتوں کی تفصیل اور بھوپال سے ان کے تعلق خاص کے بارے میں سوالات کیے تو آپ نے فرمایا کہ میں ۱۹۲۱ء میں بھوپال آگیا تھا اور روز یہ خارجہ کی حیثیت سے فرانس انجام دے رہا تھا۔

۱۔ افکار۔ شمارہ ۱۵۔ مارچ ۱۹۶۳ء صفحہ ۸۱-۸۲

راس مسعود میرے خاص دوستوں میں تھے۔ نواب صاحب انہیں بھوپال بلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی ہدایت پر خط و کتابت میں نے ہی کی اور انہیں وزارت تعلیمات کا عہدہ قبول کرنے کی ترغیب دی چنانچہ وہ بھوپال آگئے اقبال کے وہ بے حد عقیدت مند تھے۔ میں بھی ان کا ایک ادنیٰ پرستار تھا۔ راس مسعود کی دلی خواہش تھی کہ اقبال علاج کے لیے بھوپال آجائیں۔ نواب صاحب کی بی بی یہی آرزو تھی۔ چنانچہ اقبال کو انہوں نے خط لکھا کہ بھوپال

آنے پر آمادہ کر لیا اور وہ ۱۹۳۵ء میں علاج کے لیے بھوپال تشریف لے آئے۔ ان کا قیام راس مسعود کی کوٹھی ریاض منزل میں ہوا تھا۔ ریاض منزل اور میرا بگلہ نزدیک ہی واقع تھے۔ چنانچہ پہلی بار ریاض منزل ہی میں اقبال سے مجھے نیاز حاصل ہوا۔ اور میرا جذبہ عقیدت کچھ اور بڑھ گیا۔

نواب صاحب بھوپال کے خاص معانج دہلی کے مشہور ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے اور ڈاکٹر حمین ان کے استٹنٹ تھے جو اکثر بھوپال آتے تھے بعد میں ان کے نواب صاحب سے خصوصی تعلقات پیدا ہو گئے اور ان کی خواہش پر وہ چیف میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے بھوپال آگئے چنانچہ نواب صاحب کے ایماپر ڈاکٹر رحمون اور ڈاکٹر عبد الباسط نے اقبال کے اعلان پر خاص توجہ مبذول فرمائی۔ اسی دوران راس مسعود نے اقبال کی اطلاع کے بغیر ان کے وظیفہ کی کوششیں شروع کر دیں جس کی منظوری میں میں نے بھی عملی طور پر حصہ لیا اور جلد ہی ملکہ رف خاص سے پانچ سورو پے ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں راس مسعود اقبال سے بڑی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ اقبال اپنے ناگفتہ بہ معاشی حالات پر کسی عنوان جلد قابو پر لیں اور ان کی صحیحت جلد بحال ہو جائے۔ تاکہ وہ تمام پریشانیوں سے نجات پا کر تخلیقی کاموں میں مصروف رہیں۔ اسی سلسلے میں راس مسعود نے اپنے طور پر نواب صاحب بھوپال سے سفارش کر کے سر آغا خاں کو بھی پانچ سورو پے ماہوار وظیفہ دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس بات کا علم اقبال کو نہ تھا اور جب راس مسعود نے اقبال کو اس سلسلے میں خط لکھا تو خوش ہونے کے بجائے وہ فکر مند ہو گئے ان کے اعلیٰ ظرف نے نواب حمید اللہ خاں کی خصوصی عنایت کے بعد کسی اور کا احسان اٹھانا گوارانہ کیا۔ جس پر راس مسعود نے یہ کوشش کی کہ سر آغا خاں کے وظیفہ کا ٹرست قائم ہو جائے یا یہ رقم اقبال کے بچوں کے نام کر دی جائے۔ لیکن اس کام کی

تکمیل سے پہلے ہی مسعود کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کی مسائی بار آور نہ ہو سکیں۔

ایک بار میری موجودگی میں اقبال کے قیام بھوپال کے دوران راس مسعود نے ان کے کہا کہ ناب صاحب بھوپال نے ایک ملاقاتات میں فرمایا ہے کہ نظام حیدر آباد سے بھی پانچ سورو پے وظیفہ مقرر کر ادؤں گا۔ یعنی کہ اقبال نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ مجھے اب کسی وظیفہ کی ضرورت نہیں۔ نواب صاحب نے جو کچھ میرے لیے مقرر کر دیا ہے وہ میری ضروریات کے لیے کافی ہے ان کی اس شان استغنا سے ہم دونوں بہت متاثر ہوئے۔

اکثر شام کو کبھی ریاض منزل میں کبھی میرے بنگلہ پر اقبال سے میری ملاقاتات میں ہوتی تھیں ہم لوگ اکثر ویشتر کھانا ساتھ ہی کھاتے تھے۔ ان ملاقاتات میں خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اقبال کو چھیڑنے کے لیے ایک بار ان سے کہا کہ آپ اردو میں شعر کہتے ہیں اور اس زبان کا دنیا کی زبانوں میں کوئی خاص مرتبہ نہیں فرمایا وقت آنے پر اس کی قدر و اہمیت ضرور تسلیم کی جائے گی۔

ویسے ذاتی طور پر مجھے ان کے فلسفہ مولانا روم کے پیروکی عیشت سے ان کی بلند پایہ اردو اثر انگیز کلام ان کے عالمانہ خطبات سے گہری دلچسپی تھی۔ جہاں تک مسلمانوں اور ملت اسلامیہ کی خدمت کا تعلق ہے اقبال کا مرتبہ دوسرا اکابر سے کسی طور پر کم نہیں۔ انہوں نے اپنے ولود انگیز پیغام اور اپنی عملی کوششوں سے بر صغیر کے مسلمانوں کے لیے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اقبال کا قیام دوبارہ شیش محل میں ہوا۔ وہاں بھی اکثر ویشتر ملاقاتات اور خیریت دریافت کرنے جاتا تھا۔ آخری قیام ۱۹۳۶ء کے دوران ان کی تمام تر توجہ قرآن مجید کے حوالی لکھنے پر مبذول تھی۔ ان حوالی کے لیے فرمائی روائے بھوپال نے ان سے درخواست کی تھی۔ لیکن ان کی صحت دن بدن خراب رہنے گی۔ بھوپال کے علاج سے وقت فائدہ ضرور ہوا لیکن اپنے خانگی حالات کی بنا پر وہ عرصے تک بھوپال میں قیام نہیں کر سکے۔

راس مسعود کے انتقال کے بعد اپنے ایک سچے اور مخلص دوست اور عقیدت کیش کی جدائی نے انہیں بھی ٹھہرال اور کمزور کر دیا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندر بیٹھ تھا۔ شاعر مشرق اپریل ۱۹۳۸ء میں ہم سے جدا ہو کر معبدود حقیقی سے جاملے اردو دنیاۓ علم و ادب نوار بصیرت سے محروم ہو گئی۔

پروفیسر سید نواب علی مرحوم کے ایک صاحبزادے سید احمد علی میشل بنک آف پاکستان کراچی میں مینجر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہیں میری اس کتاب کا علم تھا۔ جولائی ۱۹۶۷ء میں انہیں اپنے بنک کی جانب سے آٹھ کے لیے ڈرگ کالونی کراچی کی براچی میں تعین کیا گیا۔ عجب اتفاق ہے کہ وہاں ان کی ملاقات چودھری خاقان حسین سے ہو گئی۔ جن کا اکاؤنٹ بھی اسی براچی میں تھا۔ اور رہائش بھی اسی کالونی میں تھی۔ دوران گفتگو جب خاقان حسین خاں نے اپنے قربی عزیز علی حیدر عباسی کا ذکر کرتے ہوئے قیام بھوپال کی کچھ تفصیلات بتائیں تو سید احمد علی کو دلچسپی پیدا ہوئی اور انہوں نے میرے کام کا ذکر کیا اور ملاقات کے لیے ان سے طے کر لیا۔ چنانچہ سید اها ① علی کے ساتھ چودھری خاقان حسین سے ان کے دولت کدہ پر ملا تو انہوں نے اپنے قیام بھوپال کی نہایت دلچسپ تفصیل سنائی۔ ۱۹۳۸ء میں کس طرح وہ بھوپال گئے اور ۱۹۳۷ء تک وہاں مقیم کیوں رہے۔ اقبال سے انہیں کیونکر شرف نیاز حاصل ہوا۔ راس مسعود اور بیگم راس مسعود ان سے کس قدر شفقت فرماتے تھے وغیرہ۔

کوئی دو گھنٹے تک وہ تمام تفصیلات سناتے رہے اور ہم دونوں جیرت زده ان کی دلچسپ اور معلومات افزایا تیں سنتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا مختصر احوال قلم بند کر دیں تو عنایت ہو گی۔ اس طرح میری کتاب میں کچھ اور نئے واقعات کا اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ حسب وعدہ انہوں نے تحریری

یادداشتؤں سے مجھے نواز دیا۔

چودھری خاقان حسین بھی مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۳ء آپ اپنے چچا علی حیدر عباسی سابق وزیر صیغہ سیاسی ریاست بھوپال کے ساتھ مقیم رہے اور ان کی وسیع غیر آباد زمین کو قابل کاشت بنایا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس آپ کی ملاقاتیں ریاض منزل میں اقبال سے برابر ہوتی رہیں راس مسعود سے ان کے خاندانی تعلقات تھے اس لیے ریاض منزل میں وہ برابر آتے جاتے تھے۔ راس مسعود اور بیگم راس مسعود ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ آپ نے بتایا کہ راس مسعود کی دوسری بیگم امتہ امسعود عبدالرشید صاحب سابق وزیر ریاست انور کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا پہلا لڑکا فوت ہو گیا تھا۔ دوسری صاحبزادی نادرہ مسعود تھیں جن کی شادی پروفیسر شیداحمد صدیقی کے صاحبزادے ڈاکٹر احسان رشید سے ہوئی ہے۔

۱ افسوس کے ۱۹۴۷ء میں آپ کا انتقال ہو گیا

۲ سابق والیں چانسلر کراچی یونیورسٹی

اقبال سے بھوپال میں اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے چودھری خاقان حسین نے بتایا کہ ۱۹۳۵ء میں حڈاکٹر محمد اقبال بسلسلہ علاج بھوپال تشریف لائے اور ریاض منزل میں قیام کیا۔ اس بیگلہ کے نچلے حصہ میں مسعود صاحب کا دفتر ہاں بیٹھنے کا کمرہ کھانے کا کمرہ اور استقبالیہ کمرے تھے۔ اوپر کی منزل میں خواب گاہ کے کمرے تھے۔ ایک کمرہ کا رخ بھوپال کے مشہور بڑے تالاب کی جانب تھا۔ اور اسی سمت میں شملہ کوٹھی اور اردو گرد کی خوبصورت پہاڑیاں دور تک پھیل تھیں وہیں سے یاٹ کلب گھنے جنگلات اور شاداب پہاڑی سلسلے نظر آتے تھے۔ اسی کمرے میں سر محمد اقبال ٹھہرائے گئے تھے۔ جہاں ایک بڑا پینگ کچھ صوفے، چند کرسیاں ایک میز وغیرہ سلیقے سے رکھی تھیں۔ خصوصی نشست زیادہ تر اسی

کمرے میں ہوا کرتی تھی۔ سر محمد اقبال اپنے پلگ پر تشریف فرمائے ہوتے راس مسعود چا
صاحب علی حیدر عباسی ار میں دوسری نشتوں پر بیٹھتے۔ ان کا مخصوص حقہ پلگ کے دامنی
جانب رکھا رہتا اروان کا خاص ملازم علی بخش قالین پر قریب ہی بیٹھتا۔ اور وقتاً فوقاً حقہ کو
تازہ کرتا رہتا۔ علامہ اقبال برابر گفتگو کرتے رہتے ان کی گفتگوں کریوں محسوس ہوتا کہ جیسے
علم و حکمت کا دریا بہرہ ہا ہو گفتگو ہر موضوع پر ہوتی تھی۔ اکثر رات کے کھانے کے بعد ہم لو
گ ان کے کمرے میں جمع ہوتے اور دس گیارہ بجے رات ترک ان کی صحبت سے فیضیاب
ہوتے۔

ایک بار کھانے کا ذکر آیا تو آپ نے بے اختیار فرمایا کہ مسلم لیگ کے لکھنوا جلاس اکے
دوران جیسا کھانا راجہ صاحب محمود آباد نے کھلایا ہے ایسا تو شاید ہی پھر نصیب ہو۔ ہر
ڈیلیکٹ کے لیے یہ مختلف اور لذیز ترین کھانوں کے چھخوان دلوں وقت آتے تھے۔
ایک روز آپ نے اپنے سفر اپین کا ایک اچھوتا واقعہ سنایا جس کے پس منظر کا شاید ہی
کسی کو علم ہو۔ فرمانے لگے کہ لندن کے قیام کے دوران نواب صاحب بھوپال سے ملنے گیا
تو انہوں نے فرمایا اقبال اپین کیوں نہیں جاتے؟

میں نے عرض کیا کہ اگر میں بھی نواب بھوپال ہوتا تو اب تک ہو آیا ہوتا۔

بات آئی گی ہو گئی۔ دوسرے دن مجھے میرے ہول میں نواب صاحب کا ایک چیک چھ
ہزار روپے کا ملائم سمجھ گیا کہ یہ سفر کے لیے ہے۔ چنانچہ میں نے اخبار میں ایک سیکرٹری کا
اشتہار دیا۔ اور ایک موزوں لیڈی سیکرٹری انتخاب کر کے اس کو سفر کی تفصیلات بتائیں اور یہ
ہدایت کی کہ روانگی سے اختتام سفر تک وہ ان سے کوئی گفتگو نہیں کرے گی۔ چیک کی ساری
رقم اس کے حوالہ کر دی۔ اور سفر کے لیے روانہ ہو گا۔ وہ اس قدر کارگزار سیکرٹری ثابت ہوئی
کہ مجھے سفر میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس نے میری رہائش قیام اور سفر کا بہت ہی اچھا

انتظام کیا۔ اسی سفر کے دوران میری ایک نوٹ بک جس میں نئے اشعار اور چند نظمیں درج تھیں کہیں گم ہو گئی۔ بہت تلاش کیا لیکن دستیاب نہ ہو سکی۔ اس کالم کے گم ہونے کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

ایک شب آپ نے فرمایا کہ جب تک میں نے عربی زبان پر عبور حاصل نہیں کیا تھا۔ میرا علم ناقص تھا۔ عربی سیکھنے کے دوران میری ملاقات دہلی میں مقیم ایک عرب کے سفیر سے ہو گئی اور انہوں نے اپنی لائبریری کی تمام عربی کتب مجھے استفادہ کے لیے عنایت کر دیں جن سے میں نے بہت کچھ علم حاصل کیا۔

ایک دن ڈاک سے کسی جرمن دوست کا خط علامہ اقبال کو ملا جس کا مضمون انہوں نے مسعود صاحب کو سنایا۔ میں وہاں موجود تھا۔ اس خط کا ایک جملہ جو اس وقت کی یورپی سیاست سے متعلق تھا مجھے وہ یاد رہ گیا۔

۱-۲۔ ملاحظہ ہو دیا چہ شانی

The storm is in the air and
it is not long in breaking

میں جب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو ادب سے سلام کر کے بیٹھ جات اور گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر ہتا۔ ان کی اور مسعود صاحب کی بات چیت خاموشی سے سنتا رہتا۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت فرماتے تھے۔

چچا صاحب کی زمینوں کے سلسلے میں کچھ دن میں بھوپال سے باہر رہا۔ گھر لوٹا تو بیگم مسعود کا فون آیا اور انہوں نے فرمایا کہ علامہ اقبال دریافت کر رہے تھے کہ خاقان کئی دنوں سے کیوں ہیں آئے؟ میں نے عرض کیا کہ بھوپال میں نہیں تھا۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ اسی وقت ریاض منزل پہنچا اور علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر صحیح صورت حال سے انہیں مطلع

کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاض منزل کی وہ یادگار صحبتیں میرے لیے سرمایہ افتخار تھیں اور جب بھی وہ لمحے یاد آتے ہیں علامہ اقبال کی شفقت و محبت ان کا تجربہ علم ان کی انسان دوستی ان کا اعلیٰ کردار اور ان کی عظیم المرتبت شخصیت میری آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔

شیش محل کے قیام کے دوران بھی جب مجھے وقت مل جاتا ضرور حاضر خدمت ہوتا۔ اس قیام میں جاوید اقبال بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس وقت وہ بہت کم سن تھے۔ خود علامہ کی صحت پہلے سے کافی بہتر نظر آتی تھی۔ بھوپال کے تجربہ کار اور ماہر ڈاکٹر ان کے علاج کے لیے ہر ممکن توجہ صرف کر رہے تھے۔ اروانہ میں تھوڑا بہت فائدہ بھی ہو گیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ۱۹۳۶ء کے بعد چند روز چند حالات کی بنا پر وہ پھر بھوپال نہ آ سکے۔

بھوپال کے ایک اور ادیب مسح صدیقی جو اقبال کے نیازمندوں میں شامل ہیں خوش قسمتی سے مجھے کراچی میں مل گئے۔ انہوں نے اقبال کے متعلق جو واقعات سنائے ان کی نوعیت نہایت دلچسپ ہے۔

مسح صدیقی ۱۹۵۷ء میں پاکستان آ گئے تھے۔ قیام پاکستان کے قبل وہ بھوپال کے واحد معیاری ہفت روزہ ندیم سے وابستہ رہ چکے تھے۔ اور ان کے متعدد مضامین ہفت روزہ ندیم اور بیرون بھوپال کے ممتاز جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔

اقبال سے ملاقاتوں کے سلسلے میں آپ نے بتایا کہ میرے والد معظم رسول صدیقی اقبال کے خاص نیازمندوں میں تھے اور میری حقیقی پھوپھی مذہبی جمین خمار بھوپال کی ایک ممتاز شاعر تھیں اور اقبال کی پرستار۔ ان کا کلام شائع ہو کر ہر طبقہ سے خراج تحسین وصول کر چکا تھا۔ وہ اردو عربی اور فرنسی میں کامل دستگاہ رکھتی تھیں..... سر راس مسعود نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر بھوپال کے مشہور سلطانیہ گرلز سکول میں بحیثیت مدرس ان کا تقرر کر دیا تھا۔ جب بھوپال میں آل انڈیا مشاعرے ہونے لگے تو ان کی غزلیں بھی مشاعرے می

ل سنائی جانے لگیں اور خوب مقبول ہوئیں۔ اس دور میں پرودہ کا سخت رواج تھا۔ مہ جبین خمار بھی پرودہ کرتی تھیں۔ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئی اور مشرقی پاکستان منتقل ہونے کے بعد ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔ ان کے کلام میں اسرار و رموز فطرت اور فلسفیانہ فکر ملتی ہے۔ ان کا غیر مطبوعہ مرثیہ جوانہوں نے اقبال کی وفات کے فوراً بعد لکھا تھا۔ اور ان کے مسودات میں محفوظ تھا۔ گزشتہ صفات میں شامل ہے۔ مسح صدیقی نے بیان کیا ہے کہ جب اقبال بھوپال آ کر شیش محل میں وارد ہوئے تو بھوپال والوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ علامہ اقبال کو بھوپال اور بھوپالیوں سے جس قدر خلوص اور محبت اور قلبی لگاؤ تھا ان کی ایک دونبیں ان گنت مثالیں موجود ہیں۔ آپ کے تعلقات صرف فرمائ روائے بھوپال اور عماندین ریاست ہی سے نہیں بلکہ بھوپال کے عام لوگوں سے بھی پیدا ہو گئے تھے شیش محل کے دوران قیام ہر شخص ان سے بلا روک ٹوک ملنے جاتا تھا۔

سر زمین بھوپال ہمیشہ سے صاحبان علم و فضل کی آماج گاہ رہی ہے۔ اران کے قدم میمنت لزوم سے سرفراز ہوتی رہی ہے۔ بالخصوص دور حمیدی میں بر صغیر کی مشہور معروف ہستیاں کسی نہ کسی سلسلے میں بھوپال سے وابستہ رہی ہیں اور یہ انہیں کافیض تھا کہ مقامی حضرات میں علوم و فنون کے حصول کا شوق پیدا ہوا اور پروان چڑھا جس کے نتیجہ میں بھوپال نے ہندوستان گیر شہرت رکھنے والی شخصیتیں پیدا کیں۔

میرے والد معظم رسول صدیقی کو بھی علم و ادب سے گہرالگاؤ تھا۔ اور ان کا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق علامہ سلیمان ندوی، سر سید راس مسعود اور مولوی عبدالرزاق مصنف البر امکہ وغیرہ سے والد صاحب کے خصوصی تعلقات تھے۔ وہ اکثر و بیشتر ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ علامہ اقبال سے بھی انہیں دلی عقیدت تھی۔ جب وہ بھوپال آنے لگے تو یہ جذبہ عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ

گیا۔ اور وہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ اقبال آخری بار شیش محل میں قیام فرمائے تھے میری عمر کوئی چودہ سال کی تھی اروآٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ علامہ اقبال تشریف لئے ہیں ان سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے بھی ساتھ لے چلیے وہ تو ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ میں بھی ان کا نیاز حاصل کرلوں گا چنانچہ والد صاحب کے ساتھ ایک شام کو ہم شیش محل پہنچے اور علامہ اقبال سے شرف نیاز کی سعادت نصیب ہوئی۔

اس سے قبل والد صاحب کے ہمراہ میں راس مسعود سر سید لیاقت علی اور شعیب قریشی وغیرہ کے دولت کدوں پر حاضر ہو چکا تھا۔ اور ان حضرات کی شاہانہ زندگی کا منظر دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ علامہ اقبال بھی اسی شان اور کروفر کی زندگی بسر کرتے ہوں گے لیکن جب ان کے کمرے میں پہنچا تو حیران رہ گیا۔ اور میرے تصورات کا تانا بانا ٹوٹ گیا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سادہ سی مسہری پر علامہ اقبال کا گاؤں تکنیکے سہارے سادہ تمیص شلوار میں ملبوس تھے۔ حقہ ان کے پاس رکھا ہے۔ گاؤں تکنیکے آس پاس کچھ کتابیں رکھی ہیں۔ اللہ اللہ کیا نظارہ تھا۔ اور قلم بھی وہیں موجود ہے۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور چند گدے دار کر سیاں رکھی ہیں۔ اللہ اللہ کیا نظارہ تھا۔ اتنا عظیم انسان اور اس حد تک سادگی پسند۔ سلام کر کے ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے اور والد صاحب نے مزاج پر سی کے بعد نہایت ادب سے عرض کیا کہ ان کی چھوٹی بہن مہ جبین خمار کو بچپن ہی سے اعری کا شوق ہے اور وہ آپ کے کلام کی پرستار ہی نہیں بلکہ آپ سے متاثر ہو کر بیشتر نظمیں بھی کہتی ہے اسے اسرار و موزفطرت سے بہت لگاؤ ہے۔ اگر آپ اجازت دین تو ان کی ایک نظم سناؤں تاکہ آپ اپنے قیمتی مشوروں سے نواز دیں۔ وہ اپنا مجموعہ کلام شائع کرانا چاہتی ہے۔

علامہ نے بخوبی نظم سنانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ والد صاحب نے وہ نظم
سنائی جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

نظمت عقل کا فرما جہاں کے نظم و نق کے انز
تمام عالم کی حکمرانی اسی کے سيف و درق کے اندر
بصارت عقل نکتہ میں ہے ساعت عقل رمز شنوا
نئے نئے راز پا لیے ہیں زمیں کے ہر ہر طبق کے اندر
یہ بخوبی ذخیر کے تموج میں شور قطروں کا سن رہی ہے
شکوہ ذریعوں کا دیکھ لیتی ہے وادی لق و دق کے اندر
ضیا کے آثار ڈھونڈتی ہے یہ ظلمت شب کی تیرگی میں
فروع ماہ جبیں کی جو یالغس کے اندر غصہ کے اندر
یہ زندگی پاشیوں سے واقف فضائے ہستی پہ مہر کی ہے
فیوض باراں سے کشت سر بسراز دیکھتی ہے زحق کے اندر
کشاکش انزوں سے اپنی جو ہر مہیا کو کھینچتی ہے
طلب کی قوت یہ مانتی ہے ضرورت مستحق کے اندر
حقیقت انقلاب سے یہ حسوس کو آگاہ کر رہی ہے
بہار کی لالہ کاریاں ہیں خزان کے کہنہ خلق کے اندر
سنی نوائے سروز اس نے منازل ارتقا کی جانب
کتابت فطرت میں جا چکتی ہے نکات اپنے سبق کے اندر
رہ ترقی پہ گام فرسا ہوئی مگر فطرت فطانت
یہ دیکھتی ہے فراز و پستی ہر ایک سهل و ادق کے اندر

نداق کی اہمیت کو تسلیم کر چکی ہے عقل نکتہ پورا!
دجائے شب میں فروغ ظلمت سحر کی رونق فلق کے اندر
ہیں کارفرمائیاں ہمیشہ نظامِ فطرت کی ضابطے میں
عطای ہوئی جذبہ نظر کو حس بصارتِ حق کے اندر
اٹرجو ماحول کا ہے اس کو فراست فہم مانتی ہے
ہوئی ہے ماحول میں نبی کے ہوا کی خلقتِ حق کے اندر
نگاہِ منظر پر ست کو دے چکیں مگر دعوتِ نظارہ
مچل کے شام و سحر کی رعنائیاں حجابِ شفقت کے اندر
چھپے ہوئے رازِ روزِ روشن سحر کی تابندہ طلعتوں میں
بہار کا جلوہ نگاریں گلوں کے رنگیں ورق کے اندر
نہ ہو گا خورشیدِ علم لامعِ خیال میں تابشیں نہ ہوں گی
تضرمِ آٹھی کی شوکت رہ نمایاں حرث کے اندر
قوائے علمی کی پورش کو غذاۓ درسِ جدیدِ فطرت
اگر کتابوں میں عقلِ الجھی گرے گی قصرِ حمق کے اندر
کتابتِ فطرت کے سارے اوراقِ منتشر کو کرے فراہم
رہے قوائے خردِ جہادِ شعور میں بطلِ وحق کے اندر
بساطِ جدیدِ فطرت اگر بچھی ساحتِ جہاں پر
حوالہ رفتت کی چیرہ دستی کمند ڈالے گی لامکاں پر
علامہ اقبال نے نظم سن کر پسند فرمائی اور کہا کہ شاعرہ کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ آگے
چل کر بلند مقامِ حاصل کرے گی۔

میر امشورہ یہ ہے کہ آپ اسرار و رموز فطرت سے متعلق تمام کتابوں کو یک جا کر لیں اور دیگر موضوعات کی نظمیں علیحدہ ترتیب دے دیں اس طرح شاعر کی فکر کا صحیح طور پر احاطہ کرنا آسان ہوگا۔

مسح صدیقی کہتے ہیں کہ علامہ کی باتیں مجھے آج تک یاد ہیں اور یہ تاثر آج بھی دل پر نقش ہے کہ اگر علامہ کا بھوپال سے تعلق پیدا نہ ہوتا تو بھوپال کے شعرا ی میں ڈنی اور فکری انقلاب اتنی جلد و نمانہ ہوتا۔ بھوپال میں تو ہمیشہ سے غزل اور قصیدے کا رواج چلا آرہا ہے لیکن علامہ کی شاعری نے جہاں پورے ہندوستان کے شعرا کو متأثر کیا ہے وہیں بھوپال کے ذی شعور شعرانے بھی ان سے گھرے اثرات قبول کیے ہیں۔

اقبال کے بھوپالی نیازمندوں کی تلاش کے دوران چند اور نامکمل اور ادھورے واقعات کا بھی علم ہوا ہے کاش تفصیلات بھی فراہم ہو جاتیں۔

بھوپال کے جواں سال محقق شیم احمد کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انہوں نے ایک تفصیلی خطہ میں لکھا کہ بھوپال کے ایک بزرگ استاد کا پتا چلا ہے جو علامہ اقبال کے صاحزادے جاوید اقبال کو شیش محل میں پڑھانے آتے تھے علاوہ ازیں علامہ اقبال شام کے وقت کملا پارک ۲ کی طرف چھل کدمی کرنے جایا کرتے تھے۔ وہاں اکثر ایک صاحب سے جنہیں کشتی رانی کا شوق تھا علامہ کی برابر ملا تائیں ہوتی تھیں۔ ایک صاحب بھوپال میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے کلام پر علامہ اقبال سے اصلاح لی ہے۔ نیز مولینا شعری بھوپالی کے پاس ضرب کلیم کا وہ نسخہ ہے جو علامہ اقبال نے اپنی تحریر اور دستخط سے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ ایک اور صاحب محمود الحسن سابق ایگری کیلیو آفیسر میونسل بورڈ سیہو (بھوپال) کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ علامہ اقبال کی پرائیویٹ اور خوبی بیٹھگوں میں شرکت کرتے تھے۔ وہ اقبال کی سیرت کے بہت سے گوشوں سے واقف ہیں اور انہیں اقبال کے بہت

سے لٹائے یاد ہیں۔ ان کے متعلق پتا چلا ہے کہ اب سیہو بھوپال میں نہیں ہیں۔ شاید پاکستان میں ہوں۔ اگر پاکستان میں ہوئے تو پتا لے کر بھیج دوں گا۔ افسوس کہ شیعیم احمد تعلیم ختم کر کے اور نگ آباد کے کسی کالج میں پیغمبر اہو کر چلے گئے۔ اور یہ تشنہ اطلاعات تشنہ ہی رہ گئیں۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ جاوید اقبال کے استاد کا نام کیا ہے؟ نہ کملہ پارک کے ان صاحب کا پتا چلا جنہیں کشتی رانی کا شوق تھا اور جن کی اقبال سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یہ اطلاع بھی راز ہی رہی کہ نواب صاحب کو بھوپال بھیجا ہوا ضرب کلیم کا خاص دستخط نسخہ مولینا شعری کے ہاتھ کس طرح لگا۔ محمود احسن کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی وہ بھوپال چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ کوئی اور محقق ان امور کی چھان بین کر سکے۔

ابراہیم یوسف بھوپال کے ممتاز نوجوان ادیبوں اور افکار کے قلمی معاونین میں سرفہرست ہیں۔ اپنی کتاب کے سلسلے میں انہیں بھی توجہ دلائی۔ وہ بھوپال سے باہر تھے۔ کافی مدت کے بعد مجھے ان کا جواب ملا۔ اس خط میں اقبال سے متعلق سرسری اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔ خط بنام رقم الحروف مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۳۶ء

۲۔ بھوپال کی ایک مشہور تفریق گاہ

ان کے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”.....اقبال کے متعلق عبدالقوی صاحب کا مقالہ تم کو مل گیا اچھا ہوا۔ وہ تمہارے کام میں ضرور مددے گا مگر موضوع کے لحاظ سے شاید عبدالقوی صاحب نے زیادہ انصاف نہیں کیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اقبال اور راس مسعود کے ذاتی تعلقات پر زیادہ زور دیا

ہے۔ ویسے میرے ذاتی علم میں ہے کہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو
میرے والد کے استاد کے ہاں جو فقیر ائمہ زندگی پر کرتے آئے تھے
اقبال بذات خود آیا کرتے تھے۔ اور کئی کئی گھنٹے ان کے گھر گزارا
کرتے تھے چونکہ میری عمر اس وقت بہت کم تھی ممکن ہے چوتھی یا
پانچویں جماعت میں رہا ہوں۔ چونکہ مولوی صاحب درویشانہ زندگی
گزارتے تھے اس لیے ممکن ہے کہ اقبال کا تعلق اس سلسلے میں ان
سے رہا ہو۔ بھوپال جانے پر والد صاحب سے اس سلسلے میں
معلومات حاصل کروں گا۔ ممکن ہے وہ کوئی کام کی بات بتا سکیں۔
اگر کوئی بات معلوم ہو گئی تو تم کو لکھوں گا۔ لیکن جہاں تک اقبال کا
مولوی صاحب کے یہاں آنے جانے کا سوال ہے یہ مسلم ہے کہ
کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ خود اقبال کو ان کے گھر
پر دیکھا تھا۔ مگر بچپن کے نقوش ہیں جو اس قدر دھوئندے ہو گئے ہیں
کہ ان کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

عبد القوی نے شاید اس سلسلے میں کوئی معلومات حاصل کرنے
کی کوشش نہیں کی۔ صرف راس مسعود اور نواب بھوپال سے ان کے
تعاقبات کا ذکر کر کے چھوڑ دیا،

لیکن اس نامکمل رواداد کی کوشش کے باوجود مجھے مزید تفصیل نہ مل سکی کیونکہ ابراہیم
یوسف اس جگہ سے کہیں اور تبدیل ہو گئے اور جب میرے خطوط بھی ان کے پتے سے لوٹ
آئے تو صبر کرنا پڑا۔

اقبال اور بھوپال کی اشاعت کے بعد بھوپال کے ممتاز ادیب و شاعر حبیب فخری نے

جو گورنمنٹ کا نجی شینخو پورہ میں اردو کے استاد تھے مجھے لکھا کہ پنجاب کے ملک محمد اشرف نے اپنے زمانہ قیام بھوپال میں علامہ اقبال کی مشہور نظم امیں کی مجلس شوریٰ کا انگریزی ترجمہ اور اس پر حواشی لکھئے تھے۔ میری درخواست پر انہوں نے محمد اشرف صاحب سے رابطہ قائم کیا اور اشرف صاحب نے مجھے اپنی کتاب کا دوسرا ایڈیشن عطا فرمادیا۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ یہ کتاب پہلی بار دی ڈیلوز کا نفرنس کے نام سے ۱۹۳۶ء میں اور دوسرا ایڈیشن دس کفر ڈستیان کے عنوان سے نظر ثانی اور اضافے کے بعد ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ یہی نسخہ محمد اشرف نے گجرات سے مجھے ارسال فرمایا۔ اس ایڈیشن میں جہاں اطالوی پروفیسر بوسانی کی رائے سر شیخ عبدالقدار مرحوم کا تعارف اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا پیش لفظ شامل تھا وہیں بھوپال کی بعض مقتدر شخصیتوں کی آراء بھی شامل تھیں جن میں علامہ موسیٰ جاراللہ (جو بھوپال میں نظر بند تھے) علامہ سید سلیمان ندوی (قاضی ریاست بھوپال) اور مولانا سہما مجددی (جو آخر عمر میں مستقل قیام کے لیے لاہور سے بھوپال آگئے تھے) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ محمد اشرف نے اپنا مکمل پتا نہیں لکھا تھا اور اپنی کتاب بھی عجیب فخری کے توسط سے مجھے بھیجی تھی اس لیے افسوس کہ برادر راست ان سے ربط و تعلق اور مزید معلومات نہ حاصل ہو سکیں لیکن اسی ایڈیشن کے پہلے پیش لفظ میں نومبر ۱۹۳۶ء میں انہوں نے بھوپال کی ایک معزز شخصیت سید زاہد علی جعفری کے خصوصی تعاون کا شکریہ ادا کیا تھا جن پر بھوپال کے مشہور بزرگ اور ادیب محمد احمد سبزواری سے میں نے جعفری صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ جعفری صاحب تو کراچی ہی میں رہتے ہیں ان کا پتا معلوم کر کے تفصیل بتاؤں گا۔ چند روز کی تلاش کے بعد جعفری صاحب سے ملاقات ہو گئی ارو جب انہیں محمد اشرف کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن دکھایا تو انہوں نے اس کے پس منظر میں تفصیل سے اظہار کیا تو خیال فرمایا جس کا لب لباب یہ ہے کہ محمد اشرف بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ

بھوپال آگئے تھے۔ ان کے والد ملکہ پی ڈبلیوڈی میں ایس ڈی او تھے محمد اشرف نے ابتدا بھوپال کے پبلیٹی آفس میں ملازمت کی جہاں جعفری صاحب بھی ملازم تھے۔ بعد میں دونوں نے یہ ملازمتیں چھوڑ دیں۔ اشرف صاحب نے کچھ عرصے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں کام کیا اول میں ۱۹۳۲ء میں ان کو یہ کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور زاہد صاحب کے مشوروں سے انہوں نے بھوپال کی مشہور حمیدیہ لاہوری یہی اور دیگر لاہوری یوں سے استفادہ کے بعد اپنے مسودے پر موی جاراللہ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا سہما مجددی سے آراء حاصل کیں اور یہ مسودہ لے کر ۱۹۳۵ء میں لاہور واپس آگئے اور کتاب کا پہلا ایڈیشن انگریزی کتابوں کے مشہور پبلیشر محمد اشرف نے ۱۹۳۶ء میں شائع کر دیا۔

جعفری صاحب کے بقول پہلے ایڈیشن میں علامہ اقبال گوئے دانتے ڈارون چنگیز خان کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ دوسرا ایڈیشن جسے بک ہاؤس لاہور نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا ہے اس میں یہ تصاویر شامل نہیں ہیں۔

حبيب فخری کی اطلاع کے مطابق بھوپال کے ایک اور نوجوان عربی کے سکالر تھے۔ ابوالنصر احمد الحسینی نے مصر کے مشہور علمی و ادبی ماہنامہ المقتطف میں علامہ اقبال کی وفات کے بعد ۱۹۳۸ء میں انکی فنی عظمت کے مختلف پہلوؤں پر تین طویل مقامی عربی میں تحریر کیے تھے جو شائع ہو کر عرب دنیا میں کافی مقبول ہوئے۔ رقم الحروف نے المقتطف کو کراچی لاہور حتیٰ کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی تلاش کرایا لیکن اس کی فائل دستیاب نہ ہو سکی۔ آئندہ شاید بھوپال کا کوئی محقق اسے ڈھونڈ نکالے۔

کتاب کی نظر ثانی کے دوران ہی حمید الدین شاہد نے کراچی کے ماہنامہ ”سب رس“ کا جنوری ۱۹۷۸ء میں اجر اکیا اور پہلے شمارے کو اقبال نمبر کی صورت میں پیش کیا تو خود محمد احمد سبزواری کو اپنا فرمودش اور گم کردہ مضمون شاعر باکمال دستیاب ہو گیا جو انہوں نے علامہ

اقبال کی وفات کے فوراً بعد لکھا تھا۔ اور ماہنامہ سب رس حیدر آباد دک کو بھیج دیا تھا۔ جس کے نگران مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم اور مدیر صاحبزادہ محمد علی خاں میکش مرحوم تھے۔ یہ مضمون پہلی بار ماہنامہ سب رس حیدر آباد دکن کے اقبال نمبر میں شمارہ جوں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ جسے سب رس حیدر آباد دکن نے اقبال کی شائع کیا ہے۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد بھوپال کے اہل قلم اور بھوپال سے کسی عنوان ربط و تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کی متعدد تخلیقات ہندوستان کے مختلف رسائل میں بکھری ہوئی ہیں۔ بھوپال کے ناقدین اور محققین کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسی تمام تخلیقات کو تلاش و تحسس کے بعد سمجھا کر کے کتابی صورت میں محفوظ کر دیں۔

بھوپال میں مقیم چند نیازمندوں کا مختصر احوال عبدالقوی دسنوی نے بھی اپنے دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

”..... پروفیسر محمد زیر صدیقی صدر شعبہ عربی حمیدیہ کالج بھوپال کا بیان ہے کہ علامہ اقبال نے جس شیش محل میں آکر قیام کیا تو وہ آٹھویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے علامہ کو جو سرکاری موڑ ملی تھی اس کے ڈرائیور جسم حیدر تھے۔ وہ زیر صاحب کے ملاقاتی تھے۔ چنانچہ وہ سکول سے واپسی پر اس موڑ میں بیٹھ جاتے تھے۔ اتفاق سے ایک روز ڈاکٹر صاحب مکان سے باہر آئے غالباً وہ شملہ کی طرف جا رہے تھے انہیں دیکھ کر جسم حیدر نے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ جسم حیدر نے بتایا کہ قاضی صاحب کا پوتا ہوں ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ بھٹک لیا اور دریافت کیا کہ کیا پڑھتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ عربی پڑھتا ہوں تو انہوں نے عربی کی گردان

پوچھی اور مختلف قسم کے سوالات کیے۔ زیر صاحب کا بیان ہے کہ اکثر اس کے بعد اس طرح علامہ سے ملاقات ہوتی رہی۔

جناب حکیم قمر الحسن صاحب چیف ایڈیٹر روزنامہ ندیم بھوپال فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں اقبال کا قیام شیش محل میں تھا وہ حکیم اولاد حسین صاحب کے ساتھ علامہ سے ملنے گئے۔ حکیم اولاد حسین قمر الحسن صاحب کے رشتے کے بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ وہ پانی کے علاج سے کافی تجربہ کرتے۔ علامہ ان سے طبعی مشورہ چاہتے تھے۔ چنانچہ کچھ دیر تک تو علاج کے سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد حکیم اولاد حسین صاحب نے قمر الحسن صاحب کا تعارف کرایا اس وقت قمر الحسن صاحب کی عمر مشکل سے باسیں سال ک ہو گئی علامہ نے ان سے مختلف سوالات کیے اور دریافت کیا کہ کیا لکھتے ہو۔ اس زمانے میں حکیم قمر الحسن صاحب افسانے اور انشائیے لطیف لکھا کرتے تھے۔ یہ وزمانہ تھا جب نئی پوڈیگور کی انتشار پردازی سے متاثر تھی۔ چنانچہ جب انہیں معلوم ہا کہ حکیم صاحب کو افسانے اور انشائیے نظیف کا شوق ہے تو فرمایا کہ انشائیے لطیف بے مقصد چیز ہے۔ نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ کوئی صحت مندا اور تعمیری ادب پیش کریں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ طلبہ کو چاہیے کہ پہلے علم حاصل کریں اس لیے کہ بغیر اچھے علم کے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔

ممnon حسن خاں صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک بار علامہ اقبال نے سر راس مسعود سے کہا کہ حیدر آباد میں اردو یونیورسٹی قائم

ہو چکی ہے۔ آپ کا تعلق مہاراجہ انور سے ہے آپ کوشش کیجئے کہ انور ہندی یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ سر راس مسعود نے علامہ کی یہ بات بہت پسند کی اور کہا کہ بھوپال میں ہر جمعہ کو انور اور اجین سے سنگھرتوں اور ہندی کے علماء آتے ہیں اروآپس میں تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ یہاں ترجمہ کا کام بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ میکھ دوت کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اب کالیداں اور مشہور ڈرامہ شکنٹلا کے ترجمہ کا کام ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔

علامہ بھوپال میں تعلیم کے خواہاں تھے۔ انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ سر راس مسعود یہاں وزیر تعلیم ہیں اور اس لیے امید کرتے تھے کہ یہاں تعلیم عام ہو گی۔ وہ نواب صاحب سے بھی خوش تھے اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ نواب صاحب اچھے دل اور روشن دماغ حکمران ہیں اس لیے انہیں امید تھی کہ قوم اور ملک کو ان کی زات سے فائدہ پہنچے گا۔ بھوپال کے مایناز مصور جناب عبدالحليم انصاری جن کی کوئلہ کی بنائی ہوئی تصویر ہم اس مقالہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے دوران قیام بھوپال دوبار ملے۔ چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ علامہ محمد اقبال سے پہلی مرتبہ سر راس مسعود مرحوم کے یہاں ریاض منزل میں ملاقات ہوئی دوسری مرتبہ وہ شیش محل میں مقیم تھے۔ چونکہ سر راس مسعود نے خاص طور پر انہیں علامہ اقبال کے کمرے میں لے جر کر تعارف کرایا تھا اس لیے علامہ نے بھی خاص التفات فرمایا۔ چنانچہ عبدالحليم انصاری صاحب جب علامہ سے ملنے

کے لیے شیش محل گئے تو انہوں نے شلوار قمیص پہنے پلٹک پر بیٹھا پایا۔

حقہ سامنے رکھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر فرمایا:

سر راس مسعود نے آپ کے بارے میں کئی پسندیدہ باتیں بتائی ہیں۔ میں چونکہ ان کے مزاج سے واقف ہوں اس لیے آپ کو اچھی طرح سمجھا اور خوش ہوا۔

عبدالحیم انصاری صاحب نے کہا:

آپ سے شرف نیاز میرے لیے اعزاز ہے اور خوش نصیبی بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ مجھ کو آرت کے متعلق بہت سے مسائل سمجھنا اور بہت سے مراحل حل کرنا ہیں منزل عرفان کے۔ اتنی باتیں انہوں نے بڑی جسارت کے ساتھ کہی تھیں۔

علامہ اقبال نے دریافت کیا آپ کا سمجھیکٹ کیا ہے؟

عبدالحیم صاحب نے جواب دیا: فطرت کشی اور مطالعہ فطرت اور یہ بھی کہا کہ میں عام آرٹسٹوں کی طرح فطرت کو پینٹ ہی نہیں کرتا بلکہ اسے پڑھتا بھی ہوں۔ فطرت میرے نزدیک ایک کتاب ہے جسے الہامی جس کے مطالعہ سے روشنیاں حاصل ہوتی ہیں۔ الہام و عرفان کی رموز و نکات واشگاف ہوتے ہیں علوم و فنون کے۔ حلیم صاحب فرماتے ہیں کہ میرے خیالات سے علامہ نے دلچسپی لی اور فرمایا کہ آپ نے دلچسپ نظریہ پیش کیا ہے۔ میں چونکہ آج کل معجلین کی ہدایت کا پابند ہوں اس سے پھر باتیں کروں گا۔

اس زمانے میں علامہ بھلی کے علاج کا ایک خاص کورس پورا کر

رہے تھے اس لیے عبدالحکیم صاحب نے بھی احتیاط بر تی۔ اگرچہ انہیں اس کا بہت افسوس ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس وقت کچھ موقوع حاصل ہو جاتے تو اس دیدہ و رکی بدولت تھائق و معارف کے بہت سے سربستہ راز وا ہو جاتے۔ الوان فطرت کی تعلیم و تشریح آیات فطرت کی نگارش و اشاعت اور ایک نئے اسلوب و انداز سے عمل میں آتی ہے۔ جس کے سبب انسان آرٹ ار و فطرت کے قدیما اور روحانی رشتہ کو سمجھ سکتا ہے اور ان کے الہامی پیغام کو جان سکتا۔

میں نے جب دریافت کیا کہ علامہ سے ملاقات کا اس قدر اشتیاق کیوں تھا تو انہوں نے فرمایا۔ اس لیے کہ مجھے ایسے عارف کامل کی تلاش تھی جس کے پاس تنخیر کائنات کا عمل بھی ہو اور وہ واقف اسرار ازال بھی ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر اور حصول زندگی کی خاطر ذوق و وجدان کو بھی ساتھ لی جستجو کی منزل پر تھا۔ علامہ اقبال سے ملنے کے لیے اس لیے بھی میراجذبہ شوق مچل رہا تھا کہ وہ فن کا نقاد اور قدردان تھا۔ قدردان وہی ہو سکتا ہے جو نقاد بھی ہو سچا۔ سچا نقاد وہی ہو سکتا ہے جو ماہر ہوفن کا عدل و انصاف کی صداقت رائے کا مظہر ہو۔ چونکہ وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھا اس لیے اس نے فن کی تخلیق نہ نمود و مجزہ فن سے تعبیر کیا ہے:

مجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود
جہاں وہ ایک اچھا نقاد فن کا رہتا۔ اچھا سازندہ فطرت بھی تھا۔
اس لیے میں نے بربط قلب پر اسے کچھ راگ سنائے تھے اور یقین

اور اعتماد پر

جس روز دل سے رمز مغنى سمجھ گیا
سمجو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے
علامہ سے ملاقات کی دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ وہ فطرت
اور آرٹسٹ کے فطری تعلق اور روحانی رشته کو سمجھتا تھا۔ دونوں کے
مزاج اور مذاق سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ فطرت اپنی جگہ پر
حسین ہے بے شک لیکن اس کو حسین سے حسین تر بنانے والا آرٹسٹ
ہے اسی لیے اس نے کہا بھی:

آں ہنر مندائے کہ برفطرت فزدو
راز خود را بزنگاہ ماکشود
اقبال رمز ہائے فطرت کا امین و معمتمد تھا اور ترجمان فطرت بھی
جس نے بہ پاس اعتماد و دیانت بہت سی چیزیں مصلحتاً رمز و کنایہ میں
ادا کی ہیں اور اپنی اس مصلحت کو ظاہر بھی کیا ہے یہ کہہ کر:
حدیث خلوتیاں جزبہ رمز و ایما نیست
اقور جب میں نے دریافت کیا کہ آپ نے علامہ اقبال کی
تصویر کس جذبہ کی وجہ سے بنائی تو انہوں نے جواب دیا کہ علامہ
اقبال کے قیام بھوپال کے دوران جتنا اشتیاق ملاقات تیز ہوتا گیا
جذبہ عقیدت بھی اتنا ہی بڑھتا گیا۔ اسی نے میرے دل میں علامہ کی
تصویر بنانے کی بناڑا لی جس کی وجہ سے میں نے اپنے عقیدت کیشی کو
قلم کاری کے ذریعہ ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا جو شیبہ اس وقت مقالہ کی

زینت ہے وہ قلم مصور کا نقش عقیدت ہے۔

۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں صفحہ ۳۹ تا ۴۳

عبدالحليم انصاری بھوپال کے ماہی ناز آرٹسٹ ہی نہیں بلکہ ان کا شمار ممتاز اہل قلم میں بھی ہوتا ہے۔ ان کے مضامین ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں افکار کے جوش نمبر پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۵۹ء میں انصاری صاحب کا معمر کہ آرامضمن جوش ملچ آبادی پر جب شائع ہوا تو مجھے کئی تعریفی خطوط ملے انصاری صاحب کو میں نے بھی توجہ دلائی کہ وہ اتنی اچھے آرٹسٹ ہیں۔ مجھے راحت منزل ریاض منزل اور شیش محل کی تصاویر نہیں مل رہی ہیں۔ میرے دیرینہ رفیق اور مشہور ادیب رشدی ایڈیٹر روزنامہ افکار بھوپال تلاش کر رہے تھے۔ کیا اچھا ہو کہ آپ اپنے موقلم سے ان عمارتوں کا نقش ابھار دیں۔ تاکہ میں انہیں کتاب میں محفوظ کر دوں۔ کیونکہ یہی وہ شاہانہ عمارتیں ہیں جن کو شاعر مشرق کی سکونت کا شرف نصیب ہوا تھا۔ عبد الحليم انصاری نے وعدہ کیا اور اپنی سی کوشش بھی کی لیکن افسوس کہ اپنی شدید علالت اور چند روزوں کی بنا پر وہ مجھے زیر بحث عمارتوں کی قلمی تصویریں نہ بھیج سکے۔ البتہ اپنی کولڈ سے بنائی ہوئی تصویر کو شامل کتاب کرنے کی بخوبی اجازت دے دی۔ یاٹ کلب بھوپال کا ایک غیر مطبوعہ نگین کارڈ جو انصاری صاحب کے موقلم کا شاہہ کار ہے۔ دوران خط و کتابت انہوں نے مجھے بھیج دیا تھا۔ جو اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ بہت خوبصورت جگہ ہے اور اقبال اکثر سیر کرنے کے لیے یاٹ کلب جایا کرتے تھے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے۔

بھوپال کے ایک اور ماہی ناز فرزند اور بلند پایہ ادیب ڈاکٹر محمد یوسف صدر شعبہ عربی جامعہ کراچی کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنہیں اقبال سے قیام بھوپال کے دوران شرف نیاز حاصل نہ ہو سکا لیکن انہوں نے اقبال کے فکر و فن سے استفادہ بھی کیا اور ان پر کئی یادگار

مضامین بھی لکھے اردو عربی اور انگریزی میں تحریر کیے جو لاہور کراچی اور قاہری کے مقدار ادبی
جرائم میں شائع ہو کر کافی پسند کیے گئے۔

کراچی میں ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر سید محمد یوسف نے ان خطوط کی نشان دہی
فرمائی جنہیں منون حسن خاں صاحب نے شیخ عطا اللہ مرتب اقبال نامہ کو علی گڑھ بھیجے تھے۔
اقبال نامہ میں وس خط منون حسن خاں کے نام ہیں چوبیس خط راس مسعود کے نام تین خط
لیڈی مسعود کے نام اور ایک خط راس مسعود کا اقبال کے نام شامل ہے۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف ۱۹۱۶ء میں بمقام بھوپال پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال میں
حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے وہیں سے عربی میں ایم ایس اور پھر پی ایچ ڈی کی
ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے بعد قاہرہ چلے گئے کئی سال تک قاہرہ میں رہے پھر سیلوں کی
یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ اور ۱۹۵۹ء میں کراچی آگئے اور کراچی یونیورسٹی سے فسک ہو
گئے جب سے یہیں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اقبال نامہ کے خطوط کی تفصیلات اقبال
سے عقیدت مندی بھوپال سے ربط تعلق کے بارے میں جب میں نے ان سے متعدد
سوالات کیے تو انہوں نے بیان کیا کہ میرا بچپن بھوپال میں گزر اجہاں میرے والد احسان
حسین مرحوم الگرینڈ ریٹریٹری ہائی سکول کے ہیڈ ماستر تھے اور نواب حمید اللہ خاں کی
شہزادیوں کے اتنا لیق تھے۔ اس وقت یہ ہائی سکول بھوپال کا سب سے بڑا علمی ادارہ تھا
بھوپال کے تمام بچوں کی طرح میں نے بھی اسی سکول میں تعلیم پائی۔ سکول سے باہر والد
مرحوم نے عربی فارسی کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا اور جس کے نتیجے میں میرا شعر و ادب کا شوق
سکول کے ساتھیوں کی بہت ترتیز تر ہو گیا۔ جب ذرا استعداد پیدا ہوئی اور ذوق آگے
بڑھا تو شکوہ اور نالہ پیتم کی گونج کان میں پڑی۔ اقبال سے ایک سکول کے طالب علم کا یہ
پہلا تعارف تھا۔ دینی علوم سے واقفیت حاصل ہوئی تو اقبال سے عقیدت بڑھ گئی۔ اقبال

کے کلام نے یہ یقین عطا کیا کہ دین کوئی فرسودہ شے نہیں دین کے علم کو جلا دی جائے تو عصر حاضر کی روشنی ماند پڑ جائے۔

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں جب اقبال بھوپال آئے تو میرے شعور میں چنگی آچکی تھی اور اقبال سے عقیدت والہانہ انداز میں پہنچ چکی تھی مگر عاشق کوتا ب نظارہ کہاں۔ ملاقات کا نہ موقع آیا نہ ہمت ہوئی۔ اس کے فوراً بعد میں علی گڑھ پہنا تو ہر صحبت میں ضربِ کلیم کا چرچا سننا۔ جیسے جیسے مسلم لیگ نے زور پکڑا۔ اقبال کے سیاسی افکار بالخصوص ملت اور وطن کے تصورات ابھرتے گئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دیسے بھی مسلم لیگ کی سیاست کے ایک بڑے مرکز کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کی جائے گی۔ یہاں کی نئی نسل نے تحریک کو پاکستان کو کامیاب بنانے میں ہر ممکن حصہ لیا۔ مسلم لیگ کی شاخ قائم ہوئی اور مسلم مٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا جس نے نوجوانوں میں ایک نیا عزم نیا جوش اور نیا اولہ پیدا کر دیا..... متعدد جلسوں کی صدارت قائدِ اعظم نے فرمائی اور انہوں نے علی گڑھ کے با حوصلہ نوجوانوں کو ہمیشہ پرامیدنگا ہوں سے دیکھا۔ ۲ مارچ ۱۹۴۰ کی پر جوش تقریر کا حوالہ نامناسب نہ ہو گا جس میں قائدِ اعظم نے یو نین میں تشریف لا کر سیاسی حالات پر تقریر فرمائی اور آکر میں کہا:

”میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ شانہ بہ شانہ کھڑے ہو جائیں اور مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ایک مستحکم اور مضبوط پیکر فولاد کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہیے۔ اپنی قوت کی تنظیم و تربیت کیجئے اور ان کو ادب و تادیب کا خوگر بنائیے۔ ہماری قوم ہمارے ساتھ ہے۔ آپ رکاوٹوں سے پر اگنده نہ ہوں۔ ہاں مسلمانوں کو مشتمل اور یک جا کریں۔ اور فوی قواعد کی طرح پابند کار بنائیں۔ اس طرح آپ ان

کو ایک ایسے حیرت افزال شکر سیاسی میں تبدیل کر لیں گے جسے چشم ہند
نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس طرح ہم جلد تر آزادی کی منزل مقصود پر پہنچ
جائیں گے!“۔

حکیم الامت کی وفات کی خبر آئی تو علی گڑھ والوں کے دل میں ان کے افکار کو جمع کرنے اور تعمیر ملت میں انہیں بروئے کار لانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس وقت میں مسلم یونیورسٹی میں مسلم لیگ کی شاخ کا جوانہ سیکرٹری تھا۔ اس سلسلے میں مجملہ دیگر اساتذہ شیخ عطاء اللہ صاحب جن کا تعلق شعبہ معاشیات سے تھا رہنمائی کیا کرتے تھے۔ ہم طلبہ ان کو ایک باوقار استاد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ وہ جو شیلے بالکل نہ تھے۔ بڑے پر سکون سادہ مگر صائب الرائے اور پختہ یقین رکھنے والے تھے شعروادب سے ان کا لگاؤ کا کبھی اندازہ نہ ہوا۔ حتیٰ کہ اقبال کے شعر بھی بہت کم پڑھتے تھے۔ البتہ ملت کے مستقبل کی بابت برابر سوچتے رہتے تھے اور جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا یہی وجہ تھی کہ انہیں اقبال کے ساتھ پچی عقیدت تھی ان کی اصابت رائے دیکھیے کہ انہوں نے سب سے پہلے اقبال کے مکاتیب جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ ان کی توضیح و اکسار یہ کہ انہوں نے دوسروں کو یہ کام کرنے کی دعوت دی اور کئی سال انتظار کرتے رہے کہ کوئی اٹھے جب کوئی نہ اٹھا تو انہوں نے محض اپنے عزم صادق اور خلوص نیت سے یہ خدمت انجام دی۔ خطوط جمع کرنے کے لیے انہوں نے جہاں مشاہیر سے رابطہ قائم کیا وہاں چھوٹوں کو بھی مامور کیا۔ مجھے تاکید کی کہ بھوپال جاؤ تو ممنون حسن خاں صاحب سے ذاتی طور پر گزارش کرو مجھے ممنون حسن خاں صاحب سے نیاز حاصل تھا۔ میں نے شیخ عطاء اللہ صاحب کے حکم کی تعییل کی اور ممنون حسن خاں صاحب نے بخوبی وہ خطوط جوان کے پاس تھے شیخ صاحب کو بھجوادیے۔

اقبال نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو علوم اسلامیہ کے متعلق ایک اہم نوٹ لکھ کر بھیجا

تھا۔ جس کا اردو ترجمہ شیخ عطاء اللہ نے سہیل سے نقل کر کے اقبال نامہ جلد دوم (صفحہ ۲۱۲-۲۲۵) میں شامل کیا ہے۔ اس کی انگریزی اصل بھی میں نے مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے تلاش کر کے نکالی تھی جو میرے پاس رہ گئی۔ اسی عرصہ میں میرا تقریرواد یونیورسٹی میں ہو گیا اور میں قاہرہ جانے کی تیاری میں ایسا مصروف ہوا کہ عطاء اللہ صاحب کو نہ پہنچا سکا۔

۱۔ علی گڑھ (کتابیجھ ۱۸۷۵ء تا ۱۹۷۴ء) صفحہ ۲۸-۲۹

یہ انگریزی اصل بعد کو میں نے اقبال روپیو بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں شائع کی۔ شیخ میں مصروف چلا گیا۔ ادھر قیام پاکستان کے نتیجہ میں اندوہنا ک حالات رونما ہوئے۔ شیخ عطا اللہ علی گڑھ چھوڑ کر لا ہور چلے گئے اور معاون حضرات کی رفاقت سے بھی محروم ہو گئے مگر ان کی اقبال دوستی اور ہمت و پیکھیے کہ تن تھا اقبال نامہ کی دوسری جلد بھی مرتب کر کے شائع کر دی جس کا مامکا بیڑا اٹھایا تھا اسے بحسن و خوبی انجام کو پہنچایا۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف سے میں نے خطوط کی اہمیت اور اقبال کے بعض ذاتی خطوط کی اشاعت پر ان مذاہوں کی بھجوک کے بارے میں رائے دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ مکاتیب کی اہمیت یہی ہوتی ہے کہ ان میں انسان کی سیرت سادہ و بے تکلف جلوہ گر ہوتی ہے۔ انسان کھل کر خط لکھتا ہے۔ اس لیے کہ تحریر کی سچائی سادگی و پرکاری ہمیں متاثر کرتی ہے۔ میرے خیال میں کسی مکتوب کو حذف کر دینا یا ایک مکتوب میں سے کسی کا نام حذف کر کے اس کی جگہ نقطے رکھ دینا علمی دیانت کے خلاف ہے۔ اقبال ایک انسان تھے۔ انسانی ضروریات اور انسانی جذبات رکھتے تھے۔ اس کے اظہار کے لیے ان کی انسانی عظمت کو بڑھانہیں لگتا اس لیے مجھے معتبرین سے اتفاق نہیں۔ اقبال جیسے عظیم انسان کے دل میں ذرا بھی خلش ہو تو اس کا اعتراف و اظہار کم از کم اپنے مخلص دوستوں سے کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا اس سے حق تھا۔ چنانچہ راس مسعود کے نام جتنے خطوط ہیں ان کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان

خطوط کی اشاعت سے جھگٹ نہ ہونا چاہیے۔ ان پر اعتراض کا کوئی جواز بھی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ میری دانست میں یہ رجحان افسوس ناک ہو گا کہ اگر ہم اپنے تصورات بلکہ تعصبات کے مطابق اقبال کا بت تراشیں۔

ایک طرف تو یہ صورت حال ہے دوسری طرف شاعر کے وہ ایامت ہیں جنہیں اس نے اپنی زندگی میں مسترد از قلمزد کر دیا یا بالقصد نظر انداز کر کے اپنے مجموعہ میں انہیں شامل نہیں کیا۔ لیکن ان کا کھون لگا کر بڑے ٹمطرائق اور زور و شور کے ساتھ وہ تمام غیر اہم کلام اس کے سر مرٹھا جا رہا ہے فرض کیجیے کہ ایک مضمون کا مسودہ تیار کرتا ہوں اسے شائع کرتے وقت اگر س میں سے سے چند سطریں نکال دیتا ہوں تو کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ ردی کی ٹوکری سے کاغذ کا پر زہ نکال کروہ سطریں میرے ذمہ لگائے

ڈاکٹر سید محمد یوسف نے بھوپال کے ناتے اقبال کے افکار و خیالات پر اب تک جو مضامین لکھے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

اردو

- ۱۔ عقل و عشق
- ۲۔ اقبال کے کلام میں روایت و جدت
- ۳۔ اقبال اور عبدالرحمن الداخل
- ۴۔ مسجد قرطبه کا مرکزی خیال
- ۵۔ اقبال اور شعر
- ۶۔ اقبال کی سیاسی بصیرت
- ۷۔ جمالیات سے متعلق اقبال کے افکار

عربی

- ۱۔ فلسفہ اقبال
- ۲۔ آراء اقبال عن المرأة وظيفتها في الحياة
- ۳۔ الامامة في رأي اقبال
- ۴۔ پیام مشرق (نقد)
- ۵۔ ضرب الکلیم (نقد)

انگریزی

A study of Iqbal's views on Ijma. studies in
Islamic History and culture.

بھوپال کے ایک جواں سال وجوں فکر ادیب و محقق ڈاکٹر حنفی فوق بھی ان حضرات میں شامل ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کی ذات گرامی سے بلا واسطہ اثر قبول کیا۔ انہوں نے میرٹرک کا امتحان شاہجهہ نی ماؤں ہائی سکول بھوپال سے پاس کرنے کے بعد کان پور کارخ کیا اور وہاں کے حلیم کالج سے اثر کیا پھر وہ لکھنؤ چلے گئے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے آنرز اور ایم اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ وہ ڈھاکہ کے چلے گئے اور ۱۹۵۰ء سے ہی وہ ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی سے مسلک ہو گئے۔ تقریباً ۲۱ سال وہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ وہیں سے انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد وہ دوسرے استاد ہیں جنہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے انگریزی مقالہ لکھا اور ان کے مقالہ کا عنوان تھا:

The social analysis of Urdu

Poetry during and after 1857

ان کے انگریزی مقالہ کا ایک بام تہام تر علامہ اقبال کے متعلق تھا۔
اس کے علاوہ علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ سے متاثر ہو کر بھی انہوں نے کئی اور قیمتی مضامین تحریر کیے اور ڈھاکہ کی مختلف ادبی تقریبات میں اقبال پر تقریریں بھی کیں تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ اقبال کی ادبی شخصیت مطبوعہ ”نگار“، لکھنو

۲۔ اقبال مطبوعہ ”افکار“، کراچی

۳۔ اقبال اور جمہوریت جائزہ کراچی

-۴-

Iqbal and the heritage of western thoughts.

-۵-

Inetnationalism in Iqbal's Poetry

۶۔ اقبال ڈے کے موقع پر مختلف اداروں مثلاً پاکستان کونسل ڈھاکہ۔ بلبل اکیڈمی ڈھاکہ یونیورسٹی کے مختلف ہال بزم فنون اور دوسرا ادبی انجمنوں کی جو تقاضہ رکھیں یا مضامین پڑھے وہ علامہ اقبال کی متنوع شخصیت زندگی اور فن سے متعلق تھے۔

ان کے ترجمے بنگلہ زبان کے ممتاز جرائد سنگبار آزاد اور موضوعات میں بھی شائع ہوئے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کے بھوپال کے قیام نے سبھی ادیبوں شاعروں اور فن کاروں کو بے حد متاثر کیا۔ میرا وطن بھی بھوپال ہے چنانچہ کانپور لکھنا اور ڈھاکہ کے قیام کے دوران جب بھی میرا بھوپال جانا ہوا وہاں کے ادیبوں

اور شاعروں سے ربط و تعلق قائم ہو جاتا۔ بھوپال میں اقبال شناسوں کی بہت بڑی تعداد تھی چنانچہ اقبال سے میر امداد نہ ہونا بھی فطری تھا۔

اختر جمال..... ممتاز ادیب صحافی اور ہفت روزہ ندیم کے اولین مدیر محمود الحسن صدیقی کی صاحزادی اور بھوپال کے آتش نفس اور مشہور شاعر احسن علی خاں کی بیوی ہیں اور ان دونوں اسلام آباد میں ہیں۔ اختر جمال سے رابطہ قائم ہونے پر میں نے ان سے دریافت کیا کہ انہوں نے علامہ اقبال کو دیکھا تھا اتنا یا ان سے کوئی اثر قبول کیا تھا میرے خط کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ:

”..... جہاں تک اثرات کا تعلق ہے تو میں تو کیا کوئی ادیب و شاعر ایسا نہ تھا جس نے علامہ اقبال کے قیام بھوپال سے اثر قبول نہ کیا ہو۔ میرے پاس ندیم بھوپال کے کچھ پرچے آج بھی محفوظ ہیں۔ ان پر چوں اور عبدالقوی دسنوی کے مضمون۔ علامہ اقبال بھوپال میں سے استفادہ کر کے میں نے ایک مضمون اقبال اور بھوپال ماہنامہ فنون لاہور میں لکھا تھا۔ وہ بھیج رہی ہوں۔ شاید آپ کسی کام آسکے۔“

مضمون پڑھ کر کچھ نئی باتیں میرے علم میں آئیں۔ چنانچہ میں نے جستہ جستہ اقتباسات پیش خدمت ہیں اس مضمون سے یہ بھی پتا چلا کہ کم سنی کے زمانے میں وہ ایک بار علامہ اقبال سے ملنے بھی اپنے والد محمود الحسن صدیقی کے ساتھ گئی تھیں۔ مضمونے آغاز میں انہوں نے جواہر طہار خیال کیا ہے اس کے مطالعہ سے بھوپال میں علامہ اقبال کے اثرات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔۔۔ ملاحظہ ہو۔۔۔

”..... بھوپال کے مدراس میں اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ اردو دفتری

عدالتی اور سرکاری زبان تھی۔ شہر میں اردو کے بڑے بڑے کتب خانے تھے رساۓ اور اخبارات نکالے جاتے تھے۔ اور بھوپال کی ادبی اور تہذیبی زندگی میں اقبال کا اتنا چرچا تھا اور وہاں کے لوگ اقبال سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر یہ ماحول دیکھا تھا اور اقبال کی محبت مجھے مقدس و رشی کی طرح ملی تھی۔

اس زمانے میں بھوپال میں جدوجہد آزادی کا بھی ایک مشہور گڑھ تھا مولوی برکت اللہ بھوپالی جو جمال الدین افغانی کے دست راست تھے۔ افغانستان میں ہندوستان کی انقلابی حومت کے وزیر عظم تھے۔ برکت اللہ بھوپالی ۱۹۲۷ء میں انقال فرمائے تھے لیکن بھوپال میں ان کی تحریک کے گھرے اثرات تھے اور کئی سیاسی جماعتیں تھیں۔ نواب صاحب ہندوستان کی سیاسیات میں ایک اہم حیثیت رکھتے تھے..... وہ اعتدال پسند تھے۔ ان کے تعلقات برطانوی ہند کے حکمرانوں اور سیاسی رہنماؤں دونوں سے دوستانہ تھے۔ اس لیے جب بھی باہمی بات چیت ہوتی تو نواب صاحب ثالث کا کام کرتے۔

اقبال سے بھوپال جا جو علق رہا ہے اس کی بہت سی یادیں خطوط اقبال روزگار فقیر اور گنح ہائے گرانمایہ میں محفوظ ہیں۔ اس لیے میں اپنے اس مضمون میں ان باتوں کا تذکرہ نہیں کروں گی۔ میں وہ باتیں ہی لکھ رہی ہوں جو میں نے اپنے بزرگوں سے سنی ہیں۔ یا جو

یادیں اور باتیں اقبال کی وفات کے بعد ہفت وار ندیم میں شائع ہوئیں اور جو اتفاق سے اس وقت بھی میرے پاس ہیں۔ میرے والد محمود الحسن صدیقی مرحوم ندیم کے ایڈیٹر تھے۔ ندیم ویکلی والد صاحب نے سر راس مسعود کے ایما پر جاری کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ماہنامہ ظل السلطان کے مدیر تھے۔ والد کا علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ سے ہی سر راس مسعود سے تعلق تھا۔ اور ان کے بھوپال کے دوران قیام یہ تعلق بہت بڑھ گیا تھا۔ والد کہا کرتے تھے کہ سر راس فیض صحبت سے جو کچھ اہیں حاصل ہوا وہ زندگی کے تمام تجربات سے زیادہ قیمتی تھا۔ جس زمانے میں علامہ اقبال بھوپال تشریف لائے والد کو بھی بارہا ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور جب وہ ان دونوں کی باتیں سنایا کرتے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھرا آتے تھے۔

نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال کے تعلقات بہت قریبی اور دوستانہ تھے۔ وہ غالباً اپنے علی گڑھ کے زمانہ قیام سے ہی اقبال کے قریب آئے تھے۔ نواب صاحب نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور ایک عرصہ دراز تک وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے چانسلر بھی رہے تھے۔ علامہ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ علی گڑھ کے طلباء ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے علامہ اقبال کے ایک خط میں جو غلام بھیک نیرنگ کے نام ہے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۹۲۷ء سے قبل ہی نواب صاحب بھوپال سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک چندے

کے سلسلے میں انہیں نواب صاحب کی مدد کا یقین تھا۔ ۳ جنوری ۱۹۲۷ء کو لکھتے ہیں کہ اگر کچھ کمی چندے میں رہ گئی ہو تو والی بھوپال سے مدد کی انتباہ بہتر ہو گی۔

آخر جمال اپنے مختصر مضمون میں آگے چل کر لکھتی ہیں:

علامہ اقبال کے بھوپال آنے کی خبر کئی دن سے مشہور تھی۔ جس گاڑی سے علامہ اقبال تشریف لائے وہ رات کو پہنچتی تھی۔ بھوپال کے عوام اور خواص سب ہی اقبال کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب تھے۔ عائدین شہر اسٹیشن پر موجود تھے۔ نواب صاحب نے اپنے نمائندے کے طور پر اپنے ملٹری سیکرٹری سر اقبال محمد خاں کو بھیجا تھا۔ سر راس وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گئے تھے اور وہاں بے تابی سے ٹھیل ٹھیل کر ریل کا انتظار کر رہے تھے۔ جب گاڑی اسٹیشن پر رکی تو ایک صاحب افغان ٹوپی شلوار قمیص اور ڈھیلے سے کوٹ میں ملبوس اسٹیشن پر اترے۔ والد صاحب بیان کیا کرتے تھے کہ سر راس تقریباً دو ڈر کر علامہ کے قریب گئے اور محبت سے گلے ملے اور ان کی پیشانی پر بوسہ لیا۔ وہ اتنی محبت اور گہرے خلوص سے ملے کہ اسٹیشن پر کھڑے ہوئے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

سر راس مسعود نے عائدین اور معززین شہر کا علامہ سے تعارف کرایا پھر علامہ کے خادم علمی بخش کو بلا کران سے مصالحہ کیا اور ان کی خیریت دریافت کی۔ علامہ کے پاس بہت مختصر سامان تھا جو سر راس مسعود کی گاڑی کے پیچے ہی آگیا تھا۔ نواب صاحب کی خواہش تھی

کہ علامہ شاہی مہمان خانے میں قیام کریں لیکن علامہ نے فرمایا کہ
اس بارتوہ اپنے دوست، ہی سے ملنے آئے ہیں۔ اس لیے مناسب
ہو گا کہ وہ سر راس کے ساتھ قیام کریں۔ علامہ صاحب کا قیام ریاض
منزل میں ہوا۔ یہ مکان بھوپال کے مشہور بڑے تالاب کے کنارے
پر ہے۔ ریاض منزل کے بالائی کمرے سے جہاں علامہ کو ٹھہرایا گیا
اس تالاب کا منظر بے حد حسین نظر آتا ہے۔ ایک طرف شملہ کی سربز
پہاڑیاں اور روشنیاں نظر آتی تھیں۔ اور تالاب کا دور تک پھیلا ہوا
پانی طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک عجیب و غریب
طلسماتی فضا پیدا کرتا کھاتا دیتا تھا۔ اس کمرے میں اس منظر کو دیکھے
کراقبال سے اپنی مشہور نظم نگاہ کی جس کا آخری شعر ہے:

نگاہ ہو تو بھائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی
ممنون حسن خاں صاحب اس زمانے میں سر راس مسعود کے
پرنسل سیکرٹری تھے۔ سر راس نے ان کو علامہ کی خدمت میں رہنے کا
حکم دیا تھا اور دفتر سے ان کی حاضری معاف کر دی تھی۔ علامہ نے
سر راس سے کہا تھا کہ انہیں جس چیز کی ضرورت ہو اور جو کام ہو وہ
ممنون حسن خاں کو اطلاع دے دیں۔ وہ ان کے ہر حکم کی تعییں کریں
گے۔ ممنون حسن خاں علامہ کی اس خدمت پر فخر کرتے ہیں اور اسے

اپنی بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔

ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

ممنون حسن خاں صاحب کے ذمے خط و کتابت کا کام بھی تھا۔

علامہ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ہندوستان کے کونے کونے سے خطوط آتے تھے۔ اور سر راس کی طرح ان کا علیحدہ میں بیگ جاتا تھا۔ تمام خطوط ممنون حسن خاں صاحب اپنے پاس رکھتے تھے۔ صحیح کے وقت تمام خطوط علامہ صاحب کو سناتے پھر علامہ جو کچھ جواب میں لکھواتے وہ اسے پنسل سے نوٹ کر لیتے اور بعد میں صاف کر کے یا ٹانپ کر کے علامہ کے دستخط کے لیے پہنچادیتے تھے۔ ان خطوط میں سب سے زیادہ علی گڑھ کے طلبہ اور استاذہ کے ہوتے تھے جو علامہ کی خیریت جاننے کو بے چین ہوتے تھے اور ان کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں کرتے تھے۔

علامہ اقبال کی بھوپال میں مصروفیات اور اپنی علامہ سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

علامہ..... بھوپال میں زیادہ تر آرام ہی کرتے تھے۔ باہر بہت کم نکلتے تھے مگر جامع مسجد اور اکثر موئی مسجد میں نماز پڑھنے ضرور جاتے تھے۔ سر راس مسعود کے گھر پر اقبال کے مداح اور عقیدت مند برابر جاتے رہتے تھے۔ علامہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اپنی تکلیف اور بیماری کا احساس ملاقاتی کونہ ہونے دیتے تھے۔ جن لوگوں کو اس زمانے میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہے وہ انتہائی محبت اور احترام سے اس زمانے کی باتیں یاد کرتے ہیں۔

مرحوم رائے زادہ آفتاب جو اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے
والد مرحوم کی معیت میں علامہ کی خدمت میں اکثر جایا کرتے تھے۔
اور علامہ سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ علامہ سے عقیدت اور
محبت میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔

میں اسے اپنی بڑی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ نہ صرف یہ کہ میں
نے ان سے بہت سے لوگوں سے علامہ کی باتیں سنی ہیں بلکہ بچپن
میں علامہ کی دید کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا ہے۔ ان دنوں مجھے
پڑھنا نہیں آتا تھا اسکوں میں داخل نہیں ہوئی تھی مگر گھر میں رشتے کے
دوسرے بڑے بہن بھائیوں سے علامہ اقبال کی نظمیں سارے
جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا اور ایک مکڑا اور ملکھی سنی تھیں۔

ایک دن صبح جب ابا جان سر راس مسعود کے ہاں جا رہے تھے
میں نے اور میری بہن نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی تو انہوں نے کہا
کہ کل علامہ اقبال وہاں آئے ہوں گے جو مسلمانوں کے سب سے
بڑے شاعر ہیں تمہیں اس شرط پر ساتھ لے جائیں گے کہ سلام کرو
گی..... ریاض منزل میں بڑے تالاب کے کنارے بہت مرا آتا
تھا۔ چھیرے مچھلیاں پکڑتے نظر آتے۔ کشیاں چلتی ہوئی دکھائی
دیتیں۔ اروپھر روس مسعود کا باغ بہت بڑا تھا۔ جس میں خوبصورت
تتلیاں تھیں اس لیے ہم دونوں بہنوں نے سلام کرنے کا پکا وعدہ کر لیا
اگرچہ راستہ بھر سلام کے خیال سے دل دھڑکتا رہا۔

ریاض منزل کے برا آمدے میں پہنچ کر ایک بزرگ کو کرسی پر

بیٹھے ہوئے سرراس مسعود سے بتائیں کرتے دیکھا۔ وہ شلوار قیص
پہنے ہوئے تھے۔ کندھوں پر چادر لپٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی حقہ رکھا
تھا۔ ہم نے جھک کر مری مری سی آواز میں آداب کہا۔ سرراس نے
کہا کہ یہ محمود کی بچیاں ہیں بہت شرماتی ہیں۔ علامہ نے دعا دی
اور نام پوچھے۔ اب تو ہماری آواز حلق میں اٹک گئی۔ ابا جان نے ہم
دونوں کے نام بتائے اور اس کے بعد ہم نے فوراً باغ کی راہ لی۔
جب گھنٹہ بھر بعد ابو نے ہمیں چلنے کے لیے بلوایا تو پھر ایک بار سلام کا
مرحلہ طے کرنا پڑا۔ والپی پر ابو نے کہا کہ تم بڑی ہو کر اس بات پر فخر
کیا کرو گی کہ ہم نے بچپن میں علامہ اقبال کو دیکھا تھا۔

اور آج جب ابو کی اتنی بہت سی محبت بھری با تیں یاد آتی ہیں تو یہ
بات بھی ان کا بڑا احسان معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی شرمندی اور بیوقوف
بچیوں کو اپنے ساتھ علامہ کے حضور میں لے گئے تھے۔

ممنون صاحب مہینے میں دو بار ضرور علامہ کو خط لکھتے تھے اور وہ
بڑی باقاعدگی سے ان خطوط کا جواب دیتے تھے۔ انتقال سے صرف
دو دن پہلے ممنون صاحب کو ان کا آخری خط ملا تھا جس میں
انہوں نے لکھا تھا:

..... مائی ڈیر ممنون۔ آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا۔ افسوس کہ
شدید عالت کی وجہ سے جواب نہ لکھوا سکا۔ دمے کے متواتر دوروں
نے مجھے زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا ہے مگر اب خدا کے فضل سے
افاقہ ہے۔ آنکھوں کا آپریشن مارچ میں ہونے والا تھا مگر دمہ کی وجہ

سے اسے ملتی کرنا پڑا۔ اب بشرط زندگی انشاء اللہ تمبر میں ہو گا۔

ممnon حسن خان کے نام جو خطوط آتے تھے ان کا اقبال کے سب ہی عقیدت مند بے چینی سے انتظار کرتے تھے اور ان کو سنتے تھے۔ یوم اقبال پر مجھے بچپن کا ایک واقعہ کشیریا آ جاتا ہے۔ ایک دن میں جب کسی کام سے باہر کے مکان میں گئی تو میں لے وہاں ابو اور ان کے عزیز دوست ممnon حسن خاں کو زور زور سے روتے ہوئے دیکھا۔ ابو کو اس سے پہلے میں نے روتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اندر آ کر مکان میں امی اور نانا میاں کو بتایا کہ ابو اور ان کے دوست عورتوں کی طرح رور ہے ہیں۔ سب میری بات سن کر حیران ہو گئے۔ جب ابا خود اندر آئے تو انہوں نے بتایا کہ ممnon حسن خاں یہ اطلاع لے کر آئے ہیں کہ علامہ اقبال کا آج صحیح پانچ بجے لا ہو رہا میں انتقال ہو گیا۔

یہ بات تو بہت بعد میں سمجھ آئی کہ ابو اور ممnon حسن خاں اس زور اس قدر تڑپ کر کیوں رور ہے تھے بچپن میں تو یہ واقعہ یاد رکھنے کی وجہ صرف ابا کا رونا تھا۔

میری درخواست پر اختر جمال نے هفت روزہ ندیم میں شائع شدہ مضامین کا مختصر سا اشاریہ لکھ کر بھیجا جو درج ذیل ہے افسوس کہ ندیم کی پوری فائل نہ اختر جمال کے پاس موجود ہے نہ تلاش و جستجو کے بھوپال میں کسی جگہ مل سکی ورنہ تمام شائع شدہ مضامین کا مکمل اشاریہ شامل کتاب ہو جاتا۔ پھر بھی یہ چند حوالے اس امر کی نشاندہی ضرور کرتے ہیں کہ بھوپال میں اقبال سے اثرات قبول کرنے والوں کا ایک بڑا حلقة پیدا ہو گیا تھا۔

اشارہ یہ فت روزہ ”ندیم“

- ۱۔ اقبال کا نظریہ شاعری از مائل نقوی ۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء
 - ۲۔ شاعر مشرق علامہ اقبال (اداریہ) از محمود الحسن صدیقی ۱۱۵ پریل ۱۹۳۸ء
 - ۳۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال از محمد احمد سبزواری ۱۵ مئی ۱۹۳۸ء
 - ۴۔ علامہ اقبال کی یاد میں از ممنون حسن خاں ۲۲ مئی ۱۹۳۸ء
 - ۵۔ اقبال کی تعلیم از ڈاکٹر سید ظفر الحسن کیم جولائی ۱۹۳۸ء
- ان مضامین کے علاوہ ندیم میں اقبال کی متعدد نظمیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ صرف ایک نظم کا حوالہ سکا ہے جو علامہ نسر راس مسعود کی رحلت پر پڑھی تھی۔

۱۔ مسعود مرحوم از علامہ اقبال ۲۲ فروری ۱۹۳۸ء

۱۔ فنون مئی جون ۱۹۷۰ء صفحہ ۶۵ تا ۷۰



اقبال کے تاثرات

دنیا کی عظیم المرتبت اور لافانی شخصیتوں کے کارناموں پر نظر ڈالیے تو یہ اکشاف ہوتا ہے کہ قدرت انہیں کسی نہ کسی بلند نصب العین کی تمکیل کے لیے ہی خلق کرتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جب تک زندہ رہتی ہیں ملک و ملت کو زندگی کے صحیح اور بلند تر مقصد کا پیغام پہنچاتی ہیں اور جب دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں تو ان کے چھوٹے ہوئے نقوش پا قوموں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ آفاق گیر شخصیتیں کا ہر دور اور ہر زمانے میں بھی مشن رہا ہے۔ اقبال ایسی ہی بلند و برتر بزرگ و محترم اروز زدہ جاوید شخصیتیں میں سرفہrst ہیں جنہوں نے زندگی بھر فکر و عمل کا پیغام دیا اور جب وہ جدا ہوئے تو ملک و ملت کو انتا کچھ قیمتی سرمایہ دے گئے جس سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ آزادی اور بیداری کی وہ اہم جس نے پورے بر صیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا سچ پوچھیے تو اقبال کے انقلاب انگیز اور حیات افروز پیغام کا ہی نتیجہ تھا بر صیر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر شخص اقبال کا دل دادہ تھا۔ اور یہ خوش نصیبی غالب کے بعد اگر کسی اور باکمال شاعر کے حصے میں آئی ہے تو وہ اقبال کی ذات ستودہ صفات تھی۔ کیا مسلمان کیا ہندو کیا سکھ کیا دیگر مذاہب والے سبھی اقبال کے فکر انگیز اور بصیرت افروز کلام کے گرویدہ و شیدا تھے بظاہر وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر بر صیر میں جگہ جگہ ان کی انقلاب آفریں تقاریر کے ترجیح ہو رہے تھے۔ اور یادگاریں قائم ہو چکی تھیں۔ کہیں ان کے فلسفہ خودی پر کام ہو رہا تھا کہیں ان کی انقلاب آفریں تقاریر کے ترجیح ہو رہے تھے کہیں ان کے کلام کے دوسری زبانوں میں ترجیح ہو

رہے تھے۔ کہیں ان کی یاد میں ادارے قائم ہو رہے تھے۔ بھوپال میں ہی ان زندہ و باعمل شہروں میں شامل تھا جہاں پہلی بار ان کی عظمت کے اعتراف میں اقبال لاہوری کا قیام عمل میں آیا۔ اور یہ اقبال کی ذات سے اہل بھوپال کی جانبگی کا پہلا عملی قدم تھا جو بھوپال کے چند سو پھرے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اٹھایا۔ اس لاہوری کے بارے میں بھوپال کے جوان سال محقق شیم احمد نے جو تفصیلات فراہم کی ہیں ان کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا:

ا ذاتی مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۶۳ء

اقبال لاہوری کا قیام و افتتاح یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کو عمل میں آیا۔ اس کے باñی عبداللطیف خاں تھے سابقہ مجلس انتظامیہ میں جو حضرات شامل تھے ان کے نام یہ ہیں:
۱۔ سید آفتاب الدین ایم اے (صدر) ۲۔ ظفر علی خاں (نائب صدر) ۳۔ سید ساجد علی (جزل سیکرٹری) ۴۔ احمد مصطفیٰ سیکرٹری ۵۔ حیات صدیقی (سیکرٹری نشر و اشاعت) ۶۔ محمد عمر انصاری منتظم ۷۔ سید حامد جعفری (معتمد) ۸۔ عبداللطیف خاں (خازن) ۹۔ عبدالباسط (رکن) ۱۰۔ سید شوکت علی (رکن) ۱۱۔ عبدالعزیم انصاری (رکن)

ان حضرات کے بعد بھوپال کے جن اقبال شناسوں نے اقبال لاہوری کی مجلس عاملہ اور مجلس انتظامیہ میں شمولیت اختیار کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں।

مجالس عاملہ

۱۔ سید آفتاب الدین ۲۔ سید ساجد علی ۳۔ محمد انصاری ۴۔ سید حامد جعفری

۵۔ عبداللطیف خاں

مجلس انتظامیہ

۱۔ سید سلیمان نقوی (سیکرٹری) ۲۔ انعام الدین (جوائیٹ سیکرٹری) ۳۔ واحد علی (سیکرٹری نشر و اشاعت) ۴۔ رشید احمد (خازن) محمد خالد (منظوم) ۵۔ سید عزیز الدین (رکن)

نامزد ممبران

۱۔ سید مسعود علی بی۔ ۲۔ محمد انس خاں بی۔ ۳۔ شفیق احمد صدیقی

اقبال لائبریری کی کل کتابوں کی تعداد..... ۲۰۰۰۰

اردو کی کتابیں..... ۲۳۰۰

ہندی کی کتابیں..... ۳۰۰

انگریزی کی کتابیں..... ۲۰۰

اقبال کی تصانیف..... ۱۵ (بے تفصیل ذیل)

(۱) ضرب کلیم (۲) زبور عجم (۳) پیام مشرق (۴) ارمغان حجاز (۵) جاوید

نامہ (۶) بال جبریل (۷) اسرار و رموز (۸) بانگ درا (۹) باقیات اقبال (۱۰) اقبال

اور نونہال (۱۱) انتخاب دیوان اقبال مرتبہ تاج آفس (۱۲) خطبات اقبال مرتبہ رضیہ

فرحت بانو (۱۳) اسلام کے سیاسی تصورات (۱۴) کلیات اقبال (ناشر نیو تاج آفس)

(۱۵) فلسفہ عجم

ان کے علاوہ اقبال پر کتابیں..... ۲۵ (بے تفصیل ذیل)

۱۔ فکر اقبال..... غلام دشییر

۲۔ آثار اقبال..... غلام دشییر

۳۔ اقبال پر ایک نظر..... سید محمد شاہ

۱۔ ان حضرات کے علاوہ آصف شاہبیری بھی ان نوجوانوں میں شامل تھے جنہوں نے اقبال لا بسیری کوئی سال تک بخیر و خوبی چلایا افسوس کہ وہ کے دوران ان کا انتقال ہو گیا

۵۔ تصوف اقبال..... حبیب النساء بیکم

۶۔ مفہومات اقبال..... محمود نظامی

۷۔ رموز اقبال..... ڈاکٹر میر ولی الدین

۸۔ اصلاحات اقبال..... بشیر الحق دسنوی

۹۔ اقبال کی شاعری..... عبدالمالک

۱۰۔ اقبال (انگریزی میں)..... عظیم بیگ

۱۱۔ اقبال کا نظریہ فن..... عزیز احمد

۱۲۔ اقبال..... محمد حسین خاں

۱۳۔ اقبال..... شائع کردہ انجمن ترقی اردو

۱۴۔ اقبال..... مجھوں گورکھپوری

۱۵۔ حیات اقبال..... شائع کردہ تاج آفس

۱۶۔ اقبال اور ٹیکوڑ..... عارف بٹالوی

۱۷۔ روح اقبال..... ڈاکٹر یوف حسین خاں

۱۸۔ رسالہ نیرنگ خیال..... اقبال نمبر

۱۹۔ مقام اقبال..... اشراق حسین

۲۰۔ اقبال..... مولوی احمد الدین

۲۱۔ سیرت اقبال..... یکتا حقانی

۲۲۔ اقبال امام ادب.....رئیس احمد جعفری

۲۳۔ اقبال قرآن حکیم کی روشنی میں.....محمد یوسف

۲۴۔ اقبال اس کی شاعری اور پیغام.....علی اکبر

۲۵۔ شرح اسرار خودی.....پروفیسر محمد یوسف

اقبال لاہوری میں اور پلک دارالمطالعہ شاعر مشرق کی یاد کوتا زہ رکھنے کے لیے کیم اکتوبر ۱۹۳۸ کو معرض وجود میں آیا۔ یہ وسط شہر کے مشہور بازار ابراہیم پورہ میں واقع تھا۔ اور قیام سے آج تک نہایت خاموشی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ ابتدائی دور میں عبداللطیف خاں کے ساتھ بھوپال کے ایک سیاسی و سماجی کارکن آصف شاہ بیمی نے بھی عملًا اس کی ترقی میں سرگرم حصہ لیا۔ کئی سال تک پابندی سے ۱۹۴۱ کو یوم اقبال منایا جاتا رہا۔ کبھی کبھی یوم اقبال پر کل ہند کے پیانے پر مشاعرے بھی منعقد ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی اقبال لاہوری کی عملی سرگرمیا جاری رہیں۔ مختلف مواقع پر لاہوری کے زیر اعتمام کے لیے خصوصی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء سے ایک نیا سلسلہ کار پردازان لاہوری نے شروع کیا ہے کہ وہ شہر کے معزز حضرات اور سرکردہ ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کو ہر ماہ مدعو کرتے ہیں۔ ان سے مفید مشورے حاصل کرتے ہیں۔ اور اقبال لاہوری کے مختلف پروگراموں کا تعارف کرتے ہیں۔ اب تک جن مقتند راوی ممتاز شخصیتوں نے اقبال لاہوری کے بارے میں اپنی گراں قدر آراء اور اس لاہوری کو پہ نفیس دیکھ کر تحریر کی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

”میرے لیے لاہوریاں ایک تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتی

ہیں۔ جن سے قوم کے شعور کا افق روشن ہوتا ہے اور مطالعہ کا شوق

نہاں خانے میں جھانے کا موقع دیتا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ اقبال

لابریری کے دیکھنے اور اس کے ملخص کارکنوں سے ملنے کا موقع ملا۔
مجھے یقین ہے کہ یہ کتب خانہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرے گا اور اسی
ترقی کرے گا کہ بھوپال کا دل بن جائے دھڑکتا ہوادل۔“

.....پروفیسر احتشام حسین



”آپ نے ایک شمع جلانی ہے۔ ضرورت ہے کہ چراغاں ہو۔
اگر جگہ بہتر ہو تو آرام دہ کرسیاں میزیں اور عمده قسم کی ہوں تو آپ
اس نیک کام یعنی علم کی ترویج و ترقی کو زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں۔
اس لیے میری رائے یہ ہے کہ آپ حکومت مدھیہ پر دیش اسے کہیے
کہ اس لابریری کو گرانٹ دے ارباب زر سے کہیے کہ چندہ دیں۔
اس طرح لابریری کو اور بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔“

.....سجاد ظہیر



”میں مجبور ہو گیا کہ وہ سب کچھ کہوں جو ایک بہترین کتاب گھر
کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ آج میں لابریری میں دوسرا بار آیا ہوں۔
پہلے دن کی حاضری روaroی کی تھی۔ خدائے بزرگ و برتر کا ر
پردازان کے حوصلے بڑھائے۔“

.....(حامد سعید خاں حامد)



”لابریریاں عوام کو علم و ادب سے روشناس کرانے کا اور ان کے ذوق کو بلند کرنے کا موثر ذریعہ ہی۔ مجھے یقین ہے کہ اقبال لابریری اسی طرح رواں دوال کام جاری رکھے گی اور میری دلی اور نیک دعا نئیں اس کے ساتھ ہیں“۔
(عادل رشید).....



”عوام کے لیے اچھے کتب خانوں کی بڑی ضرورت ہے جو انہیں اچھی کتابیں بھی پہنچائے اقبال لابریری کے کارکنان مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے ایک اچھی لابریری تیار کی“۔
(علی سردار جعفری).....

”بھوپال کی تہذیبی سطح کو بلند کرنے کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں ان میں اس لابریری کا بھی نمایاں حصہ ہے جسے فراموش نہ کرنا مناسب ہے نہ آسان۔ س کے لیے تمام کارکنان مبارک باد کے لائق ہیں“۔
(کیفی عظمی).....

۱۹۵۶ء میں بھوپال مدھی پرڈیش کا صدر مقام بن گیا۔ مدھیہ پرڈیش میں ریاست بھوپال کے علاوہ ریاست اندور اور ریاست گولیار وغیرہ بھی شامل کر دی گئیں اور وسط ہند کی ان ریاستوں کے وفاق کو مدھیہ پرڈیش کا نام دیا گیا۔

”بھوپال اپنے مخصوص نظریات و افکار کا گھوارہ علم و ادب رہا
ہے جو ملخص اس گنجینہ علوم کے کارکنان عظمت و باقی ہیں ان کی
جدوجہد کا یہ آغازی دور مستقبل بلند کا خود ضامن ہے۔“

(انور صابری)

”اردو کی لائبریریاں یوں تو بہت کم نظر آتی ہیں اب تو اور بھی
کم ہیں۔ اس پس منظر میں مدھیہ پر دلیش کی راج دھانی میں یہ عمدہ
لائبریری دیکھنے آیا تو مسرت ہوئی،“

(حبيب تنویر)

”ملک و قوم کے لیے صالح ادب کی سخت ضرورت ہے۔ اقبال
لائبریری اس سلسلے میں فال نیک ہے عوام کی ادبی خدمت کرنے
والوں کو میں نے ان کی ادبی سرگرمیوں کے لیے مبارک باد دیتا
ہوں۔“

(عش ملیمانی)

”عوام کو آج مطالعہ کے لیے صالح ترقی پسند ادب کی ضرورت
ہے اور اقبال لائبریری جو عرصے سے عوام کی ادبی خدمت انجام
دے رہی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی ضرور کوشش کرے
گی۔“

(جاں ثاراختر)

”اقبال لائبریری بھوپال کی شان دار علمی و ادبی روایات کا
ایک زندہ و متحرک ادارہ ہے۔ اس کے مختص منتظامیوں اور پر جوش

کارکن اقبال کے فلسفہ اور اس کی تعلیمات سے سرشار ہو کر جس اعتماد
حصولہ امنگ اور لگن سے ایک معیاری لا بہریری بنانے کی دھن میں
لگے ہوئے ہلکا وہ اس کے تابناک مستقبل کی صفائت ہے۔ یہ
لا بہریری صرف ایک کتاب گھر ہی نہیں ایک ثقافتی مرکز بھی ہے۔
اس ترقی پذیر ادارہ کی ضروریات کی تکمیل ایک قومی ضرورت ہے۔
سردست لا بہریری کے پیش نظر ایک موزوں عمارت کی تعمیر
نادر مخطوطات کتب کی فراہمی اور ایک معیاری مجلہ کا اجراء ہے اور
ظاہر ہے کہ یہ چیزیں عوام کی دلچسپی اور حکومت کے حقیقی تعاون و
سرپرستی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں۔

(سید قمر الحسن چیف ایڈیٹر روزنامہ ندیم بھوپال)

”بھوپال کی ادبی تحریکات پر کچھ لکھتے وقت اقبال لا بہریری کو
نظر انداز کرنا مشکل ہے اور لا بہریری نے بھوپال میں ادبی سرگرمی
پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔“

(کوثر چاند پوری)

”لا بہریریوں کا قیام قوم و ملت کی فلاح کے لیے اشد ضروری
ہے۔ مجھے سرت ہے کہ میں اقبال لا بہریری آیا یہ دلکھ کر بڑی خوشی
ہوئی کہ لا بہریری منتظمین اور ارکین بڑی خوش اسلوبی سے اس ادارہ
کو چلا رہے ہیں میری دلی مبارکباد قبول کیجیے“

(عبد الحمید انصاری مالک روزنامہ انقلاب بمبئی)

”مجھے یقین ہے کہ کوڑہ سمندر میں بدل جائے گا کیونکہ اقبال

لابریری میرے لیے ایک نہایت حیرت انگیز اور مسرت افزا چیز ہے۔ اس لابریری کے منتظمین میں خلوص کارکا وہ جذبہ نظر آتا ہے جس نے حیات جاوہاں کی شمعیں روشن کی ہیں۔

(افریسمابی)

”اقبال لابریری کے سلیقہ شعار کارکنوں کا آئینہ اقبال لابریری ہے جس میں ان کی عرق ریزی اور علم و فن سے محبت کا عکس جھلکتا ہے۔

(مظفر شا بجہاں پوری)

”اقبال لابریری بھوپال کی قابل فخر اور عظیم لابریری ہے جس کے ذریعہ تشنگان ادب برابر سیراب ہوتے رہے ہیں اور آج بھی بفضلہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ خدا کرے ہمیشہ ہمیشہ یہ لابریری اسی طرح علمی اور ادبی خدمت کرتی رہے۔

(شعری بھوپالی)

اقبال لابریری کے زیر اہتمام جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سالہا سال تک یوم اقبال و سعی پیانہ پر منایا جاتا رہا جس کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، سرتیج بہادر سپرڈ بندٹ جواہر لعل نہرو، راج گوپال اچاریہ، ڈاکٹر راجندر پر شاد مولانا ابوالکلام آزاد اور محمد الیاس برلنی وغیرہ ایسے اکابر پیغامات ارسال کیا کرتے تھے جو یوم اقبال کے موقعوں پر سنائے جاتے تھے۔ جن بلند پایہ اور مقتنز شخصیتوں نے یوم اقبال کے سلسلے میں اقبال کی سیرت و شخصیت، ان کے افکار و نظریات اور ان کی شاعرانہ عظمت کو تحریر و تقریر کی صورت میں خراج عقیدت پیش کیا ان میں علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر سید

اختشام حسین، مولوی محمد ابراہیم، محمد احمد سبزواری، حکیم سید ضیاء الحسن، ڈاکٹر سید عبدالرحمن، ڈاکٹر سلیمان احمد رضوی، سردار جعفری، کوثر چاند پوری، کامتا پرشاد اللہ ملک راج، سورج کلا سروز، حامد حسین باسط بھوپالی، شعری بھوپالی، ایم عرفان مولانا وجہ حسینی، آفاق احمد، زہرہ جمال، تربیتی سرن شادا ابراہیم یوسف، عبدالحکیم انصاری، حبیب فخری گوہر جلالی، مقصود عمرانی، آصف شاہمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۲ جون ۱۹۵۸ء کو یوم اقبال کے موقع پر منتظمین نے جو پوستر شائع کیا تھا اس کے مطالعہ سے بھوپالیوں کی اقبال سے عقیدت و محبت کا ناقابل تردید ثبوت ملتا ہے۔ اس پوستر سے جہاں ایک طرف اقبال کے گھرے اور ثابت اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہیں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تقسیم ہند کے باوجود اہل بھوپال کے دلوں سے اقبال سے والہانہ عقیدت کی شمعیں اسی تابانی کے ساتھ روشن ہیں۔ وہا پنے محبوب شاعر سے کل کی طرح آج بھی اپنا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں پوستر کا متن حسب ذیل ہے:

”زندہ قویں اپنے نامور اسلاف کی یاد تازہ کر کے موجودہ
نسلوں کو مردہ پرستی کا نہیں زندگی کا درس دیتی ہیں۔

علامہ اقبال گواں عالم آب و گل میں موجود نہیں مگر ان کی
شاعری اور ان کا پیغام آج بھی زندہ اور پائندہ ہے۔ اوریہ ان کے
افکار و نظریات کی صدائے بازگشت ہی ہے کہ ہر سال ہند اور
پاکستان میں جا بجا اس عظیم انسان کو مختلف صورتوں میں خراج
عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

اقبال کا پیغام کیا تھا؟ بچھڑی ہوئی انسانیت کے لیے قم کی جاں
بنخش آواز؟ پست ہمتی اور بے عملی کے لیے حوصلہ افزال لکار۔ تنگ

نظری اور تعصّب کو وسیع المشربی اور فراخ حوصلگی کا درس۔ خود فراموشی اور خود فرمبی کو خودی اور خود آگاہی کی تعلیم۔ انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کر دینے کی تلقین۔ غرضکہ ہماری بیت اجتماعی کو فردیا جمیعت کی حیثیت سے جتنے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان سب کا حل اقبال کے کلام اور پیغام میں موجود ہے۔ چنانچہ اسی پیغام سے ایک نئی نسل اور اسی کلام سے ایک نئی تازگی حاصل کرنے کے لیے ہم یوم اقبال منار ہے ہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس یوم اقبال میں مردہ پرستی کی رسوم ادا نہیں کیے جائیں گے بلکہ مردوں کو زندہ رہنے کا چلن سکھایا جائے گا۔ کیونکہ یہ دن اس شخص کی یاد میں منایا جا رہا ہے جس نے مردہ قوموں کی رگوں میں زندگی کا گرم خون دوڑایا ہے۔

اقبال کی بھوپال سے والبیگی اروان کی بالواسطہ یا بلا واسطہ اثرات کا ایک اور دستاویزی ثبوت ہمیں اس کتاب سے ملتا ہے جو تصورات اقبال کے نام سے اگست ۱۹۲۵ء میں حیدر آباد کن سے نفیس اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس کتاب کا مصنف بھوپال ہی کا ایک جواں سال اور قابل فخر ادیب و نقاش اسفل فخری تھا جس نے اقبال کے سانحہ ارتحال کے فوراً بعد سے لکھنا شروع کر دیا۔ اور دو ماہ کی شبانہ روز مخت شاقہ کے بعد مسودہ تیار کر لیا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اقبال کا یہ پرستار اپنے مسودہ کو کتابی صورت میں نہ دیکھ سکا۔ بلکہ یہ کتاب اس کی جواں مرگی کے بعد بھوپال ہی کے ایک اور جواں حوصلہ ادیب و شاعر عمران انصاری کی سعی و کوشش سے طبع ہو گئی۔ عمران انصاری کی شاغل فخری سے قربت و قرابت تھی۔ چنانچہ جب یہ مسودہ ان کی نظر سے گزر تو انہوں نے اسے اشاعت کے قابل بنایا اور نفیس اکیڈمی کے صاحب ذوق مالک محمد اقبال سلیم گاہندری نے اسے زیور طباعت

سے آراستہ کیا۔ یہ کتاب اب تقریباً نایاب ہے۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد مجھے یہ کتاب دستیاب ہو سکی۔ اور جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو اس کے ورق ورق سے مجھے شاغل فخری کی اقبال شناسی اس کی علیمیت اور اس کی اعلیٰ صلاحیت کا رکا ثبوت ملا۔ یہ اپنی نویت کی پہلی کتاب ہے جو اقبال کے فکر و فلسفہ کا بڑی حد تک احاطہ کرتی ہے اور جسے ہم بلا خوف تردید بھوپال کی جانب سے اقبال کے حضور پہلا قابل فخر نذرانہ عقیدت کہہ سکتے ہیں۔

”شاغل فخری ہندوستان کے مشہور صحافی مقالہ نگار اور افسانہ

نگار تھے۔ برسوں ”مدینہ“، بجور میں کام کیا ہے بچوں کے رسالہ ”غنچہ“، بجور کے ایڈیٹر بھی رہے علمی ذوق کے مالک تھے۔ سب سے بڑی یادگار ”تصورات اقبال“ ہے..... جوانی میں انتقال کر گئے

۲۔

۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں صفحہ ۲۶۔ ۲۷

۲۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ صفحہ ۲۵۰

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کے اس مختصر سے تعارف سے شاغل فخری کی عام زندگی اس کی غربت و تنگ دستی، اس کے ماحول کی گھنٹن، اس کے والد کی محبوب الہوائی اس کے ذوق علم و کتب بینی، اس کی بے پناہ ذہانت اور صلاحیت کا قطعی اندازہ نہیں ہوتا۔ البتہ تصورات اقبال میں عمران انصاری نے دو دو باتیں صفحات اتنا ۱۳۱ میں شاغل فخری اور اس کی زندگی کے بارے میں اپنے طور پر اور شاغل فخری کی ڈائری سے اقتباسات پیش کر کے اس کی شخصیت اس کی خودداری اس کی حوصلہ مندی اس کے ذوق علم اور اس کے خانگی الام انگیز حالات کی جو تصویریں پیش کی ہیں انہیں پڑھ کر انسان بے اختیار آب دیدہ ہو جاتا ہے۔ فخری کی ڈائری کے اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ اس نے انتہائی صبر آزم حالت میں زندگی بسر کی ۱۵

روپے مہانہ پر مزدوری کر کے اپنے کنبہ کا خرچ چلایا۔ والد کی دیوانگی دوجوں بھنوں کی موجودگی گھر کی خستہ حالی کے باوجود اس نے منتظر فاضل کا امتحان پاس کیا اور چند روز پر پیشانیوں محرومیوں اور ناکامیوں سے بھی دل برداشتہ نہوا بلکہ زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا۔ ارواس کی بھی حوصلہ مندی تھی کہ بھوپال کے مایناز فرزند ابوسعید بزمی ایڈیٹر مدینہ بجنور کی جب اس پر نظر پڑی تو انہوں نے بجنور بلا کر اسے رسالہ غنچہ کا ایڈیٹر بنایا۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ مدینہ ایسے بڑے اخبار کا ایڈیٹر ہو گیا اور اس کی اعلیٰ صلاحیتیں دنیا کے سامنے آگئیں وہ کتنا بڑا اقبال شناس تھا اس کے بارے میں عمران انصاری کی زبانی سینے:

”فخری تہذیب جدید کی پیداوار اور تہذیب جدید کا بہترین نقاد تھا۔ وہ تہذیب اسلامی کا زبردست ہامی اور اسلام و قرآن کا ایسا والد و شیدا تھا کہ بھی باعث ہے جو اس کی نگاہ صرف اقبال آ کر ٹھہر تی تھی۔ اور اس کے کلا کوسن سن کر جھوم جھوم اٹھتا تھا جس طرح کہ اس کی کتابی رٹی اور از بر کی جاتی ہیں اسی طرح اس نے اقبال کے ایک ایک مصروفہ کو سمجھا اور بوجھا تھا۔ وہ جس جس طرح حافظ قرآن تھا اسی طرح حافظ اقبال بھی ا۔“

وہ لگاتار کام کرنے کا بچپن سے عادی تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنی بگڑتی ہوئی صحت پر قابو پان کی کوشش کرے کیونکہ اس کے پھیپھڑے متاثر ہیں۔ اس تشخیص کے باوجود فخری نے اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو استعمال کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ زیادہ دنوں جی نہ سکا۔ اور عین جوانی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بلاشہ وہ اقبال کے کلام کا حافظ تھا۔ تصورات اقبال میں اس نے اقبال کی فکر کے تقریباً

ہر گوشہ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ بھوپال کی محدود فضائیں رہ کر اس نے اپنے علم و مطالعہ اور قوت مشاہدہ میں اتنی گہرائی اور گہرائی کیونکر پیدا کر لی.....!
محمد اقبال سلیم گاہ ہند روی حرف آغاز میں لکھتے ہیں:

”تصوراتِ اقبال مرحوم شاغل فخری کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

شاغل ایک مدت تک مشہور اخبار ”مذہب“، بجنور کی ادارت کا کام کرتے رہے اور ملک کے بہترین لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ افسوس کہ ان کی عمر نے ساتھ نہ دیا اور وہ عین جوانی میں انتقال کر گئے ان کے انتقال سے ہم نے ایک ایسے عالم کو کھوایا جس کی یاد بہت دنوں تک باقی رہے گی۔

۱۔ تصوراتِ اقبال صفحہ ۲

یہ مسودات ہمیں مرحوم شاغل فخری کے قریب ترین عزیز اور اپنے کرم فرماجناب حافظ عمران انصاری کی عنایتوں سے ملے عمران صاحب نے ان مسودات کو بڑی محنت سے مرتب فرمایا اور طباعت و اشاعت کے قابل بنایا ہے۔ ہم ان کی اس محنت و شوق کے لیے صمیم قلب سے شکرگزار ہیں۔ اگر ان میں یہ ذوق نہ ہوتا اور وہ یہ سارا کام اپنے ذمہ نہ لیتے تو شاید یہ کتاب منصہ وجود پر نہ آسکتی ہے۔“

آگے چل کر لکھتے ہیں:

”تصوراتِ اقبال میں شاغل نے اپنے مطالعہ اقبال کا حصل مختلف ابواب میں تقسیم و ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے اس میں اقبال کے تصورات و افکار کی دل نشیں انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ اور

اقبال کے کلام سے ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف مسائل انفرادی و اجتماعی پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کیا خیالات تھے اور وہ خیالات کس سرچشمہ ہدایت سے سیرابی کا نتیجہ تھے۔

شاغل مرحوم کی تحریر ساف واضح اور عالمانہ انداز کی مرتب و مربوط تحریر ہوتی ہے۔ جس میں ایک قسم کا شکوہ اور وقار بھی پایا جاتا ہے۔ مسائل کی ترتیب عموماً منطقی انداز میں کرتے ہیں۔ اور نتائج کو واضح الفاظ میں پیش کرتے ہیں ॥“

آئیے اب یہ بھی دیکھیے کہ خود اس جواں مرگ ادیب نے اقبال کی موت کا کیا اثر لیا اور اس کی نظر میں اقبال کا مقام کیا تھا۔ یہ تصورات اقبال کا پیش لفظ ہے جو شاغل نے اپنے زندگی ہی میں لکھا تھا۔ اس کے مطابع سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اقبال کی موت نے اسے کس طرح ہلا کر رکھ دیا۔ اور وہ بے اختیار قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا اور صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں یہ منفرد یادگار تصنیف معرض وجود میں آگئی:

بیا بہ مجلس اقبال ویک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند
گو اقبال کا سامنہ ارتھاں تمام دنیا ک لیے بالعموم اور عالم
اسلامی کے لیے بالخصوص ایک زبردست حادثہ ہے۔ جو صد یوں تک
بھلا یا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس کی خوشنودی روح کے لیے اب سب
سے اہم فاتحہ خوانی بھی ہے کہ اس کے پیغام کو اور اق کتب سے نکال
کر دلوں کے صحائف میں جگہ دی جائے۔ اس کو بیش از بیش سمجھا
جائے اور دنیا کو بار بار سمجھا جائے کہ ترجمان حقیقت اپنی زندگی کی

آخری سانس تک کس زندہ و طاقت و رحقیقت کو بے نقاب کرتا رہا ہے۔ تاکہ جس مقصد کے لیے اس نے جگر کا دی کی تھی وہ حاصل ہو اور جو راستہ اس نے تیار کیا تھا اس پر قدم پڑنے لگیں۔

۱۔ تصورات اقبال صفحہ ۵

۲۔ تصورات اقبال - صفحہ ۶

اقبال کو سمجھنے سمجھانے کے لیے فکر عجیق اور فرصت طویل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ فلسفہ قدیم و جدید پر پورا پورا عبور رکھنے کے ساتھ خود وہ بھی ایک زبردست مفکر ہے اور برسوں غور و فکر کے بعد اس نے حیات انسانی کے لیے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ تمام تر کلام اللہ کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس کے فلسفیانہ نکات جو وجدان و شعریت کی زبان میں ادا ہوئے ہیں وہ سب قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تشرع ہیں اس لیے اگر اقبال کو صرف فلسفیانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ معما بن جاتا ہے۔ اس کے فلسفہ کی پچیدگیاں سمجھانے کے لیے قرآنی بصیرت کی ضرورت ہے۔ وہ حیات انسانی کو اس بلند ترین نصبِ العین سے واقف کرنا چاہتا ہے جو قرآن نے متعین کیا ہے اور ہرئے اسلوب میں وہی کچھ کہتا ہے جو قرآن نے کہا ہے۔

اقبال کی مہمات سخن سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے سب سے پہلے اس کی روشن فلکر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ شعر و حکمت کے باب میں اس کے انداز تفہیر پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن اس مقام پر بھی چند الفاظ بطور تعارف عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

اقبال کے تجیلات کا مرکزی نقطہ زندگی ہے اور اس کا تحفظ و ارتقا
اس کے تصورات کا نصب العین ہے۔ وہ موجودات کے حقائق سے
آنکھیں بند نہیں کر لیتا بلکہ ان کو بغور دیکھتا اور زندگی کی راہیں تلاش
کرتا ہے۔ اس میں اس کا فلسفہ عمل کا فلسفہ ہے۔ اور اس کا یہ علم یا
فلسفہ ادب خورده دل ہے اور دل کو وہ عشق و وجدان کے زیر فرمان
رکھتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کہ علم ہمیشہ علم کا دست
پرور رہا ہے۔ حیات کی پیچیدگیاں محض عقل سے نہیں سمجھائی جا
سکتیں۔ عقل کی جوانیوں کے لیے ایک خاص حد مقرر ہے جس سے
آگے بڑھنے کے لیے اس کو دوسرا زبردست و برتر قوت کی رہنمائی
میں چلنا پڑتا ہے جس کو اقبال نے عشق و وجدان سے تعبیر کیا ہے عقل
کی نارسائی اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے جذبہ شعریت کا ہی وہ
اج تک مکمل تجزیہ نہ کر سکی۔ کبھی تو اس کی ہمہ گیری اور زبردست اثر
اندازی دیکھ کر اس کو مفید بناتی ہے۔ اور پھر جب اس کے حدود کا
احاطہ نہیں کر سکتی تو لغو والا یعنی کہہ کر دامن چھڑا لیتی ہے۔ یہی بے
چارگی اس کو صلی اللہ علیہ وسلم ح کے معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اس طرح مذہب
کا تعلق بھی عقل سے زیادہ وجدان سے ہے۔ اگر اس راستے میں
صرف عل کی مشتعل جلائی جائے تو تاریکی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔
اور قدم قدم پڑھو کر لگتی ہے۔ مجرد عقل شک و موسسہ کی دلدل میں
پھنسا دیتی ہے اور عشق و وجدان یقین و استقامت کی ٹھوس چٹان پر
کھڑا کر دیتا ہے۔ کیفیات قلب کو سمجھنے کے لیے دل ہی کی روشنی میں

آن پڑتا ہے۔ اور ان کے اظہار کے لیے دل ہی کی زبان درکار ہوتی ہے۔ اس لیے عقل اسی وقت کامل ہوتی ہے اور نظارہ کی پریشانی اسی وقت دور ہوتی ہے کہ نظر وہ کی ہمراز ہو..... یہی تفکر اقبال کا بنیادی نقطہ ہے۔

اقبال پر لکھنے کا خیال ایک عرصہ سے دل میں تھا۔ جو امر وزو فرد اپرٹل رہا تھا۔ کہ اس کے ساتھ سانحہ ارتھاں کی خبر میرے اعصاب و حسیات پر ایک برقی تازیانہ بن کر گئی اور ایک ناقابل ضبط و شدید ترین اندر وہی تقاضہ سے بیتاب ہو کر میں اس طرف متوجہ ہوا اور دو ماہ کی مسلسل کاوش کے بعد ان صفحات کو پورا کیا۔
اس کے فوراً بعد نیاب اشک خونیں ہے ملاحظہ ہو:

حلقة مستند سر تربت من نوحہ گراں
دلبران زهرہ وشان گلبدنان سیم بران
(پیام مشرق)

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صحیح کیسی المناک صحیح تھی۔ کہ ایک طرف آسمان پر سورج بلند ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف زمین کے اندر مشرق کی عظمت و سعادت کا آفتاً غروب ہو رہا تھا۔ دنیا کے لیے یہ بہت ہی جانکاہ حادثہ تھا۔ وہ چیخ اٹھی کہ اور س کے صبر و ضبط کا کلیجہ پھٹ گیا۔ حسرت کی آنکھ یہ دیکھ کر خوب چکاں ہو گئی کہ عشق کا وہ شعلہ جو صدیوں کی افسر دگی کے بعد اقبال کی آہ سحر گا ہی و سوز نفس سے بھڑک اٹھا تھا۔ پھر سیاہ پوش ہو گیا۔ جب میں کو پر فشاںی سکھانے والا طائر

لا ہوتی عالم آب و گل سے منہ موڑ کر افلاک کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔
اور وہ نے نواز حیات دیکھتے ہی دیکھتے فردوسی حوروں کا وجدانی نغمہ
بن گیا۔

وہ لب ہائے الوہیت کا ایک لطیف تسم تھا جس کا کوثر و تنیم کی
موجوں میں ڈوبا ہوا نطق شیریں اس چن کی آپیاری کر رہا تھا۔ وہ
حیات انسانی کا پیغام بر تھا جا کے سینہ کا مد و جزر مشرقی روحانیت کے
لیے درس ابدیت اور مغربیت مادیت کے لیے برق خاطف تھا۔ وہ
اسلامیان عالم کا حسان ثانی تھا جو انسانی غیرت و خودی کے لیے
غفلت کا شکن تازیانہ بنا اب کون ہے جو ہم کو افلاک کی سیر کرانے؟
.....
اب کس کے منہ سے ہم ستاروں کا پیغام اور نوریوں کے گیت
سینیں؟..... آہ اب کس کی زبان وہ آتش بیانی ہے جو عرش نشیں کے
حضور میں ہم خاکیوں کی طرف سے سپاس نامہ پیش کر کے جواب
حاصل کر سکے؟.....

حسن ہمیشہ اس کے لیے ترپے گا

اور

عشق ہمیشہ سو گوارہ ہے گا

پس از من شعر من خواند دریا بندی گویند
جهانے را ڈگر گوں کردیک مرد خود آگاہ ہے

(پیام مشرق)

ماتم اس کا نہیں کہ اقبال کی رحلت نے شاعری کا دروازہ بند کر دیا۔ بہت سے نفر گو اور شیوه بیان شاعر موجود ہیں اور بہتر سے میر و مومن اور غالب و حالی مستقبل کے گھوارے میں پروش پار ہے ہیں۔ دل کی خون چکانی اس لیے ہے کہ جو صدائے ربانی آج خاموش ہوئے ہے وہ مدتیں بلند نہیں ہو سکے گی۔ کہ اس وقت زمانے کا رہجان دوسرا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چن میں دیدہ ور پیدا
(بانگ درا)

اقبال ہم سے نہیں چھنا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ سے ہی
چھن گئے ہیں وہ ہم سے ہمارا تعارف کرا رہا تھا۔ تاکہ ہم اپنی
صد اقوتوں سے واقف ہو کر ارض و سما پر چھا جائیں اور کائنات کی
پہنائیاں ہماری جوانیوں کے لیے تنگ ہوں۔ دیکھیے کن پر سوز الفاظ
میں ہمارے لیے خدا سے عزم واستقامت کی دولت طلب کرتا ہے:
دل مرد مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرہ لاتزر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہ مسلمان کو تلوار کر دے
حسن و عشق کی داستانیں تو ابھی بہت کچھ بیان ہوں گی لیکن یہ آتشیں نعرے اب کون
بلند کر سکے گا:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزاداں چاک
(بال جبریل)

در دشت جنون من جبریل زبول صیدے
یزاداں بکمد آور اے ہمت مردانہ
(زبور عجم)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھئے بتا تیری رضا کیا ہے اے
(بال جبریل)

اس باب کے بعد دیگر ابواب جس ترتیب سے لکھے گئے ہیں اور جن جن موضوعات کا
اٹھ اٹھ کیا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

اسلام و مومن صفحہ ۱۵ تا ۲۸

روحانیت و مادیت صفحہ ۲۹ تا ۳۳

دین و سیاست صفحہ ۳۲ تا ۳۹

۱۔ تصورات اقبال صحراء تا ۱۲

ملوکیت واشتراکیت صفحہ ۲۰ تا ۲۷

قومیت و بین الاقوامیت صفحہ ۲۷ تا ۱۱۳

شعر و حکمت صفحہ ۱۵ تا ۱۶۳

موت و حیات صفحہ ۱۶۲ تا ۱۸۷

خودی صفحہ ۱۸۸ تا ۲۱۳

بے خودی..... ۲۱۵ تا ۲۵۰

۲۵۱..... خلاصہ کلام

اور آخر میں گل ہائے عقیدت ہیں جو صفحہ ۲۵۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۵۳ پر ان اشعار کے ساتھ ختم ہوتے ہیں:

مثُلَ الْوَانِ سَحْرَ مَرْقَدِ فَرَوْزَانِ
 نُورٌ سَّهْمٌ مُعْمُورٌ يَهْ خَاكِي شَبَّتَانِ
 آسَماَنِ تَيْرِي لَهْدٌ پَرْ شَبَّنِ فَشَانِ
 سَبْرَهُ نُو رَسْتَهُ اَسَّهَرَ كَيْ نَغَهَبَانِ
 (باگ درا)

مختلف ابواب میں شاغل نے اپنے فکر و قلم کے خوب جوہ رکھائے ہیں۔ اور شاعر مشرق کے اشعار سے ہی نہیں بلکہ قرآن مجید اور احادیث کے جابجا حوالے دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ:

”اقبال نہ محض شاعر تھا نہ محض فلسفی۔ دراصل وہ ایک حقیقت
 کبریٰ کا پیغام بر تھا اور حسن کا ادا شناس عاشق۔ اس کی شیریں و آتش
 بیانی اس کی فکر و نظر کی مستی ہے جس سے اس کا پیغام دماغوں سے
 گزرتا ہوا لوں کی گہرائی میں اتر جاتا ہے محض شاعری یا محض فلسفہ خود
 اس نے بھی کبھی اپنا سرمایہ اختار نہیں جانا۔ اس کا مطلع نظر شعر گوئی و
 فلسفہ سنجی نہیں..... بلکہ پیش اندازی تھا۔“

بھوپال کے ہونہار اور صاحب بصیرت نوجوان ادیب شاغل فخری مرحوم نے تصورات اقبال کھل کر صرف اقبالیات کے مطالعہ میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ بھوپال کی ادبی تاریخ میں

اولیت کا شرف بھی حاصل کیا۔ اس کتاب کی توضیح و تشریح کے دوران ایک جگہ شاغل مرحوم نے اقبال کے تصور پاکستان کو بظاہر ناممکن العمل قرار دیا تھا۔ کاش وہ زندہ ہوتا تو اپنے نظریہ کی اصلاح کر لیتا اور پاکستان ایسی..... اسلامی مملکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا اور یقیناً خوش ہوتا۔ کیونکہ وہ نہایت روشن خیال اور ہوش مندادیب تھا۔ اور خود اصلاحی کا قدرت نے اسے جو ہر عطا کیا تھا۔ ویسے بھوپال کا یہ تنہا نوجوان ہے جو صحیح معنوں میں اقبال کا سچا عاشق تھا۔ اور مرتبے مرتبے بھی اقبال کے سلسلے میں اس نے جو کلمات ادا کیے وہ اس کے سچے عشق اور جذبہ صادق پر دلالت کرتے ہیں عمران انصاری لکھتے ہیں:

”میرے ہی مواجهہ میں اقبال پر ایک سیر حاصل گفتگو اس نے کی اور اقبال کی صحیح صحیح منزلت کے بارے میں جس اعتقاد و یقین کے ساتھ وہ اپنے عقائد کا اظہار کر رہا تھا اس وقت میری آنکھوں میں وہ تصویر بسی ہوئی ہے کہ کھانسی کو پوری طرح روک کر دونوں گھٹنوں کو دونوں بازوؤں میں گھٹنے کے بعد وہ تن کر بیٹھ گیا تھا اور سیاہ حلقوں میں بے نور ہو جانے والی آنکھوں میں اقبال کی تصویر کھیچنے رہا تھا۔ اللہ اکبر ہے نام اللہ کا!“۔

شاغل فخری کے علاوہ بھوپال کی جن دیگر ممتاز شخصیتوں نے اقبال کو موضوع بحث بنایا ان کے فلکر و فن پر کام کیا ان میں رضیہ فرحت بانو محمد امین زبیری، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، اور عبدالقوی دسنوی قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی ادبی کاوشوں کا آئندہ صفحات میں احاطہ کیا گیا ہے۔ صرف رضیہ فرحت بانو کی مرتبہ کتاب خطبات اقبال مجھے دیتات نہ ہو سکی لیکن یہ کتاب اقبال لاہوری بھوپال میں موجود ہے۔ رضیہ فرحت بانو بھوپال کی ممتاز ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں۔

تصورات اقبال کی طرح ایک اور اہم کتاب اقبال کا سیاسی کارنامہ ہے۔ جسے محمد احمد خاں ایم اے ایل ایل بی نے تالیف فرمایا ہے۔ یہ کتاب کاروان ادب کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

بھوپال کے بلند پایہ اور شہرت یافتہ ادیب انشاء پرداز محقق اور مورخ محمد امین زیری مارہروی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانے سے نواب حمید اللہ خاں کے دور حکومت تک آپ نے بھوپال میں رہ کر جو علمی ادبی تاریخ اور تحقیقی کارنا مے انجام دیے ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے ماہنامہ ظل السلطان بھوپال کی ادارت کے زمانے میں اقبال سے آپ کی خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مہتمم تاریخ کی حیثیت سے آپ کا نام بھوپال کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں آگئے اور یہیں انتقال فرمایا۔ میرے عم محترم پروفیسر نواب علی سے محمد امین زیری اکثر ملاقات کے لیے مجھے اپنا ایک معركہ آرا مضمون تصور پاکستان بھی عطا کیا تھا جو خود میری بے سروسامانی کے سبب مسودات میں کہیں گم ہو گیا۔ جب ۱۹۵۹ء میں نے اپنی کتاب کا کام شروع کیا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ کہ محمد امین زیری نے اقبال پر ایک کتاب بعنوان خدو خال اقبال تحریر کی ہے جو شائع نہیں ہو سکی۔ تحقیق سے یہ بھی پتا چلا کہ اسے انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام شائع کر دیا جائے۔ کسی وجہ سے انجمن اس کتاب کو شائع نہیں کر سکی عجب اتفاق ہے کہ میں اپنی اس کتاب کے آخری ابواب مکمل کر رہا تھا کہ مجھے سید انیس شاہ جیلانی کی مرتبہ کتاب نوازش نامے تبصرے کے لیے موصول ہوئی اور یہ دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی کوئے انتہا نہ رہی کہ جس مسودہ کی تلاش میں میں سرگرد ایں رہا اس کی تفصیلات خود محمد امین زیری کے ان خطوط

میں مل گئی جوانہوں نے سید انیس شاہ جیلانی کو ۱۹۵۶ء میں تحریر کیے تھے۔

۱۔ تصورات اقبال صفحہ ۲۷

۲۔ بعد کی تحقیق سے اقبال کا سیاسی کارنامہ محمد امین خاں سابق چیف جسٹس بھوپال کی ثابت نہیں ہوئی ملا حظہ ہو دیا چڑھنے والی

انیس شاہ جیلانی نے ان خطوط سے قبل جو وضاحتی نوٹ لکھا ہے اس کے مطابعے سے خدوخال اقبال کے بارے میں کئی ایسی تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں جن سے اردو دنیا تقریباً اور اقبال شناس آج تک لاعلم تھے۔ لکھتے ہیں:

”مرحوم (محمد امین زیری) سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس

مجموعہ میں شریک تقریباً سبھی خطوط میں ذکر خیر ان کی تصنیف

خدوخال اقبال کا ہے۔ میں یہ مسودہ ان سے حاصل کرنے میں اس

لیے ناکام رہا کیونکہ میری مالی حالت چند ماں قابل رشک نہ تھی۔ والد

محترم کو میرا پبلشر بن کر ان کا روپیہ ضائع کرنا گوارانہ ہوا۔ حالانکہ یہ

کتاب کاروباری لحاظ سے بھی خاصی کامیاب رہتی جیسا کہ جوش ملیح

آبادی نے بھی رحیم یار خاں بہاول پورڈویژن میں والد صاحب کے

پوچھنے پر بتایا تھا کہ اور یہی مشورہ جناب رئیس احمد جعفری مدظلہ مرحوم

نے دیا تھا کہ اشاعت کا اہتمام کر ڈالنا چاہیے۔ لفغ نہ سہی لاگت تو

نکل ہی آئے گی۔ پچھلے دنوں مرحوم کے ایک قربی عزیز سے جن کے

پاس وہ مسودہ محفوظ ہے حصول مسودہ کی تحریک کی گئی اور میں گھر

پھونک تماشہ دیکھنے پر آمادہ ہوا بھی تو وہ کافر مسلمان ہو گیا اور یہ لکھا کر

پچھا چھڑا لیا کہ فی الحال وہ اس تصنیف کو منظر عام پر لانے کے حق

میں نہیں ہیں۔ زبیری مرحم کی روح یقیناً اس انکار پر تڑپ اٹھی ہو گی۔ یہی وہ زبیری ہیں جن کے طفیل اردو ادب میں مکاتیب شبلی بنام عطیہ کا گراں بہا اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ شبلی کے انسان ہونے کا ثبوت بھی ملا۔

خدا کرے خود خالِ اقبال کو منظر عام پر لانے کی سعادت مجھے
حاصل ہو لیکن ہی میری ہی آرزو تو ہے اور اس کا شرمندہ تعبیر ہونا
معلوم ہے۔

اس وضاحت کے بعد مجھے محمد امین زبیری کے وہ خطوط شامل ہیں جن کے مطالعے سے
محوزہ کتاب کے بارے میں نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں جستہ جستہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱)

”اک۔ اک۔ سکول کل غلط ن کراچی

لے دسمبر

مکرم و محترم تسلیم

آپ کا محبت نامہ کل موصول ہوا۔ خطوط شبلی سے اغلبًا کتاب شبلی

کی رنگین زندگی مراد ہے۔

انواعِ نامے۔ صفحہ ۵۸۔۵۷

آپ ذکر شبلی ملاحظہ فرمائیے جو حیات شبلی پر تقید ہے۔ اس سے
اصل حالت معلوم ہوتی ہے اور کیسی تدبیس و تلبیس ہے۔

یہی حالت علامہ اقبال کی سوانح عمریوں کی ہے۔ میں نے ان

پر تقييد بھي لکھي ہے۔ خدو خال اقبال تاریخی نام ہے لیکن اپنی ضعیف
 العمري اور علالت کی وجہ سے نظر ثانی نہیں کر سکا۔
 میری عمر ۸۶ سال میں ایک مہینہ کم ہے۔ کوئی تصویر نہیں اور
 تصویر کا کیا ہوگا۔ اب تو سکون کو دل چاہتا ہے۔
 خدو خال اقبال بڑی معركہ آرا کتاب ہو گی۔ پاکستان یا تقسیم
 ہند کا تو کا واسطہ بھی نہیں۔ یہ صرف بزم اقبال وغیرہ کا پروپیگنڈا
 ہے۔

معاف فرمائیے میرے متعلق آپ نے حسن نظر سے کام لیا ہے
 ورنہ من آنم کہ من دانم۔
 زیادہ شوق ملاقات
 خاکسار

محمد امین زبیری ۱۹۵۶ء

(۲)

”.....علامہ اقبال پر میری تقنید شاعرانہ نہیں بلکہ علامہ اقبال کی
 سیرت پر جو کتا میں شائع ہوئی ہیں ان پر انہی خطوط سے تقнید ہے۔
اگر آپ تیار ہوں تو میں مسودے دوں گا۔ اس کتاب کے
 متعلق بالمشافہ گفتگو کی ضرورت ہے۔
 میں یہاں ۸۶ سال کی عمر میرے لیے سفر ممکن نہیں آپ خود
 تکلیف فرمائیں اس کا تاریخ نام خدو خال اقبال ہے عطا یہ بیگم میکلوڈ

روڈ ایوان رفتہ پتہ ہے۔ اپنی خاص عنایت فرمائیں۔

خادم۔ محمد امین زبیری

۱۹۵۶ء دسمبر ۲۵ اکتوبر کراچی مہر ڈاک خانہ ۷۲۱۳/۱۲

(۳)

”۱۹۵۶ء دسمبر ۲۵“

..... کتاب کا نام میں نے خدو خال اقبال تجویز کیا ہے۔ مسودہ دیکھے بغیر آپ قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے..... زیادہ انسب ہو گا کہ آپ ہی لکھیں کہ کیا ادا کر سکتے ہیں۔ کتاب مطبوعہ کے ۲۰۰ صفحات ہو جائیں گے۔ میں نے تمام کتب میں حوالوں سے ہی کام لیا ہے..... ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی مسودہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

خلاص

محمد امین زبیری

(۴)

”۱۹۵۷ء جنوری ۳“

..... یہ کتاب بڑے معركہ کی ہے۔ آج کل اقبال کو انیماۓ کرام کی صفات میں ان کی سیرت نگاروں نے شامل کر دیا ہے۔..... جہاں تک شاعری کا تعلق ہے جس قدر تعریف کی جائے بجا ہے..... میری کتاب دراصل ان کی سوانح عمریوں کی تنقید ہے۔ واقعات ارو انہی کے خطوط سے..... مجملًا چند عنوان پیش ہیں

تمہید۔ شاعری کی تعریف۔ سیرت نگاروں پر تنقید۔ نقوش سیرت۔ ابتدائی حالات۔ مناہل زندگی۔ اقتباس خطوط بنام عطیہ بیگم۔ غیر ملکی لباس سے نفرت۔ شان فقر و غیور۔ ایک نیشنل فنڈ بلند ارادے۔ عملی زندگی۔ خطاب۔ جنگ عظیم کے متعلق نظمیں۔ علی گڑھ کی تحریک۔ مدحت طرازی۔ خالص تعلقات۔ اقبال اور وزیر اعظم سرکش پرشاد نظام سے ملاقات۔ شاہان افغانستان سے خاص تعلق۔ سر راس مسعود سے درخواستیں۔ اور وظیفہ بھوپال۔ سیاست۔ عام سیاسی مصروفیات۔ تصور پاکستان کا تاریخی منظر اچودھری رحمت علی کے ایک رفیق کا بیان۔ چند تجھبات۔ انتقال۔ یہ فہرست بہت محمل ہے۔ تاہم نصف اندازہ ہوتا ہے۔

خلاص محمد امین زیری

(۵)

”جنوری ۱۹۵۷ء“

.....میرا شغل تصنیف و تالیف پیشہ وار اندھیں۔ میں ۷۸۱۹۰۷ تا ۱۹۳۱ء فردوں آشیاں بیگم صاحبہ بھوپال کا لٹریری استٹمنٹ اور ایک بڑے دفتر کا انسچارج تھا جس کا تعلق مصنفوں وغیرہ سے بھی رہتا تھا۔ دفتر میں ہمیشہ تین چار ادیب و مصنف میرے ماتحت تھے خدا کا شکر اور بھوپال کا احسان ہے کہ مجھے میرے گزارے کے قابل پیش ملتی ہے البتہ مہاجرت نے گزاراً گراں تر بنادیا ہے۔ مہاجرت سے پہلے

میری جس قدر کتابیں شائع ہوئیں وہ میرے شوق کا نتیجہ تھیں اور
صرف یہ خیال رہتا تھا کہ گرہ سے خرچ نہ ہو اور نفع اتنا ملے کہ اپنے
دوستوں اور لامبیریوں کو ہدیہ دے سکوں.....

میں نے آپ کے خط کے ایک فقرہ پر کہ کم از کم دنیا کو تصویر
کا دوسرا رخ تو نظر آجائے گا۔ بے ساختہ خیال کیا کہ:

سپر دم بتو ماہی خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

اے سہوکتابت ہے پس منظر ہونا چاہیے۔

خدا کرے ہمارے نوجوان ایسے ہی خیال کے ہو جائیں تو یہ ملیع
کاریاں نہ ہو سکیں۔ اب معاملہ معاملہ کی طرح کیجیے!
خلاص محمد امین زیری!

لیکن یہ معاملہ کسی وجہ سے طے نہ ہو سکا۔ اور جیسا کہ سید انیس شاہ جیلانی نے وضاحتی
نوٹ میں بھی لکھا ہے کہ وفات کے بعد انہوں نے دوبارہ مسودہ حاصل کرنے کی سعی و جہد
کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور اس طرح یہ مسودہ آج تک شائع نہ ہو سکا۔

اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ڈاکٹر سلیم حامد
رضوی کا تحقیقی مقال ہے جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ یہ مقالہ ادبی کتابی
صورت میں جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا کتاب کا آٹھواں باب دور پنجم کی تخلیقات پر
مشتمل ہے جس میں ۱۹۲۷ سے ۱۹۲۹ء تک کے ادیبوں شاعروں انشاء پردازوں اور ان
مشاہیر کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی عنوان بھوپال سے وابستہ رہے..... یہ نواب حمید اللہ
خاں آخری فرمائ روانے بھوپال کا زمانہ ہے جن کے دور حکومت میں ریاست بھوپال نے

صنعتی ترقی اور آئینی اصلاحات کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے میدانوں میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ مشاہیر علم و ادب کا تعلق آئینی اصلاحات کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے میدانوں میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں مشاہیر علم و ادب کا تعلق بھوپال سے کی ذیلی سرخی کے تحت سب سے پہلے راس مسعود کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۳۶۸ تا ۳۶۲ ڈاکٹر اقبال کے عنوان سے ابتدأ اسطری نوٹ لکھا ہے۔ جس میں ان کے بھوپال آنے اور ریاض منزل میں اور شیش محل میں قیام کا حال درج ہے پھر انہوں نے راس مسعود کے نام اقبال کے ان چند خطوط سے اقتباسات دیے ہیں جن کے مطابعے سے نواب صاحب بھوپال اور اقبال کے خصوصی روابط پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تمام خطوط گزشتہ صفحات میں زیر بحث آچکے ہیں۔ اس لیے ان کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ اقبال نامہ ہی سے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے وہ قطعہ بھی نقل کیا ہے جو مولانا حمالی کی صدم سالہ برسی پر اعلیٰ حضرت کی موجودگی میں اقبال نے پڑھا تھا۔ اس کے بعد نذرینیازی کے مضمون اقبال کی آخری علاالت کا ایک حوالہ دیا ہے جس میں جا بجا بھوپال کے قیام کا تذکرہ ہے۔ آگے چل کر ضرب کلیم کی ان نظموں کی نشان دہی کی ہے جو دوران قیام بھوپال اقبال نے کہی تھیں علاوہ ازیں مشہور مثنوی پس چہ باید کردے اقوام شرق کے بارے میں ہے جو دوران قیام بھوپال اقبال نے کہی تھیں اس خواب کا بھی ذکر ہے جو انہوں نے شیش محل میں دیکھا تھا اور اس کے فوراً بعد مثنوی کے اشعار کا نزول شروع ہو گیا تھا۔ سب سے آخر میں انہوں نے اقبال کے بھوپال سے تعلق خاص کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد کی نسل نے اقبال کے فکرون سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں فرماتے ہیں:

”بھوپال کی سرز میں کو یہ فخر حاصل ہے کہ علامہ اقبال نے چند

ماہ بیہاں گزارے ارو بیہاں کے فرمان روای کی محبت اور عظمت ان کے

دل میں مستقل طریقہ پر جا گزیں رہی۔ مقامی شعراء کے ۱۹۳۵ء کے بعد کے کلام کو اٹھا کر دیکھیے تو آپ علامہ اقبال کے نقوش و افکار بہت نمایاں ملیں گے۔

۱ نوازش نامے صفحہ ۵۸ تا ۷۶

۲ یہ خطوط مسٹر ممنون حسن خاں صاحب بی اے کے پاس تھے جن سے شیخ عطاء اللہ نے حاصل کر کے اقبال نامہ کے مجموعہ مکاتیب اقبال کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیے ہیں۔ (ڈاکٹر سلیمان حامد رضوی)

اس چیز نے علامہ اور بھوپال کے رشتہ کو اور زیادہ مضبوط کر دیا
ہے۔

عبد القوی دسنوی سیفیہ کالج بھوپال میں اردو کے لیکچر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے بھوپال میں رہ کر اردو کی نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔ نوائے سیفیہ کالج کا امتیازی جریدہ ہے جس نے آپ کی زیر نگرانی اردو زبان و ادب کی ٹھوس خدمت کی ہے۔ آپ کو بچپن سے ہی اقبال سے عقیدت و محبت تھی۔ جب ۱۹۶۱ء میں آپ بھوپال بحثیت لیکچر پہنچ تو آپ اقبال کا بخوبی مطالعہ کر چکے تھے چنانچہ آپ نے ایک مضمون علامہ اقبال بھوپال میں تحریر کیا جو پہلے نوائے سیفیہ میں شائع ہوا بعد میں آپ نے اسی مضمون کو کتابچہ کی صورت میں بھی ۱۹۶۷ء میں شائع کر دیا۔ یہ کتابچہ سائز کے صفحات پر مشتمل ہے۔ آغاز میں آپ نے ان مشکلات کا ذکر کیا ہے جو اقبال پر کام کرنے کے سلسلے میں پیش آئیں فرماتے ہیں:

”..... جب میں تعلیم سے فراغت پا کر فروری ۱۹۶۱ء میں

بھوپال آیا تو اس وقت تک اقبال کو مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کر چکا

تھا۔ اور ان کی عظمت کا معرفت اور شاعری کا دل دادہ ہو چکا تھا۔ ان کے افکار و خیالات اور تصورات دل کے مختلف گوشوں پر اپنائیے جما چکے تھے۔ یہاں اقبال کے عاشق اور ان کے دیوانے ان کی آمد کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے نظر آئے۔ میں نے ایسے لوگوں کی آنکھوں میں تذکرے کے ساتھ خوشی کی چمک چھروں پر مسرت کی دمک اور دلوں میں فخر کے جذبات محسوس کیے۔ لیکن مجھے یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ یہاں کب آئے کیوں آئے اور نواب صاحب بھوپال سے ان کے کس قسم کے تعلقات تھے؟ اور سر راس مسعود نے دوستی کا حق کس طرح ادا کیا۔ اس قسم کے خیالات ہمیشہ دل میں چکیاں لیتے رہے یہاں کے لوگوں سے دوبارہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی مایوس ہونا پڑا۔ اس میلے کہ اس دور میں ان لوگوں میں سے جو علامہ کے قریب رہے تھے بہت کم موجود ہیں۔ باقی یا تو بھوپال چھوڑ چکے ہیں یا ملک عدم کی راہ لے چکے ہیں۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور باوجود نامساعد حالات کے کوشش جاری رکھی۔

علامہ اقبال سے ملنے والوں میں خاص طور سے منون حسن خاں ۲ کا نام لیا گیا موصوف اس زمانے میں سر راس مسعود کے سیکرٹری تھے اور علامہ اقبال کی دلکشی کا کام انجام دے رہے تھے۔ خان صاحب علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے۔ اور اس دور کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں۔ ان سے علامہ اقبال اور بھوپال کے تعلق سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے

بہت حد تک میری رہنمائی ہست افزائی اور بڑی مدد کی۔

۱ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ صفحہ ۲۶۸

۲ آپ بفضلہ حیات ہیں۔ قیام بھوپال ہی میں ہے سنگیا ہے کہ آپ نے اقبال پر بہت کچھ لکھ رکھا ہے جواب تک شائع نہیں ہو سکا۔

۳ آپ کے انکشافت کے لیے ملاحظہ ہو دیا یہ طبع ثانی

ان کے علاوہ عبدالحیم النصاری صاحب، اقبال حسین خاں
صاحب حکیم قمر الحسن صاحب زیر احمد صدیقی صاحب یوسف قیصر
صاحب اور اختر سعید خاں صاحب سے اس سلسلے میں کافی تعاون ملا
۔ دراصل ان صاحبان کی دلچسپیوں نے ہی اس کام کو اس منزل تک
پہنچانے میں میری ہمت افزائی کیا۔

یہ کتاب پچھے عبدالقوی دسنوی نے بطور خاص مجھے بھی ارسال کیا تھا۔ اور مجھے یہ لکھا کہ
علامہ اقبال پر اس سے زیادہ مواد نہیں ملا۔ آپ اس کام کو تمکیل تک پہنچائیں۔ کیونکہ انہیں یہ
علم تھا کہ اقبال اور بھوپال کے موضوع پر میں عرصہ دراز سے کام کر رہا ہوں۔ اور اس سلسلے
میں بھوپال کے متعلق حضرات کو خطوط لکھتا رہا ہوں۔ اس کتاب پچھے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا
ہے کہ دسنوی صاحب نے اسے بہت عجلت میں تحریر کیا ہے۔ اور پہلی ہی نظر میں جو مواد مل گیا
اسے اپنے مضمون میں سمیٹ لیا۔ حالانکہ یہ موضوع ایسا نہ تھا کہ عجلت اور رواروی کا شکار ہو
جاتا۔ خود بھوپال کی لا بھری یوں میں ندیم گفت روزہ اور دوسرے اخبارات و رسائل کی فائلیں
مل سکتی تھیں۔ جن میں اقبال پر شائع ہونے والا مواد بآسانی ء حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن
افسوں کہ وہ ادبی سرمایہ اب تک تاریکی میں ہے۔ شاید آنے والے دور میں کوئی محقق یا خود
عبدالقوی دسنوی اسے ڈھونڈ نکالیں اور نشر و اشتاعت کی جو سہ لوگوں میں سرسری ہو سکے۔

تحت اسے کتابی صورت میں شائع کر دیں۔ اس منتشر مواد کو یک جا کیے بغیر اقبال کے ان گھرے اثرات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جو بھوپال کی نئی اور پرانی نسل نے قبول کیے اور جس کے نتیجہ میں اقبال شناسی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

کتابچہ کے صفحہ ۵ پر انہوں نے اقبال سے ملاقات کرنے والوں کے جو نام شائع کیے ہیں ان میں دونام محل نظر ہیں مفتی انوار الحق کا اقبال کی بھوپال آمد سے بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا اور آصف شاہیری اس وقت بہت کم سن تھے جب اقبال قیام کے لیے بھوپال آئے اسی طرح دیگر واقعات میں کسی تسلسل یا ظلم و ضبط کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ ان معمولی کوتا ہیوں کے باوجود عبدالقوی دسنوی کی سمجھی وجہ لا یق تحسین ہے۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ اقبال کے زمانہ قیام کی کتنی ہی شخصیتیں پاکستان منتقل ہو گئیں یا جن میں سے چند ایک سے راقم الحروف رابطہ کر سکا اور کتنی ہی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں یا منون حسن خاں کی ذاتی گرامی..... آج بھی اقبال کے سلسلے میں سب سے متند اور مقتدر ہے۔ کاش وہ اپنے اس اردو اور انگریزی مواد کو جلد منصہ شہود پر لا سکیں جو اقبال سے ان کی عقیدت و وابستگی کے نتیجہ میں معرض وجود میں آ چکا ہے اور اشاعت کا منتظر ہے۔ اگر ان کی یہ کتابیں شائع ہو جائیں تو یقیناً اقبال اور بھوپال کے قربی اور گھرے روابط کے کچھ اور نئے گوشے دنیا کے سامنے آ جائیں گے۔ کاش جلد ایسا ہو سکے۔

اقبال کی بھوپال میں آمد و قیام سے..... بھوپال کے ادیبوں شاعروں فن کاروں اور اہل علم نے جو ثابت دیر پا اور گھرے اثرات قبول کیے ان کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد کا زمانہ برصغیر میں سیاسی تحریکات کے عروج کا وَ زمانہ ہے جب اقبال کے پیغام بیداری، حب الوطنی کے ترانوں اور آزادی کے نغموں نے غلامی اور محکومی کے خلاف جدوجہد میں ہندوستان کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کو سیاسی رہنماؤں اور

مجاہدین آزادی کی صفوں میں دو شبد دو شکر لاکھڑا کیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے فرج کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تمام ترقی صلاحیتوں کو جہاد آزادی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس طرح بھوپال کے فن کا رابھی جہاد آزادی میں برابر کے شریک تھے۔

۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں صفحہ ۳۔۲

۳۔ ملاحظہ ہود پیاچہ طبع سوم

بھوپال جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ ہمیشہ سے شعروخن اور علم و ادب کا گھوارہ ہے۔ بھوپال کے بیشتر والیان ریاست اکابر اور اعلیٰ حکام نہ صرف بلند پایہ شاعر اور صاحب دیوان گزرے ہیں بلکہ ان کی علم و سی ادب نوازی شاعروں اور ادیبوں کی قدر شناسی سر پرستی اور عزت افزائی بھی ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ بھوپال کے ریاستی ماحول میں شعروخن کی محفلیں ہمیشہ برپا ہوتی ہیں۔ اپنے مزاج اور روایات کے اعتبار سے بھوپال کے شعر اعموماً غزل کی طرف مل رہے اور اسی منابت سے بھوپال کو شہر غزل کہا جاتا تھا۔ بھوپال کے مذاق شعری کا اندازہ ایک دلچسپ واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

اخوان ریاست سے تعلق رکھنے والے ایک تحصیل دار میاں اسد اللہ خاں جب اپنی تحصیل سے دیہاتوں کے دورے پر جاتے تھے تو ان میں فرائض منصبی انجام دیتے تھے کہ بعدرات کو ان کے کمپ میں محفل شعروخن گرم ہو جاتی تھی جس میں قصبه کے شراء کے علاوہ پٹواری قانون گو وغیرہ بھی شاعر یا سامع کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے تاکہ میاں اسد اللہ خاں کی نگاہ التفات اور حسن ذوق سے فیض یاب ہو سکیں۔

بھوپال کا تنہا یہ ادبی کارنامہ ہی اس کی عظمت کا ہمیشہ امین رہے گا کہ غالب کے دو ابتدائی دیوان بھوپال ہی سے دستیاب ہوئے۔ پہلا دیوان نواب فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا۔ جس کی بابت مشہور ہے کہ مرازا غالب نے ان کی فرمائش پر ارسال کیا تھا۔ یہ

دیوان مولوی انوار الحق کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری سے معزکہ آرامقدمہ کے ساتھ نواب حمید اللہ خاں کے دور حکومت میں نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا نسخہ جو نسخہ حمیدیہ سے زیادہ اہم ہے اور غالب کا قلمی اولین دیوان ہے۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے دوران بھوپال میں ایک کتب فروش سے امر وہہ کے ایک شخص نے خرید لیا جسے عرشی زادہ اکبر علی خاں نے فوٹو سیٹ پر شائع کیا ہے اور اس کا نام نسخہ عرشی زادہ رکھا ہے۔

سیاسی تحریکات کے اثرات سے ریاستوں کا متاثر ہونا فطری تھا۔ چنانچہ بر صیر کی عام سیاسی بیداری کے نتیجہ میں بھوپال میں بھی اسٹیٹ پیپلز کافرنس معرض وجود میں آگئی اور اس نے ذمہ دار حکومت کا انعرہ بلند کر دیا اور اب بھوپال میں بھی دنیا کے غریبوں کو جگادی نے اور کاخ امراء کے درود یوار ہلا دینے والے انعرے کبھی مددم اور کبھی تیز آواز میں گوئے گئے۔ بیداری کی اس عام اہر سے بھوپال کے ادیبوں اور شاعروں کا علیحدہ رہنا ممکن تھا۔ خاص کر ایسے حالات میں جب کہ وہ اپنے ادبی رہنمایا اور سیاسی پیشواؤ اقبال کو خود اپنے ہی شہر میں موجود پاتے تھے اور ان کے فکر و بصیرت سے درس تپش حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ اقبال بھوپال کی ادبی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ غالباً ایک بار کسی سکول کی سالانہ تقریب میں ضرور شریک ہوئے تھے اور حاضرین کے بے حد اصرار پر ایک غزل:

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

سنائی تھی۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ بھوپال کے ادیبو شاعر اور اہل ذوق ان کے قیام بھوپال کے دوران ہمیشہ آستانہ اقبال پر حاضری دیتے تھے اور ان کے افکار عالیہ سے فیضیاب ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ شبوہ دیال تھن بھوپال کے کائنات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بے حد ذہین طباع اور خوش گو شاعر تھے۔ قدرت نے انہیں ہجوجوئی میں یگانہ بنادیا تھا۔ ان کو بھوپال کا سودا کہا جاتا تھا۔ اور ان کی

ہجوبیات بھوپال میں زبان زد عالم تھیں۔ اسکول کی تقریب میں اقبال کی غزل بخن نے بھی سنی اور اس موقع نکال کر خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت ادب سے اقبال سے دریافت کیا کہ لفظ پر ہیز مذکور ہے یا مونٹ۔ اقبال نے زیرِ تسلیم کے ساتھ نہایت شفقت سے فرمایا کہ ویسے تو پر ہیز مذکور ہی استعمال ہوتا ہے لیکن اقبال کو اتنا تو حق ہے کہ وہ اسے مونٹ بھی استعمال کر سکے۔ یہ واقعہ مجھے اظہر سعید خاں نے سنایا تھا جس سے خود ایک بار شجو دیاں بخن اقبال کے ملاقاتوں کے ذیل میں بیان کیا تھا۔

بھوپال واقعی شہر غزل تھا۔ مجھے دیکھو غزل کے بانکن کا دل دادہ تھا۔ لیکن یہ بانکن زیادہ عرصہ اپنا جلوہ نہ دکھاس کا کیونکہ بھوپال کو اقبال ایسے عظیم شاعر مفلک رکن تھے رس اور رکنیتہ شناس کا قرب اور اس کے کلام سے بھوپور استفادہ کی ہر ممکن سہولت میسر آگئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے بعد بھوپال کے بیشتر شعر اغزل کے ساتھ ساتھ نظر نگاری کی طرف بھی مائل ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند مصنفوں کی بنیاد رکھی گئی تو پورے بر صغیر میں نئے ادب نئے افکار و خیالات اور نئے تصورات سے ادب اور زندگی کے رشتے نہ صرف مختکم معتبر اور حقیقت پسندانہ انداز میں دنیا کے سامنے آنے لگے بلکہ ادب و شعر کی نئی تفہیم کا ابھی آغاز ہو گیا اور اس طرح شاعر مشرق کے کلام سے ترقی پسند ادیبوں نے بھی بیش از بیش استفادہ کیا اور زندگی اور ادب کے نئے خواب اور نئی تعبیریں موضوع بحث بننے لگیں۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ اور نئی تعبیریں موضوع بحث بننے لگیں۔ اس تمام عرصے میں بھوپال کے ادیبوں اور شاعر کی نئی نسل پروان چڑھ کی تھی۔ اسے ماضی کی اقدار سے زیادہ اپنے گرد و پیش کی فضما حول معاشرہ کے تضاد اور حالات کی نامساعدت نے بڑی حد تک با غنی بنا دیا تھا لیکن محض بغاوت ہی تو مسائل کا حل نہیں بن سکتی۔ اس لیے جو نئے شاعر پیدا ہوئے انہوں نے موضوعاتی شاعری کے لیے خود کو بتکنائے غزل سے باہر نکلا۔ اور مرجوہ

موضوعات اور رومانی نظموں سے قطع نظر کر کے خالص سیاسی رنگ کی نظیمیں بھی لکھنی شروع کر دیں جو کبھی اصلی اور کبھی سیاسی بندشوں کے سبب فرضی ناموں سے چھپتی رہیں لیکن بات:

دل ضبط زبان ضبط اثر ضبط فغان ضبط
سرکار کا منشاء ہے کہ ہو سارا جہاں ضبط
سے آگے نہ بڑھ سکی۔

یہ صحیح ہے کہ بھوپال میں کوئی ایسا نظم گوشاعر پیدا نہیں ہوا جس نے کلیتاً اقبال کے لب و
لہجہ یارِ نگ و آہنگ میں نظیمیں کی ہوں۔ لیکن ایسا ہندوستان کے دوسرے مقامات پر کہاں
ہوا؟

نواب حمید اللہ خاں کے دور میں بھوپال کے جن شعراء کی بیرون بھوپال بھی شهرت و
عظمت تھی ان کی ایک طویل فہرست ہے پھر بھی سہا مجددی ملا روزی ذکری داری، شریف محمد
خاں فکری [سید محمد یوسف قیصر ارشد تھانوی، محی صدیقی، سید محمود عظیم فہمی، رمزی ترمذی محمد
اسمعیل ہاتف عبدالجلیل مائل نقوی، حامد سعید خاں، منیر بھوپالی، تربینی سرن شاد، بہاری چران
صادق، باسط بھوپالی، شعری بھوپالی، اور ان کے بعد کی نئی نسل میں کیف بھوپالی احسن علی خاں،
آخر سعید خاں، اظہر سعید خاں، وجدي الحسیني فضل علی سرو، اسد بھوپالی، عرشی بھوپالی، عنبر چغتائی
، مرزا متین سروش، عمران النصاری، گوہر جلالی احمد علی جاوید، حبیب فخری، محمور بھوپالی، شعبہ
دیال سخن، مقصود عمرانی، مقصود عرفانی، افسوں بھوپالی، گوپی کشن شوق، سورج کلا سہائے سرو،
مه جبین خمار، سعیدہ بانو، محمد علی تاج، عشرت قادری، وفا صدیقی، جہاں قدر چغتائی، شہاب
اشرف شفا گوالیاری، رفتت الحسینی، اور محسن بھوپالی کا ذکر ضروری ہے۔

اسی طرح نشرنگاروں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جنہوں نے
بھوپال کے علم و ادب کے خزینوں میں بیش بہا اضافے کیے۔ کچھ شخصیتیں وہ ہیں

جنہوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اقبال کے پیغام کو دنیا کے سامنے نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا۔ اور کچھ وہ ہیں جنہوں نے جدید دور کے نئے تقاضوں کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا۔ ایک نیک نامی اور شہرت حاصل کی۔ چند ایک ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے براہ راست اقبال کے فکر و فون پر کام کیا۔ ذیل میں ایک مختصر سی فہرست پیش کر رہا ہوں جس سے رف اندازہ ہو سکے گا کہ ان میں سے کتنے صاحب مرتبہ ہیں اور کتنے عالی مرتبہ:

مولوی عبدالرزاق، محمد امین زبیری، ڈاکٹر عبدالحسین، مولانا محمد اسماعیل جیراچپوری، مفتی انوار الحق، شاہ اسد الرحمن، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، علامہ سید سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، محمود عظیم مفتی، علامہ میاں خالد حامد رضوی، سہا مجددی، قاضی ولی محمد سید محمود یوسف قیصر، ملار موزی محبوی لکھنؤی، ارشد تھانوی، محمد احمد سبزواری، ابوسعید بزمی، خاتون ارشد، شاغل فخری، محمود الحسن صدیقی، کوثر چاند پوری، قدوس صہبائی قمر الحسن، وجدي الحسينی، عبدالحکیم آرثٹر رشدی سلمان الارشد، انتیر سعید خاں، ابراہیم یوسف، رقیہ خلیل عرب..... اشتیاق عارف قمر جمالی، انجم سلمانی، ایم عرفان جوہر قریشی، کوکب جمیل، سید حسن محمود الحسینی لطف اللہ خاں نظمی، اختر جمال، زہرہ جمال، احمد بکی، خلیل بدر، شاہ میری راہ پروین رشدی، رضیہ فرحت بانو شفیقہ فرحت محمد وکیع صدیقی، اور آخری دور میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر حامد حسین، عبدالقوی دسنوی، شیمیم احمد، آفاق احمد عبدالاحد خاں تخلص، ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر حنیف فوق اور ڈاکٹر محمد یوسف وغیرہ۔

بھوپال میں نظم نگاری پر خصوصیت کے ساتھ جن شعراء نے اپنی توجہ مبذول رکھی اور نظم کی روایت کو آگے بڑھایا ان میں محمود اعظم فہمی، ملار موزی، ارشد تھانوی، محبوی صدیق، باسط بھوپالی، کیف بھوپالی، احسن علی خاں، اختر سعید خاں، اظہر سعید خاں، وجدي الحسينی عمران النصاری اور ۱۹۲۷ء کی آزادی کے بعد محسن بھوپالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۰ء میں بھوپال میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آگیا اور چند ہی سالوں میں اس انجمن کے باشمور ادیبوں شاعروں اور فن کاروں نے نظر نظم دونوں میں موضوع وہعت کے نئے اسالیب کو اپنایا اور اس طرح بھوپال میں بھی نئے ادب کی طرح ڈال دی۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو ساری دنیا کی طرح بھوپال کے اہل قلم نے بھی سکھ کا سانس لیا اور نشر و اشاعت کی نئی راہیں کھولیں۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں رشدی اور راقم الحروف نے بڑی جدوجہد کے بعد ماہنامہ افکار کا ڈکٹریشن حکیم قمر الحسن ایڈیٹر ”ندیم“، کی وساطت سے حاصل کیا اور یہ سوچا کہ جب تک بھوپال سے کوئی معیاری ادبی ماہنامہ جاری نہ ہوگا اس وقت تک نہ بھوپال کے علم و ادب کی تشویہ ممکن ہوگی نہ ادیبوں اور شاعروں کا بجا طور پر تعارف ہو سکے گا جب اتفاق ہے کہ رشدی اور میں نے افکار کے اجراء کے لیے اقبال کی مشہور نظم تخلیق مطبوعہ ضرب کلیم کے پہلے شعر:

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
کو منتخب کیا۔ اور جب ایک صحبت میں ملارموی سے جو رشدی کے اور میرے مشترک
دوست تھے اس شعر کا حوالہ دے کر افکار کے اجراء کا مشورہ لیا تو ملارموزی نے جو اپنی غیر
معمولی صلاحیتوں کے لیے ہندوستان گیر شہرت رکھتے تھے ماہر نجوم بھی تھے اور جو ہری بھی
اور جن کی گلابی اردو اور طنزیہ مزاحیہ نظموں نے ہندوستان بھر میں دھوم مچا دی تھی کچھ دیر
سوچتے رہے۔

۱۔ شعرا کے اس گروہ میں راقم الحروف بھی شامل تھا لیکن اس فہرست میں دانستہ اپنا نام شامل نہیں کیا ہے۔

پھر ہنس کر فرمایا کہ اس نام کی تاثیر یہ ہو گی کہ تم دونوں ساری عمر مجموعہ افکار بنے رہو گیا
ہجوم افکار میں گھرے رہو گے اس لیے اگر فکر وں سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو ماہ دا بختم گلستان
یا باغ و بہار قسم کا نام رکھو یہے میرا بخوم یہ بتاتا ہے کہ لفظ ”افکار“ کو یقیناً دوام حاصل ہے اور
پھر تم نے تو اس نام کو شاعر مشرق کے شعر سے اخذ کیا ہے لہذا بسم اللہ۔

ملارموزی..... آج اس دنیا میں نہیں لیکن ان کی پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی
افکار مارچ ۱۹۳۶ء میں معرض وجود میں آیا اور اسے جاری ہوئے آج ۲۸ سال ہو چکے ہیں۔
ماہنامہ ”افکار“ ۱۹۵۰ء میں میرے ساتھ بھوپال سے کراچی آگیا اور اپریل ۱۹۵۱ء سے اس
نے دوسرے دور کا پاکستان سے آغاز کیا۔ مریے آنے کے بعد ۱۹۵۱ء سے روزنامہ
افکار..... رشدی نے بھوپال سے جاری کیا جوتا حال جاری ہے۔ واقعی شعر و حکمت کا فلسفہ
بھی عجیب ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ رشدی یا میں اقبال کے اس شعر:

جہان تازہ کی افکار تازہ سے نمود

کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

کی صداقت کے امین بن کر انہائی صبر آزماء اور نامساعد حالات میں اسے زندہ رکھ سکیں
گے۔ لیکن اقبال کے فیضان سے یہ چراغ آج تک رو شہے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک افکار
بھوپال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اور اس کی لوح پر ہم جہان تازہ والا شعر
ہمیشہ درج کرتے رہے۔ کتنے ہی پرانے اور نئے لکھنے والے اس کے زریعہ متعارف
ہوئے۔ اور ۱۹۳۷ء کے فوراً بعد جب صفیہ اخترا اور جاں ثار اختر حمید یہ کالج بھوپال
میں لکھر رہو کر آگئے تو بھوپال کی انجمن ترقی پسند مصنفوں میں بھی جان پڑ گئی۔ ۱۹۳۹ء میں
بھوپال کی ادبی تاریخ میں پہلی بار کل ہند ترقی پسند مصنفوں کا نفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس کا
افتتاح علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمایا اس کا نفرنس کی قابل ذکر شخصیتوں میں پنڈت سندر

لال کرشن چندر جوش ملیح آبادی عصمت چغتائی شاہد لطیف مہندر ناتھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔
متوں اس کا انفرنس کا بھوپال میں چرچار ہا۔ افکار نے اس کا انفرنس کا یادگار نمبر شائع کیا۔ اور
اس طرح بھوپال نے دنیا کے ادب میں اپنے لیے ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ افکار جب
تک بھوپال سے نکلتا رہا اقبال کی فکر کا ترجمان رہا..... اور جہان تازہ کی افکارتازہ سے تعمیر
کرتا رہا۔ اور اسی مسلک پر وہ آج بھی گام زن ہے۔



قرآن مجید کے حواشی

۱۹۳۱ء سے اقبال کے بھوپال آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا جا چکا ہے اور یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء کے بعد جب راس مسعود بھوپال تشریف لائے تو کچھ اور وسعت پذیر ہو گیا۔ ۱۹۳۳ء میں ہی ان کی صحت کا عالم ڈگر گوں ہو چلا تھا۔ چنانچہ نواب صاحب بھوپال کی خواہش پر اور راس مسعود کی ترغیب پر وہ ۱۹۳۵ء میں بھوپال آ کر علاج کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اسی دوران راس مسعود سے تبادلہ خیالات ہوا نواب صاحب کو بھی راس مسعود نے ان کے خانگی حالات اور مالی حالات سے مطلع کیا۔ اور نواب صاحب نے بلا کسی تذبذب کے فوری طور پر ان کا وظیفہ مقرر کر دیا نواب صاحب نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ قرآن مجید کے ایسے مستند حواشی تحریر کر دیں کہ جو تمام مسلمانان عالم کے لیے رہبری و ہدایت کا سبب بن سکیں۔ اقبال نے بخوبی اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ چنانچہ مکتوبات اقبال کے آخری باب خاتمه تحفہ میں نذرینیازی نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ پیش خدمت ہے:

قرآن شریف کے نوٹ

”۱۹۳۵ء میں جب اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے حضرت علامہ کی لائف پیش مقرر کر دی اور حضرت علامہ نے رقم الحروف کو اس کی اطلاع کی تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا: اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف کے نوٹ لکھنے

پر صرف کر دوں گا۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں خقر آن مجید کے ان تفصیلی حواشی کی تتمیل جب ہی ممکن تھی جب حضرت علامہ کو صحت ہو جاتی۔ مگر اس کے باوجود لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اس قسم کے کچھ حواشی کیا پہلے سے لکھے ہوئے موجود تھے یا ان کا کچھ حصہ بعد میں لکھا گیا اور اگر نہیں تو یہ حاشیے لکھے جاتے تو ان کی نوعیت کیا ہوتی۔ کیا حضرت علامہ اپنے ذہن میں مطالب قرآنی کا کوئی خاص نقشہ قائم کر چکے تھے؟ ان کے خیالات اس سلسلے میں کیا تھے۔ یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور قوم کا ذوق تجسس بجا طور پر اس امر کا مقتضی ہے کہ ان کا کوئی ٹھیک ٹھیک جواب مل سکے۔ بالخصوص اس لیے کہ ناقدین کی رائے کچھ بھی ہو حضرت علامہ کا اپنا ارشاد تو یہی ہے کہ ان کے افکار کا سرچشمہ قرآن پاک اور اسوہ حضور رسالت مآب صلمع کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ اسی ذات گرامی سے جس پر قرآن مجید نازل ہوا والہانہ عشق و محبت کا تعلق تھا جس کی بدولت کتاب اللہ کی حکمت ان پر عیاں ہوئی پس چہ باید کرد کے یہ اشعار کس کی نظر سے نہیں گزرے۔

در جهان ذکر و فکر انس و جاں
تو صلوٰۃ صح تو بانگ اذاں
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
قطره دریا و طوفانم توئی
گرد تو گردد حریم کائنات

از تو خوا هم یک نگاہ التفات

قرآن پاک سے حضرت علامہ کو جو عشق تھا اور اس کا مطالعہ

انہوں نے جس کاوش اور محنت سے کیا تھا وہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس سے لوگ ناواقف ہوں۔ ان کی طالب علمی کے اور ابتدائی زمانے کے دوست بھی اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ بڑے سحر خیز تھے۔ فجر کی نماز اول وقت میں ادا کرتے اور پھر قرآن مجید کی تلاوت بڑے ذوق و شوق سے فرماتے۔ اپنی آخری علالت میں جب ان کی آواز بیٹھ گئی اور گلے کی تکلیف کچھ جس دم کے باعث تلاوت قرآن کا سلسلہ چھوٹ گیا تو انہوں نے کس حسرت سے کہا:

در نفس سوز جگر باقی نماند

طف قرآن سحر باقی نماند

علی بخش ان کے مدت العمر سے ملازم کا بھی جو ہمیشہ سے ان

کے ساتھ سایے کی طرح لگا رہا یہی بیان ہے کہ فجر کی نماز کے لیے

وضو اور جائے نماز کا اہتمام سونے سے پہلے ہی کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ بھی

معلوم ہے کہ تعلیمات قرآنی کے بارے میں ان کا ایک خاص نقطہ نظر

تھا۔ جس کی اپنے اشعار اور خطبات میں انہوں نے وضاحت بھی

کی۔ لیکن جہاں تک ان تفسیری حاشیوں کا تعلق ہے وہ کبھی سپر قلم

نہیں ہوئے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یعنی علالت۔ البتہ اس سلسلے

میں ان کی دو ایک تحریریں ضرور دستیاب ہوئیں اور وہ شاید اب اقبال

اکیڈمی میں محفوظ ہیں۔ ایک تحریر میں توفيقہ اسلامی کی بحث میں بعض

قرآن مصطلحات مذکور ہیں۔ دوسری تحریر صرف چند ایک قرآنی مصطلحات پر مشتمل ہے۔ لیکن ان دونوں تحریریوں کی حیثیت جواشی کی نہیں علامہ اقبال نے ان تحریریوں میں کوئی جملہ بھی رقم نہیں فرمایا۔ صرف چند الفاظ مستفسر انہ انداز میں لکھے ہیں جس سے کچھ مترشح ہوتا ہے۔ تو یہی کہ انہوں نے اپنی یادداشت کے لیے چند ایک باتیں بطور اشارات لکھ لی تھیں۔ رہایہ امر کہ وہ ان باتوں کی تشریح اور تفصیل کس انداز میں اور کس نجح پر کرتے اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ الایہ کہ ان کی روز مرہ گفتگو یا ان ارشادات سے جو وقتاً فوتفاً انہوں نے اس سلسلے میں فرمائے سامعین کو ان کے خیالات کا شاید ایک حد تک اندازہ ہو سکے۔ یہ اس لیے کہ قرآن اور رسالت یہ دو موضوع ایسے ہیں کہ کوئی بھی مسئلہ یا کوئی بھی بحث ہو اس کا خاتمہ اسی پر ہوتا ہے۔ کہ قرآن پاک کا ارشاد اس سلسلے میں کیا ہے یا یہ کہ حضور رسالت مبارک صلیع نے اس بارے میں کیا طرز عمل اختیار کیا۔ بسا اوقات وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کا مطالعہ کس نجح پر کرنا چاہیے۔ اور پھر باتوں باتوں میں تعلیمات قرآنی کی طرف بڑے لطیف اشارات کر جاتے۔ مختصرًا یہ کہ ان کے ذہن میں تعلیمات قرآنی کو ایک باقاعدہ شکل میں پیش کرنے کا تصور تو ضرور تھا لیکن یہ سب علالت وہ اکثر محسوس کیا کہ ان کے پیش نظر شاید بھی ایک مسئلہ ہے جس پر وہ انتہائی تجسس اور تحقیق سے قلم اٹھانا چاہتے ہیں۔ رسالت اردو کے اقبال نمبر میں میں نے اپنے مضمون اقبال کی آخری علالت

میں اس امر کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ ان کا ذہن کس طرح ہر وقت اسی فکر میں الجھا رہتا تھا۔

ندیز نیازی کی اس توضیح و تشریح کے بعد میں محمد امین زیری مر حوم کا ایک مضمون بھوپال کا علمی جائزہ میری نظر سے گزر جسے سید محمد یوسف قیصر نے مجھے بطور خاص بھوپال سے بھجوایا تھا۔ اس مضمون میں والیان ریاستی علمی ادبی مذہبی اخلاقی، تاریخی کارناموں کا مختصر تذکرہ بھی ہے اور ہندوستان سے جتنی مایہ ناز خصیتیں بھوپال سے وابستہ ہیں اور انہوں نے بھوپال میں رہ کر یا بھوپال کی امداد سے علمی ادبی اور تاریخی خدمات انجام دیں ان کا جستہ جستہ احوال بھی درج ہے۔ یہ مضمون رسالہ اردو کے صفحہ ۱۱۵ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۳۸ پر ختم ہوتا ہے اور بلاشبہ بھوپال کے علمی کارناموں کا جو کئی ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اتنے مختصر اور جامع انداز میں محمد امین زیری ایسے بلند پایہ ادیب و محقق ہی احاطہ کر سکتی ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے دوران صفحہ ۱۳۰ پر دور حمیدی کے مختلف علمی و ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی یہ عبارت جب میری نظر سے گزری:

”.....ہر ہائی نس نے ڈاکٹر اقبال مر حوم کی ایک مستقل تصنیف

کی درخواست پر افکار حاضرہ کی روشنی میں قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کے لیے پانچ سورو پے ماہانہ کی امداد مقرر کی گر علامہ نے تین سال میں اس کام کا اقدام بھی نہ کیا

اس ہو کتابت ہے۔ لکھ لی تھیں ہونا چاہیے

۲۔ مکتوبات اقبال صفحہ ۳۲۴-۳۲۵

اور نہ کوئی یادداشت ہی چھوڑی ا۔

تو مجھے واقعی حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ اس عبارت سے جو ۱۹۵۸ء میں لکھی گئی ہے۔

نذر یہ نیازی کا وضاحتی بیان جو کتابی صورت میں ۱۹۵۷ء میں سامنے آگیا تھا خود بخود تردید ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے بیان کردہ واقعات بھی صحت پر منی نہیں کیونکہ پانچ سورو پر یہ بطور وظیفہ مقرر ہوا تھا کہ بطور امداد یہ رقم ماہانہ مقرر کی گئی تھی جس کا ثبوت گز شہ صفحات میں بھی مل سکتا ہے اور ڈاکٹر اقبال سے بھی عبدالجید سالک فرماتے ہیں:

”.....اس درویش خدامست نے کبھی دولت و جاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں روزمرہ کی معيشت تک دشوار ہو گئی۔ اس موقع پر نواب صاحب حمید اللہ خاں والی بھوپال نے اپنے تعلق خطر اور قدر دانی خدمت اسلامی کے باعث جیب خاص سے حضرت علامہ کا پانچ سورو پے ماہانہ وظیفہ (تا) حسین حیات مقرر کر دیا۔

مسی ۱۹۳۵ء میں ہی بیگم کا انتقال ہوا اور اسی مہینے میں بھوپال کا وظیفہ شروع ہوا۔“

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ والی بھوپال نے اپنے تعلق خاطر اور قدر دانی خدمت اسلامی کے پیش نظر وظیفہ مقرر کیا تھا۔ امداد مقرر نہیں کی تھی۔ نیز خود اقبال اور راس مسعود کے خطوط کے علاوہ شہزادی عابدہ سلطان کے ارشادات اور حیدر علی عبدالسی کے بیان سے بھی پانچ سورو پے ماہانہ وظیفہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ نیز یہ وظیفہ غیر مشروط تھا اس لیے محمد امین زبری مرحوم کا یہ رقم ڈاکٹر اقبال مرحوم کی ایک مستقل تصنیف کی درخواست پر افکار حاضرہ کی روشنی میں قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کے لیے دی گئی درست نہیں۔ پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ تفسیری نوٹ لکھنے کی درخواست یا خواہش اقبال نے کی تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب بھوپال نے اقبال سے اس خدمت کو انجام دینے کی درخواست کی تھی۔

جس کا ثبوت ہمیں کئی مستند بیانات سے مل جاتا ہے۔ جو گزشتہ صفحات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ان کا ایک اور اعتراض کہ علامہ نے تین سال تک اس کام کا اقتداء نہ کیا اور نہ کوئی یادداشت ہی چھوڑی۔ بھی محل نظر ہے کہ نزیر نیازی نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے۔
اس سلسلے میں ان کی دو ایک تحریریں ضرور دستیاب ہوئیں اور وہ شاید اقبال اکیڈمی کے پاس محفوظ ہیں۔ ایک تحریر میں توقفہ اسلامی کی بحث میں بعض قرآنی مصطلحات مذکور ہیں۔ دوسری تحریر میں ایک قرآنی مصطلحات پر مشتمل ہے۔

ظاہر ہے یہ حواشی تو نہیں ہیں لیکن ان کے اس بیان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ انہوں نے اس کام کو سب کاموں پر مقدم سمجھ کر ابتداء کر دی تھی۔ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور یہ عظیم کام تشنہ تکمیل رہا۔

محمد امین زیری کے اس اعتراض برائے اعتراض کا اندازہ محمد نعیم ندوی کے اس مضمون کے اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو فاران کراچی میں بعنوان علامہ شبی دار المصنفین اور بھوپال شائع ہوا ہے لکھتے ہیں:

۱۔ رسالہ ”اردو“ جنوری ۱۹۵۸ء

۲۔ ذکر اقبال۔ صفحہ ۱۹۶

”.....علامہ شبی نے جو اپنے گوناگون علمی کمالات اور کارناموں کی بدولت تاریخ علم و ادب میں زندہ وجاوید ہیں۔ تقریباً نصف صدی تک داد تحقیق دینے کے بعد عمر کے آخری حصہ میں سرور کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں اپنے اخلاق و عقیدت کا

نذرانہ پیش کرنے کا ارادہ کیا لیکن راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سرمایہ کی نایابی تھی۔ چنانچہ علامہ شبی نے جنوری ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں قوم کے نام یہاں اپیل شائع کی کہ جو اس سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ دستِ تعاون دراز کرے۔ مشیٰ محمد امین زیری، جو ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کے لٹریری سیکرٹری تھے یہ اپیل دیکھ کر سرکار سے کوئی نہیں کی اس لئے ہوئی دولت سے اپنے دامن بھر لینے کی درخواست کی اور اس علم نواب خاتون نے برسو چشم اس لوقت کر کے مصنف غلام کو دوسرا آستانوں سے مستغفی اور تمام افکار سے بے نیاز کر دیا۔

مشیٰ امین زیری مرحوم کا ذکر نوک قلم پر آگیا ہے تو چند سطور ان کے متعلق بھی گوارا کر لی جائیں۔ زیری مرحوم کو علامہ شبی سے غایت درجہ عقیدت تھی چونکہ وہ ریاست کے شعبہ تاریخ کے مہتمم بھی تھے۔ اس لیے وہ ریاست کی تصانیف و تالیفات کے سلسلے میں علامہ مرحوم سے مشورہ لیتے رہتے تھے۔ سیرت کی امداد کرنے میں موصوف کے جدوجہد کو بڑا خل تھا۔ علامہ شبی کے مطبوعہ مکاتیب میں زیری کے نام ۳۳ خطوط پائے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے بھی دونوں کے تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن اپنے مددو ح علامہ شبی کی رحلت کے بعد ایک عرصہ کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی شہرہ آفاق تصنیف حیات شبی منصہ شہود پر آئی اور اس نے علمی دنیا میں دھوم چاہی تو انہی زیری مرحوم نے یک دم قلب ماہیت اختیار کر لی ورنہ

صرف سید صاحب علیہ الرحمۃ سے انتہائی بدظن ہو گئے بلکہ علامہ شبی
کی شاہست کو مجرد حکرنے کی فکر ان پر مسلط ہو گئی۔ بظاہر تو
انہوں نے یہ شکوہ کیا کہ حیات شبی ک مصنف نے سوانح نگاری کا حق
ادا نہیں کیا ہے اور شبی کی زندگی کا صرف ایک رخ دکھایا ہے۔ تصویر
کے دوسرے رخ سے جسے زبیری رنگین زندگی کا نام دیتے ہیں چشم
پوشی ہے۔

مگر اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ شبی کی رنگین زندگی سے اغماض
کا الزام سید صاحب پر صرف برائے الزام ہی ہے ورنہ حقیقت
واقع یہ ہے کہ زبیری صاحب مرحوم کے بار بار اصرار کرن پر بھی سید
صاحب نے حیات شبی کا مسودہ ان کو دیکھنے نہ بھیجا۔ اس پر چرا غ
پا ہو کر زبیری صاحب نے اپنی بقیہ عمر شبی و سلیمان علیہما الرحمۃ کی
مخالفت اور ان پر طنز و تعریض کرنے میں گزاری ا۔

۱ ماہنامہ فاران کرایجی اکتوبر ۱۹۶۸ء صفحہ ۲۵ تا ۲۹

نفس موضوع سے ہٹ کر اس طویل جملہ مفترضہ کو پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ
شبی کی طرح زبیری مرحوم کو اقبال سے بھی کچھ اسی نوعیت کا لیہی بغرض تھا۔ جس کے نتیجہ میں
آخری عمر میں انہوں نے خدو خال اقبال لکھ ڈالی جس کا خاص مقصد اقبال کی سیرت کے
دوسرے رخ کو اجاگر کرنا تھا۔ لیکن ان کی یہ آرزو ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی اور
خدو خال اقبال کا مسودہ ہی لاپتا ہو گیا جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔

اب آئیے اس حقیقت کا مزید جائزہ لیں کہ قرآن مجید کے حواشی کے سلسلے میں ان کے
کیا کیا عوّاز نام تھے وہ اس سعی و جهد میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ اور اس ضمن میں

انہوں نے کیا سرمایہ چھوڑا۔ سب سے پہلے عبدالجی德 سالک کی مشہور کتاب ذکر اقبال سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

تصنیفی منصوبے

”.....علامہ اقبال کے ہم صحبت نیازمندوں کو معلوم ہے کہ حضرت مددح کے ذہن میں بعض نہایت مفید تصنیفات کے خاکے اور بعض تنظیمی اور اصلاحی اداروں کے منصوبے موجود تھے۔ جن کو وہ اپنی زندگی میں ہی معرض شہود پر نہ لاسکے لیکن ان کی تڑپ علامہ کے قلب میں مرتبہ دم تک رہی۔ مثلاً وہ جوانی کے زمانے میں محسوس کر چکے تھے کہ اگر اسلام ایک ضابطہ حیات کی حیثیت سے آج کل کے زمانے میں کامیاب اور آبرومند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانہ حال کے جو رس پروڈنس یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرح اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں اور دلیل برہان سے اصول فقہ اسلامی برتی آج کل کے قانون پر ثابت کی جائے۔ مجوزہ کتاب کا نام تھا۔

Constitution of Islamic

Jurisprudence

انہوں نے بارہا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ایک کتاب لکھیں گے

جس کا نام ہو گا۔

Islam as I Understand

(یعنی اسلام میرے نقطہ نظر سے) جس میں اسلام پر ایک جدید تعلیم یافتہ سائنس داں اور فلسفی کی نگاہ سے روشنی ڈالی جائے گی اور ایسی زبان اختیار کی جائے گی جسے زمانہ حال کے علمی حلقات سمجھتے ہیں۔

اوخر حیات میں قریب قریب ہر روز یہی ذکر رہتا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤں گا۔ جس کا نشانہ یہ ہو گا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعہ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے گا اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی کے متعلق قائم کر رکھے ہیں وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں۔

اس کتاب کا نام کبھی کبھی
اکٹھا کر کرتے تھے۔

Aids to the study of Quran

بتایا کرتے تھے۔

۱۔ ذکر اقبال صفحہ ۲۱۲-۲۱۳

مقدمۃ القرآن

قرآن مجید کے حواشی کے بارے میں ممنون حسن خاں کے انکشافات نے دیباچہ طبع ثانی میں ملاحظہ کیے ہوں گے۔ خوش نصیبی سے نظر ثانی کے دوران اقبال کا ایک ایسا خط بھی مل گیا جس سے پہلی بار یہ علم ہوا کہ انہوں نے قرآن مجید کے حواشی کے متعلق کتاب کا نام مقدمۃ القرآن رکھا تھا۔ اقبال نے یہ خط دوسرے قیام بھوپال کے دوران شیش محل سے ڈاکٹر محمد دین تاشیر کو انگلستان ارسال کیا تھا۔

گزشتہ صفحات میں اقبال کے وظائف کے متعلق ۱۹۳۵ء کے دوران اقبال اور راس

مسعود کے درمیان جو خطوط کا تبادلہ ہوا ہے وہ آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔ انہوں خطوط میں انہوں نے ایک تجویز نواب صاحب بھوپال کی خدمت میں ذریعہ راس مسعود پیش کی تھی جس کا واضح ثبوت ذیل کا خط مہیا کرتا ہے۔ اس خط میں وہ ڈاکٹر تاشیر کو لکھتے ہیں:

”اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت درد مندی سے میرا اعلان کرایا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کو سر راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لیے مجھے انہوں نے تاحیات پانچ سورو پے ماہوار کی لٹریری پیشن عطا فرمائی ہے آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہوگا۔“

مقدمۃ القرآن اور لٹریری پیشن کی اصلاحات کا شاید ہی اس سے پہلے کسی کو علم ہو۔ اور اس امر کا بھی کہ لٹریری پیشن کی خبر اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ دوسرے قیام بھوپال کے دوران جاوید بھی ان کے ہمراہ تھے جیسا کہ خط کے مندرجات سے ظاہر ہے:

”بھوپال شیش محل“

۲۲ جولائی ۱۹۳۰ء

ڈیرویٹا شیر صاحب السلام علیکم

جاوید کے لیے الف لیلہ کا نسخہ جو آپ نے بھیجا ہے مجھے آج یہاں بھوپال میں موصول ہوا۔ جاوید بھی میرے ساتھ ہے۔ وہ کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہے۔

میں یہاں بھوپال میں بغرض علاج بر قی مقیم ہوں۔ اور اگست

کے آخر تک علاج جاری رہے گا۔ بہ نسبت سابق حالت بہتر ہے۔ اور ڈاکٹر صاحبان لیقینی امید دلاتے ہیں کہ آواز عود کر آئیے گی۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت درمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ سر راس مسعود سے یہ معلوم ہوا ہے کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لیے مجھے انہوں نے تاحیات پانچ سورو پے کی ماہوار لٹریری پیش ن عطا فرمائی ہے۔

۱۔ سہو کتابت ہے ۱۹۳۵ء ہونا چاہیے

آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہوگا۔ اب ذرا صحت اچھی ہو لے تو انشاء اللہ اس کتاب کو لکھنا شروع کر دوں گا۔ اسی سال کے دوران میں امید ہے صور اسرافیل بھی ختم ہو جائے گی۔ پھر کچھ مدت کے لیے مقدمۃ القرآن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دوں گا۔ باقی اب زندگی میں کوئی دلچسپی مجھ کو نہیں رہی۔ صرف جاوید اور منیرہ کی خاطر زندہ ہوں۔ انگلستان آنا بھی اب ممکن نہیں رہا۔ اگر میں کچھ مدت کے لیے اوہر چلا جاؤں تو ان بچوں کی نگرانی کون کرے گا۔ اس کے علاوہ میرے لیے ان کی جدائی بھی مشکل ہے۔ ان کی ماں کی آخری وصیت بھی یہ تھی کہ جب تک یہ دونوں بچے بالغ نہ ہو جائیں ان کو اپنے سے جدا نہ کرنا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور سے فساد کی خبریں آرہی ہیں ملٹری نے فائر کر دیے تھے۔ آج کی خبر ہے کہ دس مسلمان مارے گئے زخمیوں کی تعداد معلوم نہیں

ہے۔ ملٹری اور پولیس کے آدمی بھی زخمی ہوئے ہیں یہ سب کچھ مسجد
شہید گنخ کے انہدام کے سلسلے میں ہوا ہے اور ہورہا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ
انگریزی تدبیر کے اب آخری دن ہیں زیادہ کیا عرض کروں۔
علی بخش سلام کہتا ہے جاوید آداب لکھواتا ہے۔

محمد اقبال

حاشیہ پر:

میاں صاحب کے باغ کے آم لا ہور سے کھا کر روانہ ہوا تھا۔
اگر چنان آموں کا موسم کچھ میرے بعد شروع ہوگا۔
اپ نے ارادہ کیا تھا کہ جاوید نامہ پر لکھ رہیں گے۔ وہ لکھ رکھا
گیا یا ابھی تک معرض التوا میں ہے۔ لکھا جائے تو ایک کاپی ضرور
ارسال کیجیے۔

محمد اقبال اے۔

إِنَّ الْأُوْرَاقِبَلَ - صفحَةٌ ۲۰۵

اسی سلسلے میں میاں محمد شفیع ایم اے مش کا ایک مضمون ہماری بہت سی الجھنوں کو دور کر
دیتا ہے جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس کتاب کا خاکہ ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے
جسے وہ نواب صاحب کی تجویز پر لکھ رہے تھے۔ میاں صاحب کا مضمون ملاحظہ ہو:

شاعر مشرق کی آخری خواہش

”۱۹۳۳ء میں مجھے علامہ اقبال مرحوم کے نویندہ کی حیثیت
سے کام کرن کا شرف حاصل ہوا تو علامہ مرحوم نے چند کاغذات

میرے حوالے کیے جن پر ان کے ہاتھ سے کتاب کا ایک خاکہ لکھا ہوا تھا وہ انگریزی زبان میں اسلام کے مطالعے کے لیے ایک دیباچہ قلم بند کرنا چاہتے تھے جس میں اسلام کے فلسفہ قانون روپ خصوصیت کے ساتھ بحث کی جاتی چونکہ ان کی پینائی کمزور ہوتی جا رہی تھی اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ وہ یہ کتاب مجھے تحریر کرواتے جاتے۔ اگر یہ مکمل ہو جاتی تو انگریزی زبان میں تو اسلامی نظام حکومت و معاشرت اور فلسفہ اسلامی قانون کے متعلق یہ ایک مستند ترین اور دور آفرین تصنیف ہوتی۔ اس کتاب کی تجویز درحقیقت انہیں نواب صاحب بھوپال نے پیش کی تھی۔ لیکن بدقتی سے علامہ مرحوم کی بڑھتی ہوئی علاالت نے انہیں اپنے ارادے پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اور بالآخر ۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء کوموت نے انہیں ہم سے چھین لیا۔

علامہ اقبال کی اس تحریر کو میں نے اب تک ایک قومی امانت کے طور پر سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ قائد اعظم مرحوم سے بھی اس کا ذکر کیا تھا اور انہوں نے مارچ ۱۹۳۳ء میں ایک گرامی نامے کے ذریعہ مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں علامہ کی کتاب کا خاکہ ان کی خدمت میں ارسال کر دوں تاکہ وہ اس کا مطالعہ کر کے اسے کسی ایسی شخصیت کے سپرد کر دیں جو اس امانت کو سنبھالنے اور علامہ مرحوم کے تحریر کردہ خاکہ کے مطابق کتاب کو مکمل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ قائد اعظم مرحوم کا خیال تھا کہ چونکہ کتاب کا موضع بحث فلسفہ قانون ہے اس لیے ایک قانون دان ہی اس کو بہتر طریقے سے انجام دے

سکتا ہے۔ چونکہ یہ نوٹ پنسل سے لکھے ہوئے تھے اس لیے مدھم پڑتے جا رہے تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء میں سنٹرل جبل ملتان میں اسیری کے دوران میں نے بڑی احتیاط سے انہیں نقل کر لیا۔ اور اب میں اس خاک کی نقل بجسے قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ اہل اصحاب علامہ اقبال کی خواہش کے مطابق اس خاک کو پیش نظر رکھ کر ایک ایسی مستند کتاب تصنیف کر سکیں جس میں اسلام کو ایک پایۂ حقیقت اور ہمارے معاشرہ میں ایک زندہ و فعال عنصر کی حیثیت سے پیش کیا جاسکے۔

۱۔ اسلام کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟

(۱) اس میں قوت و فعالیت ہے۔ اس نے مختلف ادوار میں فروعات اور زوابد سے نجات حاصل کرنے کی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اسلام میں نئی تحریکیں میں ان پر ایمان نہیں رکھتا کیونکہ یہ فکری انتشار اور اندر وونی خلفشار کا اظہار کرتی ہیں۔

(۲) اسلام..... دنیا نے جدید اور مملکت برطانیہ

ب..... اسلام اور شہنشاہیت

اسلام پر عرب شہنشاہیت کا اثر..... انہوں نے روما اور ایران کی شہنشاہیتوں کو ختم کر کے ایک نئی شہنشاہیت کی بنیاد ڈال دی۔ شہنشاہیت کے اسباب و مل

(۱) مذہبی جوش اور انسانیت کی اصلاح و ہدایت کی لگن۔

(۲) بھوک (افلاس)

بہر حال اس باب چاہے کچھ ہی ہوں اس کے نتائج مفید ثابت نہیں ہوئے شہنشاہیت نے ان رہبانیت پسند مذاہب کو بھی اسلام کے دامن میں پناہ دے دی جنہیں اسپنگلر نے مویدوں کے مذہب Magian کا نام دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے سابقہ مذاہب کے فلسفیانہ مناقشات اور مباحثات یعنی روح نفس قرآن حدیث یا قدیم اور اسی قسم کے دوسرے متنازعہ مسائل کو اپنے اندر جذب کر لیا اور حقیقی اسلام کو باہر نہ کا بہت کم موقع ملا۔

ج..... اسلام کو سمجھنے کے لیے دور جدید کے طالب علم کی مشکلات۔ اسے اسلام کے متعلق لا تعداد اور ان گنت لڑپر کی چھان بین کرنی چاہیے۔ اور قرآن حکیم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں نے اسلام کا مطالعہ اسی طریق پر کیا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

و..... اسلام کیا ہے؟

کیا یہ ایک مذہب ہے دوسرے مذاہب کی طرح؟
مذہب کے کیا معنی ہیں؟ قرآن میں اس کے لیے دین کا لفظ استعمال ہوا ہے قانون کی اطاعت دیکھیے قرآن (۱۸:۵)

پرانے ایشیائی مذاہب کی خصوصیات۔

(۱) ابتدائی مذاہب میں وحی کا تصور۔ ایک پراسرار فعل۔ اسلام نے اس کی خالص علمی اور سائنسی توضیح پیش کی ہے۔ قرآن۔ ابن خلدون۔ تصوف۔

(۲) نجات

(۳) دنیا سے قطعی بے تعلقی (لارہبانیہ) خانہ، حجرے، تھانے،
اسلام اور عیسائیت کا موازنہ (واللہ یخز جکم من الظلمات الی النور)
حضرت عیسیٰ وحی۔

(۴) غیب کا خوف (لاخوف علیہم ولا حم تحرنون)

(۵) اپنگر کی کتاب Some Secret

جلد دوم صفحہ نمبر ۲۲۵ مارٹین کی جلد اول بھی Teachings

پڑھیے۔

(۶) زمان اور عالم کی بے حقیقتی Unreality پر ایمان۔

(ربنا خلقت ہذا باطل اصل اتنی علی الانسان.....)

(۷) تقدیر

(۸) دینی حکومت Theocracy

اسلام کے ظہور کے وقت دنیا میں جتنے مذاہب موجود تھے
اسلام ان کے خلاف ایک احتجاج تھا۔

کائنات ایک حقیقت ہے وقت حقیقت ہے۔ اب نبیوں کا
ظہور نہیں ہوگا۔ (بنی موعود)

(ج) قید Limitation سے فرار نہیں۔

شیج بچاؤ نہیں ہوگا۔ قسمت یا تقدیر Fatalism کوئی چیز
نہیں۔

کیا اسلام ایک دینی حکومت ہے؟

کلیسا اور ریاست کارشنہ!

ریاست کیا ہے۔ ایک معاہدہ ہے ازدواجی رشتہ کی طرح۔
ر۔ لیکن اسلام مذہب سے بہت کچھ زائد ہے۔ امن و اطمینان
اندرونی و بیرونی (قرآن.....۱۸:۵)

(۱) اسلام انسان کی نسلی تفریق کو ختم کرتا ہے (بیرونی امن)

(۲) یا اقتصادی مساوات پیدا کرتا ہے (اندرونی امن)

(۳) یہ باب یہاں ختم ہوتا ہے دو آخری مشاہدات۔

۱۔ کیا اسلام ایک خطرہ ہے؟

۲۔ اسلام عیسائیت کا دشمن یا رقیب نہیں۔

دنیا کو تہذیب کا سبق دینے میں وہ عیسائیت کے ساتھ اشتراک
عمل قبول کرتا ہے۔

باب دویم..... اسلام کا قانون

دیکھیے ڈکسن کی تصنیف After Two Hundred

Years مودیوں کے مذہب میں وحی ایک پراسرار عمل ہے۔
اسلامی تصوف میں اس پراسرار عمل کی علمی اور سائنسی تشریح کی گئی
ہے۔

کیا یہ اخلاقیات کا نام ہے جس میں جذبات کی اثر پذیری ہے؟

ا..... مذہب..... کیا یہ خدائے واحد یا دیوتاؤں میں ایمان

کا نام ہے جن کی کسی نہ کسی صورت میں پرستش کی جاتی ہے۔

رہبانیت کو مذہب کا نام دیا گیا ہے۔

(۱) کیا یہ دنیا سے قطع تعلق کا نام ہے؟ (الرہبانیہ فی السلام)

(۲) کیا یہ غائب کا خوف ہے؟ (الخوف علیکم ولا ہم بخزون)

(۳) کیا یہ فوق الحس Super Sensible سے رابط کا

نام ہے؟

اس کا جواب کسی حد تک اثبات میں ہے۔ لیکن ایسی فوق الحس جسکی علمی تشریح و توضیح کی جاسکے۔

ابن خلدون اتمام Finality کا تصور۔

(۴) کیا ہی کوئی خفیہ تعلیمات ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل کی جاتی ہے۔ (راز؟)

اسپنگلر کی کتاب All early Magian Religions

جلد دوم صحیح ۱۲۲۶ (قدتبین الرشد من الغی)

(۵) مذہب..... لفظ مذہب کا مأخذ..... قرآن میں مذہب کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا قرآن میں دین منہاج اور ملت کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ملت اور دین کے الفاظ کے معنی۔

(۶) دیکھیے..... میٹ نین Matineen جلد اول

ب..... اسلام مذاہب کے پرانے مفہوموں سے احتجاج یا بغاوت کا نام ہے؟

(۱) نبوت کا خاتمه Abolition اسلام اور زمان (حل طبع)

(۲) اسلام میں نجات کا تصور۔ کیا یہ ایک نجات دہنده مذہب ہے؟ قرآن میں نجات کا لفظ صرف ایک مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔

نجات کے کیا معنی ہیں؟

(۳) یہ کوئی خفیہ تعلمات نہیں

(۲) خدا (غیب) میں ایمان..... انسانیت کی نسلی تفریق کا
خاتمه اور اقتصادی مساوات..... (قل الغو)

ج..... کلیسا اور ریاست

کیا اسام میں جماعت ایک قانونی فرد ہے؟

(Juristic Person)

ریاست اور کلیسا کا باہمی رشتہ..... ریاست کیا ہے..... نکاح
کی طرح ایک معاہدہ۔

امین شیخ الاسلام ہے..... وغیرہ

موروثی بادشاہت..... اسلام میں ملاگری (Priesthood)
کی تاریخ۔

واقعہ کر بل اس کے نتائج۔

و..... اسلام اور عورت

ر..... اسلام اور سرمایہ داری

۲۔ مویدوں کے مذاہب Magian میں وحی ایک پراسرار
عمل ہے۔

جس میں کوئی روح بولنے والے کے جسم میں داخل ہو جاتی
ہے۔ اسلام میں وحی آیات قرآنی کے حوالہ سے زندگی کی ایک عالمگیر
خصوصیت ہے۔ جس میں انسان خدا سے رشتہ قائم کر لیتا ہے۔

زندگی کے سرچشمے یا اپنے آپ کو تین طریقوں سے ظاہر کرتی ہے۔ علم کے منبع کی حیثیت سے یہ ختم کردی جاتی ہے اسلام میں فکر عمل کے بغیر نامکمل ہے۔ فکر اسلامی ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرتا ہے جس نسل فرقہ اور مذہب کے دفیانوںی تصورات معدوم اور ناپید ہو جاتے ہیں

یہ روشنی ہے (اللَّهُ نُورُ الْأَسْمَاءِ وَالْأَرْضِ)

وَاللَّهُ يَحْكُمُ مِنْ الظُّلْمَاتِ إِلَيْ النُّورِ

۳۔ نجات

نجات کیا ہے۔ نجات کس چیز سے انفرادیت کی حد بندیوں سے نہیں۔ وہ تنکم فرد اشурورا احساس کی کشاکش سے نہیں۔ یہ کائنات میں خودی کی آزادی کی نام ہے۔ خدا کا تصور (رفیق علی رفیق الاعلی)

ا۔ نیند نجات دلاتی ہے (لَا تَأْخُذْهُ سَنَةً وَلَا نُومٌ)

ب۔ شراب نجات دلاتی ہے اور شعور کی قوت اور بل کو توڑتی

ہے۔

ج۔ رقص بھی نجات دلاتا ہے (أَمْرُهُ بِالْعَفْوِ وَكَرَامَةِ)

زمان اور مکاں سے نجات (فرار) سے یہ تمام ذرائع اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں اس کی تعلیم ہے کہ آپ فکر کے ذریعہ حقیقت کا ادراک اور معرفت حاصل کر کے اور مکان پر قبضہ حاصل کریں۔ علی سلطان تکروافی خلق اسموات ()

جب ہم اشیاء کو محض اتفاقی علایق اور رتوں کے رنگ میں دیکھنے لگتے ہیں تو حقیقت حاضرہ Visible Activity کا خوف دور ہو

جاتا ہے۔ خوف منتروں اور تعویذ گندوں سے نہیں بلکہ رموز فطرت کو پہچان لینے سے دور ہوتا ہے۔

د..... دنیا کا مطالعہ ایک تحریک کی حیثیت سے۔

تاریخ..... تصوف

۳۔ ایمان.....سلامتی

اسلام میں اصلاحی تحریکیں

ابن تیمیہ

عبدالوہاب بابی.....پیشین گوئیاں

احمد یہ.....سید احمد

عقلیت

کم بیش مویدوں کی تحریکیں

نئی تحریک

نبی موعود کی بعثت

احادیث (بخاری) [۱]

نذر ی نیازی مولینا عبدالجید سالک اور میاں محمد شفیع کی شخصیتیں ایسی نہیں کہ جن کی اصابت بت رائے پر مزید اظہار خیال کی ضرورت پیش آئے۔ جو کچھ نذر ی نیازی نے تو پڑھ و تشریح کی ہے جو کچھ مولینا سالک نے بیان کیا ہے جو خاکہ قرآن مجید کے حواشی کا میاں شفیع نے شائع کر دیا ہے اس کے مطالعہ سے اقبال کی آخری خواہش کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ وہ جیسا کہ میاں محمد شفیع نے بھی لکھا ہے کہ قائد اعظم کی بھی یہی آرزو تھی کہ اس خاکہ کو کسی ایسی شخصیت کے سپرد کیا جائے جو اس امانت کو سنبھالنے اور علامہ مرحوم کے تحریر کردہ خاکہ کے

مطابق کتاب کو مکمل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ یہ خواہش اور یہ آرزو آج تک تشنہ تعصیر ہے۔ کاش مملکتِ اسلامیہ کا کوئی درمند باصلاحیت اور جوان حوصلہ فرد اقبال کی اس دیرینہ خواہش کو پایہ تیکیل تک پہنچادے اور قرآن حکیم فلسفہ اسلام اور دین متین پر ایک ایسی کتاب معرض وجود میں آجائے جو آج اور ہمیشہ مملکت پاکستان کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے لیے رشد و ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔

وَمَا تُفْتَنِي إِلَّا بِاللَّهِ!

ل روزنامہ ”افق“ لاہور ۲ ستمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۵



کچھ اس کتاب کے بارے میں

(۱۲)

۱۹۷۳ء کو شہزادی عابدہ سلطان..... سابق ولی عہد ریاست بھوپال کی صدارت میں زیر اہتمام نیشنل بک سنٹر بے اشٹر اک اقبال اکیڈمی پاکستان پاکستان نیشنل سنٹر، آرٹس کونسل آف پاکستان اور ادارہ یادگار غالب کراچی اقبال اور بھوپال کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جو مضمایں نظم و نشر پڑھے گئے وہ حسب ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ملک کے مقتدر اخبارات اور رسائل میں جو مضمایں اور تبصرے شائع ہوئے انہیں بھی اس باب میں محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ اقبال شناس ملک کی معترف و متندرجہ شخصیتوں کی آرہا اور خیالات سے استفادہ حاصل کر سکیں اور اقبال اور بھوپال کے مطالعہ میں ان سے مدد مل سکے۔

یہاں یہ اظہار بھی بے جانہ ہو گا کہ اقبال اور بھوپال اقبال اکادمی پاکستان کی پہلی تحقیقی کتاب ہے جس نے ۱۹۷۳ء کی تحقیقی کتابوں میں داؤ دادبی انعام حاصل کیا اور مصنف کو پانچ ہزار روپے عطا کیے گئے۔

ریاض فردوس میں

(نواب حمید اللہ خاں اور علامہ شیخ محمد اقبال کا منظوم مکالمہ)

نواب حمید اللہ خاں

(۱)

نگاہوں کو تمہاری جتو تھی
کہ اک تحریر دلکش رو برو تھی
کتاب اقبال اور بھوپال یہ ہے
دلیل عظمت اقبال یہ ہے
جسے لکھا ہے تم نے دارالاقبال
وہ اس سیپارہ دل میں ہے بھوپال
ستقط شرق بگہ پر ہوں برہم
مسلمان کے تدبر کا ہے ماتم
عجم میں کوئی غیرت مند بھی ہے
روایت کا کوئی پابند بھی ہے
کوئی بوذر کوئی سلمان بھی ہے
دلوں میں آیہ قرآن بھی ہے

بتاؤ کچھ تو پاکستان کا حال
 ابھی اٹھ گئے بیس شیر بنگال
 نئی شیرازہ بندی بھی ہوئی
 کہ مدت اب تچھیر دوئی ہے
 محبت کا کسی نے باب لکھا
 حقیقی صح نو کا خواب لکھا

علامہ شیخ محمد اقبال

(۲)

منم آزردہ ام از حال دنیا
 کہ انساں کرد استھصال دنیا
 شنیدیم آں تگا پوئے دمادم
 والے بنی کہ من گیرم نہ سازم
 وہ ساری صحبتیں ہیں حافظے میں
 جو ہیں اک لکھنوی اے کے تذکرے میں
 درندہ آج پھر انساں ہوا ہے
 مسلمان کا لہو ارزائ ہوا ہے
 زمین دسمنان نخجیر بکف ہے
 عرب لیکن ابھی ساغر بکف ہے
 عجم کی علحضرت کو ہے تشویش

علی اخوان و حسرت کو ہے تشویش
 عجم جوالاں گے مردان حر ہے
 جراحت پیشگی سامان حر ہے
 کہیں صقیل گر تنے دودم عشق
 کہیں صورت گر نقش ارم عشق

۱ مراد صحیہ لکھنؤی

روایت گرچہ ہے پاماں پھر بھی
 دلوں میں موجزن ہے درد مندی
 زمین پاک ہے آسودہ شوق
 مری فردوس ہے معمورہ شوق
 وہاں باقی ابھی خیر شکن ہیں
 ہزاروں دل کا محمد کا وطن ہے
 وفا کے حرف جب لکھے گئے ہیں
 جگر کے خون سے روشن ہوئے ہیں
 (تقریب رونمائی میں پڑھی گئی)..... قمر ہاشمی

ارمغان اقبال

مزاج ناقہ رامانند عرفی نیک می داغم
 مزاج ناقہ سے مانند عرفی میں بھی واقف ہوں
 چوں محمل را گراں ینم حدی را تیز تر خواہم

جو محمل ہو گراں میں تیز کرتا ہوں حدی خوانی
 حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
 حمید اللہ خاں تجھ سے فروغ ملک و ملت ہے
 زالطف تو موج لالہ خیز و از خیا بائیم
 ترے الطاف سے گلش میں فصل گل کی ارزانی
 طوف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
 بجا ہے اہل معنی کو طوف مرقد حالی
 نوائے او بہا نہا افگند شورے کہ من داغم
 کہ ہے اس کی نواوں سے دلوں میں حشر سامانی
 بیاتا فقر و شاہی در حضور او بھم سازیم
 چلیں اس کی لحد پر فقر و شاہی ہم قدم ہو کر
 تو برخاکش گھر افشاں و من برگ گل افشاں
 میں برگ گل لٹاؤں آپ کیجیے گوہر افشاں
 اقبال.....

(ترجمہ : انصاری سحر)

تقریب رونمائی میں پڑھی گئی۔

انتساب ضرب کلیم

اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں فرمائے بھوپال کی خدمت میں
 زمانہ با ام ایشیا بہ کرد و کند

دراز دستی تیرہ شمی کو کیا کہیے
 کسے نہ بود کہ ایں داستان فروخواند
 یہ لطف خاص ہے اقوام ایشیا کے لیے
 تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است
 وہ نور دیدہ بھوپال ہدم اقبال
 دل تو بیند و اندیشه تو می و داند
 قبول صورت شاہین ہر فضا کے لیے

۱۔ ماہنامہ افکار کراچی جون ۱۹۷۳ صفحہ ۲۶-۲۷

۲۔ ایضاً صفحہ ۲۵

بگیر ایں ہم سرمایہ بہار از من
 اسی کے نام سے منسوب تھنہ درویش
 کہ گل بدست تواز شاخ تازہ تر ماند
 وہی ہے آب بقا چشمہ بقا کے لیے
 اقبال.....

.....ترجمہ آزاد: انور حارث
 (تقریب رونمائی میں پڑھی گئی)

خطبہ صدارت

محترم مصنف و میزبان و معزز حضرات!
 آپ نے اقبال اور بھوپال کی افتتاحی یا تعارفی تقریب میں مجھے صدارت کی دعوت

دے کر جس امتیاز ک لیے منتخب فرمایا ہے اس کا ذاتی طور پر ممنون ہونا ایک فطری امر ہے۔ اور میرے لیے یہ ایک بڑا خوش گوار فرض ہوتا ہے کہ میں چند رسمی و اخلاقی خوش نما جملوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں ہدیہ تشكیر پیش کر کے اس فرض سے سبک دوشی حاصل کر لیتی..... لیکن بات اتنی ہی نہیں.....

بات تو یہ ہے کہ صہبا صاحب کی اس بارہ سال کی محنت اس کاوش اس تحقیق اور اس قابل قدر تصنیف نے جہاں علامہ اقبال کی زندگی کے یادوں کے اس گوشے پر پہلی بار روشنی ڈالی ہے جس سے عام لوگ کم واقف تھے وہاں بھوپال کی روایات تاریخی کردار مذہبی علمی، ادبی و قومی خدمات کی بھی نشاندہی پاکستان میں پہلی بار صہبا صاحب کی ہی طرف سے کی گئی ہے۔

اس لیے آج میری مسرتوں میں میرے فخر میں میرے امتیاز میں اور میری سپاس گزاری میں میں تنہ انہیں بلکہ اپنے ساتھ تمام اہل بھوپال کو شریک محسوس کرتی ہوں۔ اور ان سب کی طرف سے میں بھی ہدیہ تہنیت و تبریک پیش کرتی ہوں..... عزیز و قابل فخر مصنف.....

آج ہماری تہمیت میں ایک بڑی مسرت یہ بھی ہے کہ تاریخ بھوپال کے شان دار اوراق میں ایک اور جگہ گاتے باب کا اضافہ ایک فرزند بھوپال ہی کے قلم سے ہوا..... ساتھ ہی ساتھ ہمیں اقبال اکادمی اور ان تمام بزرگ حضرات کا بھی ممنون ہونا چاہیے۔ جنہوں نے اس تصنیف کی ترتیب و تدوین و اشاعت میں اتنا پر خلوص تعاوں کر کے اس کو پاٹیکیل تک پہنچایا۔

اقبال اور بھوپال کے متعلق سب سے پہلے تو میں اس بات کا اعتراض کروں گی کہ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ کوئی شخص اس تحقیق و جستجو میں کامیاب ہو سکے گا۔ کیوں کہ ان واقعات کو

گزرے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ قیام پاکستان کے دوران جو لاکھوں افراد ادھر سے ادھر ہوئے۔ ان میں جان و مال کا نقصان تو ہوا ہی ہوا..... بہت سے رابطہ ٹوٹ گئے۔ قیمتی دستاویزیں خطوط اور کتابیں اس طرح ضائع ہو گئیں کہ پھر ان کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ خود میری کتابیں اور بیشتر کاغذات کا بھی یہی حشر ہوا۔

اس لیے جب مجھے معلوم ہوا کہ اقبال اور بھوپال کے متعلق صہبا صاحب مجھ سے بھی کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مجھے افسوس و مایوسی ہوئی۔ کہ میرے پاس سوائے ان دونوں کے جو علامہ ابال نے مجھے بھوپال میں بطور تخفہ دیے تھے کوئی دوسری تحریری اور ٹھوس مواد نہ تھا جس کو زندگی کے مستند واقعات کی تائید کے طور پر پیش کیا جاسکے.....
مگر اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میری حیرت اور خوشی کی کوئی انہنہ رہی کہ اس تصنیف میں صہبا صاحب نے تحقیق کی دیانت کا پورا پورا حق کیوں ادا کر دیا ہے۔ کہاں کہاں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ واقعات خطوط وغیرہ اکٹھے کیے ہیں اور کتنے دلچسپ انداز میں ان کو پیش کیا ہے۔

یہ کتاب جہاں ماضی پر روشنی ڈالتی ہے وہاں مستقبل کے لیے دعوت فکر بھی دیتی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں بھوپال کے اس دور کے نقشے سامنے آگئے ج میں علامہ اقبال سر راس مسعود، شعیب قریشی، مولانا محمد علی، شوکت علی، مسز نائیڈ و بی اماں، پنڈت نہرو، گاندھی جی، قائد اعظم، اور بہت سے اکابر کی مسلسل آمد و رفت رہتی تھی۔

میں نے سوچا.....

اقبال اور بھوپال قائد اعظم مسلم لیگ علی گڑھ یونیورسٹی اور نواب حمید اللہ خاں یہ سب ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں تھیں جن کا مجموعی نام پاکستان تھا.....

پھر میں نے سوچا..... کہ ان جیسی تاریخ ساز شخصیتوں کا یا اداروں کا ماضی سے توبے

شک رشتہ ہے کہ تاریخ بنائے۔ ایک ملک بنائے۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی و نظریاتی سلطنت بنائے۔ مگر حال و مستقبل سے ان کا کتنا تعلق باقی رہ گیا؟؟؟.....
اس پر آپ بھی غور فرمائیں.....

علامہ اقبال آج ہمارے ہاں ایک تاریخ ساز مفکر، عظیم شاعر، فلسفی اور دانش وردوں کے دیوتا تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان کے پچار یوں کے لیے اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا:
نہ وہ حس میں رہیں شوخیاں نہ وہ عشق کی رہیں گرمیاں
نہ وہ غزنوی کی تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز کی
یوم اقبال تو منایا جاتا ہے۔ قائد اعظم کی شان دار سال گرد بھی ہوتی ہے۔ یوم پاکستان
پر چراغاں ہوتے ہیں تقریبیں ہوتی ہیں تو پوں کی سلامیاں لی جاتی ہیں۔ پر چم لہرائے
جاتے ہیں۔ پھر..... کیوں پاکستانیوں کا دل ہے کہ بجا بجا جاتا ہے نگاہیں جھکی جھکی جاتی
ہیں.....

نہ وہ اسلام کا سُنگھار ہے جو بھوپال کے پتے پتے بوٹے بوٹے سے نکھر کر اس کے حسن
کو دو بالا کرتا ہے۔ نہ وہ علی گڑھ کی بہار ہے۔ جہاں کے نوجوان متوالے ایک قوم ایک ملت
کے نشے میں اٹھلاتے تھے۔ نہ وہ مسلم لیگ ہے۔ جس کا ادنیٰ کارکن بھی نظریہ پاکستان کو
جزویمان تصور کرتا تھا۔

یہ وہی سرز میں ہے جس کو قائد اعظم بانی پاکستان کی پیدائش کا فخر حاصل ہے۔ یہ وہی
ملک ہے جس نے شاعر مشرق کو جنم دیا ہے اور یہ وہی قوم ہے جس نے تعمیر پاکستان کو
عبادت سمجھا تھا.....

بیس بائیس سال کے قلیل عرصہ میں عبادت گناہ میں تبدیل ہو گئی۔ اتحاد مختلف قومیتوں
کو جنم دے رہا ہے۔ علاقائی تعصبات نے اخوت و محبت کی جگہ لے لی ہے۔ مسلمان نے

مسلمان کے خلاف پاکستان نے پاکستان کے خلاف وہ ظلم و بربیت کا مظاہرہ کیا کہ تقسیم ہند کے فسادات بھی شرما گئے۔

میں نے سوچا.....

ایسی فضائیں کتنے لوگوں کو اس سے دلچسپی رہ گئی ہو گئی کہ علامہ اقبال کا بھوپال اور فرمان روائے بھوپال سے کیا تعلق تھا۔ کیا رشتہ تھا۔ کیا پس منظر تھا؟.....

بہر حال واقعات و حالات تو اپنی جگہ موجود ہیں۔ علامہ اقبال اور میرے والد مرحوم میں جو قدریں مشترک تھیں ان کی بنیادی لی گڑھ یونیورسٹی تھی۔ عالم اسلام کی ترقی فلاح و بہبود تھی۔ جو کسی خاص علاقہ سے مخصوص نہ تھی۔

اکثر میرے والد یہ مصروف گنگنا یا کرتے تھے:

مسلم ہیں ہم ڈن ہے سارا جہاں ہمارا اور یہی دھن ہمارے تمام اکابر سابقہ کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔ اگر علامہ اقبال کا تصویر ان کا پیغام ان کی دعا میں یا ان کا شکوہ تمام عالم اسلام کے لیے یکساں تھا تو قائد اعظم بھی صوبہ سندھ تک محدود نہ تھے۔ اور نواب حمید اللہ خاں بھوپال ہی نہیں بلکہ بھوپال کی اس تاریخ کے محافظ و علم بردار تھے۔ جس نے مسلمانوں کی نشاة ثانیہ کے لیے بھوپال اور بیرون بھوپال برصغیر و بیرون برصغیر مسلسل دوسو چھاس سال خدمات انجام دیں۔

اور یہی وہ عظیم رشتہ تھے جو ہمارے بزرگوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے تھے۔ منزل سب کی ایک تھی فرائض جدا جاتی تھے۔ اس دور کے ہر فرد نے ہر طبقے نے بڑی دیانت داری اور بڑے خلوٰۃ دل کے ساتھ اپنا یہ فرض ادا کیا۔ بڑی عظیم الشان قربانیاں دے کر پاکستان بنایا اور اس طرح ہم کو اپنی نشاة ثانیہ کے لیے ایک فقیہ المشائی موقع اللہ تعالیٰ نے عطا

فرمایا.....

مختلف زبانیں تو اس وقت بھی تھیں۔ صوبے تو اس وقت بھی تھے مگر کسی نے بھی ان مسلمانوں کے اتحاد و ارتقا کے لیے رکاوٹ نہ سمجھا تھا۔ ایک ہی نعرہ تھا کہ.....
مسلمان ایک قوم ہے اور بر صغیر میں ان کی نمائندگی کا حق واحد مسلم لیگ ہی کو ہے۔
اسی نکتہ کو نواب حیدر اللہ خاں صاحب نے جب گاندھی جی سے تحریری طور پر تسلیم کروا
لیا..... تو ایک طرف تو گاندھی جی نے فرمایا.....

I Have Made A Himalyan Blunder

دوسری طرف قیام پاکستان کا جمہوری جواز پیدا ہو گیا۔ اور قیام پاکستان کی بنیاد مستحکم ہو گئی۔ اس وقت ہمارے تمام بزرگوں کو یقین تھا کہ جب بر صغیر کے مسلمان متعدد ہو کر سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے قیام میں کامیاب ہو جائیں گے تو دنیا کے دوسرے مسلمان خود بخود اس طرف متوجہ ہوں گے۔ آپس کے اتحاد کی خود بخود تغییب ہو گی اور اس برادرانہ تعلق سے تمام دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے شریک کار و مدد و معاون بن جائیں گے۔

انہیں بنیادوں پر گفتگو ہوتی تھی جس کو بارہا میں نے خود بھی سنائے ہے۔ قائد عظیم سر آغا خاں عامد اقبال میرے والد مرحوم سر راس مسعود چوہدری خلیق الزمان شعیب قریشی ڈاکٹر الفصاری، وغيرہ وغیرہ..... سب متفق تھے۔ سب کے دل میں یہی آرزو کیں تھیں۔ یہی ولوں تھے۔ مگر کتنے قلیل عرصہ میں بجائے اتحاد و اخوت کے الیہ مشرقی پاکستان رو نما ہوا؟ اس سے صرف ہم ہی مجروح نہ ہوئے بلکہ تمام عالم اسلام کو زبردست دھچکا لگا.....!

بہر حال یہ تقریب ایک مصنف کی بارہ سالہ جدوجہد کی کامیابی پر مسرت اور خوشی کے اظہار کے لیے منعقد ہی گئی ہے اس میں میرا یہ ماتم بے موقع بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب یہ کتاب تاریخی بھی ہے اور مستند بھی۔ اقبال اور بھوپل کے متعلق بھی ہے تو

تاریخ کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اگر ماضی کے واقعہ مستقبل کے امکانات سے صرف نظر کیا جائے۔ اس کے مطابع سے اندازہ ہو گا کہ علامہ اقبال اگر مفکر تھے تو اہل بھوپال اہل عمل تھے۔ اور کتنے عزم اور پختگی کے ساتھ مسلمانوں کی عام فلاج و بہبود کے لیے بالخصوص تعمیر پاکستان کے لیے بھوپال نے اپنے اپنے خاندان کے اپنے ورثا کے مفادات کی بھی پروانہ کرتے ہوئے تعمیر پاکستان میں کتنا بڑھ چڑھ کر حصہ لیا.....!

آج کی محفل میں مفکر بھی ہیں مصنف بھی شاعر بھی ہیں اہل قلم بھی۔ اقبال کے جانشین بھی ہیں بھوپال کے وارث بھی آپ کی اس جانشینی کا حق اسی وقت ادا ہو گا کہ مسلمانوں کی نشأة ثانیہ کو آپ اسی طرح جاری رکھیں جس طرح آپ کے ہمارے بزرگوں نے طاقت برطانیہ اور غیر مسلم اکثریت کے باوجود جاری رکھا اور کامیاب بنایا تھا..... وہ دور دور غلامی کہلاتا تھا۔ آج آپ آزاد بھی ہیں اور خود مختار بھی۔ اس وقت آپ کو مستعد داخلافات سے سابقہ تھا۔۔۔۔۔ آج آپ کو صرف اپنے مسلمان بھائیوں کا اعتماد بحال کرنا ہے محبت اور پیار سے متحد کرنا ہے۔ دلائل کے ذریعہ یقین دلانا ہے کہ ہماری سب کی بقا اور ترقی کا راز اتحاد و محبت میں ہے۔ تفرقہ تعصّب سے دینا چاہیے۔ یا طاقت کا مظاہرہ کر کے لوگوں کو مرموم و مجبت میں ہے۔ یہ طریقہ غیر مہذب اور غیر جمہوری ہونے کے علاوہ مسلمانوں کے شایان شان بھی نہیں ہے۔

اس لیے میرے بزرگوں میرے بھائیو میری بہنو ایک ہی موقف ہے ایک ہی نعرہ ہے.....

مسلمان ایک ہی قوم ہیں اور جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں وہاں پاکستان ہے۔
مسلمان جغرافیائی حدود نسلی امتیاز اور لسانی فرق وغیرہ کا کب پاندرہا ہے
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

پاکستان پائندہ باد
شہزادی عابدہ سلطان

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

نے عنوان کی کتاب

جناب صدر برادرم صہبہا خواتین و حضرات.....

میں صہبہا صاحب کو جسمانی طور پر ایک پرچھائیں سے زیادہ نہیں پاتا۔ اور جب دیکھتا ہوں کہ وہ اتنے بھاری بھر کم کام کر ڈالتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ بھاری بھر کم کام کی تازہ ترین مثال اقبال اور بھوپال ہے میں نے کتاب پڑھی ہے اور پوری پڑھی ہے۔ اقبال پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ہیں شاید اتنی ہندوستان میں رہنے والے کسی اردو یا فارسی کے شاعر پر غالب کے سوانحیں لکھی گئی ہیں۔ اقبال اور بھوپال ایک نے عنوان کی کتاب ہے اور مجھے اس کتاب کے باوجود اس کے کہ اس کو مدد و تحقیق یا جزوی تحقیق کہا جاسکتا ہے۔

۱۔ ماہنامہ افکار کراچی جولائی ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۳۳ تا ۳۴۳

بہت سے ایسے مواد ملے ہیں اور بہت سی ایسی محققانہ باتیں ہیں جن میں نہ صرف یہ کہ اقبال کی شاعری اور ان کی شخصیت کے بہت سے نئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ اور بہت سی اہم شخصیتوں کے بارے میں اہم معلومات ہوتی ہیں۔ مثلاً سر راس مسعود، نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال..... ان لوگوں کی شخصیت پر جوروں پر ہوتی ہے وہ اگر یہ کتاب نہ لکھی گئی ہوتی تو شاید ہم لوگ ان لوگوں سے بالکل ناواقف رہتے۔ صہبہا صاحب نے بڑی محنت اور کاؤش اور تحقیق اور دیانت داری سے اور اسی کے ساتھ ساتھ بغیر کسی قسم کے تصرف کے مواد اکٹھا کیا ہے۔ اقبال کے جتنے خطوط انہوں نے اکٹھا کیے ہیں ان کی داد مجھ

سے بیشتر مقررین اور مقالہ پڑھنے والوں نے دی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ جو خطوط مطبوعہ یا غیر مطبوعہ اب تک لوگوں کی نظر سے گزرے ہیں ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سے ان کی شخصیت اور شاعری سے ہم پہلے بھی واقف تھے۔ لیکن ان خطوط سے ان کی شخصیت ان کے قلندرانہ مزاج ان کی تخلیق شعری اور ان کی بہت سی اور انسانی اور شعری حیثیتوں پر ایک نئی روشنی پڑتی ہے۔

اقبال کو اپنے کام کے ساتھ جو کام وہ اپنے ذمے لے لیتے تھے یا اس کے لیے حامی بھر لیتے تھے۔ سچی لگن ہوتی تھی۔ اس کی ایک مثال جس کی طرف بعض مقررین نے اشارا کیا ہے۔ جشن حالی ہے جو ۱۹۳۵ء میں پانی پت کے مقام پر ہوا تھا۔ کس بے چینی کے ساتھ راس مسعود کو بار بار خط لکھتے تھے کہ اور خصوصیت کے ساتھ کہ وہ اس لیے نواب بھوپال کو راضی کر لیں۔ اور ان کو اس بات پر آمادہ کیے رہیں کہ وہ آ کر صدارت کریں جشن حالی کی۔ میں جشن حالی کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ میں خود وہاں موجود تھا۔ ایک منصی کی حیثیت سے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پہلی آفسر تھا اور مجھے وہاں بھیجا گیا تھا.....!

اقبال راس مسعود اور نواب بھوپال سے پہلی مرتبہ ملنے کا موقع مجھے دیں ملا۔ وہ میری ڈاکٹر اقبال سے پہلی ملاقات تھی اور آخری ملاقات بھی..... اور مجھے یاد ہے صہبا صاحب کی کتاب نے وہ یاددازہ کر دی کہ وہ کس قدر بیمار تھا۔ ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ یہی ہیں مجھے کچھ ایسا احساس ہوتا تھا کہ بات بات پر ان پر رفت سی طاری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اگر کوئی سوال کرتا تو زحمت بھی ہوتی تھی۔ میں نے بھی ان سے دو تین سوالات کیے تھے پھر احساس یہ ہوا کہ ان پر رفت طاری ہو جاتی ہے یا آواز چونکہ بیٹھی ہوئی ہے بولنے میں تکلیف ہوتی ہے پھر میں نے سوال نہیں کیا۔ اور انہوں نے ایک ہی دن قیام کیا۔ پھر اسی وقتہ دلی چلے گئے اور دلی سے لا ہو رہے۔ ان تمام باتوں کو تفصیلی معلومات صہبا صاحب نے جس طرح

سے اپنی کتاب میں فراہم کی ہے وہ یقیناً قابل قریب اور ان سے آئندہ لکھنے والے بہت کچھ فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ یہ تو اس کتاب کی اہمیت ہوئی۔ ہم کو یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوتی ہے کہ صہبا صاحب نے بہت مد ہم، بہت ہموار اور بہت سترھے شیشہ طریق پر تحقیق کے بعد جو مواد اکٹھا کیا ہے اس کو سلیقہ سے پیش کیا۔ ان کی عبارت میں شگفتگی ہے اور دلنشی ہے مجھے نہیں معلوم تھا کہ صہبا صاحب ایک محقق بھی ہو سکتے ہیں۔ اور تحقیق کو شگفتہ انداز دلچسپ انداز..... اس انداز میں کہ شروع سے آخر تک کتاب میں دلچسپی قائم رہے اس انداز میں پیش کر سکتے ہیں..... مجھے یہ احساس اس وقت ہوا جب میں نے اقبال اور بھوپال ان کی یہ تازہ تصنیف اٹھائی تو آپ یقین مانیے کہ اس کتاب کو ہاتھ سے رکھ دینے کو ہی نہیں کرتا تھا۔ اور میں نے وہ کتاب دو دن میں پڑھی۔ انہوں نے کتاب میں تحقیق کی بھی داد دی ہے اور شخصیت نگاری کے بھی آداب بر تے ہیں۔ اور بعض شخصیتوں کے جیسا کہ میں نے پہلے کہا بہت سے ایسے گوشوں کو جاگر کیا ہے جو اگر یہ کتاب نہ چھپتی تو شاید ہمیشہ کے لیے پوشیدہ ہو جاتے۔ مجھے شاید اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے بیشتر لوگوں نے مقالے پڑھے ہیں۔ تفصیلی جائزہ لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ کتاب قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ لوگ اس کو خریدیں گے اس لیے کہ زبانی قدر تو بہت عام ہے۔ کتاب کی اصل قدر تو یہی ہے کہ اس کی اشاعت ہو۔ اس کی بکری ہو۔ میرا خیال ہے اور مجھے امید ہے کہ صہبا صاحب کی کتاب کی مانگ ہو گی اور خاص کر کے اقبال انھیوزیاست Enthusiast جو اقبال کے گرویدہ لوگ ہیں ان کی شاعری ان کی شخصیت کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتے ہیں ان کی یہ کتاب مقبول ہو گی۔

..... پروفیسر مجنون گورکھپوری
(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

اقبالیات میں ایک نیا موضوع

اقبال سے تو شاید ہم سب کو برابر کی نسبت رہی ہے لیکن سرز میں بھوپال سے تعلق اور رفیق دیرینہ صہبائکھنوی سے تعلق خاطر کے جرم میں ماخوذ ہو کر میں آج آپ کے سامنے پیش ہوا ہوں۔ میرے لیے یہ اپناہی مسرت کی بات ہے کہ خوش بختی سے اقبال اور بھوپال کے جس مسودے کو مجھے دیکھنے کا موقع ملا تھا وہ آج نظر افروز کتاب کی صورت میں ارباب نظر کے سامنے ہے۔ اس کی ترتیب و تکمیل میں جو دراج طے ہوئے ہیں اور صہبائکھنوی کو جن وقتوں سے دست و گریباں ہونا پڑا ہے۔ اس کا بھی مجھے تھوڑا بہت علم ہوتا رہا ہے..... بہرحال اس را جتنوں میں صہبائکھنوی پر جو گزری ہے یہ بے خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اقبال اور بھوپال کے مطالعہ اقبال اور اقبالیات کے سلسلے میں ایک لاکٹ شتاش کا وہ تحقیق ہے۔

شاہید آج تحقیق سے زیادہ کوئی شعبہ علم تختہ مشق نہیں رہا ہے۔ خصوصاً تحقیق ادبیات کو ادب کے منشیوں نے نقل خلاصہ نگاری اور بسیار نویسی کا مترا داف اور بہانہ بنالیا ہے..... محقق ہونے کا آسان ترین لمحہ ہے کہ چند کتابوں کو سامنے رکھیے اور ان کے متن کی تفصیلات بتاتے چلے جائیے۔ نہ کسی مبسوط نظر کی ضرورت ہے نہ سماجی لپی منظر سے کوئی واسطہ ہے۔ اور نہ انسانی رابطوں سے کوئی غرض ہے۔ اس طرح کی تحقیق نہ ادبی تصورات کے تجزیے کے بکھیرے میں پڑتی ہ اور نہ ان تصورات کو مجموعی انسانی علوم سے منسلک کرنے کا جھمیلا دیتی ہے۔ تھوڑی سی محنت سے رنگ چوکھا آ جاتا ہے۔ اس تحقیق میں خیال کو جگانے اور زندگی کو روشن کرنے کا کوئی پہلو نہیں ہوتا تو نہ سہی خواہ یہ داد تحقیق الماریوں کی زینت ہی کیوں نہ بنتی رہے صاحب تحقیق کا شمار تو ادب کے جغا دریوں میں ہو جاتا ہے اقبال اور

بھوپال کے مطالعہ سے مجھے بڑی خوشی یہ ہوئی ہے کہ یہ کتاب تحقیق کی منشیانہ روایت سے الگ ہے۔ صہبائکھنوی نے اپنے مواد کی جستجو میں کم و بیش گیارہ برس صرف کیے ہیں۔ واقعات کی صداقت کو پرکھنے کے لیے دقت نظر سے کام لیا ہے اور مختلف مأخذات و ذرائع سے اپنی کتاب کے لیے مستند واقعات فراہم کیے ہیں۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ اقبال اور بھوپال کے مطالعہ سے صرف چند خشک اور بے جان کتابوں کا علم نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دور کی تہذیب اس کا فتنی و فکری پس منظر اور اس تہذیب کے پروردہ افراد کے تعلقات کی رنگارگی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ پھر اقبال کے واسطے سے اس دور کی اہم شخصیتوں اور اہم سیاسی و فکری رجحانات کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی فکر سے متاثر فکری لہروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ اس طرح صہبائکھنوی کی تحقیق بوسیدہ ہڈیوں کو منظر عام پر نہیں لاتی۔ ذہن کی زندہ وفعال سرگرمیوں کو پیش کرتی ہے۔

۱۔ ماہنامہ افکار۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۲۸، ۳۵۰

علم و ادب کا ذوق ایک زمانے سے خطہ بھوپال کے باشندوں کا حصہ خاص رہا ہے۔ اور جا گیر دارانہ سماج کے باوصف علم و ادب کی قدر دانی کی روایت کو اس خطے نے خوب پروان چڑھایا ہے۔ شلبی اور اقبال جیسے دیوپیکر مشاہیر ادب کی علمی و تحقیقی کاموں میں اعانت کا فخر بھوپال کو حاصل ہوا تھا۔ صہبائکھنوی نے جہاں ایک جانب بھوپال کی علمی فضاء اور ادبی کارناموں کے پس منظر کو تاریخی حوالوں کے ساتھ واضح کیا ہے وہاں درا الاقبال بھوپال سے شاعر عالم اور فلسفی کے روابط کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے۔ اس طرح کتاب میں اقبال اور بھوپال کے دو بظاہر الگ الگ موضوعات میں اس علمی اور فکری وحدت کو دریافت کرنے کی کوشش جھلکتی ہے جو اقبال کو بھوپال کے قریب لائی اور جس نے بھوپال کے باشندوں کے لیے اقبال کو روشنی کا مینار بنادیا۔ یہ حقیقت ہے کہ صہبائکھنوی

کی اس کتاب سے چند نئے گوشے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اور ان سے خاص طور پر اس بر صغیر کے مسلمانوں کے اس فکری پس منظر کی تلاش و جستجو کو تحریک ملتی ہے جس ن درہ خیر سے لے کر بیناف اور راس کماری تک نئی بیداری کی لہر دوڑانے کے ساتھ بعض تہذیبی نقش بھی قائم کیے تھے اور خطہ بھوپال نے بھی اس نقش آرائی میں اہم حصہ لیا تھا۔ اس سلسلہ فکر کا ایک مظہر تحریک پاکستان اور مملکت پاکستان بھے ہے۔ امید ہے کہ اقبال اور بھوپال میں جن امور کی جانب چند اشارے ملتے ہیں ان کی بنیادوں پر تحقیق کی نئی عمارتیں استوار کی جائیں گی۔ اس باخوانی میں سینے کے داغوں کوتا زہ رکھنے کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کے لیے راہوں کے تعین میں مدد ملے گی۔ کوئی ثقافت و سیاست ماضی سے بالکل بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ اس کے بخلاف ماضی کی خوبیوں اور خامیوں کا تنقیدی جائزہ شعور کی سطح کو بلند کرتا ہے ارو لائن عمل کے انتخاب میں معاون ہوتا ہے۔ اقبال فکر و عمل کے شاعر ہیں۔ اسی لیے اقبال کے ذکر و فکر و جذب کے تذکرے اور بھوپال میں ان کے کلام سے حاصل کردہ سرو و سوز و مستی کی روایت میں آج کے لے بھی بہت کچھ سامان بصیرت موجود ہے۔

اقبال اور بھوپال میں اقبال کی بعض نظموں اور بعض اشعار کی عقیبی زمین اور محکات اس طرح سامنے آئی ہیں کہ ان نظموں اور ان اشعار کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی شخصیت کے بعض خبی اور نازک گوشے ان کی قرآنیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ان کی زندگی میں خلوص و دل نوازی کے نقوش ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ اقبال کے چند خطوط بھی جو اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں جہاں اقبال کے بھوپال اور بھوپلا کی ممتاز شخصیتوں سے خصوصی روابط کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں ان کی سیرت بعض دلکش نگوں کے ترجمان ہیں اس کے علاوہ اس کتاب میں بعض جگہ تصورات فن کے بارے میں خود اقبال کے اقوال بحوالہ راوی درج کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان میں کوئی بھی تصور نیا نہیں ہے ارونہ

پہلی بار پیش ہوا ہے لیکن ان سے اقبال کی قد آور شخصیت کے سمجھنے میں ضرور مدعاً تی ہے۔ مثلاً اقبال کا یہ تصور فن کے بغیر اچھے علم کے اچھا ادب تخلیق ہنسیں ہوتا خود ان کے فن کی بلندی کا شارح ہے۔ اقبال کے راس مسعود اور دیگر احباب سے بے تکلفانہ تعلقات میں بھی جس مشرقی وضع داری اور کھڑر کھاؤ کی جھلک ملتی ہے وہ ایک دور تہذیب کی گواہی دیتی ہے۔ ان تعلقات سے جہاں اقبال کی شاستری اور نظم و ضبط کا پتا چلتا ہے وہاں ایک دور کی اقدار شاستری کا حال بھی کھلتا ہے۔ صہبہ لکھنوی نے اپنے موضوع کا دل نشیں انداز سے جائزہ لیا ہے۔ اور اقبال کی احسان شناسی دوست نوازی صاف دلی اور اعلیٰ ظرفی کے نقوش کچھ اس طرح پیش کیے ہیں کہ خود اقبال کے لفظوں میں خیاباں سے موج لاہ کے اٹھنے کا گمان ہوتا ہے۔ اپنی تلاش و جستجو میں صہبہ لکھنوی نے بعض نئے گوشے دریافت کیے ہیں اور انہیں پہلی بار اس کتاب کے ذریعہ متعارف کرایا ہے۔ اس طرح تحقیق تاریخ اور سیرت نگاری میں جو تخلیقی ہم آہنگی قائم ہوئی ہے۔ وہ اس کتاب کا بڑا وصف ہے۔ اس سے ایک عمر کے ادبی انہاک کا پتا چلتا ہے۔

اقبال کی مجوزہ کتاب کے خاکے میں جو صہبہ لکھنوی نے میاں محمد شفیع کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اقتصادی مساوات کو بھی معاشرے کی ضرورت سمجھا گیا ہے۔ اقبال کی فکر سے آگاہی رکھنے والوں کے لیے یہ کوئی نیا نکتہ نہیں۔ لیکن اقبال کی شاعری کو اپنی رجعت پسندی کا شکار بنانے والوں کے لیے ضرور ایک تازیانہ ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال اور بھوپال کے مطالعہ سے زندگی کی عظمت و سعادت کا نقش ذہن پر مرسم ہوتا ہے۔ صہبہ لکھنوی کے ساتھ ساتھ اقبال اکیڈمی اور نیشنل بک سنٹر بھی سزاوار ستائش ہیں کہ اقبال کے سلسلے میں ایک اچھی کتاب منظر عام پر آئی ہے۔

بیابہ مجلس اقبال ویک دو ساغر کش

اگرچہ سرانہ تراشند قلندری داند ڈاکٹر حنفی فوق

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

اقبال اور بھوپال

صہبائے لکھنؤی سے میرے برس ہابرس کے تعلقات ہیں۔ اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں صہبائے جن ادوار سے گزرے ہوئے ہیں ان سے میں بخوبی واقف ہوں۔ ایک عرصہ گزرا جب صہبائے کہا تھا کہ بھوپال کی ریاست سے اقبال کے گھرے روابط تھے اور ایک کتاب اقبال اور بھوپال کی بھی جاسکتی ہے۔ ایک دوسال بعد انہوں نے کہا کہ میں نے کتاب پر کام شروع کر دیا ہے۔ مواد کی فراہمی مشکل سہی لیکن ناممکن نہیں ہے۔ اس زمانے میں عبدالقوی دسنؤی کی کتاب کا تذکرہ ہوا۔ صہبائے لکھنؤی کی رائے میں یہ کتاب اقبال اور بھوپال کے روابط پر تشدد تھی۔ اہل بھوپال اور اقبال کے قریبی تعلقات رکھنے والوں کی جانب سے صہبائے لکھنؤی کے خطوط کے جوابات آنے شروع ہوئے تو آہستہ آہستہ کام آگئے بڑھا۔ لیکن میں نے صہبائے لکھنؤی کی بالتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے..... میں سوچتا تھا کہ اقبال اور بھوپال کے عنوان سے تفصیلی کتاب بھی لکھی جائے تو مطالعہ اقال می اس کی کیا اہمیت ہوگی۔ اس کے علاوہ صہبائے لکھنؤی کے بارے میں کچھ زیادہ خوش فہمی نہ تھی۔ میں انہیں ایک دینانت دار اور محنتی ادبی صحافی سمجھتا تھا۔ لیکن میں ان سے کسی تحقیقی کام کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ میں صہبائے لکھنؤی کے اتنے قریب رہ کر بھی ان کی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا اور مجھے اپنے استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ایک بات یاد آئی جو وہ اپنے طالب علموں سے گا ہے بگا ہے کہا کرتے

تھے کہ آدمی ٹھک ٹھک کرتا رہے تو کچھ نہ کچھ ہو رہتا ہے۔ صہبہ لکھنوی کی کتاب مکمل ہوئی تو یہ جملہ ذہن کے کسی چھپے ہوئے گوشے سے نکل کر روشنی میں آگیا اور پتا چلا کہ ہم انسان کی محنت اور ذہانت کے بارے میں جواندازے قائم کرتے ہیں۔

۱۳۷۴ء صفحہ ۱۲۱- جولائی ۱۹۸۷ء مہنامہ افکار۔ کراچی

وہ اکثر صحیح نہیں ہوتے۔ کیوں کہ کام کرنے والے اپنی لگن میں محمود رات اپنی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ ہم ان کے بارے میں بھی کچھ سوچتے رہیں لیکن وقت کی میزان پر وہی پورے اترتے ہیں اور اپنی منزل تک پہنچنے کا راستہ ہموار کر لیتے ہیں صہبہ لکھنوی میں بھی کام کرنے کی بے پناہ دھن تھی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی صحت کی خرابی اور گھر لیا اور کاروباری مصروفیات کے باوجود اس کتاب کو مکمل کر کے ہی دم لیا۔

صہبہ لکھنوی کی کتاب اقبال اور بھوپال کیسی کتاب ہے۔ اس میں کیا کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ عرض کر دوں کہ عنوان سے آپ لوگ بھی میری ہی طرح اس فریب میں پہلا ہو سکتے ہیں کہ ہو گی کوئی کتاب جس میں ریاست بھوپال اور نواب بھوپال سے اقبال کے چند رشتؤں کو بیان کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن ایک بار کتاب پڑھ لیجئے پھر آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ کتاب بر صیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم ترین باب ہے اور ایک ایسی مستند ادبی اور تاریخی دستاویز ہے جسے نہ ادب کا آدمی فراموش کر سکتا ہے اور نہ تاریخ کا.....

میں تحقیق کے فن سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں رکھتا۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ صہبہ لکھنوی کئے مواد کی فراہمی اور ترتیب اور حقائق کی چھان چھٹک کا ایسا سلیقہ کہاں سے برداشت ہے۔ لے دے کر ذہن اس خیال کی طرف مڑ جاتا ہے کہ وہ پروفیسر نواب علی کے بھتیجے اور داماڈ ہیں۔ نواب علی صاحب کی وقت نظر اور تحقیق لگن سے کون واقف نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ گھر کی یہی روایت صہبہ کے خون میں رچ گئی ہو گی۔ اور اس نے صہبہ لکھنوی کو اکسایا بھی ہو گا کہ تحقیق

کا کوئی کار نامہ کر کے دھاؤ۔۔۔

صہبائکھنوی نے اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اقبال اور بھوپال کے تعلق سے جو کچھ میسر آ سکتا تھا حاصل کیا اور اسے ایک لڑی میں پروردیا۔ نتیجے کے طور پر ان کی کتاب تاریخ کے ایک پورے دور کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس میں بھوپال کی معاشرت کی دل کشی اور خوبصورتی ہے۔ نواب حمید اللہ خاں کی ذہانت تدبیر اور علم دوستی کو ابھر پور عکس ہے۔ علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور شخصیت کی تابنا کی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں یہ کتاب بھوپال سے نکل کر پورے بر صغیر کے حالات پر محیط ہے۔ یہ بر صغیر ک ادب و ثقافت معاشرت و تہذیب اور سیاست کا تدبیر کا آئینہ بن گئی ہے۔ اس میں شخصیتوں کے ایسے خاکے ہیں جو ذہن سے کبھی مونہیں ہو سکتے۔ قدسی صاحب اقبال اور ممنون کی شخصیتوں کو صہبائکھنوی کے قلم نے لا زوال بنا دیا ہے۔ راس مسعود اور لیڈی مسعود کے اقبال سے روابط پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی دوستی اس کتاب کا ایک مکمل باب ہے۔ جس کا ایک سرا راس مسعود کی علم دوستی ہے اور دور اسرا شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاعرانہ اور ملی بصیرت ہے۔

اور بہت سی باتیں اس کتاب کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں نے یہاں صرف تعارفی باتیں لکھی ہیں۔ باقی آپ کو خود پڑھنی ہوں گی۔ مجھے صرف ایک بات اور کہنی ہے کہ صہبائکھنوی نے یہ کتاب لکھ کر اپنے گھر کی روایت ہی کو نہیں اردو تحقیق کو ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ لیکن ان کا اسلوب پروفیسر نواب علی کی بجائے شبی کی یاد دلاتا ہے۔ اس میں شَفَقَتِی اور رعنائی ہے وہ تحقیق کی باتیں خشک پیرائے میں لکھنے کی بجائے اپنی بات کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اسلوب کا تجزیہ بڑا مشکل کام ہے لیکن مجھے اس کے ایک سبب کا بالکل صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ انہیں اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں اپنے کام سے

اتنا گہرائشغ رہا ہے کہ زبان اپنی تمام تر دل کشی اور خوبصورتی کے ساتھ ان کے نوک قلم سے برا برپکتی رہی ہے۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ یہ کتاب اہل بھوپال کے لیے ایک نادر تخفہ ہے۔ کیوں کہ کسی جگہ سے متعلق شاذ و نادر ہی ایسی کتاب لکھی جاتی ہے مطالعہ اقبال میں اس کتاب کو بہت خاص جگہ دینی پڑے گی۔ کیوں کہ اس میں واقعات کی ترتیب بڑے اہم نتائج مرتب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود صہبا کھنونی تاریخی واقعات کی ترتیب میں اور اپنے اسلوب میں اس طرح سائے ہوئے ہیں کہ انہیں بھی اس کتاب میں دوام حاصل ہے۔ اسی لیے آج جب اس کتاب کا جشن منایا جا رہا ہے تو میرے نزدیک یہ جشن اقبال بھی ہے جشن بھوپال بھی ہے اور جشن صہبا بھی ہے۔ اور یہ بات نہ میرے بتانے کی ہے ارنہ آپ کے کہنے کی بلکہ خود کتاب کہتی ہے کہ یہ ایک یادگار جشن ہے.....!

..... پروفیسر انجم اعظمی

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

صہبا، اقبال اور بھوپال

ہمارے ہاں تحقیق کی لگن ذرا کم رہی ہے اور اردو میں تو اس چراغ کی لو اور بھی مضم ہے۔ تاہم اس سے یہ قیاس کرنا کہ درست نہیں ہو گا کہ اردو میں معیاری تحقیق کی بلند پایہ کتابیں ہی موجود نہیں۔ ہیں اور ضرور ہیں مگر ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں تحقیق کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا جس کی وجہ سے مستحق ہے۔ چنانچہ جب اقبال اور بوصپال کی اشاعت کا مسئلہ درپیش تھا تو ایک بزرگ فرمانے لگے کہ اقبال دو تین مرتبہ بھوپال گئے ہیں اور وہاں چند مہینے قیام کیا پھر بھلا زندگی کے اس مختصر واقعے پر کتاب لکھنے سے کیا فائدہ۔ دراصل یہاں کی ذاتی رائے نہیں تھی بلکہ اس کو ہمارے معاشرے کے ذہنی افکار کا پرتو

سمجھنا چاہیے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ شیکسپیری جو اکبر اور جہاں گیر کا ہم عصر تھا اور جس کے انتقال کو ساڑھے تین سو سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ اس پر بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ ہر سال ایک دونیٰ کتاب میں اس پر شائع ہو جاتی ہیں۔ اقبال کی وفات کو بھی پورے چالیس سال بھی ہیں ہوئے مگراب ہم اس پر مزید لکھنے سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں خدا ردو میں غالب کے بعد اگر کسی پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے تو وہ اقبال ہے مگر ابھی اقبال کی زندگی کے بہت سے گوشے ایسے ہیں کہ جو عوام کی نظر میں سے پوشیدہ ہیں۔ اور ان کو منظر عام پر لانے کی شدید ضرورت ہے۔ اقبال اور بھوپال اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بھوپال ایک ممتاز ریاست تھی قدیم جا گیر دارانہ نظام کی ایک شاخ مگر اس زمانے میں بر صغیر میں یہی نظام قائم تھا اور اس نظام میں براہیاں بھی تھیں اور اچھائیاں بھی بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ سربراہ خود کچھ خوبیوں کا حامل ہو۔ بر صغیر میں اس نظام نے علم و ادب بہ اور فن کی بڑی خدمت کی ہے اور بر صغیر ہی پر کیا مختصر عالمی علم و ادب میں اس ادارے نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انگریزی زبان کے قابل فخر شاعر مثلاً چاہ سر سودے، وردس و رکھ، مٹی سن، ملک الشعرا، اور ہیں جو اس رتبے پر نہ پہنچ سکے ان کو وہ بھی کسی نواب یا رئیس کی سرپرستی حاصل رہی۔ شیکسپر کا مرتبی وریو ٹھیلی Wiro Thesley ارل آف سائنس ہمپٹن تھا۔ یہی صورت ایرانی شعرا کی ہے۔ بر صغیر کی یہ روایت برقرار رہی اور جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھرا تو یہ روایت بھی منتشر ہو گئی مگر اردو اس کے ادب، شہ پاروں اور اس کے فن کاروں کی کہانی ان منتشر کرداروں کے ذکر کے بغیر کیے مکمل ہو سکتی ہے؟ جب تک اردو زندہ ہے حیر آباد کھن کی اس خدمت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ بر صغیر میں یہیں سب سے پہلے اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا

او علم جواب تک نامانوس زبانوں میں قید تھا سرز میں جامعہ عثمانیہ پر آزاد ہوا عام ہوا۔ ریاست بھوپال کی تاریخ کا دور تقریباً اڑھائی سو سال پر مشتمل ہے۔ اور اس کی علمی و ادبی تاریخ بھی اسی ورپر محیط ہے۔ اس نے ہمیشہ علم و ادب کی سرپرستی کی علماء و فضلا کی قدر کی، عین کاموں کی ہمت افزائی کی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں بھوپال کا ایک وفد حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیوان ریاست کی جانب سے نذرانہ اور تھائے پیش کیے شاہ صاحب کو بھوپال آنے کی دعوت دی۔ باہہ ہزار سالانہ جاگیر کی پیش کش بھی کی۔ شاہ صاحب نے ضعیف العمری کی بنابر معدودوری کا اظہار کیا۔ ایک اور نئیں نے مومن کو بھی بھوپال بلانا چاہا۔ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز الیے کے بعد نئیں وقت نواب سکندر جہاں بیگم نے غالب کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور کل مصارف کی ذمہ داری لی مگر وہ بھی دلی کی گلیاں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کے باوجود بیگم اپنے ماموں میاں فوج دار محمد خاں کے ذریعہ غالب کی خدمت کرتی رہیں اور اسی آمد و رفت کا نتیجہ تھا کہ غالب نے اپنے اصل دیوان کا نسخا پئے قلم سے تصحیح کر کے نذر کیا۔ اور یہی نسخہ اوائل بیسویں صدی میں عبدالرحمن بجنوری کے مقدمے کے ساتھ نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا۔ اتفاق دیکھیے کہ اس پچاس سال کے بعد غالب کی صد سالہ بری یعنی ۱۹۶۹ء میں جو دور اہم نسخہ عرضی شزادہ شائع ہوا وہ بھی بھوپال کے ایک کتب فروش کے حاصل ہو کر امر و ہے پہنچا۔ یہ نسخہ بھوپال کیسے پہنچا اس کی تحقیق پر ستاران غالب کے ذمہ ہے۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے عہد میں اردو اور عربی میں مختلف علوم و فنون پر اس کثرت سے بلند پایہ کتابیں بھوپال میں شائع ہوئیں کہ بھوپال کو بغداد الہند کہا جانے لگا۔ نواب سلطان جہاں بیگم خود مصنف تھیں اہل علم کی مدد اپنا فرض صحیح تھیں۔ سیرۃ النبی کے لیے علامہ شبلی نعمانی کی اعانت تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

تاریخ البر امکہ اور دوسری اہم تصانیف کی اشاعت ان ہی کی مرہون منت ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انجمن ترقی اردو مدرسہ دیوبند مدرسہ صولتیہ، مکہ معظمه اور دیگر اداروں یا افراد کو مستقل مددگار کرتی تھی۔ علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان کی یا ان کی اولاد کی سالگر ہوں پر سیم وزر کے نذر انوں کی بجائے علمی اور ادبی تحریک پیش کرتے تھے۔ ہمارے مہمان خصوصی کی ابتدائی تربیت ہی ان بزرگ کی گود میں ہوتی اور ان کی اکثر سالگر ہوں پر مطبوعہ کتب پیش کی گئیں۔

نواب محمد حمید اللہ خاں نے علمی ماحول میں آنکھ کھو لی۔ علم و ادب سے محبت اور وابستگی ان کو درستے میں ملی۔ انہوں نے بر صغیر کی سیاسی، سماجی اور علمی دنیا میں بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آدی سے قبل اور بعد دونوں ادوار میں سیاسی حالات اور مصالح نے ان کی بھرپور شخصیت کے خدوخال کو اجاگرنہ ہونے دیا اور ان کی پیشتر خدمات صرف منتشر زبانی روایات تک محدود رہ گئیں۔ اقبال اور بھوپال کی اشاعت سے قبل یہ واقعہ کس کو معلوم تھا کہ علامہ اقبال کے سفر پسین کے محرك اور معاون کون تے جب لندن میں منعقدہ دوسری گول میز کانفرنس کے زمانے میں علامہ نواب صاحب سے ملنے گئے توباتوں با توں میں انہوں نے کہا کہ اقبال پسین کیوں نہیں جاتے؟ تو علامہ نے برجستہ جواب دیا کہ اگر میں بھی نواب بھوپال ہوتا تو اب تک ہوا آیا ہوتا۔ دوسرے دن علامہ کو نواب بھوپال کی جانب سے چھ ہزار روپے کا چیک مل گیا اور سفر پسین کا انتظام ہو گیا۔ اس واقعہ سے قطع نظر علامہ کے اس سادہ سے جملے میں بڑا وسیع مفہوم پوشیدہ تھا۔

۱۔ مرزاظلف الرحمن ذکر یار جلے، پاک پبلیشنرزمیہد کراچی اپریل ۱۹۷۸ء صفحہ ۵۷

۲۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ ادارہ ادب و ترقیہ

وہ اب تک صرف نواب بھوپال کی سیاسی سوچھ بوجھ فراست اور دانائی کے تو ضرور قائل تھے مگر ہر بھی وہ ان کو محض ایک عالی دماغ والی ریاست ہی سمجھتے تھے۔ مگر بعد میں جب ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اور ان کے دوسرے خیالات معلوم ہوئے تو محسوس ہوا کہ ان کے دل میں بھی اسلام اور مسلم قوم کی سر بلندی کے لیے وہی تڑپ اور لگن ہے جو علامہ کے اپنے دل و دماغ میں موجود ہے۔ قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھوانے کی خواہش اس کا بین ثبوت ہے۔ جب ان کو اس والی ریاست میں قلندرانہ صفات درویشانہ خصوصیات اور مجاہدانہ جذبات نظر آئے تو وہ ان کو بے ساختہ صاحب نظری سے مخاطب کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ محض شاعری نہیں تھی بلکہ اس یکتائے روزگار کے دلی جذبات کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز تھی جو خود اپنے متعلق یہ کہتا ہے:

سر آمد روزگار ایں فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ نیائید

یہی دانائے راز نواب کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیتا ہے

کہ:

گبیر! ایں ہمہ سرمایہ بہار از من

یہی وہ ستائش اور عقیدت تھی جس نے اقبال کے مددوح کو بھی زندہ جاوید کر دیا۔

پاکستان میں اس کا احساس ذرا مشکل ہے۔ اس کا اندازہ اس ایک چھوٹے سے واقعے سے

ہو سکتا ہے کہ ریاست ۱۹۴۹ء میں وفاق ہند میں ضم ہو کر کمشنز کا صوبہ بنی اور پھر کیم نومبر

۱۹۵۶ء کو مدھیہ پردیش کے صوبے میں مغم ہو گئی۔ اس کے بھی چار سال بعد یعنی ۱۹۶۰ء

میں اردو کے ایک پیر و فنی شاعر جگن نا تھا آزاد ایک بڑے مشاعرے میں شرکت کے لیے بھوپال آئے انہوں نے وہاں چند روز قیام کے بعد ایک طویل نظم کہی اس کے دو شعر پیش خدمت ہیں:

اے مرے اقبال کے مددوہ کی دنیائے حسن
اج بھی لبریز مستی ہے تری صہبائے حسن
حال پر ماضی ترا اب بھی بھلی بار ہے
آج بھی تیری زمیں پر بارش انوار ہے ۲

علامہ نے مولانا حالی کی صد سالہ بر سی پر جو نظم پڑھی تھی اس کے اس شعر میں علامہ نے اپنے اور نواب بھوپال کے تعلق اور دونوں کے مقامات کو بڑی خوبصورتی سے یوں ادا کیا تھا:

بیاتا فقر و شاهی در حضور او بہم سازیم
تو برخاکش گھر افshan و من برگ گل افشا نم
اقبال اور بھوپال طویل کہانی کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ جس کی کڑیاں تاریخی شواہد کے ساتھ ایک دوسرے سے مسلک ہیں۔ میری نظر میں اس کتاب کی مندرجہ ذیل خصوصیات خاص طور پر مستحق توجہ ہیں:

۱۔ یہ کتاب تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس میں بیشتر چیزیں اب تک عوام کی نظر وہ سے پوشیدہ تھیں۔ اگر صہبا اس کو یک جا کرنے کی کوشش نہ کرتے تو کچھ عرصے بعد یہ سارا موالائف ہو جاتا۔ کتاب کی اشاعت تک اقبال کے بعض نیاز مند اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور بعض چراغ سحری ہیں جن میں محترم قدسی صاحب قبلہ محترمہ خاتون ارشدؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۲۔ افسوس کے اسد الرحمن قدسی کا ۱۹۷۹ء میں اور خاتون ارشد کا ۱۹۷۳ء میں

انتقال ہو گیا۔

۲۔ کتاب میں متعدد انکشافت ہیں مثلاً شکوہ کا محرك کون تھا؟ علامہ نے شکوے کے ایک بند میں کیسے تمیم کی۔ کس طرح ایک کم نام شاعر کو اصلاح دی۔ مذکرا اور موٹ کے اعتراض کا جواب کس عالمانہ انداز میں دیا۔

۳۔ مختلف نظمیں اور اشعار جو بھوپال میں کہے ان کا پس منظر کیا تھا۔ مثلا جب بھوپال میں شیش محل میں قیام تھا تو آپ نے پہلی نظم صحیح کہی جس کا آخری شعر یہ ہے:

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذان سے پیدا
یہ شعر جس کیفیت سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے وہ ریاض منزل کے قیام سے ممکن تھی۔
کیونکہ یہ کوئی آبادی سے باہر الگ تھلگ ہے بھوپال کو مسجدوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہاں بعض حصوں پر تو چپے چپے میں مساجد ہیں مثلاً شیش محل کے گرد اگر دیکھ فرلانگ یا ڈسپلی کا فرلانگ کا دائرہ کھینچا جائے تو وہاں کوئی گیارہ بارہ مسجدیں ہیں۔ اس زمانے میں لاڈ سپلائر کا رواج نہیں تھا۔ ریاست کے محلہ مساد کی جانب سے ہر مسجد میں خوش الحان امام اور موزون تھے۔ ویسے بھی علاقہ ہر قسم کے شور و شغ سے پاک تھا۔ پھر صحیح کی اذانوں میں ہر مسجد میں رق بھی ہوتا تھا۔ اس طرح خوش الحان قاریوں کی مسلسل اذانوں سے ایک عجیب روح پرور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اس سے ایک عام آدمی متاثر ہو سکتا ہے تو پھر مغرب میں سخر خیزی کے آداب نہ چھوڑنے والے پر جو گزرتی ہے اسی سے متاثر ہو کر مندرجہ بالا شعر کہا گیا ہے۔

۴۔ مختلف غیر مطبوعہ خطوط اشعار اور بعض نادر تصاویر جو پہلی مرتبہ منظر عام پر آئیں۔

ان سے بہت سے شخصی پہلو اجاگر ہو گئے۔ انصاری صاحب کی کونکے سے بنائی ہوئی تصویر سے بھوپال کے کچھ پرانے حضرات تو واقف تھے مگر پاکستان میں تو بہت ہی کم لوگوں کو اس کا علم تھا۔

۵۔ اقبال کے افکار سے یوں تو پورا برصغیر متاثر تھا مگر انے مختصر سے قیام سے بھوپال کے علمی اور ادبی حلقے کیسے متاثر ہوئے کس طرح سکون و جمود بتا لطم خیز موجودوں میں تبدیل ہو گیا۔ میرے خیال میں بھوپال میں ۱۹۳۵ء کے بعد غور و فکر کی جوئی را ہیں کھلیں نظم گوئی کا شدت سے آغاز ہوا نجمن ترقی پسند مصنفوں قائم ہوئی اقبال لاہوری کا آغاز ہوا ان سب میں غیر شعوری طور پر بھوپال میں علامہ کے قیام کو بڑا دخل رہا ہے۔

صہبا مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے چالیس سال کی کڑیاں ایسی ترتیب مہارت اور خوبصورتی سے ملائیں کہ اس پر بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ اس ذیل میں ان کو جو کاوش کرنا پڑی اس کو ان کا دل ہی جانتا ہو گا۔ مگر یہ کون دیکھتا ہے کہ تاج محل کے لیے پھر کہاں سے لایا گیا؟ لوگ تو تاج محل کو دیکھ کر انگشت بندہاں رہ جاتے ہیں۔ صہبا کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔ ان کا ایک دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا۔ ان کا تاج محل کھرا ہو گیا۔ بلکہ انہوں نے اقبال پر کام کرنے والوں کے لیے مزید را ہیں کھول دیں۔

کتاب کی ترتیب میں صہبا کی دیانت داری نے بھی مجھے کافی متاثر کیا ہے۔ جو چیز جہاں سے اور جس طرح لی اس کو من عن بیان کر دیا۔ یہ بھی قابل قدر بات ہے۔ ورنہ دوسروں کی باتوں کو اپنے نام سے پیش کر دینا ایک عام بات ہے۔ لوگ تو زندوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیتے ہیں۔ پھر ان کا تو ذکر ہی کیا جواب مدافعت کے قابل نہیں رہے۔

آخر میں میں آپ کی اجازت سے مہمان خصوصی کے ایک چھوٹے سے ذاتی واقعہ کا

تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ملاحظہ ہو دیا جچے طبع ثانی (صہبا)

۱۹۵۲ء میں موصوفہ حکومت پاکستان کی جانب سے اقوام متحده کے جزء اسمبلی کے اجلاس میں پاکستانی وفد کی سربراہ بنا کر بھیجی گئی تھیں۔ غالباً اس وقت ہندوستان کی نمائندگی مسروبے لکشمی بنڈٹ کے ذمے تھی۔ آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ امریکی پرلیس نے آپ کے کام کی بڑی تعریف کی۔ امریکہ کے صدر نے ان کو واشنگٹن آنے کی دعوت دی میں اس زمانے میں وہیں تھا اور میں نے ان کو کامیابی کی مبارکباد کا خط بھیجا۔ وفد کے سربراہ کے پاس سیکرٹریوں اور اسٹینوز کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ان کی جانب سے کوئی بھی جواب دے سکتا تھا یا یہ لکھوا کر دستخط کر سکتی تھیں مگر بھوپال سے تعلق کی بنا پر انہوں نے خود مجھے اپنے ہاتھ سے اردو میں جواب دینے کی زحمت گوارا کی۔ یہ واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ آخر کس نامور باپ کی بیٹی ہیں اور اسی ناتے سے آج یہاں موجود ہیں۔

محمد احمد سبز واری

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

کچھ صہبا کچھ اقبال اور کچھ بھوپال کے بارے میں

صہبا لکھنؤی مدیر افکار ہمارے پرانے دوست ہیں ایسے منجان مرخ کی چاہیں بھی تو کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے..... دھان پان ایسے کہ ہوا تیز ہو تو گھر سے باہر نہیں نکلتے کہ اڑتے اڑتے سمندر میں نہ جا پڑیں۔ خشکی کے جانور ہیں وزن اس عمر میں بھی سو پاؤ نڈے سے تھوڑا ہی اوپر ہے۔ ان کے انگر کھے اور بنیان اور چشمے کا وزن نکال دیا جائے اور یہ جامست بھی کرا لیں تو شاید سو پاؤ نہ بھی نہ رہے۔ ہمارا یہ وزن اس وقت تھا کہ جب نویں کلاس کے

طالب علم تھے صہباصاحب نے انکسار اور کسر نفسی کی حد کر دی۔



دھاپان ہونے کی وجہ سے یہ ٹھوس کام بھی کرتے تھیں۔ ایک کتاب بھی لکھی ہے.....
اقبال اور بھوپال جسے اقبال اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ چند روز ہوئے اس کتاب کی تکریم
میں ایک جلسہ ہوا۔ لوگوں نے خراج عقیدت پیش کیا اور انہوں نے گلے میں ہارڈ لاؤ اکر خوشی
خوشی قبول کیا۔ اچھی اچھی تقریریں ہوئیں۔ جو لوگ کتاب پڑھ کر نہیں آئے تھے انہوں نے
بھی اچھے خاصے عمدہ تبصرے کیے لوگوں کو معلوم نہیں ہونے دیا کہ ہمیں کتاب دیکھنے کی
فرصت نہیں ملی۔ اس بھیڑ میں ہم بھی شامل تھے بلکہ اہتمام ہمارے ہی ذمہ تھا۔ اس سے
فائدہ اٹھاتے ہوئے پروگرام میں نام نہ ہونے کے باوجود ایک پرچہ ہم نے بھی پڑھا جو اس
کالم میں چھاپ رہے ہیں دو صاحب مقررین میں ایسے تھے جن کو اس بات پر تعجب ہوا کہ
صہباصاحب نے یہ کتاب لکھ کیسے لی۔ پروفیسر انجمنِ عظمی بھی بن میں ہی سے تھے۔ آخر
انہوں نے اپنے آپ کو شید احمد صدیقی کے قول سے قائل کیا کہ آدمی کیسا بھی ہو ٹھک ٹھک
کرتا رہے تو ایک دن کچھ نہ کچھ بن جاتا ہے۔ انجمن صاحب کا تعجب تو خیر اس لیے ہو گا کہ ان
کے گمان کے مطابق کوئی شخص باقاعدہ پروفیسر ہوئے بغیر نہ تحقیق کے لا اُق بن سکتا ہے نہ کوئی
کتاب لکھ سکتا ہے۔

۱۔ ماہنامہ افکار کراچی جولائی ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۶۷

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے کہ دلیسی جنتے کے ساتھ صہبانتے ایسا بھاری بھرم کام
کیسے کر لیا انہوں نے صہباصاحب کو آدمی کی بجائے ایک پرچھائیں قرار دیا۔ لیکن یہ
بھول گئے کہ وہ خود تو پرچھائیں کی بھی پرچھائیں ہیں۔ بایس ہمہ اتنی کتابوں کے مصنف ہیں

اور ٹھوس باتیں کرتے ہیں۔ ہیں ان کی بات پر تجھب ہوا تو شاد عارفی مرحوم کا یہ پرانا شعر یاد آیا:

بھلا دیتی ہے فکر شعر تو اے شاد شاعر کو
بڑھے گی شعر کی طاقت یہ جتنا ناتوان ہو گا



اب اس بحث کو ہم چھوڑتے ہیں۔ آیا چھپی صحبت والا یا کوئی گر انڈیل آدمی اچھا ادیب
بن سکتا ہے کلام نرم و نازک کہہ سکتا ہے یا سارا ادب عالیہ کراہتے ہوئے صاحب فراش ہائے
ہائے کرتے ہوئے مخفی ادیبوں ہی نے پیدا کیا ہے ہم نے ایسے ادیب بھی دیکھے ہیں جو ۲۰۰۰
بیٹھک لگا کر اور سو ٹنڈ پیل کر اور ڈیر ڈھ سیر دودھ پی کر لکھنے کو بیٹھتے ہیں اور ایسے بھی ایک بادام
کی گری اور ایک قوام والا پان ان کے لیے دن بھر کے لیے کافی ہے۔ اب پڑھیے وہ پرچہ جو
ہم نے اس روز لکھا تھا۔



صہبا لکھنوی سے ہماری پرانی یادِ اللہ ہے۔ وہ ہمیں جانتے ہیں ہم انہیں جانتے ہیں۔
ان کی کتاب پر اگر ہم تبصرہ نہ کریں گے تو وہ ناراض ہوں گے۔ اور اگر کریں گے تو وہ اور
ناراض ہوں گے۔ کیا کریں ہم لکھتے ہیں ایسا ہیں الہذا عالمانہ تبریوں کا کام دوسرے صاحبوں
کو چھوڑ کر ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اے صاحب تم نے اس کتاب پر اتنی محنت شاق
کیوں کی۔ اگر پیسوں کے لیے کی ہے تو واضح ہو کہ آج کل پیسوں کے لیے کسی قسم کی محنت
کرنے کا مطلق رواج نہیں۔ اگر اپنے نام کے لیے کی ہے تو آپ کا نام پہلے ہی سے روشن
ہے۔ اگر اقبال کے نام کے لیے کی ہے تو اقبال کا نام بھی آپ کے نام سے کم مشہور نہیں۔

بہت سے لوگ جانتے ہیں۔



صہبا صاحب خود مانتے ہیں کہ جب میں نے افکار نکالنا شروع کیا تھا افکار میں بتلا ہوں۔ بلکہ اس قدر کہ مجھ پر مستقل ایک فسانہ بتلا لکھا جاسکتا ہے۔ آج کل اقبال کے خطوط چھاپ کر جوانہوں نے اپنے حکیموں ڈاکٹروں کو لکھئے تھے اور ان کی وظیفیں چھاپ کر اور تمہارا سر آنکھوں پر رکھ کر جن کو وہ رد کر چکے تھے ردی کی ٹوکری میں پھینک چکے تھے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اقبال اتنے بڑے آدمی نہیں تھے جتنا ان کو سمجھ لیا گیا ہے۔ ویسے بھی یہ ایک طرح کی خدمت ہے۔ کیوں کہ جس قدر حضرت اقبال کی حرکت عمل کے پیامبر تھے۔ اتنے ہی ان کے عالی عقیدت مند ہمارے اقبال بھائی جامد اور ٹھس اور بے عمل ہیں۔ بعض لوگ تیہاں تک کہتے ہیں کہ خود اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنی تعلیمات کے چند اس قائل نہ تھے۔ ان کی زندگی میں حرکت اور عمل کا بہت کم گز رہتا۔ اور اگر ہم یہ حوالہ دیں کہ وہ چار پانی پر پڑے دھسے اوڑھے لیٹئے رہتے تھے تو ہمارے ایک اخباری بھائی شاید پھر ہم پر لعن طعن کریں جیسا کہ پہلے کر چکے ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ جس طرح مارکس اپنی زندگی میں مارکسٹ نہیں تھے اسی طرح اقبال بھی بہت زیادہ اقبالی نہیں تھے۔ ان کی زندگی میں جھپٹ کر پاشنا اور جھپٹنا قسم کی کوئی بات آپ کو نہیں ملے گی۔



اقبال اور بھوپال میں سب سے پہلا تعلق تو یہی ہے کہ دونوں ہم قافیہ ہیں اور اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے ہم ناموں اور ہم قافیہ لوگوں کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲ کے شروع میں اقبال حسین صاحب اے ڈی سی کا بیان۔ پھر کچھ

سلسلہ راس مسعود کی ارادت اور نواب بھوپال کی عنایات کا بھی تھا۔ اس کتاب سے ضمناً بعض باتیں علامہ مرحوم کی سیاسی بصیرت کے متعلق بھی معلوم ہوئیں۔ مثلاً ان کی یہ فرماناک نواب بھوپال کو ریاست کشمیر دے دینی چاہیے اور مہاراجہ ہری سنگھ کو بھوپال بھیج دینا چاہیے۔ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کا بھی ذکر ہے ان کے نام کے خطوط بے شک اقبال نامہ میں شامل ہیں لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ ان میں ایک دو خطوط حقیقی ہیں جن میں لمعہ صاحب کو شاعری سے گریز کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ باقی لمعہ صاحب کے اپنے لمعات ہیں یا مشکوک ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے نام ایک خط میں علامہ اقبال نے دو جگہ استفادہ حاصل کرنا لکھا ہے تو ان خطوط کی اصلاحیت پر ہمارا بھی شبہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔



صہبا صاحب نے اس کتاب کے مرتب کرنے میں جتنی محنت کی ہے واقعی یہ آگئینہ تندی صہبا سے پھلا جائے ہے۔ اس میں نئی تحقیق و تدقیق بھی ہے۔ غیر مطبوعہ خطوط بھی ہیں بعض امور کی عقدہ کشائی بھی کی ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کو وظیفہ ملازمت کے مسائل سے بے جا نفرت نہیں تھی۔ اس سے پہلے انوار اقبال والے خطوط سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ فلندر آدمی تھے لیکن کتابوں کی رائماٹی ٹھوک بجا کر لیتے تھے۔ پیلسروں سے بے جار در عایت نہ کرتے تھے۔ اور کوئی عقیدت مند بلا اجازت ان کا کلام چھاپ لے تو خفا بھی ہوتے تھے۔ اس کی جان نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک صاحب کو تو چپسی چھپائی کتاب کا ڈھیر نذر آتش کرنا پڑا۔ اچھی کتاب وہ ہوتی ہے جس میں مదوح کو بے جا طور پر پڑھایا جائے نہ گھٹایا جائے حقائق بیان کیے جائیں۔ اس لحاظ سے اقبال اور بھوپال اچھی اور قابل قدر کتابوں میں ہے۔



بعض لوگ اس کتاب کو سطحی نظر سے دیکھ کر شاید یہ کہیں کہ اس میں بعض غیر ضروری باتیں بھی آگئی ہیں مثلاً حفیظ جاندھری کی نظم یاد حالی دینے کا کیا موقع ہے۔ بے شک اس کا تعلق موضوع سے نہیں ہے تاہم یہ نظم اس کتاب میں محفوظ ہو گئی ہے۔ ضائع نہیں ہو گی۔ حفیظ جاندھری صاحب خود بھی ضائع کرنا چاہیں تو بھی نہیں ہو گی۔ اگر اس کتاب میں صرف وہ اشعار شامل کیے جاتے جو علامہ اقبال مرحوم نے دوسروں کو سنائے تھے تو شاید یہ کتاب اتنی مبسوط نہ بنتی۔ اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال حسین اے ڈی سی اور معظم رسول صدیق مرحوم نے علامہ کوکون کوں سی نظمیں سنائی تھیں اور داد پائی تھی۔ دیوان توہر شخص کا نہیں چھپتا۔ اس بہانے ان بزرگوں کا کلام بھی محفوظ ہو گیا۔ ان کی لمبی لمبی غزیلیں اور غزلیں صہبا صاحب نے بڑی ایمان داری کے ساتھ پوری پوری دے دی ہیں۔



ہمیں صہبا صاحب سے صرف ایک شکایت ہے لیکن وہ شکایت پرانی ہے۔ اس شکایت کو ہم گزارش بنا کر عرض کریں گے کہ لفظ ”اچھوتا“ اور ”اچھوتی“ کا استعمال زیادہ نہ کیا کریں۔ اول تو اس دنیا میں اچھوتی چیزیں بہت کم ہوتی ہیں ہوں بھی تو اردو میں اس لفظ کے مترا دفات موجود ہیں اور ان مترا دفات میں بعض نسبتاً اچھوتے بھی ہیں.....

ابن انشاء.....

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)



کتاب کے بارے میں

صدر گرامی

معزز خواتین و حضرات

رفیقو اور دوستو

میری حیرتی کاوش اقبال اور بھوپال کے بارے میں زبان و ادب کی معتربر معزز اور مقتدر شخصیتوں نے ابھی ابھی جوا ظہار خیال کیا ہے وہ میرے لیے سرمایہ صد افتخار ہے۔ یہ کتاب تقریباً بارہ سال کی لگاتار سعی و جہد کے بعد مکمل ہو سکی ہے۔ اس کے محرک جناب ممتاز حسن خاں سابق نائب اعزازی صدر اقبال اکیڈمی تھے جن کی ذاتی توجہ اور کوشش سے نظیر حیدر آبادی مرحوم کی قابل قدر کتاب اقبال اور حیدر آباد اقبال اکیڈمی سے شائع ہوئی۔ یہ ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے۔ ایک ادبی تقریب کے دوران میں نے جناب ممتاز حسن س عرض کیا کہ اقبال اور حیدر آباد کے بعد اگر اقبال اور بھوپال پر بھی کچھ کام ہو سکے تو علامہ اقبال کی زندگی کا ایک اہم گوشہ دنیا کے سامنے آسکے گا اور شاید اقبالیات میں ایک نئے موضوع کا اضافہ بھی ممکن ہو سکے۔

میری اس تجویز پر جناب ممتاز حسن خاں نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا ار و کہا تو یہ کام آپ کر ڈالیے۔

ممتاز صاحب کے اس مخلصانہ مشورے نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا۔ کئی دن تک اس کتاب کے بارے میں سوچتا رہا۔ کئی خاکے تیار کیے۔ کئی قربی دوستوں سے مشورہ کیا۔

سبھی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ بالآخر اللہ کا نام لے کر میں نے اس کتاب پر ۱۹۶۰ء کے آخر میں کام شروع کیا۔ اور یوں ۱۲ سال کی دیوانہ و ارجمند تحقیق اور تلاش کے بعد یہ کتاب مکمل ہو کر آپ کے ہاتھوں تک پہنچ سکی۔

تحقیق و تلاش کے دوران ایک ممتاز تحقیق اور فقاد کا یہ قول میرے لیے مشعل راہ بنا

رہا.....

”تحقیق کی دنیا امکانی دنیا ہے اور یہ دنیا وسیع بھی ہے اور بسیط بھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے فن میں ”حرف آخر“ ”حرف غلط“ ہے اور اسی وجہ سے ہمیں جلد بازی میں حکم لگانے اور ترتیخ کے تعین میں عجلت نہیں کرنی چاہیے“

چنانچہ میں نے اقبال اور بھوپال کے سلسلے میں نہ جلد بازی سے کام لیا اور تحقیق کے کسی امکان کو نظر انداز کیا۔ کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں جو کچھ بیت گئی اس کی تفصیل میں نے حرف آغاز میں پیش کر دی ہے جو کتاب کے مطالعہ کے دوران آپ کی نظر سے گزرے گی۔ اس کا اعادہ کر کے آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کا سہرا جناب عبدالواحد معینی سابق اعزازی نائب صدر اقبال اکیڈمی جناب عبدالحمید کمالی معتمد اقبال اکیڈمی ڈاکٹر نذیر احمد خازن اور مجلس انتظامیہ کے سرکردہ ارائکین کے سر ہے جنہوں نے میری اس کاوش کو پسند فرمایا ہے اور اشاعت کے سلسلے میں ممکنہ سہولتیں بھم پہنچائیں

۱۔ ماہنامہ افکار کراچی جولائی ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۲۳

میں نیشنل بک سٹریٹ پاکستان سٹریٹ آرٹ کونسل آف پاکستان اور ادارہ یادگار غالب کا بھی دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں جنہوں نے مشترکہ طور پر اس تقریب کا اہتمام کیا اور آپ

تمام حضرات کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے شرکت فرما کر میری عزت افزائی فرمائی۔
آخر میں شہزادی عابدہ سلطان کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے میری درخواست پر اس
تقریب کی صدارت قبول فرما کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

شہزادی صاحبہ اور آپ کی عالی مرتبت والد محترم نواب حمید اللہ خاں نے اقبال شناسی
اور تحریک پاکستان کے سلسلے میں جو تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں انہیں کسی دور کا
مورخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

صہبائکھنوی.....

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

بزم کتاب نمبر ۳

صہبائکھنوی نے مطالعہ اقبال اور اقبالیات کے سلسلے میں ایک لاکٹ ستائش تخلیقی کا ووش
اقبال اور بھوپال کے روپ میں پیش کی ہے۔ صہبائکھنوی نے اس کتاب کے مواد کی جستجو
میں کم و بیش گیارہ برس صرف کیے ہیں۔ اقبال اور بھوپال کے مطالعے سے یہ امر واضح ہو
جاتا ہے کہ یہ کتاب تحقیق کی مشیانہ روایت سے الگ ہے۔ اس سے چند خشک اور بے جان
کتابوں ہی کا علم نہیں ہوتا بلکہ اس دور کی تہذیب، اس کا ذہنی و فکری پس منظر اور تہذیب کے
پروردہ افراد کے تعلقات کی رنگارنگی بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ پھر اقبال کے واسطے
اس دور کی اہم شخصیتوں اور اہم سیاسی فکری رجحانات کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی
فکر سے متاثر فکری لہروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ اس طرح صہبائکھنوی کی تحقیق بوسیدہ
ہڈیوں کو منظر عام پر نہیں لاتی ذہن کو زندہ و فعال سرگرمیوں کو پیش کرتی ہے۔ صہبائکھنوی کی
اس کا ب سے چند نئے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان سے خاص طور پر اس برعظیم

کے مسلمانوں کے اس فکری پس منظر کی تلاش جستجو کو تحریک ملتی ہے جس نے درہ خیر سے لے کر بیناف اور راس کماری تک نئی بیداری کی لہر دوڑانے کے بعض تہذیبی نقش قائم کیے تھے اور خطہ بھوپال نے بھی اس نقش آرائی میں حصہ لیا تھا۔ اس سلسلہ فکر کا ایک مظہر تحریک پاکستان اور مملکت پاکستان بھی ہے۔ اقبال اور بھوپال میں اقبال کی بعض نظموں اور بعض اشعار کی عقیبی زمین اور محرکات اس طرح سامنے آئے ہیں کہ ان نظموں اور ان اشعار کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال اور بھوپال کے مطالعہ سے زندگی کی عظمت و سعادت کا نقش ذہن پر مرسم ہوتا ہے۔

صہبائکھنوی کی کتاب ”اقبال اور بھوپال“ کی تقریب رونمائی شہزادی عابدہ سلطان کی صدارت میں نیشنل بک سنسٹر، آف پاکستان کراچی اقبال اکیڈمی نے مل کر کراچی میں ۲۵ مئی کو ممنانی۔

۱۔ ماہنامہ افکار کراچی۔ جولائی ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۵۔ ۳۶

اس تعارفی تقریب میں حنیف فوق صاحب کے تعارفی کلمات کے بعد پروفیسر مجذوب گورکھپوری محمد احمد سبزواری پروفیسر انجمنِ عظمی، ابن انشا نے مقالات پیش کیے۔ آخر میں صاحب کتاب نے بھی اس کتاب کے بارے میں کچھ فرمایا (ادارہ)۔



مئی کی پچیسویں تاریخ تھی۔ ہم صہبائکھنوی کی کتاب اقبال اور بھوپال کی تقریب رونمائی میں شرکت کے لیے تقریباً پانچ بجے آرٹس کولیکٹ پہنچے۔ ڈاکس سجا یا جا چکا تھا۔ اور کرسیاں وغیرہ بچھائی جا چکی تھیں۔ چند افراد ادھر ادھر گوم رہے تھے اتنے میں سحر انصاری آگئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ دعوت نامے میں ساڑھے پانچ بجے کا وقت دیا گیا ہے۔ چنانچہ

ہم لوگ بک شاپ میں کتاب دیکھنے لگے۔ باہر آئے تو دیکھا کہ ابن انشا صاحب صہبا لکھنوی صاحب اور چند مہماں تشریف لا جکے ہیں۔ بک شاپ کے برابر اقبال اکیڈمی والوں نے اپنی چند کتابوں کا سٹال لگایا تھا جن میں اقبال اور بھوپال نمایاں اور خاصی تعداد میں رکھی ہوئی تھی۔ سٹال پر ایک محترمہ تشریف فرمائیں جو غالباً انچارج تھیں۔ ہم کتابیں دیکھنے لگے۔ جب کتابوں پر ہماری توجہ ان کی عدم تو جہی کاشکار ہو گئی تو ہم آگے بڑھ گئے۔ مہماںوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے کاروں اور پیدل آنے والوں کا تانتہ بندھ گیا اور نشستیں پر ہوتی چل گئیں۔ آنے والوں میں شہر کے معروف و ممتاز شعرا اور ادباء کی خاصی تعداد تھی۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے مہماں خصوصی شہزادی عابدہ سلطان تشریف لائیں۔ صہبا صاحب اور دیگر حضرات نے مصافحہ کیا مختصر تعارفی کلمات ادا ہوئے اور وہ دائیں جانب کی نشست پر بیٹھ گئیں۔ ان کی سادگی ایک خاص وقار و تمکنت لیے ہوئے تھی۔ چہرے پر ماضی کے نقوش نمایاں تھے اور آنکھوں میں عظمت رفتہ کی چمک موجود تھی۔

تحوڑی دیر بعد انشا صاحب جو کوئی کتاب مرکز کے ڈائریکٹر ہیں۔ مائیک سنبھالا اور تقریب کا آغاز کرتے ہوئے شہزادی عابدہ سلطان صاحب سے ڈسپر تشریف فرمائونے کی درخواست کی۔ اور اس کے بعد صاحب کتاب صہبا لکھنوی صاحب کو زحمت دی گئی۔ اس وقت تقریباً تین سو نشستیں پر ہو چکی تھیں اور لوگ جلسہ گاہ کے آخری حصے میں کھڑے ہوئے تھے تلاوت قرآن مجید کے بعد انشاء صاحب نے گل پوشی کے لیے مرزا ظفر الحسن معتمد ادارہ یادگار غالب سے درخواست کی۔ مرزا صاحب نے پیکٹوں میں سے ہار برآمد کیے اور لڑیاں سلبھانے کے دوران انہوں نے ابن انشاء صاحب کو اپنا شریک کار بنا لیا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے ایک ہار شہزادی عابدہ سلطان کو اور ابن انشاء صاحب نے دوسرا ہار صہبا صاحب

کو پہنایا۔ صہبا صاحب نے سرخ کاغذ اور ریشمی رب بن میں لپٹی ہوئی کتاب شہزادی صاحبہ کی خدمت میں پیش کی اور فوٹو گرافروں نے اس یادگار لمحہ کو مقید کر لیا۔

ابن انشاء صاحب نے انور حارث کاظہار تہنیت ک لیے بلایا۔ انور حارث صاحب ماہیک پر آئے انہوں نے ضرب کلیم کا اصل انتساب جو علامہ اقبال نے اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کے نام معنوں کیا تھا پڑھا اور پھر فارسی سے ارو میں اس کا آزاد ترجمہ پیش کیا۔ ان کے بعد قمر ہاشمی صاحب نے بڑی خوبصورت نظم پڑھی جو خلد میں نواب حمید اللہ خاں اور علامہ اقبال کے مکالمے پر مشتمل تھی۔

قریب ہاشمی صاحب کے بعد اکٹھینف فوق کو مضمون پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ فوق صاحب اس طرح گویا ہوئے کہ اقبال سے تو شاید ہم سب کو برابر ک نسبت رہی ہے لیکن سرز میں بھوپال سے تعلق اور رفیق دیرینہ صہبا لکھنؤی سے تعلق خاطر کے جرم میں مانوذ ہو کر آج آپ کے سامنے پیش ہوا ہوں۔ مضمون کی ابتداء اس انداز سے ہوئی کہ لوگ فوراً متوجہ ہو گئے ور فوق صاحب بڑی روانی سے اظہار خیال کرتے رہے۔ انہوں نے فرمایا شاید آج تحقیق سے زیادہ کوئی شعبہ علم تختہ مشق نہیں بنا ہوا۔ خصوصاً تحقیق ادبیات کو ادب کے منشیوں نے نقل خلاصہ لگادی اور بسیار نویسی کا متزاد ف اور بہانہ بنا لیا ہے۔ محقق ہونے کا آسان ترین نسخہ یہی ہے کہ چند کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کے متن کی تفصیلات بتاتے چلے جائیے فوق صاحب نے صہبا اور اقبال اور بھوپال دونوں کے بارے میں چند جملوں میں بات سمجھتے ہوئے کہا۔ اپنی تلاش و جستجو میں صہبا لکھنؤی نے بعض نئے گوشے دریافت کیے ہیں اور انہیں پہلی بار اس کتاب کے ذریعے متعارف کرایا ہے۔ اس طرح تحقیق سیرت نگاری اور تاریخ میں جو تخلیقی ہم آہنگی قائم ہوئی ہے وہ اس کتاب کا بہت بڑا وصف ہے۔ اس سے ایک عمر کے ادبی انہماں کا پتا چلتا ہے۔

ڈاکٹر حنف فوق کے بعد انجم اعظمی صاحب کو مضمون پڑھنے کی زحمت دی گئی۔ انجم اعظمی صاحب نے اپنا تقدیمہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے نہایت بچے تلے انداز میں کہنا شروع کیا۔ صہبا لکھنؤی کے بارے میں مجھے زیادہ خوش نہیں تھی میں انہیں ایک دیانت دار اور محنتی ادبی صحافی سمجھتا تھا۔ لیکن ان سے کسی اہم تخلیقی کام کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کتاب کے مطلعے کے بعد معلوم ہوا کہ کہ صہبا کے اتنے قریب رہ کر بھی ان کی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے استاد پروفیسر شیداحمد صدیقی کی ایک بات یاد آئی جو وہ اپنے طالب علموں سے گاہے بگاہے کہا کرتے تھے کہ آدمی ٹھک ٹھک کرتا رہے تو کچھ نہ کچھ ہو رہتا ہے۔ انجم صاحب نے کتاب کے بارے میں بتایا کہ یہ کتاب بھوپال سے نکل کر پورے برصغیر کے حالات پر محیط ہے۔ یہ برصغیر کے ادب و ثقافت معاشرت و تہذیب و سیاست و تدبر کا آئینہ بن گئی ہے۔ جب وہ مضمون کے اس حصے پر پہنچے آج جب اس کتاب کا جشن منایا جا رہا ہے تو میرے نزدیک یہ جشن اقبال بھی ہے جشن بھوپال بھی ہے اور جشن صہبا بھی ہے تو جلسہ گاہ تالیوں سے گونج اٹھی۔

ابن انشاء مائیک پر آئے اور کہنے لگے کہ میں نے چند کلمات لکھے تھے لیکن اس پس و پیش میں تھا کہ پیش کروں یا نہیں۔ بہر حال اب کچھ حوصلہ ہوا۔ تو پیش کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا مضمون شروع کر دیا۔ ان کے فقروں کی کاث اور جملوں کی تیزی کی زد میں صہبا صاحب بھی تھے کتاب اقبال اور بھوپال بھی اور س کے پڑھنے والے بھی۔ صہبا لکھنؤی سے ہماری پرانی یادِ اللہ ہے وہ مہیں جانتے ہیں ہم انہیں جانتے ہیں۔ ان کی کتاب پر اگر ہم تبصرہ نہ کریں تو وہ ناراض ہوں گے اور اگر کریں گے تو اور بھی ناراض ہوں گے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اے صاحب تم نے اس کتاب پر اتنی محنت شاقة کیوں کی اگر پیسوں کے لیے کی تو واضح رہے کہ آج کل پیسوں کے لیے محنت کرنے کا مطلق روانج نہیں ہے اور

اگر نام کے لیے کی ہے تو اقبال کا نام بھی آپ کے نام سے کم مشہور نہیں ہے۔ محفل زعفران زار بن چکی تھی۔ انشاء جی اپنے خاص رنگ میں لکھا ہوا مضمون ختم کیا اور سحر انصاری کو دعوت سخن دی۔ سحر انصاری نے علامہ اقبال کا وہ قطعہ جوانہوں نے والی بھوپال کی شان میں جشن حالی کے موقع پر پڑھا تھا اور اس کا منظوم ترجمہ بھی سنایا۔ ترجمہ اس قدر خوبصورت تھا کہ حاضرین نے بے ساختہ داد دی۔

سحر انصاری کے بعد محمد احمد سبزواری صاحب نے مضمون پیش کیا۔ ان کا مضمون بھوپال کے علمی اور ادبی پس منظراً اور اس دور کے عالمی حالات بالخصوص ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی فضا پر محیط تھا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں کہا تحقیق کی راہیں کبھی بند نہیں ہو سکتیں۔ شیکسپیر کو کہا بکرا اور جہا نگیر کا ہم عصر تھا اس کے انتقال کو تقریباً ساڑھے تین سو سال ہو چکے ہیں لیکن اب بھی ہر سال دو ایک تحقیقی کتابیں اس پر شائع ہو جاتی ہیں۔ اقبال کو تو ابھی چالیس سال ہی گزرے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مفلک مرشد پر کافی تحقیق ہو چکی ہے۔ یہ رجحان غلط ہے۔ صہبا صاحب کے انداز تحقیق کو سراہتے ہوئے انہوں نے کہا کتاب کی ترتیب میں صہبا صاحب کی دیانت داری نے مجھے کافی متاثر کیا ہے جو چیز جہاں سے اور جس طرح لی گئی اس کو من و عن بیان کر دیا گیا ہے ورنہ دوسروں کی باتوں کو اپنے نام سے بیان کر دینا ایک عامتی بات ہے۔ لوگ تو زندوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیتے ہیں پھر ان کا تو ذکر ہی کیا جواب مدافعت کے قابل نہیں رہے ہیں!

سبزواری صاحب کے بعد نامور نقاد جناب مجنوں گورکھپوری سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مجنوں صاحب نے اس تقریب کی پہلی تقریر کی۔ انہوں نے کچھ اس طرح آغاز کیا کہ میں صہبا صاحب کو ایک جسمانی پر چھائی سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس جملے پر اہل محفل نے اس لیے اطف لیا کہ مجنوں صاحب خود بھی صہبا

صاحب کے ہم جسہ ہیں۔ اور جب دیکھتا ہوں کہ وہ بھاری بھر کم کام کر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ بھاری بھر کم کام کی تازہ ترین مثال اقبال اور بھوپال ہے۔ مجنوں صاحب نے جشن حالی میں اپنی شرکت کا انکشاف فرمایا کہ حاضرین کو حیرت میں ڈال دیا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے بتایا کہ پانی پت میں جشن حالی کے موقع پر علامہ اقبال سے ملاقات بھی کی تھی۔ اور چند سوالات بھی کیے تھے لیکن چونکہ علامہ گلے کی تکلیف میں مبتلا تھے ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اس لیے زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموش ہو گئے۔ آکر میں مجنوں صاحب نے ان الفاظ میں مبارک باد پیش کی۔ صہبا صاحب نے اپنی تحقیق کو شگفتہ اور لطیف انداز میں پیش کیا ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

صہبا صاحب سے کہا گیا کہ وہ اپنی تحقیق کے بارے میں کچھ فرمائیں۔ صہبا صاحب نے روایتی انداز میں انکساری سے کام لیتے ہوئے اپنی سعی و تحقیق پر مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نشست پر واپس چلے گئے۔ ابن انشاء نے آخر میں اس تقریب کی مہمان خصوصی شہزادی عابدہ سلطان سے درخواست کی کہ وہ خطبہ صدارت پیش فرمائیں۔

شہزادی عابدہ سلطان گویا ہوئیں۔ سب سے پہلے میں منتظمین کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں میں ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس امتیاز کے لیے منتخب فرمایا۔ اقبال اور بھوپال پر اظہار خیال فرماتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔ میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے قطعی کوئی امید نہ تھی کہ کوئی شخص اس نوعیت کی تحقیق اور جستجو میں کامیاب ہو سکے گا۔ کیوں کہ ان واقعات کو گزرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ قیام پاکستان کے دوران جو لاکھوں افراد ادھر سے ادھر ہوئے اس میں جان و مال کا نقصان تو ہوا ہی ہوا بہت سے رابطہ ٹوٹ گئے قسمی دستاویزیں کتابیں خطوط اور اس طرح ضائع ہو گئے کہ پھر ان کا پتا ہی نہ مل سکا۔ خود

میری کتابوں اور بیشتر کاغذات کا یہی حشر ہوا۔ شہزادی عابدہ سلطان نہایت ممتازت کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک جملہ ادا کر رہی تھیں۔ ان کے ہر فقرے میں خوب پہنچا تھا آج اقبال اور بھوپال نے ان پرانی یادوں کے زخموں کو ہرا کر دیا تھا۔ ماضی کے شکوہ کی پر چھائیاں آج بھی ان کی آواز کے زیر و بم میں جسم ہو کر نظر آ رہی تھیں۔ وہ فرم رہی تھیں کہ علامہ اور مریے والد میں جو قدر ریس مشترک تھیں ان کی بنیاد جامعہ علی گڑھ تھی۔ عالم اسلام کی ترقی اور فلاح و بہود تھی جو کسی خاص علاقے سے مخصوص نہ تھی میرے والد اکثر یہ مصرعہ گنگنا یا کرتے تھے۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
انہوں نے فرمایا کہ آج کی محفل میں مفکر بھی ہیں مصنف بھی ہیں شاعر بھی ہیں اہل قلم
بھی اقبال کے جانشیں بھی ہیں بھوپال کے وارث بھی ہیں۔ آپ کی جانشینی کا حق اسی وقت
ادا ہوگا کہ مسلمانوں کی نشأة ثانیہ کو آپ اسی طرح جاری رکھیں۔ آج آپ آزاد اور خود مختار
ہیں۔ اس قوت آکومتعد قسم کے اختلافات سے سابقہ تھا۔ آج آپ کو صرف اپنے مسلمان
بھائیوں کا اعتماد بحال کرنا ہے۔ محبت اور پیار سے متحد کرنا ہے۔ دلائل کے ذریعے یقین دلانا
ہے کہ ہماری سب کی بقا اور ترقی کا راز اتحاد و محبت ہی میں ہے۔

مہماں خصوصی کی تقریر کے بعد ابن انشاء صاحب نے اعلان کیا کہ چائے اور
خوردنوش کا انتظام لان میں کیا گیا ہے اور یہ انتظام بھی کیا گیا ہے کہ جو صاحب اس وقت
اقبال اور بھوپال خرید فرمائیں گے ان کی کتاب پر صہبا صاحب آٹو گراف بھی دیں گے۔
کچھ لوگ شہزادی عابدہ سلطان کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ اکیڈمی کے اسٹال سے
اقبال اور بھوپال خرید کر صہبا صاحب سے دستخط لینے لگے۔ اور بقیہ خواتین و حضرات اس
لان کی طرف چل گئے جہاں چائے اور لوازمات کا انتظام تھا۔ ایک صاحب نے چائے کے

دوران بتایا کہ چودہ پندرہ جلدیں فروخت ہو گئیں۔ ہم نے کہا غنیمت ہے ہمیں تو ہو ٹل انٹر کانٹی نیٹول کی وہ تقریب اب تک یاد ہے جس میں ایک شاعر کی ۵۰ جلدیں رکھی تھیں تقریب کے خاتمے کے بعد حساب لگایا تو پتا چلا کہ ایک جلد فروخت ہوئی اور ایک جلد کسی نے چراں۔

محسن بھوپالی.....

(تقریب رونمائی کا آنکھوں دیکھا حال ای)

اقبال اور بھوپال

صہبائکھنوی یوں تو دیکھنے میں دھان پان نظر آتے ہیں لیکن اس مختصر انسانی جسم کے اندر عزم و حوصلے کا جو دیو چھپا بیٹھا ہے۔ اس نے اچھے اچھوں سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ اور اب تو صہبائکھنوی کو عزم اور حوصلے کی علامت سمجھا جانے گلا ہے۔ یہ بات میں بلا سوچ سمجھے نہیں بلکہ میرے سامنے صہبائکھنوی کی جدوجہد سے بھر پور زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے افکار اور صہبائکھنوی دو مختلف چیزیں نہیں۔ تقریباً اربع صدی سے افکار با قاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ پاکستان جیسے ملک میں کوئی ادبی رسالہ نکالنا کتنا مشکل کام۔ وہی صہبائکھنوی کی مشکلوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ گزشتہ پچیس برسوں میں بے شمار ادبی رسالے منصہ شہود پر آئے۔ انہیں بڑے سرمایہ اور بلند ارادوں سے نکالا گیا تھا مگر ان میں سے اکثر بن کھلے مر جھاگئے۔ اس افسوس ناک صورت حال کے کئی اسباب ہیں۔ ہمارا ملک صرف سترہ فی صد پڑھے لکھے لوگوں کا ملک ہے۔ اور ان پڑھے لکھے لوگوں میں بھی مشکل سے ایک یادو فیصد لوگ ایسے ہوں گے جن کو ادب سے دچپسی ہو گی۔ اور پھر ان میں سے ایسے لوگوں کو شمار کیجیے جو ادبی رسائل خریدنے کی استطاعت رکھتے ہوں تو صورت حال نہایت حوصلہ مند نظر آتی ہے۔ ایسے حالات میں صہبائکھنوی نے افکار کو نہ صرف زندہ

رکھا بلکہ اسے پاکستان کا بہترین ادبی رسالہ بنایا اور اب ت ویر رسالہ واحد ہے جو باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے صہبا لکھنوی کو بہت سی قربانیاں دینی پڑیں۔ اور میرے نزدیک سب سے بڑی قربانی یہ دی کہ وہ اپنی شاعری کی طرف سے غافل ہو گئے جوان کا اصل میدان تھا۔ صہبا لکھنوی ایک اچھے شاعر ہیں اور ایسے بہت سے شاعروں میں سے ہیں جن کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن صہبا لکھنوی نے نشر و اشاعت کے وسائل ہونے کے باوجود اپنی شاعرانہ شخصیت کو اس طرح ابھرنے کا موقع نہیں دیا جس طرح وہ خود دوسروں کی شاعرانہ شخصیتوں کو بھارتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں لوگ اپنی ادبی حیثیت کو منوانے کے لیے رسالے نکالتے ہوں۔ وہاں کسی مدیر کا اپنے تخلیقی جوہر سے تغاف بر تنا ایک عجیب سی بات ہے لیکن جب میں افکار کی خدمات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ بھی ادیب اور شاعر صہبا لکھنوی کا مسلسل تخلیقی عمل ہے۔

۱۔ ماہنامہ کتاب لا ہور ستمبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۵۳ تا ۱۵۴

افکار کو بنانے اور سنوارنے میں صہبا لکھنوی نے جس طرح اپنا خون جگر صرف کیا ہے وہ ایک حقیقی تخلیق کارہی فن کی تخلیق میں صرف کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام ادبی رسالے کشکول اور وہ بھی کشکول گدائی نظر آتے ہیں۔ لیکن افکار ایک ایسا مجموعہ زگارشات ہے جس کا ایک اپنا مزاج ہے۔ اور جس کے مطالعے سے ہم ادب کی رفتار اور سمت کا تعین کر سکتے ہیں۔

یوں تو ہر رسالہ اپنے ایڈیٹر کے نزدیک ایک تحریک ہوتا ہے۔ لیکن ”افکار“ واقعی ایک ادبی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ گزشتہ پچیس سال کے بہترین ادب کا بڑا حصہ افکار کے توسط سے منظر عام پر آیا ہے یہی نہیں بلکہ اس عہد کے متعدد اچھے ادیب بھی ہمارے ادب کو افکارہی کے ذریعے ملے ہیں۔ اس قسم کے کام وہی رسالے انجام دے سکتے ہیں جن کے

سامنے کو واضح مقصد ہو غیر ادبی مقصد نہیں خالص ادبی مقصد بلاشبہ ”افکار“ ایک ایسا ہی رسالہ ہے۔

یہ ساری تمہید صرف کھنے کی ضرورت کے لیے پیش آئی کہ حال ہی میں صہبائکھنوی کی ایک اور خوبی کا انکشاف یہ ہوا ہے کہ شاراچانک یا اتفاقاً کو اچھا ادب پارہ تخلیق کر سکتا ہے۔ لیکن کسی شاعری نے یاد ریسے یہ موقع رکھنا کہ وہ اچانک کوئی بلند پایہ تخلیقی کارنامہ پیش کرے بڑی حد تک نامناسب ہے۔ لیکن صہبائکھنوی نے اقبال اور بھوپال لکھ کر ایک بلند پایہ تخلیق کا کردار جس خوبی سے ادا کیا ہے اس پر مسرت بھی ہوتی ہے اور حیرت بھی۔ مسرت اس بات پر کہ انہوں نے موضوع کے ہر پہلو کا بغور جائزہ لیا ہے اور حیرت اس بات پر کہ اتنی ساری مصروفیات کے باوجود وہ اتنا بڑا کام کر گزرے۔

اقبال کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب اس موضوع پر مزید لکھنے کی گنجائش نہیں رہی لیکن جن لوگوں نے اقبالیات کے ذخیرے کو کھنگالا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ابھی اس موضوع پر لکھنے کی بہت گنجائش ہے۔ اقبال کا بھوپال اور اس ریاست کے حکمران سے جو تعلق تھا اس کے بارے میں ذخیرہ اقبالیات میں چند منتشر اشارے ملتے ہیں یا عبدالقوی دسنوی کا مختصر کتابچہ یہ سب تحریریں پوری طرح موضوع کا حق ادا نہیں کرتیں۔ صہبائکھنوی نے مواد کی فراہمی میں جس محنت اور مواد کی ترتیب میں جس سلیقے سے کام لیا ہے اس کی بنابران کی کتبیاب اپنے موضوع پر پہلی جامع کوشش قرار دی جاسکتی ہے۔

۲۶۔ ۳۱۲ سالز کے ۳۱۲ صفحات کی یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں ابال سے بھوپال اور اہل بھوپال سے تعلقات کی داستان بیان کی گئی ہے۔

پہلا باب بھوپال سے علامہ اقبال کے روابط ہے۔ اس میں اقبال کے بھوپال سے

تعلق کا ابتدائی مرحلہ کی نشان دہی کی گئی ہے اور اسی ضمن میں علامہ مرحوم کے ایسے خطوط بھی درج کیے ہیں جو اہل بھوپال کے نام ہیں یا جن میں بھوپال کا ذکر آتا ہے۔
دوسرا باب اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے باہمی تعلق سے متعلق ہے۔ اس باب میں اقبال حسین خاں ندیم خاص نواب بھوپال کے بیان، مولانا غلام رسول مہر کے خطوط اور نڈیر نیازی کی تحریری شہادتوں سے اقبال اور نواب بھوپال کے قریبی اور گھرے تعلقات کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ اقبال حسین خاں اور مولانا مہر کے خطوط پہلی مرتبہ اسی جگہ منظر عام پر آئے ہیں۔ اقبال حسین کی ایک ایسی غزل بھی اس باب میں ہے جس پر علامہ نے اصلاح دی تھی۔

تیسرا باب اقبال کے بھوپال میں پہلے قیام جنوری۔ مارچ ۱۹۳۵ء کی رواداد پر مشتمل ہے۔ اسی باب میں اقبال اور سر راس مسعود کے تعلقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ چوتھا باب ریاستوں بھوپال سے وظیفہ ملنے کے بارے میں ہے۔ پانچویں باب میں اقبال کے دوسری مرتبہ قیام بھوپال جوانی۔ اگست ۱۹۳۶ء کی تفصیلات ہیں۔ اس کے بعد باب میں جشن حالی ۱۹۳۵ء سے بھوپال اور اقبال کے تعلق کی صراحة کی گئی ہے۔ پھر ڈاکٹر سید عبدالباسط جو بھوپال میں اقبال کے معاملج تھے کے نام اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط پیش کیے گئے ہیں آٹھواں باب اقبال کے تیسرا قیام بھوپال مارچ۔ اپریل ۱۹۳۶ء کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ آخری پانچ ابواب مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ہیں:

☆.....اقبال راس مسعود اور ضرب کلیم

☆.....دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا سوگ

☆.....ملفوظات قدسی اور نیازمندان بھوپال

☆.....اقبال کے اثرات

☆.....اقبال اور قرآن مجید کے حوالی

یوں تو اس کتاب کا کوئی باب نئی معلومات سے خالی نہیں ہے لیکن ملغو نظارات قدسی سے معلق ایک اہم باب ہے۔ اس باب میں حضرت شاہ اسد الرحمن قدسی شہزادی عابدہ سلطان محمد احمد سبزواری عبدالحی بن ڈاکٹر عبد الباسط محمد خلیل خاں، علی حیدر عباسی، چوہدری خاقان حسین اور مسیح صدیقی کی یادداشتیں حیات اقبال کے بہت سے نئے گوشوں کو سامنے لاتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صہبہ الکھنوی نے اس کتاب کی تدوین میں بے حد محنت کی ہے برسوں وہ اس کے مواد کی فراہمی کے لیے تنگ و دوکرتے رہے۔ متعدد اشخاص سے انہوں نیملاقا تین کیس اور بے شمار کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی کی تب کہیں جا کر یہ کتاب کامل ہوئی۔ اس کتاب میں جہاں ایک طرف ادبی تحقیق کا اعلیٰ معیار ملتا ہے وہیں دوسری طرف شنگفتہ اسلوب بیان بھی نظر آتا ہے۔ صہبہ الکھنوی کی نشر تازگی شنگفتگی اور سادگی کی حامل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو اردو کی عام تحقیقی کتابوں کے برعکس شروع سے آخر تک دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔

آخر میں اس قدر اور عرض کر دوں کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں متعدد تحقیقی مقالات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے اور ان میں سے جو شائع ہوئے ہیں ان میں دو ایک کے علاوہ مجھے کوئی ایسا تحقیقی مقالہ نظر نہیں آتا جو صہبہ الکھنوی کی کتاب کے معیارتک پہنچتا ہو۔ اقبال اور بھوپال سے ہمارے اہل تحقیق اور خصوصاً یونیورسٹیوں میں تحقیق کرنے والے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

یہ کتاب اقبال اکیڈمی کراچی نے شائع کی ہے اور قیمت پندرہ روپے ہے۔

مشق خواجہ.....

فنون۔ لاہور

اقبال کی وفات کو پینتیس برس ہونے کو آئے مگر حیات اقبال کم شدہ کڑیوں کی بازیافت کا عمل ہنوز جاری ہے۔ یہ اس مبارک عمل کا کرشمہ ہے کہ تقریباً ہر سال اقبال کی زندگی کے کسی نہ کسی دھند لے گوشے میں لانے کی مہم کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے اور یوں اقبالیات ایک نئے مقام نظر کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال کے ریاست بھوپال سے تعلقات بھی حیات اقبال کا ایک نیم تاریک علاقہ تھے۔ نواب حمید اللہ خاں سے اقبال کے روابط کا پورا سیاق و سبق معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے ناقد ان فن اقبال کی تعلیمات کے انقلابی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے وقت اقبال پر شاہ پرستی کا الزام عاید کرتے تھے۔ اقبال کے سب سے زیادہ ترقی پسند اور پختہ فکر فقاد عزیز احمد تک نے اقبال عصر حاضر کا عظیم انقلابی شاعر ثابت کرنے کے بعد یہ سوال اٹھانا ضروری سمجھا تھا:

۱۔ ماہنامہ قومی زبان کراچی اگست ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۵۷ تا ۱۷۱

بادشاہوں کا ذکر اور ان کا گورا رکر لینا ہی اقبال کی انقلابی تعلیم میں حارج ہے۔ اور اس سے ایسا تضاد پیدا ہوتا ہے کہ جس کی تاویل نہیں ہو سکتی۔ اقبال اور بھوپال کی اشاعت کے بعد یہ تضاد ختم ہو گیا ہے۔ صہبائکھنوی نے بارہ برس کی عرق ریزی کے بعد ایسا جامع اور مستند تحقیقی مواد جمع کیا ہے جس کے مطلع سے اقبال کی بھوپال سے واپسی اپنے حقیقی تناظر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انتہائی تنگستی اور اپنی رفیقة حیات کی شدید علالت کے زمانے میں بھی اقبال نے ریاست حیدر آباد سے واپسی اور سر آغا خاں سے مالی امداد کی پیش کش کو تو ایک قلندرانہ آن کے ساتھ رد کر دیا۔ سراکبر حیدری اور سر سکندر حیات کی طرف سے مادی سہاروں کی پیشکش کو تو پائے استھنار سے ٹھکرایا گر نواب حمید اللہ خاں کا وظیفہ قول کر لیا اور

نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کی نسبت پر بارہ فخر اور انبساط کا اظہار کیا..... یہ سوال اقبالیات کے سنجیدہ طالب علموں کے لیے ایک مدت سے سوہان روؤح ہیں۔ وہ والی بھوپال سے اقبال کے مراسم کو مذکورہ بالا تضاد سمجھنے پر مجبور تھے۔ صہبا لکھنوی نے اقبال اور بھوپال کی تصنیف سے اس سوال کا شافی جواب مہیا کر دیا ہے۔ اس کتاب کا کوئی بھی قاری یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر نہیں ڑکتا کہ بھوپال کی ریاست بر صغیر کی دیگر مسلمان ریاستوں کے مقابلے میں اسلام اور ہندی مسلمانوں کی انقلابی جدوجہد سے زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔ وہ پان اسلامزم کی تحریک ہو یا ہندی مسلمانوں کے جدا گانہ اور منفرد قومی وجود اور سیاسی شخص کے منوانے کی جدوجہد ہو..... ریاست بھوپال کے فرمان رواؤں نے اس میں عملی دلچسپی لی۔

ریاست بھوپال کی فرماں روشاہ جہاں بیگم نے اپنا عقد ثانی سید صدیق حسن سے کیا تھا۔ سید صاحب جمال الدین افغانی مفتق محمد عبدہ اور سید احمد شہید کے رفقائے خاص میں سے ایک تھے۔ پان اسلامزم کی تحریک مجاہدین سے عملی روایات رکھتے تھے اور اسی بنا پر برطانوی حکومت نے آپ سے نوابی کا خطاب واپس لے لیا تھا۔ اور آپ کو قید و بند کی صعوبتوں میں بنتلا کر رکھا تھا۔ نواب حمید اللہ خاں عوامی انداز فکر رکھتے تھے اور مسلمانوں کی آزادی اور ترقی کے نصب العین کو عزیز جانتے تھے۔ اور نزدی کے آخری ایام میں اقبال قرآن کریم کے حواشی جس انقلابی انداز نظر سے لکھنا چاہتے تھے نواب حمید اللہ خاں اس سے گہری دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے اقبال کو وظیفے کی پیشکش کرتے وقت اقبال کی اس آخری مہم کا ذکر کیا تھا کہ اقبال مادی پریشانیوں سے نجات پا کر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا میں۔ اس سب کے باوجود اس مسعودی دوستی ریاست بھوپال سے اقبال کی مادی وابستگی کی سب سے بڑی وجہ ثابت ہوئی۔ راس مسعودی کی بھوپال میں تقرری کے بعد جب پہلے پہل اقبال بھوپال پہنچ گئے تو نواب حمید اللہ خاں نے انہیں اپنا خاص مہمان بنانے کی سعادت حاصل کرنا چاہی مگر اقبال

نے یہ کہہ کر شیش محل میں جانے سے انکار کر دیا کہ میں تو اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔ اقبال نے مسعود مرhom کے عنوان سے راس مسعود کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں سوز و گداز گھرے خلوص اور حقیقی محبت کے جذبات موجزن ہیں اقبال اور بھوپال میں راس مسعود اور اقبال کی محبت کی پوری روادا قلمبند کی گئی ہے۔ دوستی محبت اور ایثار کی یہ کہانی و گداز بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے زندگی کے آخری لمحات میں اقبال کو راس مسعود کے پس ماندگان کی اپنے بچوں سے زیادہ فکر تھی اور راس مسعود مرتے دم تک اقبال کو مالی پریشانیوں سے نجات دلانے میں ہمہ تن محو تھے۔ بھوپال سے اقبال کی مالی امداد کا بندوبست کرنے کے بعد راس مسعود اقبال کو بار بار مجبور کر رہے تھے کہ وہ حیدر آباد اور آغا خاں کی پیش کشوں کو نہ ٹھکرائیں۔ اور اقبال بار بار راس مسعود کو بتارہے تھے کہ وہ اس وقت تک کسی شخص کی امداد قبول نہیں کر سکتے جب تک ان کے دل میں اس کی کوئی خاص و قوت نہ ہو۔ راس مسعود پھر اقبال کی تنگ دستی کی بھٹ چھیڑتے اور اقبال پھر کہتے ہیکلہ جو کچھ مجھے مل رہا ہے میری ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس سے زیادہ کی خواہش کرنا ہوس کاری ہے۔ اقبال کی یہ منطق راس مسعود کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ آخری سانس تک اقبال کو قائل کر کے مادی پریشانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے منصوبے بنایا چکے تھے۔ صہبا لکھنوی کے بھوپال سے تعلقات کا صحیح تناظر پیش کرنے کی جدوجہد میں بھوپال کی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کی تاریخ بھی قلم بند کر دی ہے۔ اور اقبال کی مشنوی پس چہ باید کر داے اقوام شرق اور ضرب کلیم کے تخلیقی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے چند غیر مطبوعہ خطوط اور قرآن کریم کے حوالی لکھنے کی آخری خواہش کا پورا خاکہ بھی منظر عام پر لے آئے ہیں۔ یہ کتاب اردو کے تحقیقی ادب اور اقبالیات..... ہر دور میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کی تصنیف سے ایسا جامع اور قابل اعتبار تحقیقی مواد سامنے آ گیا ہے کہ جس کی

حیات اقبال کے شارحوں کو ضرورت تھی اور جس کے بغیر اقبال شناسی میں ایک گونہ رکاوٹ موجود تھی۔ اقبال اور بھوپال کی اشاعت کے بعد اقبال کی مفصل اور معتبر سوانح لکھنے کا سامان پیدا ہو گیا ہے۔ نظر حیدر آبادی کی اقبال اور حیدر آباد..... محمد عبد اللہ قریشی کے مکاتیب اقبال سید نذرینیازی کی اقبال کے حضور کے بعد صہبا لکھنوی کی اقبال اور بھوپال کی اشاعت سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ بزم اقبال یا اقبال اکیڈمی یادوں مل کر سوانح اقبال مرتب کرنے کا جامع منصوبہ بنائیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب اس پر عمل شروع ہو گا تو صہبا لکھنوی کی پر خلوص اور علمی اور تحقیقی لگن کے ساتھ ساتھ ان کی تحقیقی دیانت اور بھوپال اور اقبال سے ان کی عقیدت کا اعتراف کرتے ہی بنے گی۔

فتح محمد ملک

افکار۔ کراچی

میں تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ صہبا لکھنوی اقبال اور بھوپال کے روابط پر اس قدر وقوع مقالہ لکھ لیں گے۔ جو نہ صرف تحقیق کے میدان میں ایک غیر معمولی کارنامہ ہے بلکہ تدقیق کے نقطہ نظر سے بھی نہایت اہم ہے۔ صہبا صاحب کے بارے میں حیرت انگیز کامقاہ یہ اس لیے نہیں کہ خدا نخواستہ وہ اس کام کے اہل نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ وہ بے حد عدمی الفرست آدمی ہیں۔ ”افکار“ کے ماہانہ نشر و اشاعت کے کاموں کے علاوہ ضمیم ادبی نمبروں کی ترتیب و تکمیل کا کام بھی انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان مصروفیات کے دوران چپ چاپ تحقیق و تدقیق کا کام بھی جاری رکھنا اور اسے بحسن و خوبی انجام دے دینا میرے نزدیک مجرزے سے کم نہیں۔

مذکورہ بالا کتاب پر نومبر کے مہینے میں ریڈ یو پاکستان لاہور سے ایک مختصر تبصرے میں

رقم الحروف نے جن باتوں کی طرف سامعین کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اولاً تو یہ کہ تیرہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کو اقبال اور بھوپال پر جس طرح منطبق کیا گیا ہے۔ اور موضوع سے ہٹ کر حشور وزوائد کو جس طرح ترک کیا گیا ہے۔ وہ بجائے خود ایک ہنر ہے۔ یہ ہنر صہبا صاحب کو افکار کی تیس سالہ ادارت کے تجربے سے حاصل ہوا کہ غیر ضروری اور فالتو چیزوں کو کس طرح ترک کیا جاتا ہے۔ ثانیاً اقبال کی عظیم المرتب شخصیت کو مرکزی حیثیت اگر موضوع کے لحاظ سے حاصل ہے تو مصنف نے اس حیثیت کو نہ صرف یہ کہ اجاگر کھا ہے بلکہ بھوپال کی غیر ضروری بھاری بھرم شخصیتوں سے دبنے سے بچایا ہے۔ خصوصاً نواب بھوپال اور سر راس مسعود کے مقابل میں خطرہ تھا کہ مصنف کسی عصیت کا شکار نہ ہو جائے۔ لیکن اس بال سے زیادہ اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز پل صراط سے صہبا بخوبی گزرے ہیں۔ ثالثاً بھوپال کی منفرد حیثیت کو جن عوامل کی مدد سے منفرد ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ رسالہ فنون لاہور۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۹۲ تا ۱۹۳

ان کے ایک ایک جز کو صہبا نے ملحوظ کھا ہے۔ رابعاً اقبال اور بھوپال کے روابط میں پاکستان کے خاموش خط و خال کو جس طرح ابھارا گیا ہے وہ کسی صاحب بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔ خامستاً اقبال اور بھوپال کی کہانی پاکستان کی کہانی ہے اور یہ مقالہ مسلمانان بر صغیر کی تاریخ کا اہم جز ہے۔ اس کے ذیل میں تاریخ کے طالب علم کو بہت سی تفصیلات مل سکتی ہیں۔

صہبا نے آئینہ مشاعرہ نامی ایک مختصر سے رسالہ سیاقبال اور بھوپال کے ربط کو ۱۹۱۰ء سے ثابت کیا ہے۔ نواب حمید اللہ خاں سے اقبال کے روابط کا ذکر بھی اسی مقام سے شروع ہوتا ہے۔ اور پھر علامہ اقبال کی بھوپال میں آمد و رفت اور سر راس مسعود سے خصوصی روابط کا

اغاز بھی جس طرح ہوتا ہے وہ بجائے خود اہم واقعات ہیں۔ اقبال کے وظیفے کے صحیح پس منظر پر پہلی مرتبہ اس قدر مفصل طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوران قیام بھوپال میں علامہ پر جن نظموں کا اجلال ہوا ہے اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ جشن حالی نواب صاحب کا خطبہ اقبال کی شرکت، ان سب پر پہلی مرتبہ رائے زندگی کی گئی ہے۔ اور مستند حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالباسط سے اقبال کی اہم مراسلت بہت سے ابواب واکرتی ہے اقبال اور بھوپال میں آمد و رفت علاج معالجہ وظیفہ وغیرہ پر روشنی پڑتی ہی ہے پس چہ باید کردے اقوام شرک اور ضرب کلیم کے بارے میں بھی اہم اکنشافات یہاں ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اقبال کی وفات اور تعریت تک کے واقعات جو بھوپال تک پھیلے ہوئے تھے صہبا نے انہیں بھی نہ چھوڑا۔ اور ان سب پر مستزدید یہ کہ اقبال قرآن مجید پر جس انداز اور جس نجح پر حواشی لکھنے کا مہتمم بالشان کام شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ واقعات اقبالیات میں بلا خوف تردید گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صہبا اس امر میں بھی کامیاب و کامران ہوئے ہیں کہ انہوں نے اقبال کے بھوپال سے ڈھنی قلبی اور روحانی تعلق کو ثابت کیا ہے جو مرحوم کو بھوپال سے واقعی تھا۔ چند مشہور و معروف ہستیوں سے اقبال کی مراسلت نہ صرف اس امر کا بین ثبوت ہے بلکہ مراسلت کا مواد آفتاب آمد دلیل آفتاب کا مصدقہ ہے۔

صہبا نے اقبال کی ایک نادر تصویر جو کسی بھوپالی مصور نے کولنہ سے بنائی تھی اس کتاب میں شامل کر کے اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ بھوپال کی اہم شخصیتوں اور عمارتوں کی تصویریں بھی اس میں شامل ہیں جن سے اقبال کا کوئی نہ کوئی علاقہ تھا۔ اقبال اکادمی ہر طرح لائق مبارک ہے کہ اس نے اتنے اہم کام کے لیے ایک نحیف الجذہ لیکن قوی العزم شخص کا منتخب کیا جس نے نہایت اہم دستاویزات اکٹھا کر کے اقبالیات کے سلسلے میں اقبال اور

بوہپال کو سچ مجھ ایک وقوع اضافہ بنادیا۔ بڑی تقطیع پر ۳۲ صفحات کی جلی و نخہ حروف میں نفیس کاغذ پر چھپی ہوئی یہ مجلد کتاب جس میں گرد پوش Dust Cover سے اقبال کی شاہست کا بھرم بھی قائم ہوتا ہے۔ فی زماناً پندرہ روپے مہنگی نہیں بلکہ طالبان علم و ادب کے لیے تو یہ سوا کوڑیوں کے مول ہے۔

تحقیق کافن میرے نزدیک جس قدر غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ ہے۔ غیر دلچسپ اور خشک طبع محققین اسے اور بھی خشک اور دکھا پھیکا بنادیتے ہیں۔ لیکن صہبا کا کمال یہ ہے کہ اول تا آخر زبان و بیان کی شگفتگی قائم رکھی ہے اور تحقیق کو تخلیق بنا کر پیش کیا ہے۔ بعض عسیر الحصول مخذلوں سے جس طرح مواد حاصل کیا ہے اس پر پیشہ ور محققین کی طرح فخر و مبارکات نہ کر کے جس طرح صہبا نے کسر نفسی سے کام لیا ہے بلکہ نفسی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ ان کی شرافت پر دال ہے۔ تدقیق تحقیق سے بھی آگے کی منزل ہے۔ صہبا اس خارزار میں بھی داخل ہوئے ہیں لیکن اپنی آبلہ پائی کا ذکر کرنے کے بجائے انہوں نے قیمتی مواد سے نتائج کا استباط اور استخراج کر کے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے..... ڈیگریں مارنا اور محققانہ تمرد سے کام لینا صہبا لکھنؤی کی منکسر المزاجی کے منافی ہے۔ چنانچہ جہاں اقبال کے باب میں بعض اہم باتوں کا اکٹشاف ہوا ہے آپ یہ محسوس بھی نہیں کر سکیں گے کہ یہ بات پہلی بار معرض شہود پر آ رہی ہے.....

مذکورہ بالا کتاب نہ صرف موضوع کے اعتبار سے بلکہ دو تین سال کی مدت میں اقبال پر جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے بالموازنہ فائق ہے۔ یہ چند سطریں تو محض طالب علمانہ مطالعہ کا اعتراف ہے ورنہ مذکورہ کتاب کے محاسن صاحبان بصیرت اور صاحبان نظر پر اس وقت اور زیادہ عیاں ہو سکیں گے جب وہ اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ اس کتاب کا اشارہ یہ بھی مطالعہ کرنے والوں سے داد و تحسین حاصل کرے گا۔

اوراق - لاہور

اقبال اور بھوپال ایک ایسے شخص کی تحقیق و تدوین کا شاہ کار ہے جس نے اس خارزار میں پہلے بھولے سے بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ صہبہ لکھنؤی کسی زمانے میں اردو کے صحت مند شاعروں میں ثانی ہوتے تھے۔ پھر انہیں ترقی پسند تحریک کو مقبول بنانے کا سودا ہوا۔ اس لگن میں رسالہ افکار جاری کیا۔ آہستہ آہستہ ان کی شاعری اور صحت توادرتی بوجھ تلے دب گئیں بلیکن افکار ان کے فکر و عمل کو ہر قدم پر مہیز لگاتا رہا۔ نتیجہ کبھی فیض نمبر کی سورت میں ظاہر ہوا کبھی حفظ نمبر کی صورت میں۔ جو بلی نمبر ڈیڑھ ہزار صفحات کا نکال ڈالا تو اڑھائی تین صد صفحات کا مصطفے زیدی نمبر ان کی آنکھوں میں چانہ نہیں اور اسے نمبر کی بجائے محض ایڈیشن قرار دیا۔ صہبہ لکھنؤی صاحب کی یہ سب معنوی اولادیں ان کے دھان پان جیٹھے اور کمزور صحت سے زیادہ صحت مند نظر آتی ہیں اور خوبی کی بات یہ ہے کہ یہ تمام کام انہوں نے اسکیلے ہی انجام دیے ہیں۔ اقبال اور بھوپال ان کی جتنوئے مسلسل اور عمل پیغم کی مثال ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک اسے موضوع پر جس کی حدود بہت تنگ ہیں صہبہ لکھنؤی نے پوری کتاب لکھ دی۔ اس حیرت کو دور کرنے کے لیے میں آپ کو اقبال اور بھوپال پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

اقبال اور بھوپال کی اہمیت صرف اتنی نہیں کہ یہ دونوں ہم قافیہ ہیں۔ اس کتاب میں علم دوستی فن شناسی اور ادب نوازی کی وہ درخششہ روایت اپنی کریں مجتمع کر رہی ہے جس کی روشنی پہلے بکھری بکھری تھی اس کا اعتراف اقبال کے خطوط میں تو موجود ہے۔ لیکن اس روایت کی کثریاں جن کا سلسلہ بھوپال کے فرمانزدا اور اس ریاست کے علم دوست اصحاب

کے وسیع طبقے تک پھیلا ہوا تھا۔ صہبائکھنوی کی وساطت سے پہلی بار سامنے آیا ہے۔ انہیں دریافت کرنے اور ان کا سلسلہ جوڑ نے میں صہباصاحب کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا احساس ہر سطر پڑھنے کے بعد ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر خیابان پشاور کا اقبال نمبر تلاش کرنے میں انہوں نے جس جاں کاوی سے کام لیا اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولف کو جہاں بھی مواد کی بھنک پڑی وہ وہاں اڑ کر پہنچ اور مowards حاصل کیے بغیر نہ لوٹے۔ پرانے زمانے میں کوئی بیمار پڑتا تو کوٹھے پر چڑھ کر چلتا تھا۔ چنانچہ کہیں سے کوئی معاف ضرور میسر آ جاتا۔ صہباصاحب نے بھی اس کتاب کا قیمتی مواد یوں جمع کیا ہے کہ بھوپال سے تعلق رکھنے والے ہر شخص تک اپنی کتاب کی صد اپنچا دی۔ بھون کے علاقے سے شاہ اسد الرحمن قدسی کو محکمہ سیلیمنٹ سے عبدالجی صاحب کوڈھونڈ نکالا اور بقول پروفیسر انجم عظمی ٹھک ٹھک کرتے ہوئے یہ کتاب مکمل کر دی۔

۱۔ ماہنامہ افکار کراچی جنوری ۱۹۷۸ء صفحہ ۵۷ تا ۷۱

اس کتاب کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے صرف اقبال اور بھوپال کے روابط ہی منظر عام پر نہیں آتے بلکہ بھوپال کی تہذیب اور اس تہذیب کو فروغ دینے والی شخصیات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بھوپا کا سیریزین ہے اور صہبائے بھوپال کے حوالے سے اقبال کو مس کرنے والی ہر شخصیت کو اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ کتاب کل تیرہ ابواب پر مشتمل ہے آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صہباصاحب آرٹ آف بک میلنگ کے تمام اسرار و رموز سے واقف ہیں۔

کتاب کے ہر صفحے پر صہبائکھنوی کی ذاتی مہر لگی ہوئی ہے۔ یہ انفرادیت بہت کم کتابوں کو حاصل ہوتی ہے۔ کتابت طباعت اجلی ہے ضخامت ۳۱۲ صفحات اور قیمت پندرہ

روپے۔

انور سدیدا

سیپ کراچی

صہبائکھنوی اب تک ادبی صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن گزشتہ دنوں انہوں نے اپنے دستار میں سے ایک اور طریقے کا اضافہ کر لیا..... یہ طریقہ تحقیق اور اقبال شناسی کا ہے جس نے علمی و ادبی حلقوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور خواجہ تحسین وصول کیا۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری میں بڑی پہلو داری اور تہذیب داری ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان پر اتنا کام ہونے کے باوجود اب بھی بعض مضامین یا کتابیں اقبال کی حیات یا کارناموں کو ایک نئے رخ سے پیش کر کے ادبی دنیا کو چونکار دیتی ہیں۔ صہبائکھنوی کی اقبال اور بھوپال بھی بلاشبہ ایسی ہی کتابوں میں سے ایک ہے۔

یہ بات تو ادب کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ بھوپال اور ولی بھوپال سے علامہ اقبال کے خصوصی روابط تھے۔ لیکن اس سلسلے میں ہمیں کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا۔ لے دے کر عبدالقوی دسنوی کا ایک کتابچہ علامہ اقبال بھوپال میں اور اختر جمال کا ایک مضمون اقبال اور بھوپال تھا جس سے اس سلسلے میں کچھ روشنی حاصل ہوئی تھی۔ صہبائکھنوی نے بہ طاہر اس محدود موضوع کو جس وسعت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے یہ ان کا ہی حصہ ہے۔

کتاب کے تیرہ ابواب ہیں۔ ۱۔ بھوپال سے علامہ کے روابط۔ ۲۔ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں ۳۔ بھوپال کا پہلا قیام ۴۔ اقبال اور وظیفہ ۵۔ بھوپال کا دوسرا قیام ۶۔ جشن حالی اور اقبال ۷۔ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط ۸۔ بھوپال کا تیسرا قیام ۹۔ اقبال راس مسعود اور ضرب کلیم ۱۰۔ دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا سوگ ۱۱۔ ملفوظات

قدسی اور نیازمندان بھوپال ۱۲۔ اقبال کے اثرات ۱۳۔ اقبال اور قرآن مجید کے حواشی..... کتابیات اور اشاریہ کے حصے اس کے علاوہ ہیں۔

اقبال اور بھوپال میں قیاس آرائیوں کو راہ نہیں دی گئی ہے جو بھی واقعہ درج کیا گیا ہے وہ مستند حوالوں کے ساتھ ہے یہ حوالے کہیں کتابوں اور رسالوں کے ہیں اور کہیں معتبر ہستیوں کے پیاناٹ کے۔ سب سے اہم بات یہ کہ کتاب دلچسپ ہے اور اپنے اندر بے پناہ رکھتی ہے۔ تحقیقی کتابوں میں یہ خوبی ذرا کم ہے..... بلکہ خال ہی نظر Readability آتی ہے۔

۱۔ رسالہ اور اراق لاہور سماں اکتوبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۳۲۵-۳۲۶

زیرِ نظر کتاب نہ صرف یہ کہ ایک ریاست سے ایک شاعر کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ ایک دور کے فکری اور تہذیبی نقوش بھی اجاگر کرتی ہے اقبال اور اردو ادب اور مسلم تہذیب و ثقافت سے شغف رکھنے والے ہر شخص کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

ضخامت ۳۱۲ صفحات اور لکھائی چھپائی صاف سترہی ہے۔

علی حیدر ملک!

کتاب - لاہور

اقبال کی شخصیت اور اس کے فن کا اتنا عمیق جائزہ لیا جا چکا ہے کہ اب اس پر مزید کچھ لکھنے کہ ہمت نہیں پڑتی۔ کیونکہ کسی نئے پہلو کی تلاش و ججو بذات خود ایک جا گسل عمل ہے۔ تاہم جہاں تک اقبال اور بھوپال کا تعلق ہے۔ یہ کہتے ہوئے درا بھی تامل نہیں ہوتا کہ صہبا لکھنوی نے بڑی محنت کوشش اور شبینہ دیدہ ریزی کے بعد اپنی فکری کاؤشوں کو اقبال اور بھوپال کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

جناب حنفی فوق کی اس بات سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب تحقیق کی مشیانہ روایات سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ اقبال اور بھوپال کے مطالعہ سے صرف چند خشک اور بے جان کتابوں کا علم نہیں ہوتا بلکہ ایک دور کی تہذیب اس کا ذہنی و فکری پس منظر اور اس تہذیب کے پروردہ افراد کے تعلقات کی رنگارگی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ پھر اقبال کے واسطے اس دور کی اہم شخصیتوں اور اہم سیاسی و فکری رجھانات کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ اقا کی فکر سے متاثر فکری لہروں کا سراغ بھی ملتا ہے اس طرح صہبا لکھنوی کی تحقیق بوسیدہ ہڈیوں کو منظر عام پر نہیں لاتی ذہن کی زندہ و فعال سرگرمیوں کو پیش کرتی ہے۔ صہبا لکھنوی کی اس کتاب سے بے شمار ایسے گوشوں تک ہماری رسائی ممکن ہو گئی ہے کہ جواب تک ہماری نظروں سے اوچھل تھے۔

صہبا نے بر صغیر میں مسلمانوں کی تحریک حصول آزادی کے لیے جدوجہد کی داستان اور ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی و رثے کے نقوش کو اقبال اور بھوپال میں از سرنو تازہ کر دیا ہے۔

..... عاصم صحرائی ۲

افکار۔ کراچی

ماہنامہ افکار کے فضل مدیر صہبا لکھنوی صاحب مدت مدید سے گشن ادب کی آبیاری میں معروف ہیں۔ اگرچہ وہ خود اسے شوقِ فضول اور باغبانی صحراء کے مترادف خیال کرتے ہیں تاہم اب ان کی مسائی کی کیفیت اور کمیت اپنوں اور غیروں میں یکساں طور پر پرواد پانے لگی ہے اور کم از کم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ بڑی تن دہی سے ایک ادبی ماہنامے کی بقا کے لیے کام کر رہے ہیں۔

ہجوم افکار میں گھرے رنے کے ساتھ ساتھ وہ دس گیارہ سال تک اقبالیات کے ایک اچھوتے اور اہم موضوع پر بھی کام کرتے رہے جواب اقبال اور بھوپال کے روپ میں ہمارے سامنے آگیا ہے۔

علامہ اقبال کو بھوپال نواب حمید اللہ خاں اور سر راس مسعود سے قلبی لگاؤ تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے جا بجا اپنے خطوط اور بعض منظومات میں کیا ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال ایسے درویش خدا مست و خودی مست اور نواب حمید اللہ خاں ایسے والی ریاست اور صاحب خدم و حشم میں کیا قادر مشترک تھی؟ ان کے روابط اور یگانگت کے کیا رموز و عوامل تھے۔

اقبال نے نواب حمید اللہ خاں کے نام ضرب کلیم کا انتساب کیوں کیا اور اس قسم کے اشعار سے انہیں کیا متصف کیا:

حیدر اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
زالاف تو موج لاله خیزد از خیا بام

یہ سوال اپنے پس منظر اور جزئیات کے لحاظ سے حیات اقبال اور فکر اقبال کے ایک اہم پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں اب تک کوئی سیر حاصل کام سرانجام نہ پاس کا تھا۔ جزوی طور پر بعض واقعات منتشر حالت میں مل جاتے تھے۔ لیکن ان سب کو باہم مربوط کر کے ایک مکمل عہد کو چشم تصور سے دیکھنے اور دکھانے کی سعی کسی نے نہ کی تھی۔ اس مشکل کام کی تکمیل کا سہرا صہبا لکھنؤی کے سر بندھنا تھا سو انہیں اقبال اور حیدر آباد کے نام سے اقبال اور بھوپال کا خیال پیدا ہوا اور وہ اس کی تکمیل میں جان و تن سے مصروف ہو گئے۔ کسی

مکل کتاب کا لکھنا اتنا آسان کام نہیں ہے پہلے اس کے موضوع اور بہیت کواس کے تمام تر مضمرات کے ساتھ Concieve کرنا کتاب کی تکمیل کا سب سے اہم مرحلہ ہے۔ پھر اس کے مواد کی فراہمی میں جن مشکلات مصائب اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سے جانبر ہونے کے بعد ہی کتاب کی تکمیل ممکن ہوتی ہے۔ اقبال اور بھوپال کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صہبا الحسنی کو بھی دیگر رابر بفن کی طرح قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے عہد میں بے حسی اور عدم تعاون کا رونا تو ہر شخص روتا ہے۔ لیکن اس کا صحیح اندازہ کسی علمی و تحقیقی کام کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ پھر بھی صہبا صاحب نے بعض اہم اور ناگزیر خصیتوں کے تاثرات و خیالات براہ راست ان سے حاصل کر لیے اور بعض بنیادی مأخذ تک رسائی حاصل کرنے میں پوری استقامت و جانشناختی کا ثبوت دیا۔

تین سو سے زائد صفحات کی اس کتاب کے تیرہ ابواب ہیں اقبال کے بھوپال سے روابط کی ابتداء نواب حمید اللہ خاں سے ان کے ذاتی روابط اقبال کے وظیفہ بھوپال کے محکمات اور ناکاپس منظر اس مسعود اور اقبال، بھوپال میں اقبال کے تین قیام۔ اہل بھوپال کا پر اقبال کے اثرات اور قرآن مجید کے حواشی سے متعلق اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کا منسوبہ جیسے موضوعات کا ان ابواب میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں صہبا صاحب نے ۱۹۶۰ء میں اقبال کے بھوپال سے پہلے ربط کا سراغ لگایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ ربط و تعلق اقبال کی وفات سے تین دن قبل تک قائم رہا۔ مطبوعہ مأخذ کے ساتھ ساتھ جشن حالی کی نظمیں اور خطبات اقبال کے بعض خطوط بعض تصاویر اور آٹو گراف پہلی بار..... اقبال اور بھوپال میں شائع ہوئے ہیں۔ صہبا صاحب نے سارے مواد کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ تاریخی ترتیب و تسلیل برقرار رکھتے ہوئے شگفتہ اور رواں دواں نشر میں پوری تصنیف مکمل کی ہے۔ اقبال کے معمولات ان کے بعض دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات شعر کے کلام پر

اصلاحیں مطالعہ اور شعر گوئی کے بعض پہلو پہلی بار سامنے آئے ہیں۔

نواب بھوپال کے ندیم خاص اقبال حسین خاں نے علامہ سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے علامہ کے ارشاد کے مطابق کچھ شعر سنائے میری ایک غزل کا مطلع یہ تھا:

کوئی تمنا بھری نظر سے چھپے بھلا کیوں نقاب کیسا؟

ضیائے الفت اگر سلامت حجاب کیسا حجاب کیسا؟

علامہ غزل سن کر کچھ خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر تک ان پر ایک کیفیت سی طاری رہی پھر فرمایا آپ نے اپنے غزل کے مطلع کے دونوں مصروعوں میں ایک ہی بات ادا کی ہے۔
غزل کا مطلع لکھیے میں قلم نکال کر لکھنے پر تیار ہوا تو ارشاد ہوا:

نگاہ ہے پرده سوز میری نقاب کیسا حجاب کیسا

تمہاری ان پرده بندیوں کا ملا ہے تم کو جواب کیسا؟

میں خوشنی کے مارے اچھل پڑا اور کھڑے ہو کر ادب سے عرض کیا؟

علامہ مجھے آپ کی خدمت میں اب شرف شاگردی حاصل ہو گیا ہے۔ علامہ نے مجھے بڑی پیار کی نظروں سے دیکھا اور مسکرا دیے اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ علامہ کی شفقت مجھ پر اور بڑھ گئی ہے۔

اقبال کے معانی خاص ڈاکٹر عبدالباسط کے بڑے صاحبزادے عبد الحمیڈ کا کہنا ہے کہ:

”دن میں فرصت کے ملحوں میں مطالعہ کرتے تھے۔ میں نے

علامہ کو مطالعہ کا بہت شائق پایا۔ بھوپال کی مشہور حمیدیہ لا سبری سے برابر کتابیں منگواتے رہتے تھے اور ایک دو دن میں انہیں پڑھ کر لوٹا دیتے تھے۔ اور نئی کتابیں حاصل کرتے تھے۔ جب بھی کسی کتاب

کے بارے میں ان سے کچھ سوالات کیے وہ نہایت تفصیل سے اس کے بارے میں جواب دیتے تھے مجھے ان کی یادداشت پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی جلد ختم کتابیں کیسے پڑھ لیتے ہیں۔ اور کس طرح ان کے موضوعات کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ دو کتابیں علی الخصوص ان کے سرہانے میں نے ہمیشہ دیکھیں۔ ایک مشتوی مولانا روم اور دوسری کلام عبد القادر بیدل دریافت پر علامہ نے بتایا کہ یہ دونوں کتابیں سفر و حضر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔

صہباصاحب نے ساری کتاب میں یہ الترام باقی رکھا ہے کہ وہ واقعہ کو مستند ہو اے کے بغیر رقم نہ ہو جائے۔ اس سے کتاب کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب کے وسط میں اقبال کی بیماری کے احوال سے ایک قسم کی تکرار ضرور پیدا ہو گئی ہے جو شاید ناگزیر بھی تھی۔

کتاب میں جو واقعات مختلف افراد سے حاصل کیے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا تعارف کرنے کے بعد جو واقعات درج کیے گئے ہیں اس طرح کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی کہ جو تشنہ تحقیق ہو یا ہوائی ہو۔ اقبال کے ضمن میں وظیفہ بھوپال اور حواشی قرآن مجید کے تعلق سے خاصے تنازعہ مباعث چھپیرے جاتے رہے ہیں اقبال اور بھوپال میں صہباصاحب نے پہلی بار ان امور کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے۔ اور اعتراضات و تنازعات کا بھرپور اور مدلل جواب متعلقہ امور کی روشنی میں فراہم کیا ہے۔

نادر و کم یاب تصاویر اور خطوط اقبال کے عکس کے علاوہ کتاب کے آخر میں ایک مفصل اشارہ بھی موجود ہے۔ جو اپنی ترتیب و کتابت کے لحاظ سے ایک منفرد چیز ہے۔ کتاب کے شروع میں صہباصاحب نے جو حروف آغاز لکھا ہے اس سے کتاب کے آغاز سے انجام تک

کے تمام مراحل سامنے آ جاتے ہیں۔ اور بے اختیار ان کی محنت اور گلن کی داد دینی پڑتی ہے.....

کسی رسی انداز بیان کے بغیر یہ بات پورے وثوق سے کبھی جاسکتی ہے کہ اقبال اور بھوپال سے مدت کے بعد اقبالیات کی دنیا میں ایک منفرد لچسپ اور مفید کتاب کا اضافہ ہوا ہے..... اس ضمن میں اس کے مصنف صہبہ لکھنؤی اور ناشر اقبال اکادمی دونوں مبارک با و کے مستحق ہیں۔

بحranصاری!

نشری تقریر۔ ریڈ یو پشاور

آج کی دوسری زیر تبصرہ کتاب صہبہ لکھنؤی کا ایک تحقیقی کارنامہ اقبال اور بھوپال ہے۔ اس کی ضخامت تین صفحات طباعت و کتاب اور کاغذ اوسط قیمت پندرہ روپے اور ناشر اقبال اکادمی کراچی ہیں۔ نواب بھوپال نے مئی ۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال کا پانچ سو روپے ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ یہ ہماری مردہ پرست قوم میں زندہ مشاہیر کی قدر دانی کی ایسی نادر مثال ہے جس سے اقبال ایسے بناض قوم کا متاثر ہونا قدر تی امر تھا۔ علاوہ ازیں اقبال بسلسلہ علاج تین بار بھوپال میں تقریباً سوا مہینے مقیم رہے۔ ان کے دوست اور مزانج دان اور مرتبہ شناس راس مسعود بھی انہی دونوں اس ریاست سے منسلک تھے۔ پھر ضرب کلیم کا انتساب بھی نواب بھوپال کے نام ہے۔ یہ حقائق مدقائق سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ لیکن صہبہ لکھنؤی نے نجی خطوط سرکاری دستاویزات، متعلقہ شخصیتوں کے تاثرات اور تاریخی شواہد کے ممکن الحصول ذرائع سے کام لے کر سالہا سال کی محنت سے یہ کتاب اس طرح مرتب کی ہے کہ اس میں ریاست بھوپال کی ادبی سرگرمیوں چھوٹے بڑے شاعروں

کی ادبی کاوشوں نواب حمید اللہ خاں کی سیاسی بصیرت، ملی غیرت اور جو ہر شناسی، راس مسعود کی قد آور شخصیت اور دیگر اقبال فہم حضرات کے سارے کوائف ایک ہی داستان کا حصہ بن گئے ہیں۔ اور اس ضمن میں اقبال کی عادات و اطوار مراسم و تعلقات فکر و مطالعہ کے نئے پہلو ہی سامنے آگئے ہیں۔

وظیفہ کے اظہارِ تشكیر کے طور پر اقبال نے بخی خطوط میں اور پیک تحریروں میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بعض حضرات متعرض ہوئے ہیں کہ مر قلندر کو اول تو نوابوں سے کچھ تعلق رکھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اور اگر کسی کے ساتھ کچھ سلوک کیا تھا تو اس کی اتنی تعریف نہیں کرنی چاہیے تھی جتنی علامہ اقبال نے نواب بھوپال کی تعریف کی۔ صہبائکھنوی بجا طور پر ان حضرات کے ہم نواب ہیں جو جذبہ احسان مندی کو عمدہ اخلاق کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اور انہیں اس پر بھی اصرار ہے کہ اور اس کے جواز میں انہوں نے خطوط سے اقتباس اور واقعات کے حوالے پیش کیے ہیں کہ نواب بھوپال اور اقبال ہندی مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور تعمیر مستقبل کے متعلق ایک ہی انداز سے سوچتے تھے۔ اور یہ نظریاتی ہم آہنگی دونوں کو ۱۹۳۱ء کی دوسری گول میز کا نفرنس میں ہی کافی نزدیک لے آئی تھی۔

اقبال کے بعض نادر خطوط کی طرح جو اس کتاب میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں ان کے بعض اقوال بھی اپنے ناقابل فراموش آہنگ کے ساتھ پہلی مرتبہ سامنے آئے ہیں شادی کے متعلق ان کی رائے تھی کہ شادی کا بنیادی مقصد صالح توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رومان کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔

۱۔ ماہنامہ افکار کراچی جون ۳۱۹۷ء صفحہ ۸۰

انہیں نوبل پرائز نہ ملنے کا سبب ان کے نزدیک یہ تھا کہ میرے یہاں سب کچھ مغرب کے خلاف ہے اس لیے وہ مجھے نوبل پرائز کیسے دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب بعض

یادگار تصاویر سے بھی آراستہ ہے۔ اور اقبال سے دور یا نزدیک کے تعلق کی وجہ سے ایسے بہت سے حضرات کے قلمی خاکے اور تخلیقات اس کتاب میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ جو دست برداشت سے کسی اور شکل میں محفوظ نہ رہ سکتی تھیں۔ بہر حال یہ کتاب اقبالیات میں ایک دلچسپ اضافہ ہے اور اقبال کی بعض نظموں کے پس منظر اور خود ان کی فلکر کے گوشوں پر بالکل نئی روشنی ڈالتی ہے۔

..... پروفیسر محمد احمد مشمسی

اخبار خواتین۔ کراچی

اقبال اور بھوپال کام مسودہ صہبائکھنوی یا صہبائی بھوپالی کے طویل مطالعہ اور تحقیق کا حاصل ہے۔ بھوپال کو برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کی پذیرائی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس ریاست نے اردو زبان و ادب کی اور تحریک پاکستان کی جس قدر خدمت کی ہے وہ بجائے خود ایک تاریخ ہے علامہ اقبال نے والی بھوپال نواب حمید اللہ خاں کو ضرب کلیم کے ابتدائیہ میں درج ذیل خراج تحسین پیش کیا تھا:

گبیر ایں ہمہ سرمایہ بہار از من !!

کہ گل بدست تواز شاخ تازہ تر ماند

اس کتاب میں صہبائے صاحب نے نایاب دستاویزات خطوط اور قلمی نسخے اور تصاویر یک جا

کی ہیں جن سے علامہ اقبال کے قیام بھوپال کی تفصیلات پر روشنی پڑتی ہے۔

بھوپال سے علامہ اقبال مرحوم کے روابط کا آغاز ۱۹۱۰ء میں ہوا اور یہ روابط وفات سے

صرف تین دن پہلے تک یعنی ۱۹۳۸ء پر ۱۱۴ء تک برابر قائم رہے اس طرح صہبائے صاحب

نے ۳۵ سال کے واقعات کی چھان بین کے ہے۔ اور جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے کہ چھ غیر

مطبوعہ خطوط چارائیسے خط جو مکتوبات کے کسی مسودے میں نہیں چھپے وغیر مطبوعہ مرثیہ جو علامہ کی وفات کے بعد لکھے گئے اور کئی غیر مطبوعہ کتابوں کے اقتباس جمع کر کے اقبال کے شارحین اور محققین کے لیے دلچسپی کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

آخری اوراق میں کتابیات کے تحت تقریباً چالیس حوالے کی کتب کے نام درج ہیں ان کے علاوہ اشاریہ بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ شاعر مشرق علامہ مرحوم کی حیات اور شاعری کے موضوعات پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن موضوع کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ بہت ناکافی ہے۔ زیر نظر تصنیف علامہ مرحوم کی زندگی کے ایک اہم تعلق پر قبل قدر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتابت، طباعت مناسب اور قیمت واجبی ہے۔

۱۔ پاکستان براؤ کاسٹنگ کار پوریشن پشاور کی نشری تقریرے ۱۹۷۲ء جنوری ۱۹۷۳ء

۲۔ ہفت روزہ اخبار خواتین کراچی ۳۰ جون تا ۶ جولائی ۱۹۷۳ء

حریت۔ کراچی

علامہ اقبال کو ان کی فکر و حیات کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی ہرنئی کوشش ہمارے قومی ادب میں عمومی طور پر اور اقبالیات میں خصوصی طور پر ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کی شہرت و اہمیت جس منزل میں ہے وہاں رسی آراء اور طے شدہ خیالات کی فراوانی تازگی پسند ذہنوں کو کھلنے لگی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بنے بنائے سانچوں اور سنائی باتوں کو دہرانے کی بجائے مختلف جہات میں تازہ کاری کی مثالیں قائم کی جائیں۔ مشہور ادبی ماہنامے افکار کے مدیر صہبائکھنوی نے حیات افکار کی بعض گم شدہ کڑیوں کو بڑے حسن و خوبی سے یک جا کیا ہے۔ ان کا تازہ ترین تحقیقی کارنامہ اقبال اور بھوپال دس گیارہ سال کی محنت و جان فشاری کے بعد منظر عام پر آ رہا ہے۔

نواب بھوپال حمید اللہ خاں کو اقبال سے اور اقبال کو نواب صاحب سے جو لگاؤ تھا وہ اہل علم و ادب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان دونوں میں ایک اہم رشتہ کی حیثیت سے سر راس مسعود کو حاصل تھی۔ صہبائکھنوی نے اقبال کے بھوپال سے روابط کی گم شدہ کڑیاں تلاش کی ہیں اور بڑے مدلل انداز میں یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ اقبال بھوپال کو دارالاقبال کیوں لکھتے اور کہتے تھے۔

صہبائاصاب کی تحقیق کے مطابق ۱۹۱۰ء میں بھوپال سے اقبال کا پہلا رابطہ ہوا۔ یہ رابطہ تعلق ان کی وفات سے تین دن پہلے تک قائم رہا۔ اس داستان کو مربوط اور مستند بنانے کے لیے صہبائاصاب نے بلاشبہ بڑی محنت کی ہے۔ کتابوں رسالوں اور دیگر ماذرا قباليات سے قطع نظر انہوں نے متعدد ایسی شخصیات کے انٹرویو لیے جو اقبال کے قیام بھوپال کے واقعات اور تجربات ذاتی حیثیت سے بیان کر سکتے تھے۔ اس طرح خود اقبال کی شخصیت معمولات انداز فکر اور اسلوب سخن کے بہت سے گوشے پہلی بار ایک مختلف تناظر میں ہمارے سامنے آگئے ہیں۔

کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں اقبال کے قیام بھوپال اور بھوپال کے اہل ع علم و ادب پر اقبال کے اثرات سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بقول مصنف اس کتاب میں حسب ذیل نئی چیزیں شامل ہیں۔ چھ غیر مطبوعہ خطوط چارا یسے خطوط جو مکتبات کے کسی مجموعے میں نہیں چھپے دو غیر مطبوعہ مرثیے جو علامہ کی وفات کے بعد لکھے گئے کئی نادر و نایاب کتابیں جو علامہ کی شاعری سیاست اور ان کی فکر کے وسیع گوشوں پر محیط تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ صہبائکھنوی نے تمیں پہنچتیں اس ال پہلے کے صحیح واقعات کی چھان بین کے صبر آزم امر حلے کو بڑے سلیقے سے طے کیا ہے انہوں نے کوئی واقعہ بغیر مستند حوالے سے طے نہیں کیا۔ ساتھ ہی انداز بیان بڑا شگفتہ اور روایاں رکھا ہے جو تحقیقی کتابوں میں عام

طور پر نظر نہیں آتا۔

عنوان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس پر محض ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن صہبا صاحبین بڑے سائز کی تین سو سے زائد صفحات کی کتاب لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر ذرہ صحراء و سعت گاہ ہے بشرطیکہ اس کے امکانات کا سراغ لگانے میں کوئی دیققہ نہ اٹھا رکھا جائے۔ متعدد کم پایاب و اہم تصاویر کے علاوہ کتاب کے آخر میں ایک جامع و مفید اشاریہ بھی شامل ہے اس قسم کے اشاریے جدید تحقیقی کتابوں کے لیے ناگزیر ہیں اقبال اور بھوپال کا یہ اشاریہ اپنی ترتیب و تابت کے لحاظ سے ایک منفرد چیز ہے۔

اقبال اور بھوپال میں صہبا صاحب نے ماضی کے ایک پورے عہد کوتازہ اور ایک تہذیبی تحریک کو زندہ کر دیا ہے۔ ان کی یہ کتاب اقبالیات میں ایک منفرد ول چسپ اور مفید اضافہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اقبال شناس اور ادب دوست اس کتاب کی خاطر خواہ پذیری ای کریں گے۔

۱۔ روزنامہ "حریت" سندھ ایڈیشن ۲۷ مئی ۱۹۷۳ء



کتابیات

كتب

- ۱۔ آندھی میں چراغ.....خواجہ غلام السیدین
- ۲۔ آئینہ مشاعرہ.....مرتبہ سرور قادری
- ۳۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ.....ڈاکٹر سلم حامد رضوی
- ۴۔ اقبال اور حیدر آباد.....نظیر حیدر آبادی
- ۵۔ اقبال خواتین کی نظر میں.....مرتبہ یکتا امروہوی
- ۶۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ.....محمد احمد خاں
- ۷۔ اقبال کی کہانی پچھمیری پچھاں کی زبانی.....ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی
- ۸۔ اقبال نامہ جلد اول و جلد دوم.....مرتبہ شیخ عطا اللہ
- ۹۔ انوار اقبال.....مرتبہ بشیر احمد ڈار
- ۱۰۔ اوراق گم گشته.....مرتبہ رحیم بخش شاہین
- ۱۱۔ بانگ درا.....اقبال
- ۱۲۔ تصورات اقبال.....شاغل فخری
- ۱۳۔ خدو خال اقبال غیر مطبوعہ مسودہ.....محمد امین زبیری
- ۱۴۔ خیابان مسعود.....مرتبہ جلیل قدوالی
- ۱۵۔ ذکر اقبال.....مولانا عبدالجید سالک

- ۱۶۔ روزگار فقیر جلد اول و جلد دوم..... فقیر سید و حیدر الدین
- ۱۷۔ شرح ضرب کلیم..... مولفہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی
- ۱۸۔ ضرب کلیم..... اقبال
- ۱۹۔ علامہ اقبال بھوپال میں..... عبدالقوی دسنوی
- ۲۰۔ علی گڑھ..... محمد امین زبیری
- ۲۱۔ گنج ہائے گراں ما یہ..... پروفیسر رشید احمد صدیقی
- ۲۲۔ گفتار اقبال..... مرتبہ محمد رفیق افضل
- ۲۳۔ مرقع مسعود..... مرتبہ جلیل قدوالی
- ۲۴۔ مقالات اسلام..... مولانا اسلام جیراج پوری
- ۲۵۔ مکتوبات اقبال..... سید نذرینیازی
- ۲۶۔ ملفوظات اقبال..... (مرتبہ) محمود ناظمی
- ۲۷۔ منے لالہ فام..... ڈاکٹر جاوید اقبال
- ۲۸۔ نوازش نامے..... (مرتبہ) سید انیس شاہ جیلانی
- ۲۹۔ محمد اشرف..... Thus Conferred Satan

رسائل و جرائد

- ۱۔ ہفت روزہ توحید۔ میرٹھ (جولائی ۱۹۱۳ء)
- ۲۔ زمانہ۔ کانپور (دسمبر) ۱۹۳۵ء
- ۳۔ رسالہ اردو۔ دہلی مسعود نمبر (۱۹۳۷ء)
- ۴۔ رسالہ اردو۔ دہلی (اقبال نمبر) ۱۹۳۸ء

- ۵- ماهنامه سب رس- حیدر آباد کن اقبال نمبر جون ۱۹۳۸ء
- ۶- رسالہ جوہر دہلی (اقبال نمبر) ۱۹۳۸ء
- ۷- روزنامہ آفاق- لاہور (ستمبر) ۱۹۵۱ء
- ۸- خیابان- پشاور (اقبال نمبر) ۱۹۶۲ء
- ۹- ماهنامہ افکار- کراچی (اپریل) ۱۹۶۲ء
- ۱۰- گورنمنٹ حمید یہ کالج میگزین بھوپال ۱۹۶۲ء
- ۱۱- ماهنامہ نگار- رام پور (اپریل) ۱۹۶۳ء
- ۱۲- ماهنامہ ادبی دنیا- لاہور (مسی) ۱۹۶۵ء
- ۱۳- ماهنامہ فاران- کراچی (اکتوبر) ۱۹۶۸ء
- ۱۴- ماهنامہ قومی زبان- کراچی (ستمبر) ۱۹۶۹ء
- ۱۵- رسالہ فنون- لاہور (مسی- جون) ۱۹۷۱ء
- ۱۶- رسالہ فنون لاہور (جون جولائی) ۱۹۷۱ء
- ۱۷- رسالہ العلوم کراچی جولائی تا ستمبر ۱۹۷۳ء
- ۱۸- روزنامہ حریت کراچی (۲۳ مئی) ۱۹۷۳ء
- ۱۹- ماهنامہ افکار- کراچی (جون) ۱۹۷۳ء
- ۲۰- روزنامہ مشرق لاہور (۱۰ اجون) ۱۹۷۳ء
- ۲۱- هفت روزہ اخبار خواتین کراچی (۳۰ جون تا ۲۱ جولائی) ۱۹۷۳ء
- ۲۲- ماهنامہ افکار کراچی (جولائی) ۱۹۷۳ء
- ۲۳- ماهنامہ کتاب لاہور (جولائی- اگست- ستمبر) ۱۹۷۳ء
- ۲۴- روزنامہ پاکستان ٹائمز- لاہور (۱۵ اگست) ۱۹۷۳ء

- ۲۵- ماهنامه قومی زبان کراچی (اگست) ۱۹۷۳ء
- ۲۶- رسالہ اوراق - لاہور (سپتember- اکتوبر) ۱۹۷۳ء
- ۲۷- رسالہ فنون لاہور (سپتember- اکتوبر) ۱۹۷۳ء
- ۲۸- ماهنامہ افکار کراچی (نومبر) ۱۹۷۳ء
- ۲۹- روزنامہ جنگ کراچی ۲ نومبر ۱۹۷۳ء
- ۳۰- ماهنامہ افکار - کراچی (جنوری) ۱۹۷۳ء
- ۳۱- اقبال روپیو (جنوری) ۱۹۷۳ء
- ۳۲- رسالہ سیپ - کراچی (مارچ اپریل) ۱۹۷۴ء
- ۳۳- ماهنامہ قومی زبان کراچی (اپریل) ۱۹۷۵ء
- ۳۴- ماهنامہ قومی زبان - کراچی (مارچ) ۱۹۷۶ء
- ۳۵- ماهنامہ قومی زبان کراچی (اپریل) ۱۹۷۶ء
- ۳۶- ماهنامہ سب رس کراچی (جنوری) ۱۹۷۸ء



اشاریہ

- آبشار بحمد بحمدہ۔ 276
- آنار اقبال۔ 318
- آرٹس کوسل آف پاکستان۔ 355, 375, 376
- آرنلڈ (پروفیسر) 39
- آزاد 312
- آزاد (مولانا ابوالکلام) 219, 222, 227, 275, 322
- آزاد (پروفیسر) 255
- آستانہ قدسی۔ 267, 268, 269, 272, 276
- آصف شاہیری۔ 318, 319, 322, 336
- آغا فتح حسین (ڈاکٹر) 55
- آغا خاں (سر) 71, 122, 125, 127, 130, 157, 198, 199,
- 200 201, 202, 224, 225, 233, 251, 296, 360, 382
- آغا سعید (ڈاکٹر)۔ 385
- آفاق۔ 354
- آفاق احمد۔ 339
- آفاق حسین۔ 253

- آفتاب احمد خاں (صاحبزادہ)۔ 309
آفتاب الدین (سید) 318
آفتاب نسوان۔ 59
آفرٹلوہیڈر ٹیڈا ایرز۔ 351
آکسفورڈ۔ 94
آل احمد سرور (پروفیسر) 165
آل ارلی میچن ریچنر۔ 352
آل انڈیا ریڈ یو۔ 94
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ 182
آنڈھی میں چراغ۔ 102, 103, 104, 140
آنکن شاء۔ 283
آنکنیہ مشاعرہ۔ 384
آیات قدسی۔ 66
ابر (حکیم علی محسن خاں)۔ 61
ابراہیم بن محمد۔ 146
ابراہیم علی خاں (نواب)۔ 275
ابراہیم یوسف۔ 302, 303, 322, 339
ابراہیم ٹکھنی۔ 62
ابن ابی شیبہ۔ 145, 146
ابن انشاء۔ 373, 376, 377, 378, 379

- ابن حزم۔ 153
- ابن خلدون۔ 350, 352
- ابن علی عالی۔ 63
- ابن ماجہ 146
- ابوسعید بزی۔ 59, 324, 339
- ابوشیبہ ابراہیم۔ 146
- ابومحمد سحر (ڈاکٹر)۔ 339
- ابو نصر احمد الحسینی۔ 304
- احشام حسین (پروفیسر سید)۔ 320, 322
- احسان رسول (مولانا) 254
- احسن دہلوی (سید معین الدین حسن)۔ 59, 61, 62, 63
- احسن علی خاں۔ 339
- احسن مارہروی (مولوی سید علی)۔ 61, 63, 64, 165
- احمد آباد پیلس 96
- احمد الدین (مولوی)۔ 319
- احمدرضا خاں (مشی)۔ 63
- احمده شاہ ابدالی۔ 187, 186
- احمد علی جاوید۔ 338
- احمد علی شوق قدوالی۔ 58
- احمد طاہر 55

- احمدمصطفی۔ 318
- احمرلی 339
- اخبارخواتین۔ 391
- اخترجمال۔ 386
22, 25, 256, 262, 264, 336, 338, 339
- اخترسعیدخاں۔ 339
- ادارہ اب و تقید۔ 368
- ادارہ یادگار غالب۔ 355, 375, 376
- اداود مصنفین پاکستان۔ 48
- ادبی دنیا۔ 105
- ادیب 59
- ارجمند محمد خاں (میاں)۔ 59
- اردو۔ 105, 246, 343, 344
- اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ۔ 259, 260, 323, 334, 335
- ارشد تھانوی (مولانا۔ رشید احمد) 58, 59, 61, 63, 99, 151, 253
- ارمغان اقبال۔ 368
289, 294, 295, 338, 339
- ارمغان اقبال۔ 357
- ارمغان عجاز۔ 104, 140, 236, 246, 318
- ارمغان عزیز۔ 29
- اسپنگر۔ 350, 351, 352

- اسٹائلن-283
اٹھیٹمین-81, 120
اسد الرحمن قدسی (حضرت شاہ) 37, 50, 54, 55, 59, 65, 66, 67, 74 77, 119, 267, 268, 269, 270, 271, 272, 273, 274, 275, 276, 277 339, 366, 369, 381, 385
اسد بھوپالی-338
اسرار اور موز-318
اسلام اور احمدیت-228
اسلام ایٹ دی کراس روڈ-35
اسلام کے سیاسی تصورات 318
اسلام غر 290
اسلم جیراچپوری (مولانا علامہ) 57, 58, 207, 339
اسمعیل-161
اشتاق عارف-339
اشفاق حسین-319
اصلاحات اقبال-319
اطمینان قلب-66
اظہر سعید خاں-339
افتخار عالم مارہروی (مشی مولوی) 58, 59, 61
افسر سیما بی 322

افسوس بھوپالی۔ 338

انفان کو نسل خانہ۔ 51

افکار۔ 21, 46, 49, 52, 55, 59, 164, 217, 219, 222,
256, 308, 311330, 339, 340, 357, 361, 363, 365,
367, 371, 372, 374, 379, 380, 383, 385, 387, 388,
390, 382

افکار حالی۔ 37

اقبال (شاعر مشرق حکیم الامت۔ علامہ۔ ڈاکٹر سر۔ شیخ۔ محمد)۔
21, 22, 23, 24, 25, 26, 27, 28, 29, 30, 3, 33, 34, 35, 36, 38, 39,
40, 41, 42, 43, 44, 45, 46, 47, 48, 50, 51, 52, 53, 54,
55, 57, 59, 60, 61, 63, 64, 65, 66, 67, 68, 69, 70, 71,
72, 73, 74, 75, 76, 77, 78, 79, 80, 81, 82, 83, 84, 85,
86, 8788, 89, 90, 92, 93, 94, 95, 96, 97, 98, 99, 100,
102, 103, 104, 105, 106, 107, 108, 109, 110, 111,
112, 113, 115, 116, 117, 118, 119, 120, 121, 122
123, 124, 125, 126, 127, 128, 129, 130, 131, 122,
133, 134, 135136, 137, 138, 139, 140, 141, 142,
143, 144, 145, 146, 147, 148149, 150, 151, 152,
153, 154, 155, 156, 157, 158, 159, 160, 163164,
165, 166, 167, 168, 169, 170, 171, 172, 175, 179,

182, 183, 188, 193, 194, 195, 196, 197, 198, 199,
00, 201, 201, 202, 203, 204, 205, 206, 207, 208,
209, 210, 211, 212, 213, 214, 215, 216, 217, 218,
219, 220, 221, 222, 223, 224, 225, 226, 227, 228,
229, 230, 231, 232, 234, 235, 236, 237, 238, 239,
240, 241, 242, 243, 244, 245, 246, 247, 248, 249,
250, 251, 252, 253, 254, 255, 256, 257, 258, 260,
261, 262, 263, 264, 265, 267, 268, 269, 270, 271,
272, 273, 274, 275, 276, 277, 278, 279, 280, 281,
281, 283, 284, 285, 286, 287, 288, 289, 290, 291,
292, 293, 294, 295, 296, 297, 298, 299, 300, 302,
303, 304, 305, 306, 307, 308, 309, 310, 311, 312,
313, 314, 315, 316, 317, 318, 319, 322, 323, 324,
325, 326, 327, 328, 329, 330, 331, 332, 333, 334,
335, 336, 337, 338, 339, 354, 356, 357, 258, 359,
360, 61, 362, 363, 364, 365, 366, 367, 368, 369,
370, 371, 372, 373, 374, 375, 376, 377, 378, 379,
380, 381, 382, 383, 384, 385, 386, 387, 388, 389,
390, 391, 392

اقبال احمد صدیقی - 23

اقبال۔ اس کی شاعری اور پیغام۔ 319

اقبال اکڈیمی۔ 21, 23, 24, 47, 49, 52, 194, 266, 286, 342, 344, 355, 358, 365, 371, 374, 375, 379, 381, 383, 384, 390

اقبال۔ امام ادب۔ 319

اقبال اور بھوپال۔ 21, 22, 23, 24, 26, 27, 28, 29, 30, 31, 33, 34, 39, 41, 43, 45, 46, 47, 48, 49, 50, 51, 52, 269, 270, 303, 326, 355, 358, 359, 361, 362, 363, 364, 365, 366, 367, 371, 373, 376, 377, 378, 379, 380, 381, 382, 383, 384, 385, 386, 387, 388, 389, 390, 391, 392

اقبال اور ٹیگور۔ 319

اقبال اور حیدر آباد۔ 24, 47, 48, 110, 112, 122, 123, 138, 239, 251, 374, 382, 388

اقبال اور سیاست ملی۔ 286

اقبال اور نونہال۔ 318

اقبال پر ایک نظر۔ 318

اقبال حسین خاں۔ 50, 53, 55, 74, 77, 78, 80, 83, 84, 85, 86, 87, 121, 276, 336, 373, 380, 389

اقبال خواتین کی نظر میں۔ 65, 66

- اقبال ریویو۔ 310, 24, 23
 اقبال سینیزی۔ 47
 اقبال۔ قرآن حکیم کی روشنی میں۔ 319
 اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ 33, 41, 42, 43
 اقبال کا نظریہ فن۔ 319
 اقبال کی شاعری۔ 319
 اقبال کی کہانی پچھمیری پچھان کی زبانی۔ 107
 اقبال کے حضور۔ 383
 اقبال لاہوری۔ 41, 317, 38, 319, 320, 321, 322, 330
 اقبال مخدخان، کرٹل۔ 370
 اقبال نامہ (خطوط اقبال)۔ 92, 93, 273, 313
 23, 25, 26, 27, 28, 29, 30, 31, 32, 33 34, 49, 65, 67, 75, 109, 110, 111, 114, 115, 116, 122, 123, 127 129, 130, 133, 134, 135, 141, 142, 145, 146, 147, 149, 151, 153, 157 159, 168, 169, 172, 173, 198, 200, 207, 212, 214, 224, 225, 226 227, 228, 229, 231, 235, 236, 237, 238, 239, 240, 241, 242, 243, 244, 245, 246, 247, 248, 249, 250, 252, 308, 309, 310, 313, 334
 اقبال۔ نئی تشكیل۔ 138, 285

- اکبر عظیم۔ 106, 107, 187, 367, 377
- اکبر الہ آبادی۔ 295, 217, 218, 219, 220, 284
- اکبر حیدری (سر)۔ 34, 35, 36, 122, 139, 222, 238, 382
- اکبر علی خاں (عرشی زادہ)۔ 338
- اکبر مسعود۔ 245, 246
- اکرام احمد لطف (مشی)۔ 61
- اکریما۔ 46
- اکٹھی براء ترقی دیہات۔ 280
- البراکہ۔ 58, 253, 300, 348
- الحیب۔ 66
- الحجاب۔ 58, 59, 63
- السیف الملوك علی شاہ تم الرسول۔ 145
- الشرق۔ 59
- العصر۔ 59
- العلم۔ 192
- الکلام۔ 67
- الگزینڈر جہان گلگیری ہائی سکول۔ 280, 308
- المنظار۔ 59
- الندوہ۔ 345
- الیاس برلنی (پروفیسر مولانا۔ صلاح الدین۔ محمد۔ 322, 213, 231)

- امام غزاتی۔ 106
- امان اللہ خاں۔ 138
- امانت خاں۔ 273
- امجد علی اشہری۔ امجد (سید)۔ 58
- امجد علی (سید)۔ 39
- امیر بدایونی (امیر احمد)۔ 60, 63
- امیر حسن دلیر (سید)۔ 61
- امیر مینائی۔ 234, 58, 59
- انتخاب دیوان اقبال۔ 318
- انجمن سلیمانی۔ 339
- انجمن عظی۔ 21, 5, 367, 3771, 376, 377, 385
- انجمن اردو۔ 260
- انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ 222
- انجمن ترقی اردو۔ 37, 214, 260, 281, 319, 330, 368
- انجمن ترقی پسند مصنفین۔ 338, 339, 340, 370
- انجمن حمایت اسلام۔ 37, 114, 115, 2087, 224, 274
- انصار ناصری۔ 165
- انعام الدین۔ 318
- انقلاب۔ 25, 80, 81, 82, 83, 322
- انوار اقبال۔ 348, 373

- انوار الحق (مفہی)۔ 43, 44, 326, 337, 339
- انور جہاں۔ 59
- انور حارث۔ 55, 358, 376
- انور سدید۔ 386
- انور صابری۔ 321
- انور علی انور (مشی)۔ 59
- انور مسعود۔ 116, 124, 133, 244, 245, 246, 248, 249
- انیس۔ 250
- انیس شاہ جیلانی (سید)۔ 330, 331, 334
- اوراق۔ 385, 386
- اوراق گمگشته۔ 220, 221
- اور تنفل کالج۔ 39
- ایم اے او کالج۔ 68
- ایم۔ عرفان۔ 322, 339
- ایوان رفعت۔ 332
- ایوب۔ 170
- امقتطف۔ 304
- بابر۔ 187
- باسط بھوپالی۔ 25, 59, 256, 262, 266, 3222, 338, 339

- بانگ جناح میوزیم- 91
بانگ عامد- 251
باقیات اقبال- 64, 172, 318
بال جبریل- 100, 261, 278, 286, 318, 328
بانگ درا- 65, 66, 261, 278, 286, 318, 328, 329
بانو- 65
بدور البازنغ- 226
برٹریندر سل- 283
برکت اللہ (مولوی)- 312
برگ- 284
بڑا تالاب- 93, 91, 298, 314, 315
بڑودہ کانچ- 218, 220, 221
بزم اکبر آبادی (مرزا عاشق حسین)- 61
بزم فنون- 311
بخاری- 146, 354
بشير الحق سنوی- 319
بلال جبشتی- 261
بلبل اکیدمی- 311
بولی قلندر (حضرت شاہ)- 160, 169
بولان ہول- 267

- بہادر شاہ کا مقدمہ۔ 120
 بھاری چن صادق۔ 338
 بہاء الدین کانج۔ 321
 بھوپال کانفرنس۔ 25
 بیاض سحر۔ 259
 بیگم بھوپال (ہرہائی نس۔ نواب میمونہ سلطانہ معروف بے شاہ بانو بیگم)۔ 22, 59, 154 155, 256, 233,
 بیگم راس مسعود (لیڈی۔ امته الرشید۔ امت المسعود۔ بیگم راحت چھتاری)۔ 25, 32 36, 40, 41, 93, 95, 99, 100, 101, 102, 104, 105,
 108, 114, 115, 116 118, 119, 125, 128, 129, 130,
 131, 132, 133, 135, 140, 141, 142 155, 157, 158,
 159, 198, 199, 207, 208, 214, 224, 226, 228, 229
 335, 237, 241, 242, 243, 244, 245, 246, 247, 248,
 249, 297 299, 308, 366
 بیگم فرحت نور خان۔ 22
 بیگم محمد علی۔ 40
 بی اماں۔ 359
 پاتھو لے ٹو پاکستان۔ 279
 پاک پبلشرز لمبیڈ۔ 368
 پاکستان نیشنل سنٹر۔ 355

- پاکستان کوسل - 311
- پرنس آف ولیز اسپتال - 98
- پرنس آف ولیر - 35
- پروفیسر بوسانی - 303
- پروفیسر سید نواب علی - 25, 59, 217, 218, 219, 220, 221, 222, 260 262, 272, 290, 294, 297, 330, 366
- پروفیسر شجاع - 144, 147
- پروفیسر محمد احمد سمشی - 391
- پروفیسر محمد یوسف - 319
- پروین رشدی - 339
- پس چہ باید کر داے اقوام شرق - 54, 213, 214, 216, 217, 218, 222 225, 226, 234, 261, 278, 280, 334, 383, 384
- پنجاب روپیو - 59
- پنجاب یونیورسٹی - 247, 272
- پنڈت جواہر لال نہرو - 72, 203, 224, 225, 227, 228, 233, 251 322, 359
- پنڈت سندر لال - 340
- پنڈت پھمن آیا جی - 253, 289
- پشاور یونیورسٹی - 281
- پیام مشرق - 261, 311, 318, 327

- تاج آفس- 318, 319
تاج المسجد- 276
تاج محل- 370
تاریخ الامت- 57
تاریخ اندرس- 295
تاریخ بھوپال- 62
تاریخ صحف سماوی- 219, 272
تاریخ طسم بکاولی- 62
ترمی سرن شاد- 322, 338
ترمذی- 146
تذکرۃ المصلحتے- 219
تذکرہ حاملی- 165
تذکرہ غوشیہ- 24
تصدق احمد خان شروانی- 80, 81, 83, 85
تصور اقبال- 61, 33, 324, 325, 327, 328, 329, 330
تصوف اقبال- 319
تکملہ مجمع البحار- 145
تمدن- 59
توحید- 320, 321
تنوریہ- 59

- تو شہ خانہ حضور نظام۔ 139
- تہذیب نسوان۔ 59
- تحامس میں۔ 283
- تحییو سو فیکل ہال۔ 173
- تحقیق بہادر سپر (سر)۔ 222, 278, 322
- ٹرائسکی۔ 283
- ٹرائل آف بہادر شاہ۔ 120
- ٹیگور۔ ڈاکٹر ابندرناتھ۔ 71, 110, 222, 251, 305
- ٹینی سن۔ 367
- ثاقب بدایوی۔ مولوی احسن اللہ۔ 58
- ثافت لکھنوی (مرزا ذا کر حسین)۔ 58
- شہرستان عبید۔ 267, 270
- جادہ۔ 256
- جامع امویہ۔ 106
- جامع مسجد۔ 276, 294, 314
- جامع ازہر۔ 45
- جامعہ عثمانیہ۔ 42, 105, 122, 280
- جان سٹورٹ مل۔ 64
- جال شاراختر۔ 59, 165, 321, 340
- جاوید اقبال (ڈاکٹر)۔ 31, 34, 50, 98, 113, 128, 135, 137

- 141, 148, 154, 155, 157, 159, 160, 193, 195, 198,
 200, 201, 202, 205, 206, 226, 230, 235, 237, 238,
 239, 240, 241, 247, 292, 299, 302, 347, 348
- جاوید منزل۔ 129, 133, 159, 252
- جاوید نامہ۔ 318, 348
- جاائزہ۔ 311
- جسٹس محمود۔ 184, 237, 246
- جیم حیر۔ 305
- جشن حالی (صد سالہ پانی پت)۔ 25, 35, 36, 37, 50, 53, 149,
- 150, 157, 170, 172, 173, 174, 179, 182, 189, 198,
 334, 362, 369, 378, 380, 384, 386, 388
- جمشید پانی پتی (حسین احمد خاں)۔ 182, 183
- چکر مراد آبادی۔ 59, 258, 270
- چکن ناتھ آزاد۔ 369
- جلیل قدوائی۔ 25, 40, 116, 118, 125, 126, 162, 187, 188
- جمال الدین افغانی (علامہ)۔ 57, 312, 382
- جمیل الدین عالی۔ 183
- جمیل سہسوائی (جمیل احمد)۔ 58
- جمیل نقوی۔ 29, 30, 32, 33, 34, 36, 39, 55, 162, 163,

164, 169

جنگ-42

جوش پیغ آبادی-258, 289, 308, 331, 340

جوہر-217, 222, 260, 261

جوہر قریشی-339

جهان قدر چنائی-338

جهانگیر-367, 377

جهانگیر یہ سکول-253

جیمز بیٹ نیس-58

چاہسر-367

چنگیز خاں-304

چودھری خاقان حسین - 38, 39, 40, 41, 46, 55, 73, 297,

398, 299, 381

چودھری خلیق الزماں-72, 279, 360

چودھری رحمت علی-333

چودھری محمد اطہر-253

چودھری نیاز علی خاں-277

چھوٹا تالاب-291

حافظ-103, 286

حافظ سلیمان خالص-61, 63

حالي (مولانا الطاف حسین)۔ 36, 37, 103, 149, 150, 156, 157
160, 161, 162, 163, 164, 165, 166, 169, 170, 171,
172, 173, 174, 175 176, 177, 178, 182, 183, 184,
185, 186, 187, 188, 189, 190, 191, 192, 218, 253,
255, 285, 328, 334, 357, 369

حالي بک ڈپو۔ 164

حالي ميموري مسلم ہائی سکول۔ 35, 149, 161, 162, 164, 166, 169
172, 173 178, 182, 183, 184, 185, 188, 189

حامد جعفری (سید)۔ 318

حامد حسین (ڈاکٹر)۔ 322, 339

حامد رضوی (مولانا سید) 59, 324, 330, 334, 339, 368

حامد سعید خاں حامد۔ 59, 256, 258, 259, 289, 320, 338

حبيب الحسن قادری۔ 256

حبيب الرحمن (مولانا) 267, 274

حبيب النساء بيگم۔ 319

حبيب بھوپالی۔ 262, 263

حبيب توری۔ 321

حبيب فخری۔ 303, 304, 322, 338

حج الکرامہ فی آثار القیامہ۔ 146

حضرت موبانی۔ 71, 72

- حریت-392
 حسن-46
 حسن بصری[ؒ]-261
 حسن عزیز جاوید- 119, 120, 121, 209, 276, 277, 278,
 280
 حسن محمد حیات- 72, 252, 278
 حسن ظالمی (خواجه)- 25, 71, 120, 220, 270,
 حضرت عائشہ[ؓ]- 145
 حضور احمد حضور نعیمی- 59
 حفظ الحجر- 66
 حفیظ جالندھری (ابوالاشر)- 25, 36, 59, 123, 163, 165, 166,
 182 183, 184, 185, 187, 188, 189, 258, 260, 270,
 373
 حکیم اجمل خاں (مسح الملک)- 71, 233, 278
 حکیم اولاد حسین- 305
 حکیم سلطان محمود- 95, 294
 حکیم سید ضیاء الحسن- 95, 278, 294, 322
 حکیم علی محسن خاں- 61
 حکیم محمد حسین عرشی- 114
 حکیم نایینا- (عبدالوہاب انصاری)- 88, 89, 90, 96, 97, 98, 112,

113, 116, 123, 124, 133, 156, 158, 159, 171, 198,
213, 228, 236, 237

حلان۔ 233

حليم کانج۔ 311

حمد الدین شاہد۔ 304

حمد اللہ خاں (نواب اعلیٰ حضرت فرم روانے ریاست ہائے بھوپال)۔ 23, 25
29, 2, 33, 34, 35, 36, 39, 40, 41, 43, 44, 46, 50, 52,
53, 54, 55, 59, 68, 71, 72, 73, 74, 75, 77, 78, 79, 80,
81, 82, 83, 84, 85, 86, 87, 88, 89, 90, 93, 94, 95, 96,
98, 110, 114, 115, 116, 117, 118, 119, 120, 121,
124, 125, 127, 130, 131, 132, 133, 134, 135,
136, 137, 138, 139, 160, 141, 143, 144, 146, 150,
154, 157, 158, 160, 161, 162, 163, 166, 167, 168,
169, 170, 171, 173, , 179, 182, 183, 189, 192, 193,
197, 198, 199, 2200, 201, 202, 208, 209, 210, 211,
212, 220, 224, 225, 226, 228, 230, 231, 232, 237,
238, 245, 246, 249, 150, 251, 252, 258, 267, 273,
278, 29, 280, 289, 293, 294, 395, 296, 297, 298,
302, 303, 306, 308, 312, 313, 314, 349, 356, 357,
359, 360, 362, 366, 368, 369, 373, 375, 376, 377

378, 380, 381, 382, 383, 384, 386, 388, 389, 390,
391, 392

حیدریہ اسپتال۔ 208- 89, 90, 95, 143, 194,

حیدریہ جہانگیریہ ہائی سکول۔ 308- 280,

حیدریہ کالج۔ 340- 231,

حیدریہ لاہوری۔ 389- 58, 149, 292, 304,

حنفی فوق (ڈاکٹر)۔ 21, 55, 311, 339, 365, 376, 377,

387

حیات اقبال۔ 319

حیات اللہ بی۔ 58

حیات شلبی۔ 318

حیات نو۔ 182, 172,

حیدر آباد ڈسٹریکٹ۔ 42

حیدر عباسی (علی)۔ 32, 33, 41, 55, 98, 99, 200, 219, 221,

278 295, 297, 298, 344, 381

خاتون ارشد۔ 369, 54, 65339

خالدہ ادیبہ خاتم۔ 92, 91

خالدہ شبیب۔ 279

خان محمد خاں شبیر۔ 58

خدو خال اقبال۔ 346- 33, 330, 331, 332,

- خطبات اقبال- 41, 318, 330
- خلیفہ عبدالحکیم- 86, 118
- خلیل بدر- 339
- خلیل عرب (علامہ)- 59
- خواجہ آشکار حسین- 55
- خواجہ سجاد حسین- 149, 157, 163, 166, 184
- خواجہ غلام احسین- 184
- خواجہ قمر الدین خاں راقم- 295
- خواجہ کمال الدین- 171
- خواجہ طیف حسن- 178
- خواجہ عنبر- 221
- خیاباں- 281, 288, 385
- خیابان اقبال- 288
- خیابان مسعود- 125
- خیام- 272
- درالاقامہ- 172
- درالترجمہ- 68
- دار المصنفین- 58, 345
- داغ- 59, 234, 255
- داس- 233

- دانے۔ 304
- درمنشور جلد پنجم۔ 146
- دس کنفرڈ سٹیان۔ 303
- دل گداز۔ 219
- دکن روپیوں۔ 59
- دی آؤٹ لائنز آف ہسٹری۔ 283
- دیا زائن نگم۔ 260
- دی ڈیولز کا فرنس۔ 303
- دی کولمبیا والی کنگ ڈیک انسائیکلو پیڈیا۔ 283
- دیوان غالب۔ 28, 29, 93
- دیوبند۔ 58, 368
- ڈارلنگ (ایم۔ ایل۔ اے)۔ 247
- ڈارون۔ 304
- ڈاکٹر احسان رشید۔ 116, 297
- ڈاکٹر احمد بخش (خان بہادر)۔ 95, 195, 196, 202, 249
- ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ 36, 37, 165
- ڈاکٹر اخلاق اثر۔ 47
- ڈاکٹر انصاری۔ (مختار احمد)۔ 36, 71, 72, 750, 81, 82, 83, 91, 92, 160, 193, 195, 196, 197, 274, 278, 296, 360
- ڈاکٹر بوس۔ 95, 278

ڈاکٹر تاشیر۔ 144- 25

ڈاکٹر جانسن۔ 100

ڈاکٹر زاکر حسین۔ 222- 25, 43, 44, 165, 167,

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ 303

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی۔ 260

ڈاکٹر سلطان۔ 294- 95, 278, 289,

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی۔ 339- 41, 212, 259,

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ 339- 59, 165, 2600,

ڈاکٹر سید عبدالباسط۔ 143, 154, 24, 50, 53, 54, 89, 95, 154,

155, 158 159, 193, 194, 195, 197, 202, 203, 205,

207, 208, 226, 249, 278 289, 290, 294, 296, 318,

380, 381, 384, 389

ڈاکٹر سید عبد الرحمن۔ 202, 72, 95, 158, 159, 195, 196,

203, 208 221, 249, 278, 294, 296, 322

ڈاکٹر ظفر الحسن۔ 250- 249,

ڈاکٹر ظہیر الدین احمد (الجامی)۔ 107- 105,

ڈاکٹر عبدالوهاب عزام۔ 260

ڈاکٹر محمود الہی۔ 68

ڈاکٹر مظفر علی۔ 203- 195, 196, 197, 202,

ڈکنسن۔ 351

- ڈھاکہ یونیورسٹی۔ 311
- ڈیک آف ونڈسر۔ 72
- ذکر اقبال۔ 225, 244, 277, 346
- ذکر شبی۔ 331
- ذکی وارثی۔ (محمد کریم)۔ 59, 99, 151, 259, 289, 294, 338
- ذکر یہ نیگم۔ 193
- ذوق۔ 58
- راج گوپال اچاریہ۔ 322
- راجندر پرشاد (ڈاکٹر)۔ 322
- راجہ او دھڑان بسیریا۔ 219, 221
- راجہ حسن اخت۔ 160, 171, 204
- راجہ محمود آباد۔ 38, 298
- راحت سعید چھتراری۔ (نواب زادہ)۔ 99
- راحت منزل۔ 50, 74, 75, 77, 78, 95, 30
- راس مسعود (سرسید)۔ 25, 26, 29, 30, 31, 32, 34, 35, 36,
- 38, 39, 40, 41, 42, 43, 44, 45, 46, 54, 59, 69, 88, 89,
90, 92, 93, 94, 95, 96, 97, 99, 100, 10., 104, 105,
106, 107, 108, 109, 114, 115, 116, 117, 11, 119,
121, 122, 123, 124, 125, 127, 128, 129, 130, 131,
132, 133, 134, 136, 137, 139, 140, 141, 142, 143,

146, 149, 150, 151, 154 155, 157, 158, 162, 163,
164, 3645, 166, 167, 168, 182, 183, 184185, 187,
188, 189, 193, 194, 195, 196, 197, 198, 199, 200,
201 203, 204, 205, 206, 207, 208, 209, 210, 211,
212, 214, 221, 224 225, 226, 227, 228, 229, 231,
233, 234, 235, 236, 237, 238, 239, 240 , 141, 242,
2443, 244, 245, 246, 247, 248, 249, 250, 251, 259,
260, 276 278, 281, 288, 289, 290, 293, 295, 296,
297, 298, 299, 300, 304 305, 306, 308, 310, 313,
314, 315, 316, 333, 335, 341, 344, 347 359, 360,
362, 34, 366, 373, 380, 381, 382, 383, 384, 386,

388 390

راس مسعود ایجو کیشن اینڈ ٹکچرل سوسائٹی آف پاکستان۔[2] 47, 16]

راغب حسین (مولانا)۔ 112

رائٹ آف وومن۔ 64

رائے زادہ آفتاق۔ 315

رباعیات سر مد شہید۔ 272

رباعیات عمر خیام۔ 272

رباعیات قدسی۔ 272

رحم حسین (مشی)۔ 254

رجیم بخش شاہین۔ 220

رخت سفر۔ 64

رشدی اے آر۔ 49, 55, 5, 308, 339, 340

رشید احمد صدیقی (پروفیسر)۔ 104, 109, 136, 165, 260, 297

365, 371 376

رشید الظفر خاں (نواب زادہ)۔ 95, 226, 227, 270, 273

رشید انجم۔ 318

رضاشاہ اول۔ 282, 283

رضیہ فرحت بانو۔ 141, 318, 330, 339

رعنا لکھنؤی (سید بادشاہ حسین)۔ 61, 63

رفعت الحسینی۔ 338

رقیہ خلیل عرب۔ 339

رمزی ترمذی۔ محمد اسماعیل۔ 59, 338

رموز اقبال۔ 319

رموز بے خودی۔ 261

روح اقبال۔ 319

روزگار فقیر۔ 49, 64, 99, 100, 101, 102, 105, 201, 202

215, 217 219, 231, 237, 313

رومی (مولانا روم پیر)۔ 68, 70, 110, 163, 217, 259, 261

271 272, 297, 389

- رونق دہلوی (مشی پیارے لال)۔ 61
- رکیس احمد جعفری۔ 286, 319, 331
- ریاض خیر آبادی (سید ریاض احمد)۔ 61, 63
- ریاض رضوان۔ 68
- ریاض منزل۔ 50, 54, 92, 93, 94, 95, 96, 97, 99, 102, 104, 104, 105, 107, 108, 109, 111, 117, 97, 99, 102, 104, 105, 107, 108, 109, 111, 117, 118, 120, 128, 141, 142, 151, 155, 208, 246, 281, 289, 290, 295, 296, 297, 298, 299, 306, 308, 314, 315, 334, 370
- ریڈی نار۔ 283
- ریڈی یو پاکستان۔ 21, 295, 383, 390, 391
- زبور عجم۔ 149, 318, 328
- زبیر احمد صدیقی (پروفیسر)۔ 336
- زر زگار۔ 59
- زمانہ۔ 260, 261
- زمیندار۔ 80, 242, 275
- زہرہ جمال۔ 322, 339
- ساجد علی (سید)۔ 318
- ساغر نظامی۔ 270
- سائل دہلوی (نواب سراج الدین احمد خاں)۔ 61

رس-304

سیمین ساره - ۲۹۴، ۵۹

سترویں نامہ-66

سجاد ظہیر - 320

سحر انصاری۔ 55, 357, 376, 377, 379, 390

59, 259, سحر بھویاں (سراج میر خاں)۔

سردار جعفری (علی) - 320, 322

⁹² سردار صلاح الدین سلجوقی۔ 111، 112، 140، 206، 207

242, 243

مشجع۔

سمرگزشت - 165

سریافت علی - 151

سرمدشہید-272

سر و جنی نائپڑو (مسن)۔ 71, 75, 83, 155, 251, 295, 389

سوره در فته - 64

سرور جہاں - 59

سرور قادری بدایونی (عبدالصمد) - 59, 60, 63

137, 138, 246, 285-سعدی

سعدا کبر آمادی (مولانا) - 261

سعید الظفر خاں (نوای زادہ) - 95, 120, 226, 267, 271, 273

- سعیدرزمی- 253
- سعیدہ بانو- 338
- سکندر بیگم (نواب بھوپال) 62, 368
- سکندر حیات 382
- سلام الدین خاں- 253, 278
- سلامت اللہ شاہ (سید)- 148, 210, 211
- سلطان جہاں بیگم (نواب بھوپال)- 57, 58, 59, 62, 64, 71, 72, 78, 178, 219, 220, 273, 278, 330, 345, 368
- سلطانہ عالم (شہزادہ)- 63
- سلطانیہ گرلز سکول- 299
- سلمان الارشد- 339
- سلیمان خاں خالص (حافظ)- 59
- سلیمان محمد خاں آرزو ماسٹر- 254
- سلیمان ندوی (علامہ سید)- 59, 71, 90, 144, 145, 146, 149, 153 218, 222, 224, 226, 227, 260, 270, 300, 303, 304, 322, 339 340, 345
- سلیمان نقوی- 318
- سم سکریٹ ٹھنڈن- 351
- سرست ماہم- 283
- سنگباد- 312

- سنرل جیل ملتان - 349
- سودے - 367
- سورج کلاسرو 338, 322
- سوغات - 312
- سوں اینڈ مٹری گزٹ - 242
- سہما مجددی (مولانا ممتاز احمد) - 59, 99, 151, 289, 290, 294, 303, 304 338, 339
- سمیل - 309
- سیٹھ و ٹھل داس - 289
- سیپ - 386
- سید احمد - 353
- سید احسان حسین (ماسٹر) - 308
- سید احمد خاں (سر) - 58, 136, 164, 184, 185, 186, 191, 193, 213 214, 217, 218, 236, 284
- سید احمد دہلوی (شمس العلماء) - 271, 273
- سید احمد بزرگواری (مولوی) - 289
- سید احمد شہید - 57, 382
- سید احمد عباس - 211
- سید احمد علی - 55, 297
- سید حامد رضوی - 253, 289

- سید حسن سید۔ 63, 254, 289, 339
- سید زاہد علی جعفری۔ 303, 304
- سید شوکت علی۔ 318
- سید عبداللہ (ڈاکٹر)۔ 311
- سید عبدالغفور۔ 193, 194
- سید فیضی۔ 55
- سید لطف علی (مشی)۔ 254, 289
- سید محبّ الحق (شمس العلماء۔ حافظ)۔ 275
- سید محمد شاہ۔ 318
- سید محمد علی۔ 218, 219
- سید محمد یوسف (ڈاکٹر)۔ 55, 308, 310, 339
- سید محمد یوسف قیصر بھوپالی۔ 55, 58, 59, 61, 63, 99, 151, 289, 294, 295, 336, 338, 339, 343
- سید وحید الحسن۔ 219
- سیرت اقبال۔ 319
- سیرة النبی۔ 58, 219, 368
- سیرت رسول اللہ۔ 219
- سیفیہ کاج۔ 50, 51, 335
- سلیون یونیورسٹی۔ 308
- سیما ب۔ 285, 270

- شاد عارفی - 372
- شاد عظیم آبادی - 276
- شاغل فخری - 339
- 41, 59, 323, 324, 325, 329, 330
- شاہ جہان بیگم شیریں و تاجور (نواب بھوپال) - 382
- شاہ جہانی ماؤل ہائی سکول - 311
- شاہد احمد بریلوی - 165
- شاہد لطیف - 340
- شاه سعید اول - 57
- شاه سلیمان پھلواڑی - 274
- شاه عبدالعزیز دہلوی - 368
- شاه میر راہی - 339
- شاه نامہ اسلام - 188
- 183, 185,
- شبیل (علام) -
- 33, 58, 59, 68, 71, 167, 218, 219, 275
- شبیل اقبال - 31
- شبیر علی کاظمی (سید) - 37
- شبیر حسن (مشی) - 254
- شرح اسرار خودی - 319
- شرح ضرب کلیم - 231
- شریف الدین پیرزادہ - 55

- شريف محمد خاں فکري - 59, 338
- شعر اجم - 167, 169
- شعری بھوپالی - 46, 59, 259, 302, 322, 338
- شعیب قریشی (محمد) - 40.45, 69, 70, 72, 74, 79, 80, 82, -
- 85, 130, ,141, 143, 151, 155, 207, 219, 221, 226,
- 247, 249, 278, 279, 300 359, 360
- شفا گوالیاری - 338
- شفق عمار پوری - 221
- شفیقہ فرحت - 339
- شکنستلا - 305
- شمبولاں سخن - 59, 337, 338
- شملہ پہاڑی - 95, 208, 276
- شملہ کوٹھی - 267, 291, 298
- شیم احمد - 49, 55, 161, 302, 339
- شوکت علی (مولانا) - 71, 80, 81, 83, 85, 278, 359
- شہاب اشرف - 338
- شهر ادہ بار - 251
- شہید ٹوکنی - 258
- شیخ اعجاز احمد - 22, 23, 25, 26, 29, 31, 32, 34, 37, 38,
- 64, 216 239

- شیخ عبدالقدار (سر)۔ 35, 38, 303
- شیخ عطاء اللہ۔ 24, 26, 49, 168, 308, 309, 310, 334
- شیخ محمد اسمعیل پانی پتی۔ 55, 161, 162, 184
- شیخ محمد اشرف۔ 23, 2, 27, 30, 35
- شیخ محمد بدرالاسلام فضلی۔ 162, 166
- شیدا دہلوی (خشی چندی پرشاد)۔ 61
- شیریں۔ 285
- شیش محل۔ 46, 47, 50, 54, 95, 143, 144, 145, 147, 151, 152, 153, 154, 155, 193, 207, 208, 209, 211, 212, 213, 214, 218, 234262, 279, 281, 288, 289, 290, 291, 292, 293, 294, 295, 297, 299, 300, 302, 305, 306, 308, 334, 347, 370, 382
- شیکسپیر۔ 367, 377
- صالحہ خانم عاجز۔ 59
- صحیح بخاری۔ 35, 58
- صدر منزل۔ 95, 285
- صدی ایڈیشن۔ 164, 167
- صدقی حسن توفیق (نواب مولوی) (اشیخ صدقی القتوبی البخاری)۔ 57, 58, 120, 146, 382
- صرف خاص۔ 279

صفیہ اختر۔ 340

صفیہ بیگم۔ 193

صور اسرائیل۔ 148

صوفی خدا بخش۔ 37, 38, 268, 269, 272, 273, 276

صہبہ لکھنوی۔ 26, 27, 34, 47, 51, 55, 59, 164, 217,

268, 269 276, 295, 302, 317, 336, 343, 355, 356,
358, 359, 361, 362 363, 364, 365, , 366, 369, 370,
371, 372, 373, 375, 376, 377, 378 379, 380, 381,
382, 383, 384, 385, 386, 387, 388, 389, 390, 391

392

صہیب۔ 261

ضرب کیم۔ 35, 41, 54, 86, 99, 107, 108, 151, 152,

153, 194 214, 224, 225, 226, 228, 229, 230, 231,
232, 233, 234, 235, 236 261, 378, 280, 290, 302,
308, 311, 318, 334, 339, 357, 376, 381 382, 384,
386, 388, 390, 391

طاهر الدین (شیخ)۔ 239

طلع اسلام۔ 147, 148, 150, 160, 209, 210, 286

ظاہر شاہ۔ 137, 138, 140

ظفر۔ 190

- ظفر الحسن (ڈاکٹر سید) - 316, 376
 ظفر الحسن (مرزا) - 368
 ظفر علی خاں (مولانا) - 219, 274, 318
 ظفر قریشی - 165
 ظل السلطان - 58, 64, 256, 330
 ظہور الحسن (مشی) - 254
 ظہیر الدین (سید ظہیر الدین) - 58, 61, 63
 عابدہ سلطان (شہزادی ولی عہدہ ریاست بھوپال) - 21, 33, 36, 50, 550, 209
 226, 277, 278, 280, 344, 355, 361, 375,
 376, 378, 379, 381
 عادل رشید - 320
 عارف بٹالوی - 319
 عالی صفائی پوری (سید ابن علی) - 61
 عبادت بریلوی (ڈاکٹر) - 55
 عبدالاحد خاں مغلص - 339
 عبدالباسط - 318
 عبدالحق (بابائے اردو ڈاکٹر مولوی) - 36, 37, 71, 13, 149, 163, 165, 166
 222, 245, 246, 281, 284, 300, 322, 330,
 332
 عبدالحکیم صدیقی ذکا بھوپالی - 59, 58

- عبدالحليم انصاری (آرٹسٹ)۔ 59, 289, 306, 308, 318, 322, 335, 339
- عبدالحليم شرر (مولانا)۔ 218, 219, 220
- عبدالحمید انصاری۔ 322
- عبدالحمید کمالی۔ 55, 375
- عبدالحی سید (سید)۔ 46, 55, 159, 193, 194, 196, 197, 208, 226, 247, 290, 292, 381, 385, 389
- عبدالرحمٰن بجنوری (ڈاکٹر)۔ 59, 71, 72, 219, 337, 339, 368
- عبدالرحمٰن الداخل۔ 310
- عبدالرحمٰن چغتائی۔ 25, 35
- عبدالرحمٰن قلندر (شاہ)۔ 274
- عبدالرازاق (مولوی)۔ 58, 59, 253, 289, 300, 339
- عبدالشکور اخلاص۔ 59
- عبدالعزیز خاں (مشی)۔ 60
- عبدالعلی۔ 150
- عبدالغنی۔ 31, 32, 239
- عبدالقادر بیدل۔ 389
- عبدالقدیر آزاد (مشی)۔ 59
- عبدالقوی دسنوی۔ 41, 50, 51, 212, 256, 303, 304, 312, 330, 335, 336, 339, 365, 380, 386

- عبدالقيوم (مولوی)۔ 254
- عبداللطیف خاں۔ 317, 318, 319
- عبدالماجد ریبابادی (مولانا)۔ 202
- عبدالملک۔ 319
- عبدالمتعال (حافظ)۔ 273, 275
- عبدالمتین (کامدار)۔ 59
- عبدالمحیم سالک (مولانا)۔ 225, 277, 344, 346, 354
- عبدالواحد معین۔ 23, 51, 55, 172, 374
- عبدالوهاب بابی۔ 353
- عبداللہ قریشی (محمد)۔ 55, 105, 172, 383
- عبداللہ خاں (نواب کرنل حافظ)۔ 71
- عثیق احمد صدقی۔ 318
- عرفی۔ 357
- عرش ملیسائی۔ 321
- عرشی بھوپالی۔ 338
- عزیز احمد۔ 45, 137, 138, 285, 319, 381
- عزیز الدین (سید)۔ 318
- عزیر بلکھنوی (مولوی مرزا ہادی)۔ 61
- عشرت قادری۔ 338
- عاصم صحرائی۔ 387

- عصمت اللہ بیگ دہلوی - 59
- عصمت چغتائی - 340
- عطابد ایوں - 63
- عطاء محمد عطا (بابو) - 61, 63
- عطیہ فیضی (بیگم) - 71, 218, 332, 333
- عظیم بیگ - 319
- علی امام (سر) - 121
- علی بخش - 93, 104, 128, 129, 130, 131, 141, 143, 148, 154, 157, 159, 160, 171, 195, 198, 205, 208, 214, 226, 235, 237, 238, 241, 243, 289, 292, 293, 298, 314, 342, 348
- علی حیدر ملک - 387
- عمر انصاری (حافظہ محمد) - 318
- عمران انصاری 339, 323, 324, 325, 329, 338
- عمر بن خطاب - 146
- عبرا چغتائی - 339
- عید گاہ کوٹھی - 95, 254
- عیسیٰ (حضرت مسیح) - 146, 153, 35
- عیش بھوپالی (سید امرا و علی) - 61, 59
- غازی روئے بے - 80, 85

- غالب (نواب میرزا اسداللہ خاں غالب نجم الدوّلہ دییر الملک)۔ 53, 60, 61, 64, 71, 234, 295, 328, 336, 367, 368
- غدرہ بھلی اخبار نویس۔ 120
- غدرہ بھلی کے گرفتار شدہ خطوط۔ 120
- غنجپ۔ 323, 324
- غوث علی شاہ۔ 67, 274
- غلام احمد قادریانی۔ مرزا۔ 144
- غلام السیدین (خواجہ)۔ 45, 102, 139, 165, 166, 167, 225, 229, 247, 248, 249, 260
- غلام بھیک نیرنگ (میر سید)۔ 61, 63, 67, 313
- غلام دشکر۔ 318
- غلام رسول مہر (مولانا)۔ 51, 52, 55, 74, 75, 77, 78, 79, 80, 83, 84, 85, 86, 380
- غلام قادر گرامی (مولانا)۔ 221
- فاران۔ 345
- فانی۔ 258
- فتح الباری۔ 58
- فتح محمد ملک۔ 383
- فرق۔ 258
- فرگوش مس۔ 124, 125

- فرانس نظرت حکیم - 58
 فرہاد - 285
 فضل حق قریشی - 165
 فضل علی سرور - 338
 فقیر وحید الدین - 49, 64, 99, 105, 20, 1, 215, 222, 236
 فلکراقبال - 318
 فلسفہ جنم - 318
 فنون - 312, 316, 381, 383
 فوجدار محمد خاں (نواب) - 337, 368
 فواد یونیورسٹی - 309
 فہیم رضا - 262
 فیروز خاں نون - 172
 فیروز سنز - 284
 فیضی - 167
 قاضی تلمذ حسین - 68, 69
 قاضی علی محمد (ماستر) - 59, 99, 151, 219, 278, 289, 295
 قائد اعظم محمد علی جناح - 71, 75, 83, 209, 224, 225, 278
 279, 280, 283, 309, 322, 349, 354, 359, 360

237

339

- قدیمیہ منزل (محل) - 95, 163, 155, 193, 290
قدوس صہبائی - 59, 339
- قرآن مجید پاک حکیم - 25, 29, 33, 35, 43, 45, 64, 102, 122, 127 129, 134, 137, 217, 219, 226, 227, 293, 297, 326, 341, 324, 343 344, 346, 347, 350, 351, 352, 353, 354, 369, 376, 381, 382, 383 384, 386, 388, 389
- قصر سلطانی - 94, 95
- قطب مینار - 155
- قمر جمالی - 339
- قمر الحسن (حکیم - سید) - 305, 321, 336, 339
- قمر ہاشمی - 357, 376
- قومی زبان - 119, 125, 130, 132, 188, 189, 214, 381
- القومی کتاب مرکز - 376
- کاروان ادب - 330
- کاؤان غزل - 262
- کالیداس - 305
- کامتا پرشاد - 322
- كتاب - 379, 387
- کڑک ہال - 48

- کراچی یونیورسٹی- 308, 297
- کردار- 256
- کرشن چندر- 340
- کرنل رابنسن- 212
- کرنل عبدالرشید خاں- 297, 246, 245, 238, 199, 198, 141
- کشکول قلندری- 66
- کلام عبدالقدور بیدل- 292
- کلیات اقبال- 318
- کلیات صائب- 135
- کمال اتا ترک- 283, 282
- کمال لکھنؤی (حکیم سید مهدی حسن)- 63, 61
- کمل اپنی پارک- 302
- کوثر چاند پوری (حکیم علی)- 339, 322, 321, 89, 59
- کوکب جیل- 339
- کوئن و کٹوریہ- 176
- کیف بھوپالی- 339, 338
- کیفی اعظمی- 320
- کیمبرج- 94, 35
- کینگ کانگ- 218
- گارڈن سٹی بک نیوز- 283

- گاندھی (مہاتما)۔ 72, 82, 83, 209, 222, 272, 278, 279
 322, 360
- گفتار اقبال۔ 80
- گل حسن شاہ فلندر۔ 67, 268, 274, 275
- گلنا رینگم (بی بی)۔ 40
- گنج ہائے گرائ نمایہ۔ 105, 109, 136, 313
- گو بند پرشاد آفتاب۔ 59, 289
- گوپی کرشن شوق۔ 338
- گورنمنٹ حمید یہ کالج میگزین۔ 231, 232, 234
- گوہرتاج نیگم صاحب و ولی عہد۔ 280
- گوہر جلالی۔ 322, 388
- گوہر محل۔ 66, 95
- گوئٹے۔ 35, 46, 255, 304
- گہوارہ ادب۔ 280
- گیان چندڑا کٹر۔ 339
- لارڈ یووین۔ 35, 145
- لارڈو پلکنٹن۔ 130
- لالہ قلعہ۔ 120, 155
- لالہ ملک راج۔ 322
- پچھی زائر ان افسر (مشی)۔ 59

- لسان العصر-68
 لطف اللدخار نظمی-339
 لکھنؤ یونیورسٹی-311
 لمعہ (ڈاکٹر محمد عباس علی خاں)۔-
 24, 25, 28, 29, 55, 89, 109, 110, 111, 373
 لندن یونیورسٹی-39
 لیاقت علی خاں نواب زادہ-300
 184, 219, 221, 300
 لینن-283
 مارٹین-351
 مارکس-373
 مانی جائسی (کلب احمد)۔-58
 مالوہ روپیو-59, 63
 مائل نقوی (عبد الجلیل)۔-
 59, 99, 253, 256, 259, 260, 289, 316, 338
 متنین سروش (مرزا)۔-338
 مشتوى مولا ناروم-292
 93, 110, 272, 292
 مجنوں گور کچوری (پروفیسر)۔-
 217, 165, 319, 363, 372, 376, 378
 محسن الملک-59, 258
 محسن بھوپالی-379
 55, 338, 339

- محشر لکھنؤی۔ (سید کاظم حسین)۔ 61
- محفوظ علی بدایوں (سید) 159
- محمد (حضرت نبی کریم۔ رسول اللہ صلعم)۔ 46, 86, 134, 144, 145, 146, 187, 190, 191, 192, 201, 211, 23, 214, 215, 284, 342, 343 345
- محمد ابراہیم (مولوی)۔ 322
- محمد احمد خاں۔ 41, 42, 43, 44, 278, 330
- محمد احمد سبزداری (سید)۔ 21, 42, 55, 59, 51, 253, 255, 280, 281, 283 284, 285, 286, 288, 304, 316, 322, 371, 376, 377, 378, 381
- محمد اسد (ڈاکٹر لیو پولڈیس)۔ 35
- محمد اسمعیل دسنوی (مولوی)۔ 62
- محمد اسمعیل ہائف منشی۔ 254, 338
- محمد اقبال سلیم گاہندری۔ 323, 324
- محمد اکرام شیخ۔ 284
- محمد امین زبیری مولوی۔ 33, 34, 41, 43, 54, 58, 59, 64, 86, 165 166, , 168, 169, 330, 331, 333, 333, 334, 339, 343, 344, 345, 346
- محمد انس خاں 318
- محمد انصاری۔ 318

- محمد حامد علی-68
محمد حسین تاج-318
محمد حسین خاں-319
محمد حیات-221, 219, 45
محمد خالد-318
محمد خلیل اللہ خاں-318, 46, 55, 51, 278, 289, 293, 294
محمد رفیق افضل-80
محمد زبیر صدیقی (پروفیسر)-305
محمد طاہر فاروقی (ڈاکٹر)-281
محمد عالم نجفی (سید)-61
محمد علی خاں میکش-304
محمد عباس رفت-58
محمد علی تاج-338
محمد علی جوہر (مولانا)-
25, 40, 71, 72, 218, 2319, 222, 233, 278, 283, 359
محمد علی صدیقی-55
محمد عمر دراز خاں-120
محمد مجیب پروفیسر-45, 15, 260
محمد مہدی (مولوی)-58, 59
محمد میاں شہر (سید)-59

- محمد نعیم ندوی - 344
- محمد وکیل صدیقی - 339
- محمد ہادی مرزا - 61, 55
- محمد ہادی مرزا (مرزا) - 61
- محمد یوسف - 319
- محمود اعظم فہمی (سید) - 59, 338, 339
- محمود احسان صدیقی - 315, 316 339
 محمود الحسینی - 339
- محمود علی (مشی) - 63
- محمود نظامی - 319
- محی الدین قادری زورڈاکٹر - 58, 59, 256, 338, 339
 مختار مسعود - 26
- محمود بھوپالی - 338
- مدرستہ العلوم - 218
- مدرسہ صولتیہ - 58, 368
 مدینہ - 323, 324
- مراتۃ المشوی - 68, 69
- مرزا ابراہیم بیگ - 165

- مرزا جلال الدین - 277
- مرزا شاغل فخری - 58
- مرزا فرحت اللہ بیگ - 59
- مرزا مظفر سیفی - 255, 256
- مرقع مسعود - 260, 163, 163, 164, 206
- مسجد شاہ جہانی - 105
- مسجد شہید گنج - 248, 147, 198, 199, 235, 236
- مسجد قرطہ - 30
- مسجد وزیر خاں - 273
- مسدس حاصل - 285, 35, 146, 167, 168, 169, 175
- مسعود احمد برکاتی - 55
- مسعود اکیدمی - 162
- مسعود علی سید - 318
- مسعود علی وارثی - 272
- مسلم ضیائی - 55, 48, 43
- مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - 293, 42, 58, 130, 131, 174, 185
- منڈا حمد - 146
- مسولینی - 283, 282, 232
- مسح الدین - 294, 55, 151, 293

- مسح صدیقی (قریش)- 55, 254, 256, 299, 302, 381
- مشق خواه- 381
- مصباح الدین احمد- 254
- مصطفی الراغی- 45
- مصطفی علی بریلوی (سید)- 184
- مضامین اقبال- 318
- منظفر خیر آبادی- 59, 270
- مطلوب عالم فاروقی (نشی)- 254
- منظفر شاہ جہان پوری- 322
- معارج الدین- 219, 272
- معاشیات- 281
- معشوق علی خاں جوہر (حکیم)- 58
- مظہر احمد وہمی مولوی- 59
- معظم رسول صدیقی- 299, 300, 373
- مفتش عبدہ 382
- مقالات اسلام- 57
- مقام اقبال- 319
- مقبول حسن قریشی کریں- 70
- مقدمۃ القرآن- 25, 347, 348
- مقصود عرفانی- 338

- مقصود عمرانی- 338, 322
- مکاتیب شلبی بنام عطیہ- 331
- مکتبہ افکار- 295, 262
- مکتبہ الائچی- 227
- مکتبہ جامعہ- 260
- ملتویات اقبال- 383, 49, 74, 78, 88, 90, 91, 92, 96, 97, 98, 111, 112, 113, 133, 134, 135, 142, 143, 147, 148, 154, 156, 157, 160, 169, 172, 197, 204, 206, 207, 209, 210, 211, 212, 228, 274, 341, 343
- ملکہ معظمه- 368
- ملارموزی- 339, 59, 254, 289, 294, 338
- ملا علی قادری- 146
- ملٹن- 38
- ملفوظات اقبال- 319
- ملک محمد اشرف- 304, 303
- متاز حسن ڈاکٹر- 374, 21, 38, 39
- ممنون حسن خاں- 88, 21, 22, 25, 29, 30, 33, 34, 36, 38, 60, 43, 44, 45, 46, 47, 54, 92, 93, 99, 135, 141, 143, 151, 168, 169, 207, 224, 234, 241, 242, 243, 244, 245, 246, 247, 248, 249, 152, 289, 293, 305, 308,

- 309, 314, 315, 316, 334, 335, 336, 347, 366
منادی۔ 270
مشی حسین خاں۔ 267
مشی عبدالحی۔ 63
مشی طاہر دین شیخ۔ 31, 225
منصب علی مولوی۔ ماسٹر۔ 221, 219
منوا بھانڈ۔ 38, 267
منیر احمد شیخ۔ 53
منیر بھوپالی منیر الدین۔ 59, 338
منیرہ۔ 31, 34, 113, 137, 141, 154, 201, 202, 2389, 239 240, 348
موتی محل۔ 95
موتی مسجد۔ 31, 50, 143, 276, 294
مون کوثر۔ 284
موئی جارالله۔ 304, 227, 303
مولانا شفیع داؤدی۔ 85, 80
مولوی احسن اللہ خاں۔ 58
مولوی بشیر الدین۔ 165
مولوی شکر اللہ سہیل۔ 58, 99, 154, 219, 221, 278
مولوی محمد صالح۔ 80, 75

- مومن۔ 328.368
- مهاراجہ بڑو دہ کیوار۔ 218, 220
- مهاراجہ کشمیر (ہری سنگھ)۔ 78, 79, 84, 121, 233, 373
- مهاراجہ کشن پرشاد۔ 122, 123, 270, 333
- مہ جبین خمار۔ 256, 257, 258, 299, 300, 338
- مہدی الافقی۔ 295
- مہدی حسن احسن (سید)۔ 61
- مہر دہلوی خورشید علی۔ 59
- مهند رنا تھ۔ 340
- میاں اسد اللہ خاں۔ 337
- میاں امیر الدین۔ 32, 239
- میاں خالد (علامہ)۔ 59, 339
- میاں محمد شفیع۔ 28, 348, 349, 354, 365
- میٹ نین۔ 352
- میڈ روپیونیورسٹی۔ 39
- میر 338, 103
- میر ولی الدین ڈاکٹر۔ 319
- میکھ دوت۔ 305
- مئے لالہ فام۔ 155
- میوزیم ہال۔ 71

- نادرشاه- 137, 138, 283
- نادره مسعود- 104, 105, 236, 239, 240, 245, 297
- ناصر علی ناصر اثاوی ماسٹر- 254, 288
- نامہ قدسی- 66
- ندوہ- 58
- ندوۃ العلماء- 68
- ندیم- 49, 59, 254, 255, 256, 276, 289, 295, 299,
- ندیر نیازی- سید- 305, 312, 313, 316, 321, 336, 339, 369, 389
- ندیر احمد ڈپٹی مولوی- 48, 375
- ندیر نیازی- سید- 32, 38, 39, 49, 55, 73, 74, 86, 188,
- نذریں یاری- 90, 91, 92, 96, 97, 98, 105, 109, 111, 112, 113, 123,
- نذریں یاری- 133, 135, 142, 143, 144, 146, 148, 149, 150, 153,
- نذریں یاری- 154, 156, 158, 159, 160, 165, 169, 171, 197, 203,
- نذریں یاری- 204, 206, 207, 209, 210, 211, 212, 213, 224, 225,
- نذریں یاری- 227, 237, 341, 343, 344, 354, 383
- نسخہ حمیدیہ- 71, 337, 368
- نسخہ عرشی زادہ- 337, 368
- نصر اللہ خاں (نواب)- 71
- نظام الدین اولیاء- 155
- نظام حیدر آباد کن 71, 122, 123, 138, 166

نظامی بدایونی۔ 260

- نظر حیدر آبادی۔ 47, 48, 110, 122, 138, 238, 374, 383
- نغمات۔ 66
- نغمات قدسی۔ 272
- نشیں احمد فاروقی۔ 254
- نقش چغتائی۔ 25, 35
- نقوش ماضی۔ 268, 269, 275
- نگار۔ 59, 68, 69, 70, 256, 311
- نواب بہاول پور۔ 124, 127, 160
- نواب پٹوڈی۔ 72 نواب ٹوک (ابراهیم علی خاں)۔ 274
- نواب حسن منشی۔ 254
- نواب خسرو یار جنگ۔ 273
- نواب عبدالحفظ خاں۔ 273, 274
- نواب عزیز یار جنگ۔ 29
- نواب کرناں۔ 165, 166
- نواب محمد اسمعیل خاں۔ 81, 83
- نوازش نامے۔ 33, 331, 334
- نوائے سیفیہ۔ 335
- نوائے فردا۔ 171
- نور خاں ایری ماشرل۔ 22

- نورس۔ 280
- نودی۔ 146
- نیاز فتح پوری (علامہ)۔ 58, 59, 258, 295, 339
- نیرنگ خیال۔ 252, 319
- نیشنل بک سنٹر۔ 355, 365, 375, 376
- نیشنل بک آف پاکستان۔ 297
- نیوتاج آفس۔ 138
- نیوکانچ۔ 249, 250
- واحد علی۔ 318
- وادی ایمن۔ 270
- وارث علی شاہ۔ 267
- والدہ جاوید (اہلیہ علامہ اقبال)۔ 97, 98, 111, 112, 114, 114, 128, 129 130, 131, 133, 134, 137, 141, 154, 115, 118, 119, 242, 243, 248
- والدہ راس مسعود۔ 249, 250
- واسراء ہند۔ 249, 250
- وائی کنگ پر لیں نیویارک۔ 283
- وجدی الحسینی (مولانا)۔ 322, 338
- وبے کشمی پنڈت۔ 371
- ورڈ زور تھ۔ 367
- وریو تھلی۔ 367

وزیر علی (سید)۔ 72

وفا صدیقی۔ 338

نوشن چرچل۔ سر۔ 283

وونگ مسجد شاہجہانی۔ 58

ولیزان پنج بھی۔ 283

ہاشمی فرید آبادی (سید)۔ 165, 168

ہٹلر۔ 282

ہمارا قائد۔ 42

ہمارے بنک۔ 281

ہمارے بی۔ 219

ہمایوں منزل۔ 34, 22

ہمدرد۔ 219

ہندوستان کا قومی فریضہ اور جنگ۔ 42

ہندوستان کی معیشت اور جنگ۔ 42

ہوا محل۔ 95

ہیری ہیگ (سر)۔ 250, 249

یاٹ کلب۔ 308, 298, 291

یادگار غائب۔ 175

یادگار شاہجہانی۔ 208

یادگار غائب۔ 175

یکتا امروہوی - 65

یکتا حقانی 319

ینگ انڈیا - 172

یاسف النساء یکم - 219

یوسف حسن (حکیم) - 252

یوسف حسین خاں (ڈاکٹر) - 319

یوسف سلیم چشتی (پروفیسر) - 231, 232, 233



The End----- اختتام -----